رجسٹرڈ نمبر اے ۳۶۶

قیمت ۸ر

ہمیشہ یاد رکھیے

اگر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے بعد قیمتاً یعنی ۹ ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

اگر آپ نے خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ نہیں دیا تو کوئی جواب نہیں دیا جائیگا۔ منیجر

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ

ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجۂ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۹	فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۴

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمارہ - ۴	اپریل سنہ ۴۱ء	جلد - ۳۹

ملاحظات

ندویوں کے اخلاق

اس وقت عام طور پر تمام مولویوں کے اخلاق بہت مشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، لیکن اس جماعت کا ایک خاص "طایفہ" جو اپنے آپ کو ندوی کہتا ہے، اس کے بعض افراد نے اس اشتباہ کو دور کرکے یہ بات بالکل واضح کردی ہے کہ ندوی ہونا "مولویت" کی وہ منزل ہے جہاں "ندویت" اور "دنائت اخلاق" دونوں بالکل مترادف الفاظ ہیں

اس "طایفہ" کی سب سے زیادہ نمایاں ہستی اسوقت سید سلیمان ندوی ہیں، لیکن میں اس سب سے بڑے "ندوی" کی انتہائی اخلاقی بے مایگی اور ذہنی پستی کا ذکر نہیں کروں گا، کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر میری ذات سے ہے اور میں گالی دینے والوں کا جواب ہمیشہ خاموشی سے دیا کرتا ہوں، لیکن ندوہ کے نظام شمسی میں، اس آفتاب کے گرد جو اور بہت سے "اقمار" گھومتے نظر آتے ہیں، انکا ذکر غالباً ناموزوں نہ ہوگا

دسمبر کے نگار میں "سطحیات سید سلیمان ندوی" کے عنوان سے ایک مضمون "م - ا" کے قلم سے شایع ہوا تھا۔ اس کے شایع ہونے کے بعد دریاباد سے لیکر اعظم گڈھ تک ہلچل مچ گئی، اور یہ جستجو شروع ہوئی کہ "م - ا" کون ہے، یعنی بحث یہ نہ تھی کہ لکھا کیا ہے بلکہ صرف یہ کہ کس نے لکھا ہے۔ آخرکار اس کا پتہ چل گیا کہ مقالہ نگار کا نام "مختارالدین آرزو" ہے اور پھر اس کے بعد جو کچھ سید سلیمان ندوی کے حواریین نے کیا وہ ہر چند اس قابل نہیں کہ اسے کسی مہذب انسان کے سامنے بیان کیا جائے، لیکن اس خیال سے کہ آپ ان ندویوں کی ذہنیت سے بے خبر نہ رہیں پٹنہ کے دو اخباروں کا کچھ اقتباس پیش کیا جاتا ہے جن کے اڈیٹر و نگراں سب کے سب ماشاء اللہ ندوی

ہیں۔ ایک اخبار میں علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگرد و حواری مولانا سید مسعود عالم ندوی کسی مستفسر کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مثال کے طور پر آپ اپنے پٹنہ کے اس کمسن نوجوان مختارالدین لڑکے کو سامنے رکھئے۔ آجکل آپ کے کسی حصہ میں کچھ گدگدی سی اٹھی ہوئی ہے۔ اس گدگداہٹ یا یوں سمجھئے اس شیطانی وسوسہ کو مٹانے کی آپ نے بڑی کوششیں کیں، مگر آپ جانتے ہیں کہ اس "معاملۂ خاص" میں ہمارا صوبہ بڑا ہی بد ذوق واقع ہوا ہے، چنانچہ ہمارے اس ملیح و صبیح نوجوان کو اپنے وسوسہ کی تسکین کے لئے لکھنؤ کی طرف رجوع کرنا پڑا اور معلوم ہے کہ "لکھنؤ" اس "معاملۂ خاص" میں کافی سے زیادہ خوش ذوق واقع ہوا ہے۔ جہاں صرف بایدکا مضمون ہو اگر وہاں کوئی پوری رعنائی اور سامان کا فری کے ساتھ اپنے کو پیش کر دے تو لکھنؤ والے مارے خوشی کے کھڑے کھڑے پیشاب کرنے لگیں تو اس میں بھلا ان کا کیا قصور ہے؟۔ اس بچہ کی خاص قسم کی پریشانی کا احساس کر کے ہم اسے مشورہ دینے والے ہی تھے کہ وہ لکھنؤ کی طرف رجوع کرے لیکن یہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پریشان حال معصوم نے اپنے مرض کا نسخہ خود ہی تجویز کر لیا اور نیاز کے گود میں جا پہونچے اور اپنی پریشان کن خواہش او۔ جان لیوا تشنگی کو دریائے گومتی کے پانی سے بجھانے لگے۔ زندہ باد لکھنؤ پائندہ باد آغوش نیاز۔ لیکن ہم اس بچہ کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ لکھنؤ والے بڑے مطلبی ہیں۔ جب تک جوبن باقی ہے سب کچھ کریں گے اور جہاں ڈھلنے ولنے کا قصہ آیا پھر کوئی نزدیک پھٹکنے نہیں دے گا"

اس مضمون کے بعد ہی علامہ ظفر ندوی کے کچھ اشعار نظر آتے ہیں جن کی سرخی "بے بھاؤ کی" ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہوا تیری عصمت کا مختار شیطاں،　　جو شہرت کا تو ہے طلبگار شیطاں

یہ گچی سی آنکھیں، یہ نمکین چہرہ　　بنا چشم نرگس کا بیمار شیطاں

ایک دوسرے اخبار کے دوسرے ندوی اڈیٹر نے کسی اور مستفسر کا جواب دیتے ہوئے یوں خامہ فرسائی کی ہے:

"آپ کا نام مختارالدین اور غالباً آرزو تخلص، لمبا قد، گندمی رنگ، چہرے پر ملاحت اونچی ناک سرگیں آنکھیں مزید دو آنکھیں اور ہر بات سے بھولا پن، ہر ادا سے ناز و انداز نمایاں، کسی مدرسے کے ملا، برسوں نوکری اور ملازمت کی خاطر انسپکٹر آف اسکول اور مدرسوں کے ممتحنوں کے در کی جبیں سائی کرتے رہے لیکن ہر راہ مسدود اور ہر دروازہ بند پایا آخر مضمون نگاری اور شہرت آفرینی کی سوجھی اس سلسلے میں ہندوستان کی ایک برگزیدہ ہستی پر کیچڑ اچھالا ہے جس سے تہذیب و شائستگی آنکھیں بند کر لیں اور سننے والوں نے سر پیٹ لئے۔ یہ ہے آپ کی مختصر سرگزشت"

دیکھا آپ نے، یہ ہے ندویوں کی تہذیب اور یہ ہیں وہ ذلیل حربے جو سید سلیمان ندوی کے حواریین کی طرف سے استعمال کئے جاتے ہیں یہ لوگ ان اعتراضات کا جواب کبھی نہ دیں گے جو ان کے مقالات یا مزعومات پر کئے جاتے ہیں بلکہ اپنی دل کی آگ صرف اسی قسم کی رکیک و ذلیل گالیوں سے بجھائیں گے جن کو آپ نے ان اقتباسات میں ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

یہاں مکارم نگر میں ایک میلہ "خواجہ سراؤں" کا ہوا کرتا تھا جس میں صرف گالیوں ہی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ لیکن اب غالباً یہ اعظم گڑھ کی طرف ہونے لگا ہے۔ اور بجائے زبان کے کاغذ و قلم کے ذریعہ سے اس کی نمائش ہوتی ہے!

میں مختارالدین احمد صاحب آرزو کو مشورہ دوں گا کہ وہ ان ہفوات کی مطلق پرواہ نہ کریں اور اپنے کام میں لگے رہیں۔ حاسدوں کی سزا یہی ہے کہ ان کی آتش حسد کو تیز تر کیا جائے اور اس کی بہترین صورت صرف یہ ہے کہ ان کے مزخرفات کی طرف توجہ نہ کی جائے

اذا مرّوا باللغو مرّوا کراما　!

ہماری مشکلات

اس سے پہلے کاغذ کی گرانی و کمیابی کا ذکر کیا گیا تھا، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کمیابی اب نایابی کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اور نگار کے سایز کا کاغذ لکھنؤ کے بازار میں مفقود ہے - ہندوستان کے کاغذ ساز کارخانوں کو اول تو حکومت کی فرمایش پوری کرنے سے وقت نہیں ملتا اور اگر کچھ فرصت ملتی بھی ہے تو وہ بھاری کاغذ طیار کرتے ہیں تاکہ وہ کم از کم محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر سکیں، فی الحال تو کئی مہینے کے لئے میں نے کسی نہ کسی طرح انتظام کر لیا ہے لیکن اگر بعد کو اس سایز کا کاغذ نہ ملا تو شاید تقطیع بدلنا پڑے گی -

اس مرتبہ ٹیبدک ([illegible]) کا کاغذ بھی نہیں ملا، اس لئے مجبوراً سرورق ہی کے ایک طرف پتہ لکھ کر پرچہ پوسٹ کیا جاتا ہے - سرورق کا کاغذ جو پہلے سات روپیہ فی رم کے حساب سے آتا تھا اب اس کی قیمت بیس روپیہ سے زیادہ ہے اور پھر بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا - اس لئے سرورق بھی اُسی کاغذ کا رکھا گیا جس پر رسالہ چھپتا ہے -

یورپ میں تو خیر لڑائی کی وجہ سے ہر چیز کا راشن مقرر ہے، لیکن ہندوستان میں یہ تجربہ کاغذ سے شروع ہوتا ہے - خدا خیر کرے!

میں نے اپنی ان دشواریوں کا ذکر اس لئے کیا کہ اگر اس موقعہ پر قارئین نگار نے توسیع اشاعت میں حصہ لیا تو یہ ان کی انتہائی فرض شناسی ہوگی، لیکن اگر انھوں نے اس طرف توجہ نہ کی، تو بھی نگار تو بہر حال کسی نہ کسی طرح جاری ہی رہے گا اور انھیں معنوی خصوصیات کے ساتھ جو اس کے لئے مخصوص ہیں - ظاہری صورت اگر کچھ بگڑی ہوئی نظر آئے تو اس کی پرواہ نہ کیجئے، کیونکہ حُسن صورت کا دعویٰ نگار نے کبھی نہیں کیا اور نہ آپ نے نگار کو "ٹِپ ٹاپ" والا رسالہ سمجھکر کبھی اسے خریدا!

رفتارِ جنگ

لڑائی کو شروع ہوئے انیس مہینے ہو چکے ہیں، لیکن ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب تک جاری رہے گی اور اس کا انجام کیا ہوگا - گتھی پر گتھی پڑتی جا رہی ہے اور فریقین میں سے کوئی اگر کسی گرہ کو کھولتا بھی ہے تو چار اور نئی گرہیں پڑ جاتی ہیں -

خبریں جو کچھ مل رہی ہیں وہ اس قسم کی ہیں کہ خود خبریں بھیجنے والوں کو بھی ان پر یقین نہیں اور اگر اگلے پچھلے حالات کو سامنے رکھکر قیاس سے کام لینے کی کوشش کیجئے تو اتنی متضاد باتیں نظر آتی ہیں کہ نتیجہ تو خیر بڑی چیز ہے، ہم درمیانی منزلوں کو بھی متعین نہیں کر سکتے -

اس وقت تک جو کچھ ہو چکا ہے اس نے دو باتیں بیشک پوری طرح واضح کر دی ہیں، ایک یہ کہ نازی سیلاب آگے بڑھتے بڑھتے رُک گیا ہے اور دوسرے یہ کہ انگلستان نے جو بند اس سیلاب کے روکنے کے لئے قایم کیا تھا، اس میں کوئی رخنہ ابتک پیدا نہیں ہوا -

جیسا کہ خیال تھا، موسم بہار کے آغاز سے جرمنی نے انگلستان پر بھی ہوائی حملوں کا سلسلہ شدت کے ساتھ شروع کر دیا ہے اور بحر اٹلانٹک میں بھی، اس کی آبدوز کشتیاں زیادہ سرگرمی دکھانے لگی ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جرمنی خود بھی ان حملوں کی طرف سے زیادہ مطمئن نہیں ہے اور وہ بلقان کی ریاستوں کو ملا کر، یونان کی طرف سے انگریزی مقبوضات اور نہر سویز پر بھی حملہ کرنا چاہتا ہے ہنگری تو بہت پہلے اس کا شریک ہو چکا تھا لیکن اب رومانیا اور بلغاریا بھی اس کے ساتھ ہو گئے ہیں - یوگوسلیویا کا مسئلہ البتہ ابتک اُلجھا ہوا ہے اور وہاں ایک تازہ تحریک جرمنی کے خلاف پیدا ہو چلی ہے - اگر یوگوسلیویا نے واقعی جرمنی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو بلقان کی موجودہ سیاست پر اس کا بہت بڑا اثر پڑے گا - جس حکومت نے جرمنی کے ساتھ معاہدہ کیا تھا وہ ختم ہو چکی ہے اور وہاں کے نوجوان بادشاہ نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ بالکل غیر جانبدار رہے گا - اس کے معنے یہ ہیں کہ اب نہ جرمن فوجیں یوگوسلیویا کی طرف سے یونان پر حملہ کر سکیں گی اور نہ بحر اڈریاٹک پر اقتدار حاصل کر کے جرمنی اور اٹلی کی سرحدیں ایکدوسرے

سے مل سکیں گی۔

یوگوسلیویا کی جائے وقوع ایسی ہے کہ وہاں سے خشکی اور سمندر دونوں طرف سے یونان اور بحرِ روم کی طرف فوجیں بھیجی جا سکتی ہیں اور کھانے پینے کی چیزیں بھی جرمنی کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اگر یوگوسلیویا واقعی اپنی ناطرفداری پر قایم رہا تو ہٹلر کے لئے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو وہ زبردستی اپنی فوجیں یوگوسلیویا کے اندر سے لیجائے، یا پھر صرف بلغاریا کے راستہ سے یونان پر حملہ کرے۔

اول صورت میں جرمنی کو ایک اور سخت لڑائی مول لینا پڑے گی، کیونکہ یوگوسلیویا کو برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے بھی پوری مدد ملیگی اور چونکہ یہاں کی سرزمین بالکل کوہستانی ہے، اس لئے اگر ہٹلر کو کامیابی حاصل ہوئی بھی تو مہینوں درکار ہوں گے، لیکن اگر اس نے یوگوسلیویا کو نہ چھیڑا اور بلغاریا ہی کی طرف سے حملہ کیا تو اسے ترکی اور یوگوسلیویا دو ناطرفدار حکومتوں کے درمیان سے گزرنا پڑے گا، جو خطرہ سے خالی نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بلقانی ریاستوں میں کبھی اتحاد نہیں پایا گیا اور اسی وجہ سے وہ دوسری حکومتوں کا شکار بنی رہیں، لیکن یونان، ترکی اور یوگوسلیویا کا باہمی معاہدہ زیادہ قومی اغراض پر قایم ہے اور ہو سکتا ہے کہ آیندہ صورتیں ایسی پیدا ہو جائیں کہ ان تینوں کو جرمنی کے مقابلہ میں آجانا پڑے اور یہ بات ہٹلر کے اغراض کے بہت منافی ہوگی۔

ہٹلر نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ بلقان میں لڑائی کی آگ پھوٹ پڑے، کیونکہ اول تو اس سے روس کی موجودہ پالیسی پر بڑا اثر پڑے گا، دوسرے یہ کہ فتنہ و فساد کے زمانہ میں وہ بلقان سے اقتصادی فواید حاصل نہ کر سکے گا۔ اس لئے اس کی امید بہت کم ہے کہ وہ یوگوسلیویا سے لڑائی مول لیگا، لیکن یونان پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔ وہ یہ بھی نہ کرے گا، کیونکہ اس سے اس کے اقتدار کو بہت صدمہ پہونچے گا اور بلقان میں اس کی سیاسی کامیابی ختم ہو جائے گی۔

بہرحال حالات آہستہ آہستہ جرمنی کے ناموافق ہوتے جا رہے ہیں اور جتنا زمانہ گزرتا جائے گا یہ ناموافقت بڑھتی ہی جائے گی کیونکہ جرمنی یلغار کر کے تو کامیابی حاصل کر سکتا ہے، لیکن اس کی اقتصادی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جنگ کے مصارف کو زیادہ عرصہ تک برداشت کر سکے۔

یہ جنگ یقیناً کسی نہ کسی وقت ختم ہوگی، لیکن اس میں فتح و شکست کا سوال کوئی پیدا نہ ہوگا، اس لڑائی کا نتیجہ انقلاب ہے، خواہ جرمنی میں ہو یا انگلستان میں۔ پچھلی لڑائی میں بھی جرمنی کو شکست نہیں ہوئی تھی، بلکہ ملک کے اندرونی انقلاب نے اسے ہتھیار ڈالدینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی صورت اس مرتبہ بھی پیدا ہوتی نظر آتی ہے، کیونکہ باوجود اتنے ممالک پر قابض ہو جانے کے سمندر کے راستے اس پر بدستور بند ہیں اور اس ناکہ بندی کے سامنے اُسے جلد یا بدیر ضرور سپر ڈالنا پڑے گی۔

وہ خود بھی انگلستان کی ناکہ بندی کرنا چاہتا ہے اور بحرِ اٹلانٹک میں اس کی آبدوز کشتیوں کا مقصود یہی ہے کہ باہر سے کوئی مال انگلستان میں نہ آنے پائے، لیکن وہ ابتک اس میں کامیاب نہیں ہوا۔

انگریزی جہازوں کا اس میں شک نہیں کافی نقصان ہو رہا ہے، لیکن برطانیہ کے بحری ذرایع اتنے وسیع ہیں کہ وہ اس نقصان کو عرصہ تک برداشت کر سکتا ہے اور یہی اس کی بڑی جیت ہے۔

جاپان، جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں، جنگ کا رُخ دیکھ رہا ہے اور مشرق میں اس کی پالیسی ہٹلر کی کامیابی و ناکامی کے ساتھ ساتھ چلے گی، اگر جرمنی، یونان پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو خیر، ورنہ جاپان برما یا ہندوستان کی طرف کوئی اقدام نہ کرے گا۔

بہت سے جھوٹ جو سچ سمجھ لئے گئے ہیں

دُنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن کو بالاتفاق سب نے صحیح تسلیم کر لیا ہے، حالانکہ حقیقت میں ان کی کوئی اصلیت نہیں اور لطف یہ ہے کہ اگر آپ ان کو غلط بتائیں تو دُنیا آپ کو جاہل سمجھے۔ ان جھوٹ حقیقتوں کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) عام طور پر ہر شخص سمجھتا ہے اور پورے یقین کے ساتھ سمجھتا ہے کہ چھونے اور سننے کا احساس اندھے میں بہت قوی ہو جاتا ہے اور اس کی بینائی کی قوت دوسری طرف صرف ہونے لگتی ہے، لیکن یہ بالکل غلط ہے ـــــ سر فرانسیس گالٹن نے جو علم وراثت کے ماہر ہیں، اندھوں کے مدرسہ میں طویل تجربہ کے بعد اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اندھوں میں چھونے یا سننے کی حس آنکھ والوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔

علاوہ سر فرانسیس کے دوسرے ماہرین نے بھی اس کی تحقیق کی ہے اور اُن سب نے متفقہ طور پر اس خیال کی تردید کی ہے، بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ اندھوں کے دوسرے احساسات بھی کمزور ہو جاتے ہیں کیونکہ اندھے پن سے جو اضطراب اعصاب میں پیدا ہوتا ہے اس کا اثر دوسرے حواس پر بھی پڑتا ہے۔

(۲) یہ بات بھی بہت مشہور ہے کہ بجلی کی روشنی آنکھوں کے لئے نقصان رساں ہے لیکن اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ بجلی کی روشنی یقیناً آفتاب کی روشنی سے زیادہ نہیں اس لئے اگر آفتاب کی روشنی آنکھوں کے لئے مضرت کی چیز نہیں تو بجلی کی روشنی بدرجۂ اولیٰ نقصان رساں نہیں ہو سکتی۔ البتہ روشنی کی طرف دیکھتے رہنا بیشک نقصان کی بات ہے سو اس میں بجلی اور آفتاب دونوں برابر ہیں۔

(۳) عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ جس کو کتا کاٹ لیتا ہے وہ پانی سے ڈرنے لگتا ہے اور اسی لئے وہ تالاب یا دریا کے پاس نہیں جاتا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایسے مریض پر اکثر اعصابی تشنج کے دورے پڑتے ہیں اور اسی تشنج کی وجہ سے وہ پانی پینے سے ڈرتا ہے ورنہ پانی سے اس کو ڈر نہیں لگتا۔

(۴) درندوں کے سدھانے والوں کے متعلق خیال ہے کہ یہ نتیجہ ہے مقناطیسی قوت کا جو سدھانے والوں کی نگاہ میں پائی جاتی ہے اور جس وقت یہ قوت کم ہو جاتی ہے تو حیوان کی اطاعت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ خیال بھی غلط ہے۔ فی الاصل جانور ڈر سے مارنے اور شروع سے اس کو مار مار کر اتنا ڈرا دیا جاتا ہے کہ وہ سدھانے والے کے ہر اشارہ پر چلنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر اس کے خلاف کیا تو سخت سزا برداشت کرنا پڑے گی۔ اس میں قوت مقناطیسی کو کوئی دخل نہیں۔

(۵) لوگوں کو یقین ہے کہ جب کوئی شخص کسی بلند جگہ سے گرتا ہے تو زمین تک پہونچنے سے پہلے ہی اس کا دم نکل جاتا ہے، کیونکہ گرنے کی تیزی اس کو سانس لینے کا موقعہ نہیں دیتی۔ لیکن اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ واقعات و تجربات بتاتے ہیں کہ لوگ

بڑے بڑے بلند مقام سے گرنے کے بعد بھی زندہ رہے۔ ایک شخص غبارہ سے گرا جو ۰۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اُڑ رہا تھا، لیکن زمین پر آنے سے پہلے ہی اس نے چھتری کھولی اور آہستگی سے اُترنے لگا۔ اب ہوائی جہازوں سے عام طور پر لوگ نیچے کودتے ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ نیچے آتے ہیں لیکن کسی کو ضرر نہیں پہونچتا۔

گرنے کی تیزی کی وجہ سے سانس نہ لے سکنے کا خیال بھی غلط ہے، کیونکہ انسان بلندی سے جب گرتا ہے تو اس کی رفتار سو فٹ فی سکنڈ ہوتی ہے اور یہ ثابت ہے کہ انسان ایک منٹ تک آسانی سے اپنی سانس روک سکتا ہے چہ جائیکہ دس بارہ سکنڈ الغرض گرنے کی حالت میں سانس رُکنے یا نہ لے سکنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۶) مشہور ہے کہ اگر سانپ کو مارو تو سورج ڈوبنے تک اس کی روح نہیں نکلتی، اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سانپ کے جسم میں اور دوسرے جانوروں کی طرح مرنے کے بعد بھی حرارت عرصہ تک باقی رہتی ہے اور اس کا جسم پھڑکتا رہتا ہے، چنانچہ ہوسکتا ہے کہ سہ پہر کے وقت سانپ کو مارا جائے اور شام تک اس کا جسم ٹھنڈا نہ ہو۔ لیکن اس میں سانپ کی کوئی خصوصیت نہیں اور بھی بعض جانور ایسے ہیں جو بہت دیر میں ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

(۷) مشہور ہے کہ سانپ جب کاٹتا ہے تو اس کی دُم کا ایک حصہ جھڑ جاتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ بنڈا (دُم جھڑا ہوا) سانپ بڑا ظالم ہوتا ہے، کیونکہ یہ علامت ہے اس بات کی وہ بہت سے آدمیوں کو کاٹ چکا ہے۔

یہ عقیدہ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض قسمیں سانپوں کی ایسی ہیں، جن کی دُم جھڑتی ہے اور پھر نکلتی ہے۔ البتہ جب وہ بڈھے ہوجاتے ہیں تو نشو و نما کی قوت ضعیف ہونے کی وجہ سے دُم جھڑنے کے بعد مشکل سے نکلتی ہے یا نکلتی ہی نہیں ــــ اس کا تعلق کاٹنے یا نہ کاٹنے سے بالکل نہیں ہے۔

(۸) شتر مرغ کے متعلق دو باتیں بہت مشہور ہیں ایک یہ کہ وہ لوہے کا ٹکڑا نگل کر ہضم کرلیتا ہے اور دوسرے یہ کہ خطرہ کے وقت اپنا سر ریت کے اندر چھپا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب میں محفوظ ہوں۔ لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ وہ پتھر کا ٹکڑا تو بیشک ہضم کرسکتا ہے، لیکن لوہا ہضم نہیں کرسکتا، لوہے کے ٹکڑے کو پتھر سمجھ کر کھا جانا تو ممکن ہے لیکن یہ اس کو اُگلنا پڑتا ہے۔

ریت کے اندر سر چھپا لینے کی تصدیق بھی ان شکاریوں سے نہیں ہوتی جنھوں نے برسوں افریقہ کے جنگلوں میں صرف کئے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہوتا تو آج شتر مرغ کی نسل مفقود ہوگئی ہوتی کیونکہ شکاری اور درندے ہمیشہ ان کی فکر میں رہتے ہیں اور ریت میں سر چھپانے کے بعد اس کا شکار اور زیادہ آسان ہوجاتا ہے۔

(۹) مشہور ہے کہ صحرائے اعظم کی ریت لہریں لیتی ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہوا کی وجہ سے صحرا کی ریت پر موجوں کے سے نشان نظر آنے لگتے ہیں لیکن خود ریت میں کوئی موج پیدا نہیں ہوتی۔

یہ بھی مشہور ہے کہ چور بالو (Quick Sand) اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس ریت میں کافی تری ہوتی ہے اور اس پر چلنے کے بعد انسان اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔ خود بالو میں کوئی کشش نہیں ہے۔

(۱۰) لوگوں کو یقین ہے کہ اٹلانٹک سمندر کے جنوب میں سمندر کا ایک حصہ ہے جسے "بحرِ سارگاسو" کہتے ہیں اور جب کشتیاں

اس کے قریب پہونچتی ہیں تو وہ اپنے اندر کھینچ کر انھیں ڈبو دیتا ہے۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال ہے اور آج تک کوئی واقعہ ایسا پیش نہیں آیا حالانکہ اٹلانٹک کا کوئی حصہ ایسا نہیں، جہاں جہاز نہ گئے ہوں۔

(۱۱) اب ایک تاریخی جھوٹ ملاحظہ ہو:- مشہور ہے کہ سب سے پہلے امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا، حالانکہ وہاں کے قدیم باشندوں کے آباؤ اجداد نے کولمبس سے بہت پہلے اسے دریافت کر لیا تھا۔

(۱۲) دوسرا تاریخی جھوٹ جس پر فسانے کے فسانے لکھے جا چکے ہیں، یہ ہے کہ جس وقت شہر روما آگ میں جل رہا تھا تو بادشاہ نیرو بربط بجا رہا تھا۔

روما میں آگ کا پھیل جانا درست ہے لیکن ایسے وقت میں نیرو کا ساز چھیڑ دینا صحیح نہیں۔ چونکہ یہ عیسائیوں کا سخت دشمن تھا اس لئے انھوں نے اپنے لٹریچر اور تصویروں کے ذریعہ سے یہ پروپاگنڈا اس کے خلاف کیا۔

(۱۳) کہتے ہیں کہ انسان کے دانت میں جانور کے دانتوں سے زیادہ زہر ہے، لیکن اس میں کوئی حقیقت نہیں، بات یہ ہے کہ دانت کے زخم سے جراثیم پیدا ہو جانے کا اندیشہ ضرور ہے، خواہ وہ دانت انسان کے ہوں یا حیوان کے، لیکن یہ کہنا کہ انسان کے دانت میں جانور کے دانتوں سے زیادہ زہر ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔

(۱۴) ایک عقیدہ یہ ہے کہ جب عورت حاملہ ہوتی ہے اور وہ کسی چیز سے ڈرتی ہے تو بچہ کے جسم پر اس کا نشان بن جاتا ہے اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ موتیں زیادہ تر نصف شب کے بعد ہوتی ہیں،

کانچ کے متعلق مشہور ہے کہ اگر نگل لیا جائے تو وہ زہر ہو جاتا ہے، اور بجلی کی بابت کہا جاتا ہے کہ ایک مکان پر دو مرتبہ نہیں گرتی - یہ تمام باتیں غلط ہیں اور صرف واہمہ کی پیداوار۔

مکتوبات نیاز کا دوسرا حصہ

زیر ترتیب ہے اور اس کا حجم پہلے حصہ سے زیادہ ہے۔ جو حضرات ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں گے، اُن سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

ترغیبات جنسی کا دوسرا اڈیشن بھی نظر ثانی کے بعد زیر کتابت ہے۔

تذکرۂ معرکۂ سخن اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر کیا کیا اعتراض کئے گئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور فن شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ۔ منیجر نگار لکھنؤ

نگار کے حسب ذیل پرچے قیمتاً مطلوب ہیں

نومبر سنہ ۲۲ء - مارچ، اپریل، اگست و ستمبر سنہ ۲۳ء -
فروری - اپریل - جولائی - اگست - اکتوبر - دسمبر سنہ ۲۵ء -
مارچ - اپریل - مئی - ستمبر و دسمبر سنہ ۲۶ء -
فروری - جولائی - اگست - ستمبر - اکتوبر - نومبر - دسمبر سنہ ۲۷ء -
جنوری - فروری - اپریل - مئی - اکتوبر - نومبر و دسمبر سنہ ۲۸ء -
ستمبر سنہ ۲۹ء - اپریل سنہ ۳۱ء - اگست سنہ ۳۳ء -
نومبر سنہ ۳۶ء - ستمبر سنہ ۳۷ء - اگست - اکتوبر سنہ ۳۹ء

جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں، براہ کرم اس پتہ سے خط و کتابت کریں

مولوی عبدالرؤف، بی۔ اے۔ ڈپٹی کلکٹر
الہ آباد

تاریخ اودھ کا ایک ورق

(بادشاہ بیگم)

مولوی عبدالاحد[1] بن محمد فائق ساکن امیٹھی نے لفٹنٹ جان ڈاؤڈ کی ہدایت پر جو دربار اودھ میں کمپنی کے نمایندہ تھے، بادشاہ بیگم کے سوانح حیات مرتب کئے تھے[2]۔ جو عرصہ سے غائب تھے۔ حسن اتفاق سے میرے عزیز دوست وہم وطن مسٹر نقی احمد ارشاد کاکوروی کو سلسلۂ ملازمت مہاراجہ بلرام پور کے ذاتی کتب خانہ دیکھنے کا موقعہ ملا تو وہاں انھیں اس کتاب کا ایک نسخہ نظر آیا اور اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں شایع کیا۔ یہ مقالہ اسی نسخہ سے اخذ و اقتباس کا نتیجہ ہے۔

آصف الدولہ کے عہد میں، سعادت علی خاں نے لکھنؤ کے قیام کو پسند نہ کیا، کیونکہ ان کو اپنے ارادوں میں کامیابی نہیں ہوئی تھی، وہ پہلے شاہجہاں آباد گئے اور پھر بنارس چلے گئے۔ اتفاقاً مبشر خاں (نجم الملک) خلف مشرف خاں شاگرد خیر اللہ مہتمم رصدگاہ (محمد شاہی) بھی اسی زمانہ میں بنارس آئے اور سعادت خاں سے ملاقات ہوئی۔ مبشر خاں کی ایک لڑکی تھی جس سے وہ بہت محبت کرتے تھے اور جس کو انھوں نے نجوم کی علمی و نظری تعلیم بھی دی تھی۔ وہ نسباً سادات رضوی تھے اور بڑے بلند مرتبہ کے انسان سمجھے جاتے تھے۔ سعادت علی خاں نے اپنے صاحبزادہ غازی الدین حیدر کی شادی کے لئے نجم الملک کو ان کی صاحبزادی بادشاہ بیگم کے لئے پیام دیا۔

نجم الملک نے اس پیام کو اپنے خاندانی وقار کے خلاف تصور کیا لیکن بمصلحت انکار نہ کرسکے اور بہت غور کے بعد اس پیام کو منظور کر لیا۔ نواب سعادت علی خاں نے ۱۲۰۹ھ ۹۵-۱۷۹۴ء میں اپنے بیٹے غازی الدین سے شاہانہ کر و فر سے بادشاہ بیگم کی شادی کی اور کچھ عرصہ کے بعد ایک لڑکی پوتی بیگم پیدا ہوئی۔ جو نواب علی مہدی خاں (توپ دروازہ) سے بیاہی گئیں اور اس صاحبزادی سے ایک صاحبزادہ محسن الدولہ اور دو صاحبزادیاں وزیر بیگم اور حاجی بیگم پیدا ہوئیں۔ محسن الدولہ کی شادی محمد علی شاہ کی صاحبزادی سے ہوئی، اور دونوں صاحبزادیاں ابوطالب خاں کے صاحبزادوں سے بیاہی گئیں۔

بادشاہ بیگم کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ غازی الدین حیدر نے بادشاہ بیگم کی ایک خواص صبح دولت سے دلچسپی لینا

---

[1] عبدالاحد مولوی محمد فائق کے صاحبزادہ امیٹھی کے باشندہ تھے۔ انھوں نے فارسی اپنے والد سے اور عربی فرنگی محل میں حاصل کی۔ وہ رزیڈنٹ لکھنؤ کے دفتر میں سررشتہ دار تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثار بھی۔ ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ امیٹھی میں مدفون ہیں۔ ان کے اعزہ ابھی امیٹھی میں موجود ہیں لیکن اس تاریخ کا نسخہ ان کے پاس نہیں ہے۔ —— [2] وقایع دلپذیر عبدالاحد اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے اس کتاب کی تکمیل کی تاریخ ۱۲۵۳ھ نکلتی

شروع کی اور ۱۹ر جمادی الاول سنہ ۱۲۱۰ھ کو ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ بادشاہ بیگم کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بہت برہم ہوئیں اور کہا جاتا ہے کہ صبح دولت نہایت بیدردی سے قتل کر دی گئی اور جہانگیر باغ میں دفن ہوئی۔

بادشاہ بیگم نے اس نومولود کو بھی قتل کرنا چاہا تو (میر فضل علی کی خالہ) فیض النسا بیگم نے (جو محل شاہی میں مغلانی کے عہدہ پر فائز تھیں) بڑی مشکل سے بادشاہ بیگم کو اس جرم سے باز رکھا۔ اس نومولود کا نام نصیر الدین حیدر رکھا گیا جس سے بادشاہ بیگم کو غیر معمولی محبت پیدا ہوگئی۔

بادشاہ بیگم گو بہت پرہیزگار تھیں، لیکن مذہبی مراسم میں اختراعات کرنا اُن کی عادت میں داخل تھا، وہ بہت آشفتہ مزاج اور ضدی تھیں، یہاں تک کہ ان کی ضد اور غصہ ضرب المثل ہوگیا تھا اور غازی الدین حیدر کو اُن کے خلاف عمل کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مذہبی مراسم میں ان کے اختراعات یہ تھے:

چھٹی یہ رسم امام مہدی کے چھٹی کی یاد کو تازہ کرتی تھی۔ یہ رسم خالص ہندوستانی تھی، زچہ بچہ کو پیدائش کے چھٹے دن غسل دیا جاتا ہے تمام اعزہ و اقربا کو دعوت دی جاتی ہے، ناچ رنگ ہوتا ہے اور زچہ کو نئے اور قیمتی کپڑوں سے سنوارا جاتا ہے، یہ رسم محل شاہی کے اندر شعبان کے مہینے میں ہوتی تھی۔ اس رسم میں بہت کافی روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔

اچھوتی گیارہ قبول صورت سید لڑکیاں محل میں رکھی گئی تھیں اور گیارہ اماموں کی بیویاں کہلاتی تھیں۔ ان لڑکیوں کے حاصل کرنے کے لئے والدین کو بڑی رقمیں دیجاتی تھیں اگر والدین خوشی سے ان مطلوبہ لڑکیوں کو نہ دیتے تھے تو دیگر ذرایع سے بھی اُنکے حاصل کرنے کی سعی کی جاتی تھی، ہر لڑکی کا نام اصل امام کی بیوی کے نام پر رکھا جاتا تھا اور یہ اچھوتی کہلاتی تھیں۔ احترام کی نظر سے، حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور دیگر اہل بیت کے نام سے کوئی ہستی نامزد نہ کی جاتی تھی۔ ہر اچھوتی کے پاس تین خادمایئں ہوتی تھیں جب بادشاہ بیگم خواب سے بیدار ہوتیں تو آنکھ کھلتے ہی وہ کسی اچھوتی کی زیارت ضرور کرتی تھیں، بیگم اس جماعت کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ اور جب کسی اچھوتی سے نظریں چار ہو جاتی تھیں تو تعظیماً جھک جایا کرتی تھیں۔ بیگم اچھوتیوں کی ہر خواہش کو پورا کرنا فرض سمجھتی تھیں لیکن بایں ہمہ ان کی شادی کی خواہش کو پورا نہ کرتی تھیں۔ کیونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ جو لڑکیاں اپنی زندگی کو اس مقدس مقصد پر بھینٹ چڑھا چکی ہوں اُن کو شادی کا خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

ایک اچھوتی نے جذبات پر قادر نہ رہ کر گلو خلاصی کی ایک عجیب ترکیب نکالی۔ ایک شب وہ دفعتاً رونے لگی اور آہ و بکا سے محل میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا، سب لوگ جاگ اُٹھے، بیگم کو بھی اطلاع ہوئی وہ گھبرا کر بیدار ہوئیں اور واقعات کی تحقیق شروع کر دی اُس اچھوتی نے رو رو کر بیان کیا "خواب میں امام کی زیارت ہوئی وہ بہت غصہ معلوم ہوتے تھے۔ آخر کار انھوں نے اس کنیز کو طلاق دیدی"۔ بادشاہ بیگم نے اُسی وقت عزت و احترام کے ساتھ اُس کے والدین کے گھر بھیجدیا۔

اچھوتے تیسری اختراع یہ تھی کہ ایک مخصوص کمرہ میں گیارہ لڑکے رکھے جاتے تھے اور یہ امام کہلاتے تھے، ہر امام کی پیدائش کے دن وہ کمرہ کھولا جاتا تھا اور بادشاہ بیگم بذات خود جھک کر نذریں پیش کرتی تھیں اور اس اچھوتی کو جو اُس امام کی بیوی نامزد ہوتی تھیں بیش قیمت جواہرات اور ملبوسات عطا کئے جاتے تھے۔

روضہ دوازدہ امام محل شاہی میں بادشاہ بیگم نے بارہ اماموں کا مقبرہ بھی طیار کرایا تھا اُس میں ایک مختصر مسجد بھی تھی اور یہ مقبرہ "روضۂ دوازدہ امام" کے نام سے موسوم تھا، ہر مزار پر ایک ضریح بھی ہوتی تھی جو کہا جاتا ہے کہ

اصل مزار کی نقل تھی اور اسی روضہ کے قریب ایک دوسری عمارت تعمیر کی گئی تھی جو مزار حضرت عباس کی نقل تھی۔

بادشاہ بیگم شب و روز نماز و وظایف میں مصروف رہتی تھیں۔ فاتحہ، درود، نذر، حاضری، اور خیر خیرات میں لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ بیگم ان باتوں کو دُنیاوی اور اُخروی فلاح و نجات کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔

آسیب بادشاہ بیگم کو یقین ہوگیا تھا کہ شاہ جنات اُن کے پاس آتا ہے۔ چنانچہ شاہ جنات کی آمد پر بہت بیش قیمت لباس اور زیورات سے مرصع ہوتی تھیں اور ایک پاک و صاف تخت پر خاموش بیٹھ جاتی تھیں۔ ڈومنیاں موسیقی چھیڑتی تھیں اور خود بیگم آسیب زدہ کی طرح اپنا سر ہلاتی تھیں۔

یہ تھی وہ فضا جس میں نصیر الدین حیدر شاہ نے نشو و نما پائی تھی، چنانچہ وہ بھی فرائض خمسہ کے مقابلہ میں ان مراسم پر زیادہ توجہ کرتے تھے۔ اور بادشاہ بیگم سے تعلقات خراب ہونے کے بعد بھی وہ ان مراسم کے پابند تھے بلکہ انھوں نے چند اور رسوم کا اضافہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے بارہ اماموں کے علاوہ حضرت قاسم اور حضرت عباس کی بیویاں بھی نامزد کیں۔ ہر امام کی پیدائش کے دن بادشاہ خود عورتوں کی طرح زچگی کی تکالیف برداشت کرنے کی نقل ادا کرتے تھے۔ یہ تمثیل پورے مذہبی جوش سے ادا کی جاتی تھی ایک گڑیا جواہرات سے مرصع بادشاہ کی بغل میں لٹا دی جاتی تھی اور مصاحبین بادشاہ کو اپنی مخصوص اغذیہ اس زمانہ میں کھلاتے تھے جو عام عورتوں کو اس زمانے میں دی جاتی تھیں۔ چھٹے دن بادشاہ عورتوں کی طرح غسل کرتا تھا۔ ایک خواص بچہ کو ایک کونہ میں کھڑا کر دیتی تھی۔ دوسری خواص چند گھڑے پانی بادشاہ سلامت پر ڈالتی تھی۔ اس طرح سے رسم غسل ادا ہوتی تھی۔ شب کو بادشاہ بیش قیمت زنانی پوشاک پہنکر بچے کے ساتھ صحن میں جاتے تھے اور ستارہ دیکھنے کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ جب مراسم ادا ہو جاتے تھے تو وہ فرضی بچہ ایک خوبصورت مرصع کھٹولے پر لٹا دیا جاتا تھا اور نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ عمدہ عمدہ نفیس کھانے تقسیم ہوتے تھے اور خصوصیت سے اُس خواص کو گراں بہا انعامات سے سرفراز کیا جاتا تھا جو اس "زچگی" کی حالت میں بادشاہ سلامت کے ساتھ رہتی تھی۔ بارہ اماموں کی نامزد شدہ بیویوں کو طلائی گڑیا دی جاتی تھیں اور دیگر مذہبی رہنماؤں کی بیویوں کو چاندی کی گڑیا عطا ہوتی تھی۔ اماموں کی ایام پیدائش کے علاوہ دیگر مذہبی افراد کی پیدائش کے دنوں میں بھی اسی قسم کی رسمیں حرم شاہی میں ادا کی جاتی تھیں۔

زچگی کی میعاد مقرر نہ تھی ایک ہفتہ سے دس دن تک یہ میعاد سمجھی جاتی تھی۔ جب زچگی کا وقت ختم ہو جاتا تھا تو بادشاہ سلامت پردہ سے باہر تشریف لاتے تھے اور بیش قیمت زنانہ لباس پہن کر ایک مرصع پالکی میں ہوا خوری کو نکلتے تھے۔ پالکی کے ساتھ تمام شاہی ساز و سامان ہوتا تھا اور مختلف خوش ذائقہ مٹھائیوں سے بھرے ہوئے خوان ساتھ ہوتے تھے۔ یہ رسم اس قدر مقبول ہوگئی تھی کہ شہر کی بہت سی عورتیں اپنے آپ کو "اچھوتیاں" کہلانا پسند کرتی تھیں اور اُن کے مردوں نے مردانہ عادات ترک کرکے زنانہ لباس اور انداز گفتگو اختیار کر لیا تھا

یہی نہیں بلکہ اماموں کی شادی کی تاریخیں اسلامی روایات سے تلاش کرکے ساچق اور حنا بندی کی رسمیں بھی اس میں شامل کی گئیں، ایک خاص خواص کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ پہلی محرم کو ہر سال حضرت فاطمہ کی شادی رچائی جاتی تھی، اُس دن ایک زرکار بستر پر حضرت فاطمہ و حضرت علی کے مجسمے بٹھائے جاتے تھے، رسم نکاح ادا ہوتی تھی، لوگ بہ نظر احترام صف بستہ استادہ رہتے تھے۔ نکاح کے بعد نظریں پیش کی جاتی تھیں، بعدہ ان خواتین کو جو وہاں موجود ہوتی تھیں بہترین کھانے اور مٹھائیاں تقسیم کی جاتی تھیں اور فاتحہ خوانی ہوتی تھی۔ مصنف لکھتا ہے کہ ان بدعتوں کو دیکھ کر خدا کے غضب سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے لیکن کسی کی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ شاہی جذبات کے احترام کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکتا۔

بادشاہ نے بھی بادشاہ بیگم کی تقلید میں فرح بخش کے قریب بارہ مقبرے تعمیر کئے جس میں قبر کے ساتھ ضریح اور ایک چھوٹی مسجد بھی تھی۔ حضرت عباس کے روضہ کی شبیہ لوہے کی بنائی گئی تھی۔ یہ مقبرے بادشاہ بیگم کے مقبروں سے زیادہ آراستہ و پیراستہ تھے کیونکہ بادشاہ سمجھتے تھے کہ ان مقبروں کا وجود ان کی بہبودی کا باعث ہوگا۔

میر احسان علی مرثیہ گو نے جو سعادت علی خاں کے دور میں گزرا ہے محرم کی عزاداری ۲۰ صفر تک بڑھادی۔ اس سے پہلے عزاداری ۱۰ محرم تک ہوتی تھی۔ اس طرح گویا تعزئے ۲۰ صفر سے پہلے دفن نہ ہوتے تھے۔

بادشاہ بیگم نے نصیر الدین کے سن جلوس کے پہلے سال، اعلان کیا کہ چہلم تک عزاداری تسلیم کی جائے گی اور شادی کے جلوس اس مدت تک شہر میں نکل نہیں سکتے اور جو شخص خلاف ورزی کرے گا اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ چونکہ یہ اعلان عام مفاد کے خلاف تھا اس لئے رزیڈنٹ نے بادشاہ سے گفتگو کی اور بڑی مشکل سے شاہی فرمان کو منسوخ کرایا۔ بادشاہ نے اس کے بعد دوسرا فرمان شایع کیا کہ مذہبی حیثیت سے رعایا کو عام اجازت ہے جو چاہیں وہ اپنے عقاید کی رو سے کریں لیکن بادشاہ بذات خود چہلم تک عزاداری کریں گے۔

اس فضا میں تعلیم پانے کے نتائج یہ ہوئے کہ نصیر الدین حیدر نے اپنی حکومت کا تمام زمانہ انھیں رسوم کی پابندی میں صرف کر دیا اور سلطنت کی سیاسی و معاشی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال سرکاری نے خود شاہی آمدنیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور بدنظمی ہر جگہ نظر آنے لگی۔

دوسرا باب

جب یمین السلطنت نواب سعادت علی خاں نے ۲۲ رجب سنہ ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۱۴ء کو انتقال کیا تو شب کے تین حصے گزرنے کے بعد نواب غازی الدین حیدر نے کمپنی کے نمایندوں کی امداد سے تخت سلطنت پر قدم رنجہ فرمایا اور بادشاہ بیگم کو حسب ذیل خطاب عطا ہوا: "مریم العصمت بلقیس السطوت محل خاص نواب وزیر الممالک رفعت الدولہ رفیع الملک غازی الدین حیدر خاں بہادر شہامت جنگ"۔ ولی عہد کو بھی "امتیاز الدولہ عمدۃ الملک نصیر الدین حیدر خاں بہادر اسد جنگ" کا خطاب ملا۔ آغا میر[1] کو نیابت کے عہدہ کے ساتھ "معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ" خطاب عطا ہوا۔ بادشاہ بیگم کو خطاب کے ساتھ سلون کا پرگنہ بھی جاگیر میں ملا۔

محل میں شاہجہاں آباد کی ایک سیدزادی کا طوطی بول رہا تھا اور ڈیوڑھی باہر بادشاہ بیگم کی جاگیر کا اہتمام و انصرام میر فضل علی کے سپرد تھا اور ایوان شاہی اور سلطنت کا سیاسی نظم و نسق معتمد الدولہ کے سپرد تھا۔

---

[1] بشپ ہیبر نے آغا میر کو لکھنؤ میں ۱۸۲۶ء میں دیکھا تھا اس نے لکھا ہے کہ: "وہ سیاہ فام ہے، سخت مزاج ہے، اُس کی ناک باز کی طرح ہے اور اُس کے چہرہ سے یہ عیاں ہے کہ وہ حکومت کا شیدائی ہے۔ سختی کے ساتھ اُس میں روکھاپن بھی پایا جاتا ہے .... وہ پہلے موجودہ بادشاہ کا خانساماں تھا"۔ لکھنؤ میں اُن کی ڈیوڑھی مشہور ہے جس میں اب گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج قایم ہے۔ درمیان میں سڑک آجانے کی وجہ سے ڈیوڑھی کا شاگرد پیشہ علحدہ ہوگیا ہے۔

نواب ناظر محمد عفر بین[1] علی خاں اور مرزا قمر الدین احمد معروف بہ مرزا حاجی (خلف مرزا جعفر مرحوم[2]) ۱۸۱۵ء/۱۲۳۰ھ میں بادشاہ کے مزاج میں زیادہ دخیل ہو گئے تھے یہ نواب صاحب کے کان معتمد الدولہ کے خلاف بھرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں پناہ معتمد الدولہ سے ناراض ہو گئے۔ جس وقت لکھنؤ میں یہ واقعات در پیش تھے اُسی زمانہ میں لارڈ موئرا مارکوئس آف ہیسٹنگس گورنر جنرل فرخ آباد تشریف لائے ہوئے تھے نواب غازی الدین حیدر نے یہ طے کیا کہ ولی عہد معتمد الدولہ اور راجہ دیا کشن[3] کی معیت میں جاکر نواب گورنر جنرل بہادر سے ملیں اور چند اہم معاملات میں گفت و شنید بھی کریں، اس موقعہ سے بھی لوگوں نے فایدہ اُٹھایا اور معتمد الدولہ کی غیبت میں کافی کان بھرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ فرخ آباد سے واپسی پر معتمد الدولہ کا دربار میں آنا بند ہو گیا اور ریاست کے معاملات نواب ناظر اور اُن کے گماشتہ خدا بخش اور مرزا حاجی کے سپرد کئے گئے۔

۱۸۱۸ء/۱۲۳۴ھ میں ان کو دوبارہ بادشاہ کا تقرب حاصل ہو گیا اور معتمد الدولہ نے اس مرتبہ دربار کو اپنے دشمنوں سے صاف کر دیا۔ اس سال نواب گورنر جنرل بہادر کی ایما پر بہاری لال مہاجن کے انتظام سے بیش قیمت تاج بنوایا گیا۔ اور اس تقریب میں جان مکانٹس کے ذریعہ سے فرخ آباد، کانپور، الہ آباد، جونپور کے تمام انگریزی حکام کو بھی مدعو کیا گیا اور ۱۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء مطابق ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ کو انگریز حکام کی موجودگی میں اودھ کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا گیا اور معزز افراد کی نذر قبول کی گئی اور خطبہ و سکہ جاری ہوا۔ مہر شاہی پر حسب ذیل عبارت کندہ تھی: "ابوالمظفر معز الدین غازی الدین شاہ زمن"۔ اور سونے چاندی کے سکوں پر یہ عبارت کندہ تھی:

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

معتمد الدولہ کو وزارت اور ولی عہد بہادر کو سلیمان جاہ کا خطاب ملا۔

بادشاہ بیگم اپنے اقتدار کی بہت خواہش مند تھیں انھوں نے یہ سوچ کر کہ نیابت ولی عہد کا حصہ خاص ہے اس سے انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میر فضل علی کو نیابت کی امداد کے لئے مقرر کیا جائے۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوئیں، معتمد الدولہ نے اس معاملہ کو بھانپ لیا اور کوشش کی کہ بادشاہ محل میں جانا موقوف کر دیں۔ جب تعلقات زیادہ کشیدہ ہو گئے تو کچھ عرصہ کے بعد محسن الدولہ بہادر نے اپنی نانی کی رفاقت سے منھ موڑا اور بادشاہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے لیکن سلیمان جاہ نے بیگم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ معتمد الدولہ نے ہر ممکن طریقہ سے میر فضل علی کو گرفتار کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

بادشاہ بیگم نے میر فضل علی کی مدد سے سپاہیوں کی کثیر تعداد قصبات اور جاگیرات سے طلب کی تاکہ وقت ضرورت اُن سے کام لیا جائے

---

[1] محمد عفر بین علی خاں آصف الدولہ کا غلام تھا جو درجہ بدرجہ ترقی کرتا گیا۔ اُس کا دربار اودھ میں بڑا رسوخ اور اثر تھا۔ ۱۸۱۸ء میں اُس کا انتقال ہوا۔

[2] کرنل بیلی ریزیڈنٹ پر مرزا جعفر کا بڑا اثر تھا اور اس نے غازی الدین حیدر کے حق میں کمپنی بہادر کا فیصلہ صادر کرایا۔ اُن کی خیر خواہی کا کوئی صلہ نہ دیا گیا ۱۸۱۱ء میں وہ خاموش ہو کر عالم جاودانی کو سدھارے۔ اُن کے صاحبزادے مرزا حاجی جنھوں نے کسی اعلیٰ عہدہ کو کبھی قبول نہ کیا تھا وہ مرزا جعفر کے مقابلہ میں زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے باپ کے مرنے کے بعد کچھ عرصہ تک وزارت کے فرائض انجام دئے۔

[3] راجہ دیا کشن کو غازی الدین حیدر نے دیوانی کے عہدہ تک پہونچایا اور راجہ کا خطاب عطا کیا۔ راجہ جھاؤلال کے دور حکومت میں واصل باقی نویس تھے تفضل حسین خاں کے عہد میں معزول کئے گئے لیکن آصف الدولہ نے دوبارہ مقرر کیا۔

معتمد الدولہ نے بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ بیگم میر فضل علی کو سرکاری عمال کے حوالہ کرنے پر طیار نہیں ہیں اس لئے اگر وہ اب شاہی احکام کی پابندی نہ کریں گی تو میر فضل علی کو بہ زور قوت حاصل کیا جائے گا۔ چنانچہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۸۳۲ء شاہی فوج نے بادشاہ بیگم کے محل سرا کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ بیگم نے بھی اپنی فوج کے ایک رسالہ کو شاہی فوج سے لڑنے کا حکم دیدیا اور میر فضل علی کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچی تو معتمد الدولہ نے اس مسئلہ کو رزیڈنٹ سے رجوع کیا انھوں نے تلنگوں کے دو رسالے سید باقر علی خاں میر منشی کی معیت میں محل شاہی پر بھیجے اور حکم دیا کہ یہ لوگ خود جا کر بیگم صاحبہ سے درخواست کریں کہ میر فضل علی کو سرکاری عمال کے حوالہ کر دیا جائے اور اگر اسوقت بھی بیگم اپنی ضد پر قایم رہیں تو فوجی طاقت کا استعمال کیا جائے میر منشی اور کپتان ہاس نے ۴ گھنٹہ اس جد و جہد میں صرف کئے بالآخر سلیماں جاہ کے ذریعہ سے بیگم نے میر فضل علی اور فیض النساء کو کمپنی کے سپرد کر دیا۔

میر فضل علی کی لاکھوں روپیہ کی املاک شاہی عمال کے ہاتھوں برباد و تاراج ہوئیں، خصوصیت سے معتمد الدولہ کے ملازموں نے خوبصورت عمارتوں اور مضبوط حویلیوں کو زمین کے برابر کر دیا۔ لیکن بادشاہ بیگم کو اس قسم کے مصائب و تکالیف سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ شاہی محل کی ڈیوڑھی پر سرکار انگریزی کی فوج کا پہرہ تھا، ہر آیند و روند کی تحقیقات کی جاتی تھی۔ یہ پابندی گو بظاہر محل میں رہنے والوں کو قید خانے سے بدتر نظر آتی تھی - - - - - - - - - - لیکن بادشاہ بیگم اور سلیماں جاہ کی املاک اور ذاتی اعزاز و احترام میں کوئی فرق نہ آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میر فضل علی اور فیض النساء ۲ اکتوبر ۱۸۳۲ء مطابق ۱۹ محرم ۱۲۴۸ھ کو اپنی خواہش پر انگریزی رسالہ کی محافظت میں شاہجہاں آباد چلے گئے بادشاہ نے حسب ذیل ۳ فرامین شایع کئے جنکی رو سے بادشاہ بیگم سلیماں جاہ اور میر فضل علی کو جرم و بغاوت کا ملزم قرار دیا گیا۔

(۱) پیشہ ور سپاہیوں اور مسلح اشخاص کے نام

سمع اقدس میں یہ آیا ہے کہ اکثر پیشہ ور سپاہی اور مسلح لوگ علی الاعلان یا خفیہ طور سے میرے بیٹے سلیماں جاہ کی سلک ملازمت میں داخل ہو گئے ہیں اگر ایسا کوئی واقعہ سمع اقدس میں آیا تو ملزمین کو سخت عبرتناک سزائیں دیجائیں گی اُن کی املاک ضبط ہو جائے گی اور حبس دوام کی سزا بھی ملے گی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عوام اپنے مال و منال اور اہل و عیال کے تحفظ کے خیال سے سلیماں جاہ کی ملازمت نہ کریں۔

(مطبوعہ چھاپہ خانہ سلطانی (شاہی مطبع) مورخہ ۱۲ محرم ۱۲۴۸ھ)

(۲) شاہی فوج کے افسروں کے نام

ہر گاہ کہ نصیر الدین حیدر نے میر فضل علی کی ترغیب سے جہاں پناہ کے احکام کی خلاف ورزی کی اُس کی پاداش میں پہلے وہ محبس میں رکھا گیا بعدہ اُس کو مع اہل و عیال کے شہر چھوڑنے کی اجازت عطا کی گئی۔ اس لئے مناسب سمجھا جاتا ہے کہ یہ عام اعلان کیا جائے کہ ہماری فوج کے افسروں کو نصیر الدین حیدر سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہئے، اس فرمان کے عدول حکمی کی پاداش میں قید سخت برطرفی انضباط املاک کی سخت از سخت عقوبتیں دی جائیں گی۔

(مطبوعہ سلطانی (چھاپہ خانہ) لکھنؤ
مورخہ ۱۲ محرم ۱۲۴۸ھ)

(۳) ہر گاہ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ میر فضل علی نے ڈیوڑھی پر اپنی خالہ فیض النسا (مغلانی خاص محل) کی وساطت سے ملازمت حاصل کی، اور درجہ بدرجہ ترقی کرکے داروغہ کے عہدہ تک پہونچا چونکہ وہ نسباً اچھا نہ تھا اس لئے یہ خفیف ترقی بھی اُس کو باغی اور غدار کرنے کے لئے کافی تھی۔ اُس نے شاہی محلات جاگیرات اور سلطانی ڈیوڑھی سے لاکھوں روپیہ خورد برد کیا، یہی نہیں بلکہ میر نفس علی نے سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کوئی کسر اُٹھانہ رکھی۔ بلکہ سلطنت میں انقلاب پیدا کرنے اور فتنہ و فساد کے لئے ایک خطرناک سازش میں حصہ لیا اور اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے اُس نے میرے لڑکے سلیمان جاہ کو شاہی احکام کے پس پشت ڈالنے کی ترغیب دی اُس نے سلیمان جاہ کو مستقبل کے متعلق غلط توقعات دلائے اور سرکش بنایا۔ شاہی خاندان میں فتنہ و فساد کا بیج بویا۔ غلط فہمیاں پیدا کیں بلکہ شہزادہ کو آمادہ کرلیا کہ وہ محل شاہی کے جملہ ملازمین و رہنے والوں کے ساتھ دار الخلافت سے باہر جاکر سکونت اختیار کریں ایک بڑا اثر اس غلط تربیت کا یہ ہوا کہ شہزادہ عمدہ تعلیمات اور حقیقی تربیت سے محروم رہا۔ سلیمان جاہ نے نوعمری اور ناتجربہ کاری کے دور میں برے نتایج و عواقب پر غور نہ کیا بلکہ اس بدنفس کی رائے پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ میر فضل نے ایک قدم اور بھی آگے اُٹھایا کہ دار الخلافت میں ایک علیحدہ فوج تیار کرلی اس لئے وہ شاہی خوشنودی سے محروم کیا گیا اُس کی پاداش میں اُس کو مجلس شاہی میں رہنا پڑا۔ آیندہ چل کر اُس کے اہل و عیال دار السلطنت سے شہر بدر کردئے گئے اس لئے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جو شخص بغاوت، سازش اور غداری کی پاداش میں ماخوذ ہوگا وہ بدترین عقوبتوں کا مستوجب ہوگا۔

(مطبوعہ چھاپہ خانہ سلطانی لکھنؤ مورخہ ۱۲ محرم سنہ ۱۲۴۸ھ)

اس وقت بادشاہ بیگم کے محل کا محاصرہ تھا انھوں نے معمولی کھانے پر گزارہ کیا وہ یا تو خود کھانا پکاتی تھیں یا اُنکی نواسیاں معمولی دال روٹی تیار کیا کرتی تھیں۔ پانی بھی میسر نہ آتا تھا۔ بادشاہ بیگم یا اُن کی نواسیاں (حاجی بیگم یا وزیر بیگم) خود بنفس نفیس کنویں سے پانی بھرتی تھیں۔ بادشاہ بیگم کے جانوروں کو بھی ۸-۸ دن کے بعد غذا مل سکی۔ شاہی مرلیٰ نہ پاکر بہت سے ملازمین نے بادشاہ بیگم کی ملازمت ترک کردی۔ چند وفادار ملازمین نے عرصہ کے بعد بھٹنے ہوئے چنوں سے فاقہ کشی دور کی یہ حالات دربار اودھ میں اُس وقت تک جاری رہے جب تک مارڈنٹ ریکٹس ریزیڈنٹ مقرر ہوکر آئے انھوں نے ان مظلومین کی جانب سے جہاں پناہ سے سفارش کی اور ان لوگوں کے قصور معاف ہوئے۔

۹ رذی الحجہ کو جب شب کا ایک حصہ گزرچکا تھا تو امام بخش مردھا (خلف فتح علی) کو حکم دیا گیا کہ وہ ولی عہد بہادر کے پاس خفیہ طور پر ایک پیام لے جائے۔ جب شاہی قاصد نے اطلاع بھیجی تو صاحب بنفس نفیس محل سے باہر تشریف لائے اور مطلع کیا کہ وہ بذات خود جہاں پناہ کی خدمت اقدس میں جانے اور ہر حکم کو بجالانے کے لئے طیار ہیں۔ ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں فتح علی کے لڑکے کو خلعت چہار پارچہ عطا ہوا اور امام بخش کو دوشالہ اور رومال ملا۔ دوسرے دن جلوس و سواری کے لئے شاہی احکام نافذ ہوئے اور بیٹیاں اور سامان خاص برداروں کو تقسیم کئے گئے۔ اُسی ماہ کی دسویں تاریخ کو فتح علی خاں[۱] اور امرت لال[۲] صاحب عالم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر کورنش بجالائے اور عرض کیا کہ جہاں پناہ نے حضور کو یاد کیا ہے۔ صاحب عالم فوراً طیار ہوگئے اور خدمت شاہی میں

---

[۱] فتح علی خاں۔ نواب سعادت علی خاں کے ملازمین میں بہت منتخب تھے محض اپنی دیانت کی بنا پر ذی عزت عہدہ پر پہونچے اور شاہی خزانوں کے مہتمم مقرر ہوئے۔ سعادت علی خاں کے جانشینوں کے زمانہ میں بھی یہ اسی عہدہ پر قایم رہے۔ ہر شخص اُن کی عزت کرتا تھا۔ [۲] امرت لال کائستھ سکسینہ تھے وہ سعادت علی خاں کے عہد ہمایوں میں سلک ملازمت میں داخل ہوئے اور غازی الدین حیدر کی شہنشاہی میں دیوانی کے درجہ پر پہونچے

حاضر ہوکر قدمبوسی کا شرف حاصل کیا، جہاں پناہ نے نہایت شفقت سے معانقہ کیا اور کچھ نصیحتیں بھی کیں اُسوقت حسن اتفاق سے
رزیڈنٹ بھی تشریف لائے اور اُنھوں نے بھی شاہی ایما پر صاحب عالم سے معانقہ کیا، جب جہاں پناہ تخت شاہی پر رونق افروز ہوئے
توصاحب عالم نے نذر پیش کی اور خلعت حاصل کیا تو دوبارہ نذر پیش کی اور نہایت درجہ خوش وخورم شاداں وفرحاں دربار سے
واپس ہوئے اور دربار شاہی سے محل تک ۳ ہزار روپیہ غربا و مساکین کو تقسیم کیا۔

جہاں پناہ نے گیارھویں تاریخ کو رزیڈنٹ سے استدعا کی کہ صاحب عالم کے محل سے فوجی پہرہ کا دستہ ہٹا لیا جائے۔ رزیڈنٹ
نے جواب دیا کہ کمانڈنگ افسر منڈیاؤں[1] کو مطلع کر دیا گیا ہے وہ عمل درآمد حسب مرضی جہاں پناہ کریں گے۔ جب رسالہ واپس لے لیا گیا تو
جہاں پناہ نے ۲ ہزار روپیہ بطور انعام کے انگریزی رسالہ میں تقسیم کے لئے عطا کیا۔

بادشاہ بیگم نے اب بھی ہر امکانی کوشش کی کہ صاحب عالم دربار نہ جائیں اور نہ شکار کے لئے محل سے باہر نکلیں بلکہ
محل میں خواصوں اور ڈومنیوں میں مشغول رکھنے کی کوشش کی۔ بالآخر صاحب عالم خود اس پابندی سے عاجز آگئے اور ایک دن
جہاں پناہ سے دوران گفتگو میں بادشاہ بیگم سے اپنی ناراضگی کا تذکرہ بھی کیا، یہ سنتے ہی جہاں پناہ نے شیش محل، حیدرباغ
اور حسن باغ کے محلات کو آراستہ کرنے کا حکم دیا اور تنہائی کے خیال سے نواب معتمدالدولہ کو حکم دیا کہ وہ صاحب عالم کی دلچسپی کے اسباب
مہیا کریں اور خود بھی اکثر اوقات اُن کی صحبت میں رہیں، معتمدالدولہ جن کو اپنے اقتدار کے بڑھانے کی فکر شبانہ روز تھی وہ جہاں پناہ
کے پاس حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کیا کہ جب تک اعتماد باغ اور دوسرے محلات صاف ہوں خانہ زاد کی بارہ دری دولت پورہ
میں حاضر ہے وہ خوش وضع ہے صاحب عالم اُس بارہ دری میں نزول اجلال فرمائیں۔ جہاں پناہ نے بھی اس تجویز کو پسند فرمایا اور
امرت لال عرض بیگی صاحب عالم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہی حکم پیش کیا۔ چنانچہ صاحب عالم محسن الدولہ اور روشن الدولہ
کی معیت میں فوراً دولت پورہ کی بارہ دری میں تشریف لے گئے جسوقت سواری مبارک شہر سے گزری ہزارہا مخلوق زیارت کی مشتاق
دو رویہ جمع ہوگئی اور اپنے محبوب شہزادہ کو سلامی دی۔ صاحب عالم کے اصطبل کے گھوڑے فاقوں سے بھوکے مر رہے تھے اور چند
قدم بھی اُن سے چلنا مشکل تھا۔

جب مرشد زادہ آفاق صاحب عالم کی سواری مبارک بارہ دری کے قریب پہونچی تو نواب معتمدالدولہ خود بنفس نفیس استقبال
کے لئے پاپیادہ باہر سڑک پر موجود تھے۔ جیسے سواری آئی سلامی دی گئی اور جب صاحب عالم بارہ دری میں مسند آرائی پر متمکن
ہوئے تو نواب معتمدالدولہ نے نذر پیش کی۔

بیسویں تاریخ تک صاحب عالم شاہی احکام کی روسے اس بارہ دری میں مقیم رہنے کے بعد نواب معتمدالدولہ کی معیت
میں حسن باغ تشریف لے گئے اور وہیں قیام کیا۔ روشن الدولہ اور معتمدالدولہ بادشاہ بیگم کی محل سرا پر حاضر ہوئے اور صاحب عالم
کی محل خاص سلطانی بیگم کو مع مرزا رفیع الدین حیدر معروف بہ مناجان کے حسن باغ پہونچا دیا۔ محل خاص کی سواری مبارک بھی

---

[1] منڈیاؤں، لکھنؤ سے ۳ میل شمال کی طرف واقع ہے یہ نام اُس قدیم چھاؤنی کی وجہ سے ہے جو غدر سے پہلے یہاں تھی جس کو نواب سعادت علی
خاں نے بنوایا تھا۔ منڈیاؤں کی فوج نے ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی اور چھاؤنی میں آگ لگا دی۔ دوبارہ آباد نہیں کی گئی۔ اب بھی چھاؤنی کے
آثار نظر آتے ہیں۔

باجے گاجے کے ساتھ فتح علی عرش بیگی کے جلو میں حسن باغ پہونچی اور روشن الدولہ[1] دربار شاہی میں حاضر ہوئے۔

سلیمان جاہ کی فرقت بادشاہ بیگم کو اس درجہ محسوس ہوئی کہ انھوں نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ ساتویں صفر کو معتمد الدولہ محل سرائے شاہی میں حاضر ہوئے اور استدعا کی کہ خانہ زاد جو نان جویں بھیجے وہ قبول فرمالیں اور ازراہ کرم خسروانہ اُس طعام کو تناول فرمالیا کریں، بادشاہ بیگم نے قبول کیا اور ۱۲ تاریخ تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن بیگم کی مرضی پر بند کر دیا گیا اور بادشاہ نے ۲ لاکھ کی رقم بادشاہ بیگم کو عطا کی۔ بادشاہ بیگم نے ایک خواص کو سلیمان جاہ کی خدمت میں کپڑے اور ۷ ہزار روپیہ نقد دیکر بھیجا اور وعدہ کیا کہ وہ اسی قدر رقم ماہ بہ ماہ اُن کو بھیجتی رہیں گی۔ صاحب عالم نے کپڑے رکھ لئے اور روپیہ واپس کر دیا۔

چونکہ خواصوں کے ذریعہ سے بادشاہ بیگم اور صاحب عالم میں رسل و رسایل کا طریقہ جاری تھا اس لئے جلد ہی خوشامدیوں نے صاحب عالم کو ترغیب دی کہ وہ بادشاہ بیگم سے صفائی کر لیں، صاحب عالم نے ۲۰ صفر کو مطلق کھانا نہ کھایا اور ۲۷ صفر کو بیگم کی خدمت میں واپس چلے گئے۔

(باقی)

مُشیر احمد علوی

---

[1] روشن الدولہ۔ ۱۸۳۲ء میں وزارت پائی۔ مسٹر شور نے اپنی کتاب "ہندوستان واقعات پر نقوش" میں لکھا ہے کہ "وہ بہت عمدہ خصلت کے انسان تھے۔ لیکن عقل کی کمی تھی" ایک دوسرے رزیڈنٹ نے ۱۸۲۲ء میں لکھا ہے کہ "روشن الدولہ۔ عمدہ خصلت کا انسان ہے مستقل مزاجی نہیں ہے"۔ مشہور مورخ مل نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا کہ "وہ معزز آدمی تھا لیکن فراست کی کمی تھی اور کام سے ناواقف تھا۔ اُن کی حویلی میں آجکل ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کا دفتر ہے۔

لکھنؤ کی زبان

اُصول اور روایت کی روشنی میں

ٹکسالی زبان کا مسئلہ ملک میں مدت سے پریشاں خیالی کا شکار بنا ہوا ہے ایک گروہ دہلی کی زبان کو ٹکسالی سمجھتا ہے تو دوسرا لکھنؤ کی زبان کو۔ کوئی ان دونوں میں سے کسی کی مرکزیت کا قایل نہیں بلکہ ہر جگہ کی زبان کو ٹکسالی سمجھتا ہے، انھیں لوگوں میں ہمارے مکرم یاس عظیم آبادی بھی ہیں۔ موصوف نے ایک کتاب چراغ سخن کے نام سے تحریر فرمائی ہے جس کی ابتدا میں اسی گروہ کی ترجمانی میں ایک طولانی بحث اس موضوع پر کی ہے جس کا حاصل انھیں کی لفظوں میں یہ ہے:

"لکھنؤ والے جاہل، نافہم، احمق، متعصب، تنگ نظر اور بے خبر ہیں، کیونکہ وہ صرف لکھنؤ ہی کو زبان کا مرکز سمجھتے ہیں اُنھیں یہ بھی خبر نہیں کہ اُردو کہاں سے کہاں تک پھیل گئی۔ جن جن شہروں میں اُردو بولی جاتی ہے وہ سب شہر زبان کے مرکز اور وہاں کے باشندے اہلِ زبان ہیں"

چونکہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر قومی زبان کی یکسانیت اور حُسن و قبح کا انحصار ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ اس پر اُصول، روایت، تاریخ اور درایت کی روشنی میں ایک فیصلہ کن بحث کی جائے۔

زبان کے لئے مرکز کی ضرورت

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر زبان کے لئے ایک مرکز ہونا ضروری ہے جہاں کی زبان مستند اور ٹکسالی ہو ورنہ نہ کسی زبان کے قواعد صرف و نحو منضبط ہو سکتے ہیں اور نہ اُس کا صحیح استعمال ممکن ہے۔ جب ہم ہر شہر کو زبان کا مرکز اور ہر شخص کو اہلِ زبان مان لیں گے تو پھر اس صورت میں جزوی اختلافات اتنے بڑھ جائیں گے کہ صرف و نحو کے قواعد کا انضباط محال ہو جائے گا۔ اس کی جیتی جاگتی مثال لکھنؤ اور دہلی کا اختلاف ہے چونکہ یہ اختلاف ابھی دو ہی شہروں تک محدود ہے اس لئے ہم اس کا استقرا کر سکتے ہیں لیکن جب حد سے بڑھ کے ہر شہر میں یہ بات پھیل جائے گی تو اُس وقت اُس کا استقرا محال ہو جائے گا اور زبان کا حاصل کرنا ایک اجنبی کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ دیہاتی زبان کی مثال سامنے موجود ہے کہ ایک صوبہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اچھا خاصہ تغیر نظر آتا ہے اگرچہ یہ زبانیں ادبی نہیں ہیں اور ان کا ذخیرۂ الفاظ اتنا محدود ہے کہ اس پر اطلاع حاصل کرنا چنداں دشوار نہیں پھر بھی جب ایک ضلع کا باشندہ دوسرے ضلع میں پہونچتا ہے، تو بہت سے الفاظ اُس کی سمجھ میں نہیں آتے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دیہاتیوں کی زبان کا کوئی مرکز نہیں اور اگر آج کوئی صرف یو۔ پی کی دیہاتی بولیوں کا استقرا کرنا چاہے تو ممکن نہیں۔ دیہاتیوں کا کام تو صرف اس وجہ سے چل جاتا ہے کہ اُن کی روزمرہ کی ضرورتیں اُس محدود رقبہ میں اُس بولی سے پوری ہو جاتی ہیں اس سے زیادہ کی اُن کو ضرورت نہیں لیکن ایک ادبی زبان جو پورے ملک یا ایک پھیلی ہوئی قوم

کی زبان ہو اس اختلاف کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی اسی لئے جو شہر زبان کا مرکز ہوتا ہے اُس کے بھی تمام باشندے اہلِ زبان نہیں سمجھے جاتے بلکہ خاص خاص گھرانوں کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔ انشاء اللہ خاں کہتے ہیں:

" سند اردو از گفتگوئے ملوک و امرا و حواشی و حضار شان جستن بہتر است کہ فقیہ و شاعر مہندس و محاسب و مغنی و صوفی و زنان پری چہرہ در مجلس شان حاضر می باشند و اصطلاح ہر فرقہ در گوش دارند و در ہر لفظیکہ اصلاح جاری کنند بزرگ و کوچک را در قبول کردن آں گزیر نہ باشد و زود تر مروج می شود و ہر شخص فصیح و بلیغ در مجلس شان لنگ می گردد و اگر سخنے را درست می گوید و پسند خاطر امیر و حضار می شود بہ مباہات نزد اماثل و اقران ذکر آں بزبان می آرد و صاحب کمال را در وقت حرف زدن در خاطر خلد کہ مبادا حرفے از زبان من برآید کہ موجب ریشخند شود و ہمچنیں بندش دستار و دوخت قبا و زیر جامہ و کفش ہر چہ رواج می باید بر پسند اینہا موقوف است "[1]

اگر زبان کا دائرہ اتنا تنگ نہ کیا جائے اور اُس کا یہ اُصول نہ معین کیا جائے تو پھر شہری و دیہاتی زنانی و مردانی خواص و عوام کی زبان میں کوئی وجہ امتیاز باقی نہیں رہ سکتی، ہر شہر کی زبان الگ ہو جائے اور اُس کی صرف و نحو اُس کے جغرافیے کی طرح ایک علٰحدہ چیز ہو جائے اور نہ وہ ادبی و علمی زبان بن سکتی ہے۔

الفاظ کی صحت کا معیار

کسی زبان کے الفاظ خدا کی طرف سے تو نازل ہوئے نہیں ہیں جس سے ان کا صحیح تلفظ معلوم و معین ہو جائے اس لئے کسی لفظ کی صحت کا معیار بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ لوگوں کے تلفظ کو معیاری مان لیں اور جو لفظ جس طرح اُن کی زبان سے نکلے وہی اُس کا صحیح تلفظ سمجھیں اگر اس اصول کو ہم نہیں تسلیم کرتے تو دنیا میں کسی لفظ کے صحیح و غلط ہونے کا کوئی مفہوم ہی نہ رہے گا۔ دورِ آخر کے محقق زبان شیخ ممتاز حسین عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ لکھتے ہیں:

" زندہ زبانوں میں سے کوئی ایسی نہیں جس کا مرجع کوئی خاص قطعۂ زمین نہ ہو فارسی میں شیراز و طہران کی زبان مستند ہے، انگریزی زبان لندن کی مستند ہے امریکہ میں بھی انگریزی مروج ہے لیکن امریکہ زبان کے اعتبار سے لندن کی خوشہ چینی کرتا رہتا ہے۔ سیاسی خیالات میں خلاف و عناد ہے مگر ادبی خیالات میں شمہ بھر نا اتفاقی نہیں ہے علیٰ ہذا القیاس آسٹریلیا اور افریقہ (جہاں کئی پشتوں سے انگریز آباد ہیں اور وہ اپنی فوج کو ایک علٰحدہ فوج تصور کرتے ہیں) لندن کو معیار و مرکز زبان تسلیم کرتا ہے"[2]

لہذا اُردو کا بھی ایک مرکز ماننا ضروری ہے ہاں یہ بات ضرور غور طلب ہے کہ کس جگہ کو مرکز مانا جائے اس کے لئے ایسا اُصول ڈھونڈھنا چاہئے جس کی بنا پر کسی ایک شہر کو مرکزیت کا فخر حاصل ہو سکے اس کے لئے چند لمحے سکون کے مجھے عاریتاً دیجئے ممکن ہے کسی اُصول کی روشنی میں کوئی اونچی جگہ نظر آ جائے۔

لفظ کی تعریف

یہ بتایا جا چکا ہے کہ لفظوں کا سانچا اہلِ زبان کا منہ ہے جو لفظ جس طرح اُن کی زبان سے نکلے وہی اُس کا اصلی تلفظ ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ کیا چیز ہے؟ لفظ حرفوں سے مرکب ہوتا ہے۔ انسان کے منہ سے جو آوازیں نکلتی ہیں اُن کی کچھ علامتیں مقرر کی گئی ہیں انھیں علامتوں کو حروف کہتے ہیں ہر حرف سے ابتداءً جو آواز نکلتی ہے وہی

---

[1] دریائے لطافت صفحہ ۲۰ - [2] اودھ پنچ ۱۵ اپریل ۱۹۲۶ء

اُس کی اصلی آواز ہے یہ آوازیں انسان کے لب و دہن اور زبان کی جنبش سے پیدا ہوتی ہیں اور ذرا سے فرق سے ایک نئی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔

حروف کی تشکیل میں آب و ہوا کا اثر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عرب ہمیشہ "ٹٹو" کو "تتو"، "لڈو" کو "لدو" کہتا ہے ایک یورپ کا باشندہ "گھوڑے" کو "گھورا" یہی حالت ایک ایرانی کی ہوتی ہے کہ ٹ، ڈ، ڑ، کی آواز صاف نہیں نکال سکتا اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جس طرح مختلف ممالک کے باشندے آب و ہوا کے اثر سے مختلف صورت و شکل اور مختلف عادات و اطوار رکھتے ہیں اُسی طرح اُن کے گلے، جبڑوں، حلق، تالو، زبان اور لب کی لچک یا لوچ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جب ایک ملک کے رہنے والے اپنے اصلی حرف بولتے ہیں تو ہر حرف کی ٹھیک ٹھیک آواز بے تکلف نکالتے ہیں اور وہی آواز اُس حرف کی معیاری ہوتی ہے اور جب دوسرے ممالک کے لوگ وہ حرف بولتے ہیں تو صاف نہیں ادا کر سکتے اس لئے وہ آواز معیار سے گر جاتی ہے۔

سیاسی اثر زبان پر اُصول سیاست کا بھی اقتضا یہی ہے کہ تمام صوبوں کی زبانیں ایک رشتۂ اتحاد سے جوڑ دی جائیں اور اسی لئے دارالسلطنت کی زبان معیاری قرار پاتی ہے اور ہر صوبہ میں حکومت اُس کی ترویج کی کوشش کرتی ہے خود ہر صوبے کے باشندے بھی دفتری ضرورت، شاہی قربت، حصول ملازمت کی خواہش سے مجبوراً دارالسلطنت کی زبان کو معیاری سمجھتے ہیں اور اُس کو بشوق حاصل کرتے ہیں نیز اُس سانچے میں اپنی زبان کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انشاء اللہ خاں کہتے ہیں:

"در ہر مملکت قاعدہ این است کہ صاحب کمالاں و خوش بیاناں آنجا در شہرے کہ قرارگاہ ارکان دولت بادشاہی باشد جمع شوند۔ و از کثرت ورود آدم ہر دیار برائے تحصیل قوت دراں۔ باشندگانش در تحریر و تقریر بہ از ساکنان بلاد دیگر آں ولایت باشند مانند صفاہان ایران کہ مدتہا دارالسلطنت سلاطین صفویہ بود و زبان و بیان سکنہ آنجا بہ از زبان مردم جاہائے دیگر۔ در ایران میگرفتند و می گیرند یا استنبول کہ محل جلوس سلطان روم است۔

چوں بیشتر جائے عیش سلاطین تیموریہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد بودہ است و فصیحان و بلیغان و علمائے عالی قدر فریقین و دیگر ارباب فنون لطیفہ و اصحاب علوم شریفہ در آں شہر دلنواز آرام گاہے برائے خود ساختہ بودند ہر چند کہ لاہور و ملتان و اکبرآباد دارالامارۃ ہم مسکن بادشاہان صاحب قدرت و شوکت بودہ و عمارات بلند سر بفلک رسانیدہ دریں شہرہا موجود است لیکن بزبان متیناں گفت زیرا کہ دریں جا سلاطین زیادہ از جاہائے دیگر تشریف داشتہ اند خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبان ہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ در بعضے عبارات و الفاظ تصرف بکار بردہ زبانے تازہ سوائے زبانہائے دیگر بہم رسانیدند و بہ اُردو موسوم ساختند۔ ظاہر است کہ از روزے کہ شاہجہاں بادشاہ غازی ایں قطعہ آباد ساختہ موسوم بشاہ جہاں آباد کرد از آں روز تا امروز مسکن بادشاہ ہندست در زمانہ سابق آدم ہر شہر وارد می شد و کسب آدمیت می کرد و باشندہ آنجا بشہر دیگر نمی رفت و اگر بسبب ضرورتے میرفت بزرگ زادہائے عالی قدر آں بلدہ بزیارتش می آمدند و در صحبت او قوانین نشست و برخاست و حرف زدن و دیگر آداب مجلس یاد می گرفتند"[1]

---

[1] دریائے لطافت مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ

اُردو کے مشہور انشا پرداز حضرت آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"میرے دوستو! تم جانتے ہو کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن و قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے جیسے سکّہ کے لئے ٹکسال، کیا سبب ہے کہ ابتدا میں زبان کے لئے دلی ٹکسال تھی؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دارالخلافہ تھی دربار ہی میں خاندانی امرا امیر زادے خود صاحب علم ہوتے تھے اُن کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی تھیں اسی واسطے گفتگو لباس، ادب، آداب نشست برخواست بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے ہر شے کے لئے ہمیشہ نئی نئی تراش اور نئی اصلاحیں اور ایجادو اختراع وہاں سے ہوتے تھے اور چونکہ دارالخلافہ میں ہر شہر کا آدمی موجود تھا اس لئے وہ دلپذیر ایجادیں اور اصلاحیں ہر شہر میں عام ہو جاتی تھیں"[1]

ان شہادتوں سے یہ امر پایۂ ثبوت تک پہونچ گیا کہ کسی شہر کا مرکز ہونا کوئی مفروضہ بات نہیں ہے بلکہ ایک قانون کے تحت میں ہے جب تک وہ خصوصیتیں کسی شہر کی خاک سے وابستہ رہیں گی اُسوقت تک وہ زبان کا مرکز رہے گا جب وہ چیزیں وہاں سے چلی جائیں گی مرکزیت بھی رخصت ہو جائے گی چنانچہ یہ چیزیں جب تک دہلی میں رہیں اُسوقت تک اُس کو مرکزیت کا شرف حاصل رہا اور جب وہ چیزیں لکھنؤ چلی آئیں تو اسی کو مرکزیت کا فخر حاصل ہو گیا مولوی محمد حسین آزاد کہتے ہیں:

لکھنؤ کیوں زبان کا مرکز ہے

"انھی صفتوں سے لکھنؤ نے سند اختیار حاصل کی لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو کہ دل پسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں ہے جہاں شایستہ اور رنگین مزاج لوگ جمع ہونگے اور دلپذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے وہیں سے پھول کھلنے لگیں گے چنانچہ وہی دلی کے لوگ اور ان کی اولاد تھی کہ جب تباہی سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہونچے تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں لکھنؤ دارالسلطنت ہو گیا اور اس کے ضمن میں زبان بھی دلی کی اطاعت سے آزاد ہو گئی"[2]

علم وادب میں لکھنؤ کا درجہ

ان صفتوں میں لکھنؤ نے کس حد تک ترقی کی اس کو مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔اے کی زبانی سنئے:

"جب سقراط نے ہوش سنبھالا اور آنکھیں کھولیں تو یہ وہ زمانہ تھا کہ خطہ یونان میں علم و ہنر پھٹ پڑا تھا بڑے بڑے دانشمند، حکیم، فلاسفر، مورخ، شاعر، مقرر، اور نثار اُسوقت دارالسلطنت میں موجود تھے اور کسی علم کے سیکھنے کے لئے شہر سے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی صرف بازاروں اور سیرگاہوں میں چہل قدمی کرنا تہذیب انسانیت سکھانے کے لئے کافی تھا۔

اُسی طرح ——— یہ (لکھنؤ) دارالسلطنت بھی شاعری و نثاری کا معدن، فصاحت و بلاغت کی معیار زبان و محاورات کی ٹکسال، شایستگی و تہذیب کا گھر دولت و ثروت کا سرچشمہ اور حشمت و جاہ و جلال کا خزانہ یا یوں کہو کہ اودھ کی دولت مستعجل کا دلکش مستقر تھا جس کے شیدائی دعوے سے کہتے تھے۔

گو ملی جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ　　چونک پڑتا ہوں میں ہر دم کہکے ہائے لکھنؤ

یہ وہ مبارک عہد ہے کہ رئیس و فقیر، امیر و وزیر، شاہ و گدا غرض جس کے دل میں ذرا سا بھی سوز و گداز کا جوہر موجود ہے وہ سخن فہم

---

[1] آب حیات مطبوعہ کریمی پریس لاہور صـ ۲۲ — [2] آب حیات صـ ۲۱۰

اور قدردان سخن ہیں۔ اُن کی ہمت افزائیوں سے مسرور اور مضامین و خیالات کے اُن گراں بہا انبار سے جو متقدمین اپنے نشان قدم پر چلنے والوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں مستفید ہو کر ناسخ، آتش، خلیل، بہار، وزیر، تسلیم، انیس، دبیر وغیرہ نظم اُردو کو معراج کمال پر پہونچاتے اور زبان لکھنؤ کو دہلی کی قید سے آزاد کرنے کا بیڑا اُٹھائے ہیں۔

لکھنؤ اہلِ ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج رند کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردا

اللہ اللہ کیا بابرکت عہد تھا اور کیسے متبرک نفوس تھے جنھوں نے اپنی قیمتی عمریں اصلاح زبان اور اصلاح سخن اور اصلاح مضامین کی نذر کردیں ــــ غرض اُسوقت قدیم تجنیس کی طرح ان بزرگوں کی بدولت لکھنؤ میں شاعری اور سخن سنجی کا وہ دریائے مواج جوش زن تھا اور زباں دانی اور مضمون آفرینی کا یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اُس کی دلکش سیرگاہوں اُس کے دلچسپ منظروں اُس کے دلفریب میلوں ٹھیلوں کی بہار دیکھنا بھی انسان کو تہذیب سکھانے اور شاعر بنانے کے لئے کافی تھا ــــ اُسوقت یہاں کی خاک پاک علم و فضل بانٹتی نہیں بلکہ کوڑیوں کی طرح لٹاتی تھی:

وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے

یہ اُسی زمانہ میں کہا گیا تھا اور حسب حال تھا اور

رہیگا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں

کچھ دنوں کے بعد ایک پیغمبر سخن کی زبان پر آیا!!

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اس باکمال عہد میں اور ایسے اہل کمال کے سامنے شاعری میں فروغ پانا تو دشوار تھا لیکن فن شعر میں کامل ہو جانا ہر شخص کیلئے ادنیٰ توجہ سے ممکن تھا۔[۱]

مولانا عبدالحلیم شرر تحریر فرماتے ہیں:

زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھئے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد اور قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور و بخارا تھا ــــ لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب (غفرانمآب) نے چونکہ عراق میں تعلیم پائی تھی بہذا عربی کا نیا ادبی ذوق اپنے ساتھ لائے اور ادبیت میں خاندان اجتہاد[۲] اور

---

[۱] اُردو شاعری (تذکرہ) صفحہ ۵۷ تا ۷۰ ــــ [۲] ہندوستان میں مذہب شیعہ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب ہوئے انھوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں مذہب شیعہ کی تبلیغ کی اور علم کلام و مناظرہ میں معرکہ آرا کتابیں لکھیں جن میں عماد الاسلام شیعی علم کلام میں ایک ایسی کتاب لکھدی ہے جو اس علم کی تمام کتابوں سے بہتر ہے۔ ایک زبردست کارنامہ ہے جس نے اُن کو دنیائے اسلام کا متکلم اعظم منوالیا ہے ہندوستان میں شیعوں کی مذہبی تعلیم سب سے پہلے اُنکی ذات سے ہوئی اسوجہ سے بارھویں صدی ہجری کے مجدد مذہب کہے جاتے ہیں مرنے کے بعد غفرانمآب کے لقب سے مشہور ہوئے انکا نام لیجئے تو اہل علم ہی سمجھ سکیں گے۔ غفرانمآب کہدیجئے تو شیعوں کا ایک بچہ بھی سمجھ جائیگا مشہور ہے کہ انھوں نے زیر قبہ حسینی شب قدر کی مخصوص ساعت میں اپنی اولاد میں باقی رہنے کی دعا کی تھی جو مقبول ہوئی۔ یہ تو ہم بھی دیکھتے ہیں آج ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں اُن کی اولاد اس علم کی مالک سمجھی جاتی ہے ان کے اخلاف میں تقریباً ایک سو سے زائد مصنف ہوئے جن میں بلاشبہ پچاس سے زائد ہندوستان کے اکابر علماء میں سے شمار کئے گئے ہیں، آج بھی بڑے بڑے صاحبان علم اُن کی اولاد میں موجود ہیں یہی علمی گھرانا خاندان اجتہاد کے نام سے مشہور ہے ہندوستان کے تمام علماء خواہ کسی گزشتہ کے ہوں اسی خانوادہ [illegible] علم کے ریزہ چیں اور زلہ ربا سمجھے جاتے ہیں۔

لکھنؤ کے شیعہ علماء کو فرنگی محل[1] والوں پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی اور آج تک حاصل ہے۔ علمائے شیعہ کے ادبی مذاق نے لکھنؤ کو ادب کی تعلیم کا اعلیٰ تر مرکز بنا دیا[2]۔

غدر کے بعد مرزا غالب مرحوم نے میر مہدی مجروح کو ایک خط لکھا ہے جس میں لکھنؤ کی زبان کے مستند ہونے کی یہ وجہ بتائی ہے کہ وہاں ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مرزا غالب کے زمانہ کی طرح لکھنؤ آج بھی اہلِ کمال کا مامن و زیرزادوں کا مولد شاہزادوں کا مسکن اور علماء کا مرکز ہے اسی طرح اطباء کے متعدد گھرانے شعرا کے مختلف خاندان لکھنؤ میں آباد ہیں اور جب تک یہ خصوصیتیں لکھنؤ کو حاصل رہیں گی اُسوقت تک وہ زبان کا مرکز رہے گا جس پر کسی کے ماننے نہ ماننے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ہمارا یہ دعوےٰ صرف زبانی نہیں ہے بلکہ کچھ تحریری ثبوت بھی موجود ہیں اُردو کے مشہور شاعر و انشاپرداز پنڈت برج نراین چکبست، غالب کے تقریباً چالیس برس بعد لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں:-

> اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اس شہر مرحوم کے باشندوں کا طرزِ معاشرت اُسکی گزشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل میں دردِ محبت پیدا کرتا ہے ہاں نگاہِ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو! یہاں کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ کبھی امیروں اور شہزادوں کی آنکھوں کا سرمہ تھی یہاں کی عالیشان مگر شکستہ عمارتوں کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار زمانہ کے نشیب و فراز کی تصویریں ہیں ؎
>
> ہر کجا خشت کہن بینی دریں ویرانۂ ہست فرد دفتر احوال صاحب خانۂ
>
> گو کہ یہاں کے شرفا فلک زدہ ہیں اور زمانہ نے اُن کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا ہے مگر ان میں بوئے ریاست پائی جاتی ہے وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں جس کو آئین شرافت سمجھتے ہیں اور ایک خاص تہذیب کی یادگار ہیں ؎
>
> اسلاف کے کچھ اثر ہیں باقی اس راکھ میں کچھ شرر ہیں باقی،
>
> گو خوار ہوئے ہیں خو وہی ہے مرجھا گئے پھول بو وہی ہے،
>
> اُن کی تقریر و گفتگو شستگی و پاکیزگی کا معیار ہے، اُن کی نشست و برخاست کا طریقہ سلیقہ و امتیاز کا دستور العمل ہے ان لوگوں کو جنھوں نے نئی تہذیب میں نشو و نما پائی ہے اور تہذیب قدیم کے مذاق سے بالکل ناآشنا ہیں پرانی روشوں میں سوائے عیوب کے جوہر نظر نہ آئے مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس زوال کی حالت میں بھی لکھنؤ ایک مٹی ہوئی تہذیب کی عبرتناک تصویر ہے جس کا رنگ ابھی بالکل نہیں اُڑ گیا ہے باوجود ہزاروں عیوب کے یہاں کے باشندوں کے طرزِ معاشرت میں اب بھی ایک لطافت ہے جو بیرونجات کے رہنے والوں کو نصیب نہیں۔ زبان کی شستگی، طبیعت داری علو ہمتی، جوہر شناسی ادب و سلیقہ حسنِ تقریر تو گویا شرفائے لکھنؤ

---

[1] عہد اکبری میں ایک فرانسیسی تاجر نے لکھنؤ میں گھوڑوں کی تجارت شروع کی اور یہیں قیام کر کے چوک کے متصل چار عالیشان عمارتیں بنوائیں جب اُسکی مدت قیام ختم ہو گئی اور دوبارہ اجازت نہ ملی تو یہ مکان نزول سرکار ہو گئے۔ اورنگ زیب کے عہد میں جب ملا نظام الدین سہالوی نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنا چاہی تو عطیہ شاہی کے طور پر یہ چاروں مکان انھیں دیدئے گئے۔ یہ مکانات اپنے گردو پیش کے کئی مکانوں کے ساتھ فرنگی محل کہلاتے ہیں علمائے فرنگی محل انھیں ملا صاحب کی اولاد ہیں جو حضرات اہل سنت میں علمی کمالات کے ساتھ صوفیانہ برکتوں کے مالک بھی سمجھے جاتے ہیں شاہی زمانہ میں خاندان اجتہاد اور فرنگی محل کے علماء سے علمی نوک جھوک بھی ہوتی رہتی تھی اسی کے ساتھ آپس میں دوستانہ اتحاد بھی تھا لیکن اس دور بیداری میں بہت مغائرت ہے۔ [2] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۰۲ تا ۱۰۳

کی گھٹی میں پڑی ہے"[1]

مولانا عبدالحلیم شرر تحریر فرماتے ہیں:

آداب معاشرت میں ایک اہم چیز گفتگو اور طرز کلام ہے دُنیا میں ہر شخص کی شائستگی اور ادبی قابلیت کا پہلا اندازہ اُسکے الفاظ اور اُس کے انداز گفتگو سے ہوتا ہے دنیا کی ہر اقبال مند قوم پہلے اپنی زبان کی اصلاح کرتی ہے اور اُسے ترقی دیتی ہے ـــــ اس بارہ خاص میں اہل زبان لکھنؤ اور یہاں کے شائستہ لوگوں کو جو کمال حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی اور شہر والوں میں نظر نہ آئے گا اگرچہ موجودہ تعلیم و تہذیب نے ایک حد تک یہ خوبی ہر جگہ انداز گفتگو میں پیدا کر دی ہے مگر انگریزی اثر سے معرا کر کے دیکھئے تو بالذات یہ شائستگی و شستگی اہل زبان لکھنؤ ہی کا حصہ نظر آئیگی باہر کے لوگ اس کا یہاں تک لوہا مانے ہوئے ہیں کہ لکھنؤ والوں کے سامنے گفتگو کرتے جھجھکتے ہیں اور جس قدر شائستگی اُن میں ہے اُس کو بھی بھول جاتے ہیں اس کے بعد جب اپنی صحبتوں میں بیٹھتے ہیں تو یہ کہہ کے اپنی کمزوری کا الزام دور کرتے ہیں کہ ہم سادگی سے صاف صاف باتیں کرتے ہیں اور ہمیں لکھنؤ والوں کی سی چنیں چناں نہیں آتی ۔ مگر دراصل یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے، میں نے ایرانیوں کو دیکھا کہ اُن کے سامنے ہندستانی بات کرنا بھول جاتے ہیں۔ انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسیوں کے سامنے انگریزوں کی زبان سے ایک لفظ بھی نکلنا مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح عربوں کی طلاقت لسانی کی کبھی یہ حالت تھی کہ اُن کے سامنے غیر ملک والوں کی زبان نہ کھل سکتی تھی ـــــ بعینہ یہی حال ہندوستان کے ہر شہر کے مقابل لکھنؤ والوں کا ہے کہ وہ فصاحت اور بذلہ سنجی میں سب کو دبا کے صحبت پر چھا جاتے ہیں اور اپنے سامنے کسی کو زبان نہیں کھولنے دیتے ۔

شائستگی زبان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مخاطب کو کن ضمائر سے یاد کیا جائے اور سب زبانوں میں مخاطب کے لئے دو ضمیریں ہیں ایک واحد کی اور ایک جمع کی اور معزز مخاطب کے لئے ہر زبان میں تعظیماً جمع کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے ـــــ اُردو میں مخاطب کے لئے واحد کی تو ایک ہی ضمیر "تو" ہے مگر جمع کی دو ضمیریں ہیں "تم" اور "آپ" اور ان تینوں ضمیروں کے لئے مخاطب کا درجہ اور مرتبہ مقرر ہے ـــــ اُردو زبان میں اور خاص لکھنؤ والوں میں مخاطب کے اتنے ہی درجے نہیں، بلکہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہیں ـــــ جو لکھنؤ والوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور ان کا صحیح استعمال جس قدر اہل لکھنؤ جانتے ہیں اور کسی دوسرے شہر کے لوگ نہیں جانتے ۔

مزاج پرسی کو دیکھئے ہر زبان میں اس کے لئے معمولی الفاظ ہیں مگر اُردو میں ادب و احترام کی نگہداشت کے لئے مزاج عالی، مزاج مبارک، مزاج اقدس، مزاج مقدس، مزاج معلیٰ وغیرہ کہکے معزز مخاطب کی خیریت دریافت کرتے ہیں یہ الفاظ اگرچہ اب ترقی اُردو کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شہر میں پھیل رہے ہیں مگر اُن کے استعمال میں جو اجتہادی ملکہ شرفائے لکھنؤ کو حاصل ہے کسی اور جگہ کے لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتا۔

شرفائے لکھنؤ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ کوشش تو درست رہے گا اور تمام عربی عرفوں کو حتی الامکان اُن کے اصلی مخرج سے ادا کریں گے، فارسی ترکیبوں میں اضافت نمایاں طور پر ادا کی جائے گی، علماء اور ذی علم لوگوں سے باتیں کریں گے

---

[1] مضامین چکبست مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد صفحہ ۴۰ تا ۴۱ -

تو عربی و فارسی الفاظ کو زیادہ استعمال کریں گے اور اُن کے صحیح تلفظ سے ادا کریں گے، اطبا سے گفتگو ہوگی تو عربی کے طبی مصطلحات کو کام میں لائیں گے جاہل نوکروں سے اور عوام سے بات کریں گے تو عربی الفاظ سے بچیں گے عورتوں سے بات چیت ہوگی تو اُن کے مذاق کے محاوروں اور مثلوں کو گفتگو میں صرف کریں گے خرد بزرگ سے ادنیٰ اعلیٰ سے یا عامی عالم سے گفتگو کریگا تو ہر لفظ اور ہر فقرے میں ادب و تعظیم کا خیال رکھے گا آواز مناسب درجے تک پست اور دھیمی رہے گی، اسی طرح بزرگ خرد دل سے اعلیٰ طبقے والے ادنیٰ لوگوں سے علماء عوام سے بات کریں گے تو اُن کے لہجہ اُن کے انداز اور اُن کے الفاظ میں شفقت و محبت کے جذبات مضمر ہوں گے۔ ان باتوں کا لحاظ رکھنے اور مذکورۂ بالا ادب و تعظیم کے الفاظ وضمائر استعمال کرنے سے اہل لکھنؤ کی زبان اس قدر شستہ اور رفتہ ہوگئی ہے کہ یہاں کے عوام اور جہلا دوسرے شہروں کے اکثر شعراء و فصحا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہیں اور جو شائستگی و تمیز داری اُن سے ظاہر ہوجاتی ہے کسی اور مقام کے قابل و ذی علم لوگوں سے بھی نہیں ظاہر ہوسکتی ـــ آدابِ معاشرت میں دوسری چیز طریقۂ مذاق ہے ـــ جو زبان جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے اُسی قدر اس میں مذاق و ظرافت کے پہلو بڑھتے جاتے ہیں ـــ اس کا جیسا اچھا سلیقہ لکھنؤ کے عوام الناس کو ہے دوسری جگہ کے خاص لوگوں میں بھی نظر نہیں آتا ـــ اہلِ لکھنؤ میں شوخی و ظرافت بہت ہے وہ اپنے کلام میں صدہا عنوانوں سے ظرافت پیدا کردیا کرتے ہیں، اور جو اس فن میں جتنا زیادہ کمال رکھتا ہے اتنا ہی زیادہ اہلِ سخن کی محفلوں میں چمکتا اور ممتاز ثابت ہوتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اور مقامات کے لوگوں میں یہ ملکہ نہیں ہے اور کثرت سے ہے ـــ مگر لکھنؤ والوں میں یہ ملکہ طبیعت ثانوی بن کے اُنکی فطرت اور جبلت بن گیا ہے اور لطافت کلام کے ساتھ بذلہ سنجی و ظرافت میں جیسا بے تکلف اور ستھرا مذاق اُنکا نظر آئیگا اوروں کا نہیں ہوسکتا[1]

لکھنؤ کی اس اعلیٰ تہذیب و معاشرت نے اس درجہ ترقی کی کہ ضرب المثل ہوگئی کسی کے متعلق اتنا کہہ دینا کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں یہ بتا دینا ہے کہ آپ تہذیب و شائستگی کا معیار ہیں چنانچہ زمانہ حال کے زندہ مصنف سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم۔اے لکچرار اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی اپنی کتاب مختصر تاریخ ادب اُردو میں مہدی حسین صاحب ناصری کے متعلق لکھتے ہیں:

"تہذیب و شائستگی کے متعلق غالباً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔"

یہی شائستگی اور سلیقہ مندی جو اہلِ لکھنؤ کا مایۂ امتیاز ہے باہر والوں میں نایاب ہے مجھے اکثر اس کا تجربہ ہوا ہے کہ جو شائستگی اور ادیبانہ صلاحیت لکھنؤ کے عوام سے ظاہر ہوئی وہ دوسری جگہ کے خواص سے نہیں ہوسکی۔

جونپور میں میرے ایک عنایت فرما ہیں جو انگریزی میں ایم۔اے ہیں اُردو سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں شاعر ہیں اور تنہا نہیں گھر بھر شاعر ہے ادبی ذوق پشتوں سے اُن کے گھر میں ہے میں ایک ضرورت سے جونپور گیا تھا ایک کتب فروش کی دوکان پر کھڑا تھا ہاتھ میں ایک ہندی کا اخبار تھا جس کی پشت پر ایک تصویر تھی اتنے میں ہمارے دوست بھی آپہونچے بہت خندہ جبینی سے ملے اخبار پر جو نظر پڑی تو اُس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "آپ اس کو سمجھ لیتے ہیں؟" میں نے مسکرا کے کہا کہ تصویر کی حفاظت کے لئے پورا اخبار لے لیا ہے ورنہ اتنا سمجھ دار نہیں ہوں۔ ابھی وہ ہٹے ہی تھے کہ اتفاق سے ایک لکھنوی صاحب سے ملاقات ہوگئی یہ ایک عینک فروش تھے اپنی تجارت کے سلسلہ میں جونپور آئے تھے اور کسی سرا میں مقیم تھے مجھے دیکھ کے وہ بھی اس دوکان پر آگئے استفسار حالات کے بعد ہندی کا اخبار میرے ہاتھ میں دیکھ کے فرمانے لگے "ماشاءاللہ ہندی سے بھی آپ کو ذوق ہے" اُن کے اس فقرے میں استفہام

[1] گزشتہ لکھنؤ

کی شان نہ تھی بلکہ اظہار واقعیت کا انداز تھا یعنی ایسا ہی حالانکہ ان کا مقصود بھی یہی دریافت کرنا تھا کہ تم ہندی جانتے ہو یا نہیں اسکو کس حسن سے دریافت کیا اُسوقت لکھنؤ کی قدر ہوئی - یہی وہ خوبیاں ہیں جنھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کا مرکز اور شائستگی کا مرکز بنا دیا ہو مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں :-

> "فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں ایسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی کہ چند ہی روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری ہوگیا اور شعراء کی یہاں اس قدر کثرت ہوگئی کہ شاید نہیں کسی زبان میں شاعری ہوگی، عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی"

آج بھی لکھنؤ کے جہلا جس شاعرانہ انداز میں بات کرتے ہیں دوسری جگہ کے اہل علم نہیں کرسکتے جامن کی فصل میں جسوقت ایک جامن بیچنے والا اپنی مترنم آواز میں کہتا ہے : "کالی گھٹا کے کالے پھلیندے" - تو اُس کی اس آواز پر ہزاروں شعر نثار کردینے کو جی چاہتا ہے اور گرمیوں کی فصل میں برف کی قلفی بیچنے والے کی یہ صدا : "یہ کس کی محبت میں گھل رہی ہے" اپنے اندر جذب و اثر کا ایک عالم رکھتی ہے اسی طرح گولر بیچنے والے کا یہ کہنا : "گولر کیا ہیں شہد کی کپیاں ہیں"

اور پان بیچنے والے کا یہ مصرعہ : "کرتی ہے سرخرو وہ گلوری ہے پان کی" - دماغ کی ادبی اور شاعرانہ ساخت کا پتا دیتا ہے ایسی شاعرانہ صلاحیت نے لکھنؤ کے عوام میں ظاہر ہوکے معاشرت کی تمام چیزوں میں جو نکہت اور نفاست پیدا کر دی ہے دوسری جگہ کے خواص بھی اس سے محروم ہیں - مثلاً جیٹھ بیساکھ کی گرمیوں میں کپڑے کسی پھیلے ہوئے ظرف میں کیلے کے پتے بچھا کے اُس پر عارہ گنے کی انفیس چھلی ہوئی گنڈیریاں رکھکے اوپر سے برف کا ایک ڈلا رکھدیتے ہیں اور دو چار گلاب کے پھول ارد گرد رکھکے بیچتے ہیں تو دیکھنے سے آنکھوں اور کلیجے میں ٹھنڈک پہونچتی ہے اور خواہ مخواہ کھانے کو جی چاہتا ہے دوسری جگہ ان باتوں کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں یہ باتیں عوام سے تعلق رکھتی ہیں خواص کی نفاست اور متانت کا کیا ذکر جن کی مجلس میں بے تحاشا ہنسنا، بے باکانہ گفتگو کرنا، بے ڈھنگے پن سے بیٹھنا، منھ کھول کے جماہی لینا، بے منھ پر رومال رکھے زور سے چھینکنا، بیہودہ مذاق کرنا، بازاریوں کے الفاظ زبان پر لانا، غرض ہر وہ بات جس میں سنجیدگی و متانت نہ ہو آئین ادب کے خلاف ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ مغرور اور خشک ہوں گے - مگر آپ اُن کو شاخ ثمردار کی طرح خمیدہ پائیں گے اُن کے چہرے معتدل تبسم سے شگفتہ، جبین وسعت اخلاق سے کشادہ اگر دنیں شائستگی سے جھکی ہوئی ہوں گی، اُن کی محبت آمیز باتوں میں وہ شیرینی کہ سامعہ کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب جائے غرض طرز معاشرت کی یہی لطافتیں ہیں جنھوں نے لکھنؤ کو اہل دل کی جنت بنا دیا ہے -

راجہ درگا پرشاد لکھتے ہیں کہ عارف شاہ عارف ایرانی محمد شاہ بادشاہ ایران کے عمائد دولت میں تھے اُن کے کلام کی نمکینی مائدہ فصاحت کا نمک اور شیرینی کلام بلاغت کی حلاوت افزا تھی صوفیانہ اور درد انگیز اشعار کہتے تھے انھوں نے اُٹھتی جوانی میں دنیائے کو ٹھوکر مار کر سیاحت اختیار کی .... ہندوستان کے شہروں میں خصوصیت کے ساتھ اُن کو لکھنؤ اس قدر پسند آیا کہ اکثر یہیں رہا کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں :

> اگرچہ در طریق سیر تا چینا پٹن رفتم　　بہ ہندوستاں ندیدم موضع دلچسپ چوں لکھنؤ

مرزا غالب نے غدر کے بعد عام تباہی کے عالم میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط لکھا ہے جس میں لکھنؤ کی حالت بہت مضطرب ہوکے پوچھی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنکی نظر میں لکھنؤ کیا تھا : "ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا گزری"

ایک شبہ کا ازالہ اور زبان کی ترقی کے اصول

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ ان باتوں سے زبان کو کیا تعلق اس شبہ کو دور کرنے کے لئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر زبان کی ترقی بلکہ زندگی اس کی لفظوں، ترکیبوں، اور اسلوبوں کی اصلاح پر منحصر ہے اس اصلاح کا واحد اصول یہ معلوم کرنا ہے کہ کس لفظ اور کس ترکیب میں بھونڈا پن ہے اور کس پہلو سے تراش کے اس کو خوشنما بنایا جا سکتا ہے یہ انھیں لوگوں کا کام ہے جن کی طبیعت میں پاکیزگی نفاست لطافت اور جدت کا جوہر موجود ہو اہل لکھنؤ میں یہ بات بدرجۂ کمال موجود ہے انھوں نے ہر شعبۂ زندگی میں وہ تکلف اور جدت پیدا کی ہے کہ دنیا دنگ ہو گئی ہم تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتے جس کو اس موضوع پر تفصیلی اطلاع حاصل کرنا ہو وہ گزشتہ لکھنؤ کا مطالعہ کرے۔ شاعری کے متعلق رام بابو صاحب سکسینہ کی زبانی اقتباس لیجئے:

"شعر کا اتنا چرچا پھیلا کر جابجا مشاعرے ہونے لگے۔ امرا اور رؤسا، اور عوام الناس بھی شاعری کے دیوانے تھے عمدہ اشعار پڑھکر اور سن کر لوٹ جاتے تھے۔ مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور ہفتہ وار سے ترقی کر کے ہر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعرا اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے ان کے دل بڑھتے تھے اس مقابلے سے فایدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور مشہوری کا خیال لوگوں کے لئے مایۂ ناز تھا۔"[1]

یہ ذوق ترقی کرتے کرتے اس حد پر پہونچ گیا کہ بقول حضرت شرر عورتوں تک میں اس کا چرچا ہوا اور عوام کی باتوں میں شاعری کی جھلک نظر آنے لگی اور سچ پوچھئے تو در و دیوار سے شعر برسنے لگے شادی و غم کے رقعے مجلس و محفل کے دعوت نامے ہر چیز شعر میں ہونے لگی انتہا ہو گئی کہ اخبار تک نظم میں نکلنے لگا اس اخبار کا نام نظم الاخبار تھا اور برسوں نکلتا رہا اس سے بھی بڑھ کے بعضوں نے یہ جدت کی کہ بات چیت تک شعر میں شروع کر دی۔ اسوقت بھی ایک[2] بزرگ ہیں جن کی گفتگو کا زیادہ تر حصہ نظم میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا تحریر فرماتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے رہنے والے موزوں طبع ہوتے ہیں —— اصلی سبب سوسائٹی ہے نہ طبیعت۔ لکھنؤ کی سوسائٹی میں اس قابلیت کے ظاہر ہونے کے اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔"[3]

یہی سوسائٹی کی شاعرانہ قابلیت و استعداد تھی جس نے زبان میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں جن پر اہلِ ذوق ہمیشہ تحسین و آفرین کے پھول برساتے رہیں گے۔ رام بابو صاحب سکسینہ تحریر فرماتے ہیں:

"لکھنؤ کے شعرا اور عوام الناس نے بعض الفاظ و محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ محل استعمال دہلی کے طریقہ استعمال سے بہتر اور موزوں تر تھا۔"[4]

اس دعوے میں اہلِ لکھنؤ کے حق بجانب ہونے کی تصدیق حضرت آزاد دہلوی یوں کرتے ہیں:

"جب اُن کے (اہلِ لکھنؤ کے) اور دہلی کے محاورے میں اختلاف ہو گا تو اپنے محاورے کی فصاحت پر دلایل قایم کریں گے

---

[1] تاریخ ادب اُردو صفحہ ۲۵۹ تا ۲۶۰ — [2] آپ کا نام کاظم حسین تخلص مقدس ہے خاندانی نواب زادے ہیں گورنمنٹ سے وثیقہ ملتا ہے عربی فارسی کی تحصیل کی ہے اور اس میں بھی علوم دینیہ کی طرف زیادہ توجہ رکھی اس وجہ سے بجائے نواب کے مولوی کہے جاتے ہیں۔ فنون سپہ گری میں کمال حاصل ہے مورسہ اسٹریٹ میں افضل محل کے سامنے مکان ہے — [3] شریف زادہ (ناول) انڈین پریس الہ آباد صفحہ ۱۶۹ — [4] تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۶۳

بلکہ انھیں کے بعض نکتوں کو دہلی کے اہلِ انصاف بھی تسلیم کریں گے[1]

انھیں باتوں کا نام زبان کی اصلاح اور ترقی ہے اور یہ کام مخصوص اہلِ لکھنؤ کا ہے جو کسی دوسرے شہر کے باشندوں کے بس کی چیز نہیں ہے

زبان میں لہجہ کی اہمیت

ان تمام باتوں کے ساتھ ایک اور چیز لہجہ بھی ہے جس کو اہلِ زبان کے ساتھ خاص خصوصیت حاصل ہے میر انشاء اللہ خاں انشا کہتے ہیں:

"از اردو تنہا الفاظ اردو مقصود نیست لہجہ ہم در و شریک است کہ آں اصالت اردو باشد دریں صورت ہر کہ لفظ و لہجہ اردو ہر دو درست داشتہ باشد استاد کامل است[2]"

الفاظ کی اصلی ساخت کا بقا لہجہ پر منحصر ہے، اور لفظوں میں آواز کہاں سے لاؤں جو بتاؤں کہ لہجہ سے لفظوں کا تلفظ کیونکر بدل جاتا ہے۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح مطلب ادا کرسکوں مثلاً "کیوں" بمعنی چرا، اہلِ لکھنؤ کے لہجہ میں کچھ اور تلفظ رکھتا ہے اور دوسری جگہ کے لوگ اس کا دوطرح تلفظ کرتے ہیں جس فرق کو تحریر میں نہیں ظاہر کیا جاسکتا اسی طرح اکثر اطراف کے لوگ کاف بیانیہ (کہ) کو "کی" کہتے ہیں۔ پیتا میں تا کا تلفظ تو ہر جگہ یکساں ہے "گر" پے" کے تلفظ میں اختلاف، اہلِ لکھنؤ پے بروزن شے (چیز) کہتے ہیں اور اکثر مقامات کے لوگ "پئ" بروزن "حی" (زندہ) کہتے ہیں ایسے بے شمار الفاظ ہیں جن کے استعمال میں اہلِ لکھنؤ امتیازی شان رکھتے ہیں لیکن یہ ایسا نازک فرق ہے جو تحریر کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔

لفظوں کی حرکت کا فرق

لہجہ سے مشابہ بلکہ اُس سے واضح ایک چیز تغیرِ حرکت ہے یعنی اکثر مقامات کے لوگ اپنے لب ولہجہ کی ساخت کے موافق اہلِ لکھنؤ کی تلفظ کے خلاف الفاظ کی حرکت بدلنے پر مجبور ہوتے ہیں مثلاً جاڑے کو جَڈا آٹے کو اَٹا سہارنپور اور اُس کے اطراف میں عوام وخواص سب کی زبان پر ہے پنجاب اور اُسکے اطراف میں دَفتر کو دُفتر، خَبر کو خُبر، حَسَن کو حُسَن کہتے ہیں آگرہ اور اُس کے نواح میں ضمیر متکلم "میں" کو بکسر میم ادا کرتے ہیں اسی طرح پے کو پِے۔ یہ ایسے فرق ہیں جو آب وہوا کے اثر سے زبانوں میں پیدا ہوگئے ہیں، اہلِ لکھنؤ اسی کو زبان کی موچ کہتے ہیں —— انشاء اللہ خاں کہتے ہیں:

"ساکنانِ بلاد دیگر ہر چند بعضے روزمرہ خود را در صحبت اہلِ دہلی رسانیدہ اند لیکن از لہجہ مجبور اند ہمیں کہ حرف می زنند شناختہ می شوند[3]"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"د باشندۂ شہر دیگر اگر عمر خود را در تصحیح اردو بگذارند از لہجہ اصلی گریزش ناممکن است[4]"

ایک مقام پر اسی مطلب کو یوں ادا کرتے ہیں:

"کلام باشندہ ہر شہر دلالت کند بر مولد و موطن[5]"

انھیں وجوہ سے دوسرے شہر کے اہلِ علم اپنے کو مقلد اور متبع سمجھنے پر مجبور پاتے ہیں لیکن یہ انہی لوگوں کا کام ہے جن کو خدا نے ذہن مستقیم اور ذوق سلیم فرمایا ہے اور وہ ایک بات کی حقیقت و اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔ شمس العلما خان بہادر نواب

---

[1] آب حیات صفحہ ۴۳ — [2] [3] [4] [5] دریائے لطافت۔

امداد امام اثر عظیم آبادی تحریر فرماتے ہیں:

"ہر چند یہ زبان ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے مگر اس کے صحیح بولے جانے کی نسبت صرف دہلی اور اور لکھنؤ کی طرف کی جاتی ہے —— ان دونوں شہروں کے علاوہ اور جگہوں کے اُردو بولنے والے اہلِ زبان کہے جانے کا حق نہیں رکھتے مثلاً ساکنین صوبہ بہار کہ ہر چند زبان اُردو ہی بولتے اور لکھتے ہیں مگر اُن کی زبان کو کس طرح سند نہیں مانتے حقیقتہً حال بھی یہی ہے کہ ہم بہاریوں کی زبان اہلِ لکھنؤ یا اہلِ دہلی کو پسند نہیں ہو سکتی ہم لوگوں کا بڑا کمال یہ ہے کہ زباندان کہلائیں اہلِ زبان ہونا تو تمامتر خارج از امکان ہے —— بہر حال جاننا چاہئے کہ لکھنؤ اور دہلی ہی میں ہندی اُردو بولی جاتی ہے"[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے مستند غزل سرائی صرف دو جگہوں کی سمجھی جاتی ہے یعنی دہلی اور لکھنؤ —— زبان کے اعتبار سے تو یہ خیال بالکل صحیح ہے کس واسطے کہ ان دونوں جگہوں کے برابر کہیں کی زبان نہیں مانی جا سکتی"[2]

جن لوگوں کو خدا نے علم و عقل سے کچھ بھی بہرہ عطا نہیں فرمایا وہ زبان کے ان نکتوں سے بے خبر ہیں اس لئے مرکزیت کے منکر ہیں لیکن جو زبان کے گُر دں سے واقف ہیں وہ حضرت اثر کی تائید پر مجبور ہیں۔

زبان کی مرکزیت کا دوسرا پہلو

اب اس مسئلہ کو دوسرے رُخ سے دیکھئے۔ یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ کلام میں فصاحت روزمرہ اور محاورے کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے۔ مولانا حالی کہتے ہیں:

"کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کم ہوگی اُسی قدر وہ فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائے گا —— الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو نہایت ضروری ہے"[3]

چودھری نظیر الحسن صاحب فوق تحریر فرماتے ہیں:

"روزمرہ کی پابندی تمام اقسام کلام مثل تحریر و تقریر نظم و نثر میں نہایت ضروری ہے جس قدر کسی کلام میں روزمرہ کا لحاظ کیا جائے گا اسی قدر فصاحت کے معیار پر پورا اُترے گا اور مقبول طبائع خاص و عام ہوگا بغیر محاورے کے کوئی کلام فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ پایہ پر نہیں پہونچ سکتا ہے لیکن اگر روزمرہ کی پابندی نہ ہوگی تو درجہ فصاحت سے گر جائیگا"[4]

اب غور طلب یہ بات ہے کہ روزمرہ کے کیا معنی ہیں کیا وہ لفظیں اور ترکیبیں جو معمولاً سب کی زبان پر آتی رہتی ہیں روزمرہ میں اگر ایسا ہی ہے تو آوت ہیں، جات ہیں، کھات ہیں، پیت ہیں، اس طرح کی بے شمار لفظیں ہم برابر سنا کرتے ہیں۔ کیا اس روزمرہ اور محاورے کی پابندی فصاحت کی ضامن ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر صحیح الحواس جواب میں نہیں کہے گا تو پھر کیا ادباء، شعراء، رؤسا کی زبانوں پر جاری رہنے والی لفظیں اور ترکیبیں مراد ہیں تو مجھے ایسے ادبا، شعرا اور رؤسا سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کی گفتگو بآوازِ بلند اس کو غلط کہتی ہے۔ سب کو جانے دیجئے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ذات گرامی سے کون نہیں واقف ہے نظم و نثر دونوں میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے

---

[1] کاشف الحقایق صنا۔ [2] کاشف الحقایق صث۔ [3] مقدمہ دیوان حالی ص۱۴۳۔ [4] المیزان صلا

ان کا ایک شعر ہے :

ہوں ہوں کرتی ٹھپکتی جاتی ہے ہوئے ہوئے سرکتی جاتی ہے

بہت سے اہلِ زبان بھی ہوئے ہوئے کا مطلب نہ سمجھ سکیں گے مختلف مقامات کے شعراء اور ادباء کے یہاں اس طرح کی بہت سی لفظیں ملتی ہیں تو اسی روزمرہ کی پابندی سے کلام میں فصاحت پیدا ہوتی ہے یقیناً اس کا جواب بھی آپ نفی میں دیں گے تو پھر کس روزمرہ اور محاورے کی پابندی کرنا چاہئے۔ آپ کو شاید یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ عام زبانوں پر جاری رہنے والی لفظیں اور ترکیبیں روزمرہ اور محاورہ کی تعریف ہی سے خارج ہیں بلکہ کچھ مخصوص لوگوں کی زبان پر جاری رہنے والی لفظیں اور ترکیبیں روزمرہ ومحاورہ ہیں اور کلام کو فصیح بنانے کے لئے انھیں کی پابندی لازم ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ مخصوص افراد کی زبان سے جو لفظ جس طرح نکلے وہی صحیح ہے اور اُس کے خلاف غلط اور یہیں سے تقلید اور مرکز کی ضرورت ثابت ہوگئی، یعنی ہم کو کچھ لوگوں کے تلفظ کو اور محاوروں کو معیاری ماننا پڑا، لیکن وہ کون لوگ ہیں اس کا پتہ لگا لینا آسان ہے۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں :

"جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتے ہیں اُن کو روزمرہ کہتے ہیں[1]"

مولانا حالی کہتے ہیں :

"اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روزمرہ یا بول چال کا نام محاورہ ہے[2]"

چودھری نظیر الحسن صاحب فوق لکھتے ہیں :

"جو الفاظ اور ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوں اُن کو روزمرہ کہتے ہیں اور اہلِ زبان کی بول چال و اسلوب بیان ہی کا نام محاورہ ہے[3]"

اہلِ زبان کون ہیں اس کا فیصلہ بھی مولانا حالی کی زبانِ قلم سے سنئے :

"ہندوستان میں جیسا کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے صرف دو شہر ہیں جہاں کی اُردو معتبر سمجھی جاتی ہے دلی اور لکھنؤ۔ دلی کی زبان اس لئے ٹکسالی زبان سمجھی جاتی ہے کہ اُردو کا حدوث اور نشوونما اسی خطہ میں ہوا ہے لکھنؤ کی زبان کو اسواسطے مستند مانا جاتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتداء سے شرفائے دہلی کے بے شمار خاندان ایک مدت دراز تک لکھنؤ میں جا جا کر آباد ہوئے اور ہمیشہ کیلئے وہیں رہ پڑے ہیں ہندوستان کے کسی شہر کو اہلِ دہلی سے اس قدر میل جول کا موقع نہیں ملا جس قدر لکھنؤ کو ملا ہے یہاں تک کہ دونوں شہروں کی زبان میں ایک خاص مماثلت پیدا ہوگئی ہے اور بجز خاص الفاظ و محاورات کے سوا دونوں کے بول چال اور لب ولہجہ میں کوئی معتدبہ فرق نہیں معلوم ہوتا[4]"

مرزا غالب کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو :

"جفا کے مؤنث ہونے میں اہلِ دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے کبھی کوئی نہ کہے گا کہ جفا کیا، ہاں بنگال میں جہاں بولتے ہیں کہ ہتنی آیا اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں[5]"

اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر جگہ کی زبان میں مقامی الفاظ موجود ہیں اور وہ ٹکسالی نہیں اس لئے نہ ہر جگہ کی اُردو معتبر ہے نہ ہر جگہ کے لوگ اہلِ زبان

---

[1] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۲۰ ـ [2] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹ ـ [3] المیزان صفحہ ۲۰ ـ [4] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۴ - ۱۱۵ ـ [5] ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۱

یہ شرف صرف دہلی اور لکھنؤ کے باشندوں کو حاصل ہے انہی کی تقلید پر زبان کی درستی منحصر ہے مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مشہور مقدمہ میں ایک مستقل عنوان قایم کرکے اس کی اہمیت پر بحث کی ہے وہ کہتے ہیں :

زبان کو درستی کے ساتھ استعمال کرنا

اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور اُن کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ اُن کے الفاظ محاورات بقدر معتدبہ نا معلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں لیکن چونکہ ایسا موقع ہر شخص کو ملنا دشوار ہے اس لئے ضرور ہے کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جسقدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے نہ اس ارادے سے کہ خیالات اور مضامین میں اُن کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔"[1]

مولانا حالی کے اس بیان سے اُس خیال کی ناپائیداری بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ محاورات اور روزمرہ کے متداول ہو جانے کے بعد تقلید کی ضرورت نہیں اول تو اُن محاورات کا استعمال ہی تقلید ہے دوسرے اسلوب بیان اور پیرایہ ادا ہمیشہ بدلتا رہتا ہے یہ بھی اہل زبان کی تقلید سے کبھی بے نیاز نہیں کر سکتی۔

زبان کے لئے مرکز کی ضرورت پر ایک اور دلیل

اس بحث میں یہ نکتہ نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے کہ دہلی اور اُسکے اطراف میں جو بولی مروج تھی اس میں شہری طبیعتوں کی لطافت اور نفاست کے ہاتھوں سے غیر محسوس طریقہ پر تصرفات ہوتے ہوتے لفظیں اصل سے ہٹ گئیں، محاورے متغیر ہو گئے، اسلوب بدل گیا غیر زبان کی لفظیں اور ترکیبیں بکثرت داخل ہو گئیں یہاں تک کہ بات کرنے کا ڈھنگ بھی بدل گیا اس خبط کے اثر سے کچھ نئی لفظیں اور محاورے بھی پیدا ہو گئے اب ایک نئی زبان بن گئی یہی اُردو ہے، دیہاتوں میں زبان اپنی اصل پر بہت حد تک باقی رہ گئی اور شہروں کے باشندوں نے بھی دہلی کی شہری زبان کو معیاری سمجھ کے اُس کی تقلید کی یہاں تک کہ ہر شہر کی زبان اپنے دیہاتوں سے ممتاز ہو گئی، پھر بھی مقامی لفظیں اور محاورے بہت کچھ باقی رہ گئے اس وجہ سے زبان کھچڑی ہو گئی خالص نہ رہی اس کے معنے یہ ہوئے کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کا نام اُردو ہے۔ دوسرے شہر کے باشندوں نے وہیں کی زبان کا چربہ اُتارا پھر بھی خالص نہ بن سکی اب اگر کسی لفظ کے صحیح و غلط محاورے کے معنی و محل استعمال میں امر دائر ہوگا تو فیصلہ انھیں کے کلام سے کیا جائے گا جن کی وہ زبان ہے۔

(باقی)　　سید محمد باقر شمس لکھنوی

نوٹ کر لیجئے

کہ پرانے پرچے پر ڈاکخانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے، اس لئے اگر دفتر میں پرچہ کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ بیرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۲۰ر دیکر پرچہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ ہمیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہے۔

مینجر نگار۔ لکھنؤ

محبت کی چند نفسیاتی گھڑیاں

(رومانچہ)

آج وہ جلد پہونچ گیا تھا، سورج دیوتا گنگا جی میں اشنان کرنے کی طیاری کر رہے تھے ---- پانچ فرلانگ لمبے پل پر اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ موٹر، تانگہ، یکہ اور پیدل چلنے والوں کی کثیر تعداد پل سے گزر رہی تھی یہ رونق یا تو صبح کو ہوتی ہے یا پھر اس وقت شام کو۔ لوگ دن بھر کے تھکے اپنے اپنے کام سے لوٹ رہے تھے اور کچھ تفریح کے واسطے آ رہے تھے۔ کاروباری دنیا کا شور و شغب سنتی ہوئی گنگا خاموشی کے ساتھ بہ رہی تھی کبھی کبھی اس کی کشادہ پیشانی پر شکن پڑ جاتی مگر پھر وہی سنجیدہ روش اختیار کر لیتی۔

رفیق اس ہنگامہ سے بے خبر ایک علحدہ مقام پر کھڑا ہوا سنہرے پانی پر نظر جمائے ہوئے تھا---- سامنے فضا میں چڑیوں کی سیاہ لکیر سی اُڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ لوگوں کی چیخ پکار کبھی کبھی رفیق کے کان میں آجاتی ورنہ وہ حتی الامکان اپنے کو اس پر شور ماحول سے غیر متعلق رکھنے کی کوشش کر رہا تھا........ "لاحول ولا قوۃ، دن بھر جھک مارنے کے بعد دو مچھلیاں ملیں وہ بھی نوالہ بھر کی"

"ہاں بھئی، تمھیں تو مل گئیں ---- چلو ایک وقت کا شوربہ تو ہوا، مگر یہاں تو جیسے گئے تھے ویسے ہی کورے واپس آ رہے ہیں"

کندھے پر بنسی رکھے، ہاتھ میں جھولا لٹکائے دو آدمی رفیق کے پاس سے یہ کہتے ہوئے گزر گئے ---- "ایک وقت کا شوربہ تو ہوا" یہ آواز اس کے دماغ میں گونجتی رہی یہاں تک کہ وہ پھر اسی دنیا میں آگیا۔ اتنی جلد وہ اس "مادی حقیقت" کی طرف رجوع نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لطیف تخیلات کو صدمہ پہونچا، اس کی طبیعت بکھ پھیکی سی پڑ گئی۔ وہ حیات کی ان ناگزیر ضرورتوں کو محسوس ضرور کرتا مگر نظرانداز کر جانا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ اسوقت پریشاں خاطر سا ہو گیا تھا، اس نے مڑ کر دیکھا۔ شکاری جا چکے تھے۔ سامنے سے تھکے ماندے مزدور قدم بڑھاتے ہوئے آ رہے تھے۔ بعضوں کے ہاتھ میں ناشتہ دان تھے اور بعض خالی ہاتھ تھے۔ وہ اس دنیا سے اور قریب ہو گیا۔ اب اس کی نظروں کے سامنے، ہرے بھرے درخت، شفق کی سرخی، دریا کے پاٹ کے بجائے اُترے چہرے، دھنسی آنکھیں، تھکے قدم، ننگے بدن، کھوکھلے قہقہے اور خانگی باتیں تھیں۔ وہ اب بالکل اِدھر متوجہ ہو چکا تھا، اس کی تفریح میں بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا

"اب اسقدر جلد کبھی نہ آئیں گے، سارا مزہ خاک میں مل جاتا ہے"

رفتہ رفتہ سورج غروب ہو گیا، آمد و رفت بھی کم ہو گئی، کہیں کہیں لوگ نظر آ جاتے، ورنہ پل خالی ہو چکا تھا، اندھیرا ہو چکا تھا، دور آبادی میں روشنی جھلملا رہی تھی، اپریل کی ۷ تاریخ تھی ---- چاند دریا کی سطح پر اپنی باریک نظریں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

رفیق اب پھر سکون محسوس کرنے لگا۔ اس کے ذہن سے تلخی زائل ہو چکی تھی۔ منظر کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں بھی تغیر پیدا ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ منظر سے تقریباً ہم آہنگ ہو گیا۔ اب وہ آزادی کے ساتھ جہاں چاہتا ٹہلنے لگتا۔ جہاں چاہتا کھڑا ہو جاتا وہ سینہ پھلا پھلا کر صاف اور ٹھنڈی ہوا کو پھیپھڑوں میں داخل کر رہا تھا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد وہ گھر لوٹا ---- راستہ میں، پھر شکاری، مزدور

موٹر، یکہ، تانگہ اسکے دماغ میں پھرنے لگے، مگر گھر پہونچتے پہونچتے وہ سیر و تفریح اور دلکش مناظر کو بالکل بھول چکا تھا۔

رفیق یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا، دن بھر کی بیکاری کے بعد ــــ وہ تعلیم کو بیکاری کے مشغلہ ہی کے نام سے منسوب کرتا ــــ ادب سے اس نے اتنا ہی سیکھا تھا ــــ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے مشکل ہی سے تعلیم کا کوئی دوسرا پہلو اس کی نظر میں آسکتا تھا نوکری یقینی نہیں تھی اس لئے کہ اس کے گھرانے میں کوئی بڑے عہدہ پر نہیں تھا نیچے طبقہ میں سے تھا نہیں کہ تعلیم کے نقصانات سمجھ سکتا اور گھر کے کاروبار ہی میں مصروف ہوجاتا۔ لہٰذا ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ جو وہ نکال سکتا تھا نکال رہا تھا یعنی دن بھر پڑھنا، شام کو گشت کے لئے نکل جانا، رات کو تان کر سونا ــــ شاعری سے کافی دلچسپی تھی، ناول خوب پڑھتا اور یونیورسٹی میں بھی اسی خیالی دنیا میں بسر کرتا ــــ پروفیسر صاحب پڑھا رہے ہیں مگر اس کا ذہن ناول کے صفحات میں ہے، جو کچھ وہ لکھاتے رفیق لکھ لیتا، مگر سمجھ کر نہیں، بالکل یونہی۔ تخیل پسند ہونے کی وجہ سے وہ کاہلی، ذہنی ہیجان اور خود فریبی میں لطف محسوس کرتا، مگر باوجود ان تمام تر دلچسپ مشاغل کے وہ زندگی میں ایک خلا سا محسوس کر رہا تھا ــــ جس کو پُر کرنے کے لئے وہ روز گنگا کے پل پر چلا جاتا۔

دوسرے دن وہ پل پر اسوقت پہونچا جب لوگ جا چکے تھے اور دن بھر کا شور دریا میں ڈوب چکا تھا۔ ملّاح اپنی کشتیوں کو کنارے لگا چکے تھے۔ گھاٹ پر کہیں کہیں آگ جل رہی تھی ــــ شاید ملّاح 'بھبوری' لگا رہے تھے۔

چاند نکل آیا تھا آج کی تاریخ کا چاند زیادہ بڑا، زیادہ حسین تھا دور تک روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تارے بھی جا بجا نظر آرہے تھے، جنھیں کبھی کبھی کوئی شوخ لہر تھوڑی دور تک بہا لیجاتی اور چھوڑ دیتی گنگا اپنی قدیم روایات کو سمیٹے دنیا کے نشیب و فراز پر غور کرتی بہہ رہی تھی۔ پُل کے کھمبوں سے ٹکرا کر پانی عجیب موسیقی پیدا کر رہا تھا جس میں بیک وقت لطف و خوف دونوں شامل تھے۔ رفیق آج کل سے زیادہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے کو ان 'ذی حیات' مناظر میں کھو دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ دن بھر کی تلخیوں کو پیچھے چھوڑ کر وہ قدرت کے گہوارہ میں سو جانا چاہتا تھا ــــ وہ سوچ رہا تھا "گنگا کی ہلکی ہلکی تھپکیاں کس قدر خواب آور ہیں" مگر فوراً ہی سہم جاتا ــــ گنگا کی ہلکی ہلکی تھپکیاں! پھر وہ اپنے کو نرم اور خنک ہوا کے آنچل میں چھپا لیتا یہاں البتہ اسے آرام ملتا۔ مقام کی 'شعریت' اسے شاعر ہونے پر مجبور کر رہی تھی، حالانکہ شعر سے سوائے لطف اندوز ہونے کے، اس نے آج تک ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کیا تھا ــــ وہ اس تکلیف دہ احساس کے ساتھ اس روشن رات میں کھو گیا ــــ ایک جگہ کھڑے کھڑے جب وہ تھک جاتا اور اسکی یکسوئی میں فرق آنے لگتا تو وہ ٹہلنے لگتا۔ ٹہلتے ٹہلتے اسکی زبان پر ایک مہمل مصرعہ خود بخود جاری ہوگیا ــــ "آہ! زمانِ حیات۔ آہ! زمانِ حیات" ــــ مگر اسکے معنی وہ ایک غیر محسوس طریقہ پر اندر ہی اندر سمجھ رہا تھا ــــ "آہ! زمانِ حیات!" .... "آہ! زمانِ حیات!"

اس کا ہاتھ قمیض کے بٹن کو گھما رہا تھا۔ قدم تیز تیز پڑ رہے تھے۔ نظریں مناظر سے ہٹ کر پُل کے تختہ پر جم گئیں تھیں۔ مصرعہ کی بار بار تکرار اس کے دل کے ایک نامعلوم تار کو چھیڑ دیتی جس سے ایک مبہم اور غمگین نغمہ نکل کر اس کے ذہن میں گونجنے لگتا۔ آخرکار وہ تھک کر چھڑی سے ٹیک کر کھڑا ہوگیا ــــــــــ وہ اسوقت بالکل مست تھا۔ یک بیک اس نے ایک آواز سنی جیسے کوئی چیز لہروں کو چیرتی ہوئی آرہی ہو اس نے دیکھا تھوڑی دور پر ایک کشتی ہولے ہولے بہہ رہی تھی۔ وہ صاف طور پر نہ دیکھ سکا کہ اس پر کون کون ہیں۔ کچھ دیر وہ انتظار کرتا رہا کہ کشتی لوٹے گی مگر وہ ایک موڑ پر جا کر نظروں سے غائب ہوگئی۔ اب اس کی تمام تر توجہ کشتی کی طرف مبذول ہوچکی تھی۔ مگر جلد ہی "کوئی ملّاح ہوگا" کہکر اس نے اپنے دل کو مطمئن کر لیا ــــ کچھ دیر ٹھہر کر وہ گھر چلا آیا۔

سات دن سے وہ برابر جاتا اور برابر کشتی کو دیکھتا۔ اُس کی بےچینی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اتنا تو یقینی تھا کہ کوئی صاحبِ دل

ٹہلنے نکلتا مگر اس کشتی پر اور کون کون ہیں؟ — یہی خیال اسے رہ رہ کر اس بات پر اکساتا کہ جاکر قریب سے دیکھ آئے لیکن اس کو وہ کچھ اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اس "راز" سے واقف ہوجائے گا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال پرورش پا رہا تھا۔ نہایت ہی لطیف — نہایت ہی شاعرانہ مگر اس کو ابھی وہ خود "اپنے" پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل عجیب اختلاجی کیفیت محسوس کرنے لگتا جب کبھی وہ اس خیال کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا — آج بھی وہ حسب معمول پُل پر کھڑا ہوا تھا۔ گنگا جی خوش خوش بہ رہی تھیں۔ پانی میں ڈوبی ہوئی ہوا دل و دماغ کو تازہ کر رہی تھی۔ چودھویں رات کا چاند صاف آسمان پر چمک رہا تھا — دور تک روپہلا دریا آسمان کے حسین راز، زمین کے سینہ پر بکھیر رہا تھا، کنارہ کے سیاہ درخت اس سیم گوں فضا کو غم آلود مگر لطیف کیفیت سے مملو کر رہے تھے۔ لہریں جھلملا رہی تھیں۔ چاروں طرف سکوت اور چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دُنیا جنت کا ایک خواب دیکھ رہی ہے جس کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہوگا۔ رفیق بیخودی کے عالم میں کہیں اور سانس لے رہا تھا — وہاں جہاں دل دھڑکنے کی آواز بھی نہیں سنائی دیتی۔ اس کی آنکھیں دُور کسی چیز کو ڈھونڈھ رہی تھیں کہ ناگاہ وہی کشتی ایک سمت سے اس طرف آتی دکھائی پڑی۔ رفیق نے اپنی نظریں اس پر جما دیں۔ رومان پسند دماغ میں ایک عورت نے جنم لیا — جو گنگا کی لہروں اور چاندنی رات کے سناٹے سے مل کر بنی تھی۔ اس نے کشتی کو غور سے دیکھا "بیشک ایک عورت ہے" اس کے کانوں نے ایک کھنکتے ہوئے قہقہے کی آواز بھی سنی۔ اسکے تصور میں ساری فضا نغمہ زار بن گئی۔۔۔ کشتی قریب آرہی تھی، اس کا دل دھڑک رہا تھا۔۔۔۔۔۔ "اچھا! رہنے دو۔ اُدھر ہی واپس لے چلو، کل اِدھر آئیں گے"۔ مردانہ آواز آئی، یہ آواز البتہ اسے صاف سنائی دی۔ اسے بلاشک و شبہ وہ مردانہ آواز کہہ سکتا تھا۔ کشتی واپس جا رہی تھی، اس کا دل کچھ افسردہ سا ہوگیا۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور اس نے چاندنی میں آنچل کی خفیف سی سرسراہٹ بھی سنی — یہ اس کا گمان ہو سکتا ہے — مگر نہیں اس نے آنچل کو چمکتے بھی دیکھا جس کے دامن میں زریں تارے جھلملا رہے تھے۔ اس نے یک بیک خوشبو بھی محسوس کی — وہ پھر سوچ میں پڑ گیا "کہیں یہ سب خود اسی کا تصور نہ ہو"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دوسرے دن وہ خلافِ معمول بہت جلد پہونچ گیا تھا حقیقت کی دنیا معہ اپنی سوگواریوں اور ناداریوں کے گزر رہی تھی۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا کہ ان پُر فضا مقامات کو بھی یہ لوگ اپنی ذہنی پستیوں سے مسموم کر دیتے ہیں"۔ وہ بےچینی کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ خدا خدا کر کے سورج ڈوبا اور پھر وہی سہانا منظر جیتا جاگتا نظروں کے سامنے نمودار ہوگیا۔ رفیق آج مناظر سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے تو کشتی کا انتظار تھا — جو افق سے چاندنی اور گنگا کی لہروں پر بہتی ہوئی، ہلکورے لیتی ہوئی، خفتہ جذبات کو بیدار کرتی ہوئی اسکی طرف آہستہ آہستہ آئے گی اور پھر وہ اُس میں وہ سب کچھ دیکھے گا جن کو ابھی تک کتابوں میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا "انتظار کی گھڑیاں بھی کس قدر پُر لطف ہوتی ہیں" اسنے شاعرانہ انداز میں سوچنے کی کوشش کی۔ ایک گھنٹہ ہوگیا مگر کشتی نہ آئی۔ دو گھنٹے گزر گئے مگر گنگا کا دامن خالی رہا وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ مگر کچھ نہ دکھائی دیا — وہی گنگا کی خاموش لہریں، وہی چاند کی پھیکی کرنیں، وہی بے حس سیاہ درخت، لمحہ بہ لمحہ اسکا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف پھر دیکھا۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آخر کار مایوس ہو کر وہ گھر کی طرف چل دیا۔ جہاں تک دریا نظر آتا گیا وہ مڑ مڑ کر دیکھتا گیا۔ کشتی کا کہیں پتہ نہیں تھا — وہ راستہ بھر عجیب و غریب باتیں سوچتا گیا۔ "کیسی کشتی تھی؟ — کون ہو سکتا ہے اُس پر۔ محض مرد ہوں گے؟" مگر اسکو ماننے پر اس کا دل تیار نہیں ہو رہا تھا۔۔۔" چاندنی راتوں کی سیر کیا معنی؟ آج کیوں نہیں آئی!" ایک غمگین سا خیال اس کے دل میں دوڑ گیا وہ آہستہ آہستہ چل کر گھر پہونچ گیا۔ اُسے آج عجیب قسم کی کمی سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز پُل پر بھول آیا۔
کہیں دو بجے رات کو بمشکل اسے نیند آئی۔

مجتبیٰ حسن (بی۔ اے)

جرمنی کی چھتری والی فوج

جرمنی میں چھتریوں والی فوج دو قسم کی ہے اور ہر ایک کا انتظام بھی علحدہ ہے اور اس کے فرائض بھی جداگانہ ہیں۔ ایک کا نام "ہوائی پیادہ فوج" ہے اور دوسری کا "ہوائی بندوقچی"۔

ہوائی پیادہ فوج کے دستے میں ۲۵ سے ۳۶ تک سپاہی ہوتے ہیں اور یہ بڑے بڑے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ان مقامات پر پہونچائے جاتے ہیں، جہاں ان کو چھتریوں کے ذریعہ سے اُتر کر پیدل فوج کی سی خدمت انجام دینا ہیں۔ دشمن کے ہوائی اڈوں پر قبضہ کرنا عارضی پُل طیار کرنا اور دشمن کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں پر حملہ کرنا ان کا کام ہے تاکہ باقاعدہ پیادہ فوج کے حملہ کے لئے پہلے سے آسانیاں پیدا کر رکھیں۔

ہوائی بندوقچیوں کی تعلیم وہاں بالکل ایک تنہا شکاری کی سی ہوتی ہے وہ کبھی ہوائی پیدل فوج کے ساتھ بھی کام کرتا ہے اور کبھی اسکے لئے ہراول کی خدمت بھی انجام دیتا ہے۔ اس کا خاص فرض یہ ہے کہ وہ دشمن کے پلوں کو برباد کرے، تار اور ٹیلیفون کے سلسلہ کو کاٹے اور ایسے میدانوں پر پہلے سے قبضہ کرے، جہاں ہوائی پیدل فوج کو اُترنا ہے۔

اس قسم کے حملہ کی ابتدا سب سے پہلے روس نے کی تھی یعنی ۱۹۲۰ء میں جب سُرخ افواج کو حرکت میں لانے کی ضرورت ہوئی، تو ایک نوجوان روسی افسر نے دشمن کے عقب میں چند سپاہی چھتریوں کے ذریعہ سے اُتارے اور انھوں نے متعدد پُل توڑ کر دشمن کو سخت نقصان پہونچایا اسی کے ساتھ انھوں نے سوطین آبادی میں بھی خوف و ہراس پیدا کر دیا اور دشمن کی فوج کو بعض اہم مقامات سے پیچھے ہٹا دیا۔

اس تجربہ کی کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۸ء میں روس نے ایک پوری بٹالین چھتری بازوں کی طیار کر لی، اور آج روس کے پاس کئی ڈویزن ہوائی پیدل فوج کے پائے جاتے ہیں۔

فرانس کے ماہرین نے وہاں کے جنرل اسٹاف کو بھی مشورہ دیا کہ اس قسم کی فوج طیار کرے اور وہاں اسکے تجربے بھی کئے گئے، لیکن وارکونسل نے اس کو کچھ مفید نہ سمجھا اور اس خیال کو ترک کر دیا۔ لیکن جرمنی نے البتہ اس طرف خاص توجہ کی اور اسپین کی سول وار میں اس کا تجربہ بہت مفید ثابت ہوا، اس کے بعد پولینڈ پر حملہ کرنے کے وقت ان چھتری والے دستوں سے اور زیادہ کام لیا گیا۔ لیکن زیادہ وسیع پیمانہ پر ان سے ہالینڈ میں کام لیا گیا اور سچ پوچھئے تو وہاں کا قبضہ انھیں کی وجہ سے ہوا۔

اس فوج کی تربیت بڑے اہتمام سے ہوتی ہے اور والنٹیروں کی جماعت سے انکا انتخاب بڑی چھان بین کے بعد کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو ان کا جسمانی و نفسیاتی امتحان لیا جاتا ہے۔ ماہرین ان کے دل و اعصاب کی جانچ کرتے ہیں اور ایک کرہ کے اندر جہاں ہوا کا دباؤ بہت کافی ہوتا ہے ان کو بند کر دیا جاتا ہے تاکہ اُن کے سانس کی نالیوں کی جانچ ہو سکے۔ ان تمام امتحانات کے لئے بہت سے آلات استعمال کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ صحت جسمانی کے اس کی قوت ارادی اور صبر و تحمل کا کیا حال ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا

ہے کہ اس میں ڈیچ اور جلد فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ جب کوئی شخص ان امتحانات میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو پھر اس کی باقاعدہ فوجی تعلیم شروع ہوتی ہے۔

چھتری بازی کی تعلیم اس طرح شروع ہوتی ہو کہ پہلے وہ ہوائی جہاز پر بیٹھکر چکر کھانے، غوطہ لگانے اور اُلٹنے پلٹنے کی مشق کرتا ہے اور یہ مشق اتنی زیادہ کرائی جاتی ہے کہ اس کے جسم میں ہر زاویہ سے جھکنے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔

کودنے کی مشق میز سے کرائی جاتی ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ ۲۰۰ فٹ بلند منارہ سے چھتری لیکر اُترنے لگتا ہے۔ اسی کے ساتھ غیر زبانوں کی بھی تعلیم دیجاتی ہے اور اُڑتے اُڑتے جغرافیہ کا مطالعہ کرنا اور نقشے طیار کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ چار ہفتے کی نہایت سخت مشق و تعلیم کے بعد وہ باقاعدہ چھتری باز فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے اور تیز و سست پرواز کی حالت میں ۴۰۰ فٹ کی بلندی سے اُترنے کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جوں جوں اس کی مشق بڑھتی ہے اس کا سامان بھی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک مشاق چھتری باز جب اُترتا ہے تو اس کے پاس ایک مشین گن، ایک پھاوڑا، ایک سائکل، نقب لگانے کے آلات اور کھانے پینے کا سامان بھی ہوتا ہے۔

جرمنی کے چھتری بازوں کی چھتریاں بہترین جاپانی ریشم کی ہوتی ہیں اور ایک چھتری ۲۵ پونڈ میں طیار ہوتی ہے۔ جرمنی میں دو قسم کی چھتریاں استعمال کی جاتی ہیں ایک وہ جو اُترتے وقت از خود کھل جاتی ہیں اور دوسری وہ جنھیں ہوا باز از خود اپنے اختیار سے کھولتا ہے۔

جب چھتری باز دستہ لڑائی کے لئے بھیجا جاتا ہے تو سب سے پہلے کمانڈر کودتا ہے اور وہ ایک نہایت تیز رنگ کی ریشمی چھتری استعمال کرتا ہے تاکہ دوسرے چھتری باز دور سے دیکھکر یہ معلوم کرلیں کہ وہ کہاں اُترتا ہے۔

یہ لوگ عام طور پر چھتریاں اسوقت کھولتے ہیں جب زمین کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ فٹ ہوتا ہے۔ چھتریاں تین سکنڈ کے اندر کھل جاتی ہیں اور ساڑھے سولہ فٹ فی سکنڈ کے حساب سے نیچے اُترتی ہیں۔

ایک بار جانچ کے وقت دیکھا گیا کہ ایک جرمن سپاہی ۲۴ ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے اُترا۔ اس کے پاس متعدد آلات تھے جنکے ذریعہ سے ہوا کا دباؤ، نیچے اُترنے کی رفتار اور ہوا کا رُخ معلوم ہو سکتا تھا اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو وہ بہت دیر میں چھتری کھولے اور اُترتے وقت وہ تمام آلات کو دیکھ کر نوٹ کرتا رہے کہ اُن سے کیا کیا باتیں دریافت ہوئیں۔

اس نے اپنی چھتری اسوقت کھولی جب زمین کا فاصلہ صرف ۱۰۴ فٹ رہگیا تھا، اور اس دوران میں اس نے تمام آلات سے کام لیا۔ وہ نہایت محفوظ طریقہ سے نیچے اُترا اور کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

جرمنی کی چھتری والی فوج نے اس وقت تک خاصی کامیابی حاصل کی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ اس سے کہاں کہاں کام لیا جائے گا۔

آپ کا نمبر خریداری

ہر مہینے پتہ کے کاغذ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے۔ اسے ایکبار اپنے کاغذات میں کسی جگہ نوٹ کر لیجئے۔ ہم برابر لکھتے رہتے ہیں کہ خط و کتابت میں خریداری نمبر ضرور لکھئے، لیکن آپ میں سے بہت کم اس پر توجہ فرماتے ہیں، آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی یہ بے پروائی دفتر کے لئے کتنی تکلیف دہ ہو۔ بہر حال اگر آیندہ آپ نے اپنا نمبر خریداری تحریر نہ فرمایا تو عدم تعمیل کی ذمہ داری ہمارے سر نہ ہوگی۔

منیجر نگار

مکتوبات نیاز

حضرت سلامت !

آپ نے میرا حال پوچھکر واقعی مجھے اچھا کردیا۔ مسیحا کا ذکر کتابوں میں سنا کرتے تھے، اب خود آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دُنیا کا تعلق آپ سے جو کچھ ہو، لیکن میں تو ساری دُنیا کھو دینے کے بعد بھی آپ کو حاصل کرنے کا سودا کرسکتا ہوں بشرطیکہ آپ اس پر راضی ہوں۔

ہرچند میری ارادت وعقیدت آپ کے ساتھ بالکل غیر مشروط حیثیت رکھتی ہے، تاہم فطرت انسانی قدم کے ساتھ نقش قدم کو بھی دیکھتی ہے اور دُنیا میں ہر محبت کرنے والے کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ محبت کا جواب محبت سے دیا جائے!

اک زمانہ ہوا جب میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ کو ہو یا نہ ہو، لیکن مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ اور پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کے لئے غریب خانہ حاضر ہے، لیکن اس دعوتِ زاویہ نشینی کا جواب یہ ملا کہ آپ خود دُنیا میں گم ہوگئے اور میں آپ کو ڈھونڈھتا کا ڈھونڈھتا رہ گیا۔ پھر

اے جفا ہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں !

میں آپ سے اس کی شکایت تو نہیں کرتا، لیکن اس تمنا کو اپنے دل سے نکالدوں، یہ بھی میرے امکان میں نہیں !

میں واقعی اس دوران میں بہت مضمحل رہا، لیکن حیران ہوں کہ آپ کو اس کی اطلاع کیونکر ہوئی ! غالباً برنبائے کشف!

اچھا تو فرمایئے کیا ارادہ ہے۔ میں تو آپ کو بلاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ پھر نہ غائب ہوجائیں۔ آپ ہی فرمایئے کہ میں کب حاضر ہوں۔ آپ حسب معمول اس کا جواب شاید یہی دیں گے کہ "ابھی نہیں" لیکن میں زیادہ خوش ہوں گا اگر آپ کہدیں "کبھی نہیں"۔ کسی طرح یہ "ردوقبول" کا جھگڑا تو ختم ہو !

ماشاءاللہ ! کیا کہنا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم جانتے ہو دُنیا میں کس طرح جینا چاہیئے۔ یہ فن تم نے کہاں سیکھا، کس سے سیکھا۔ حیران ہوں ! ــــ لیکن افسوس ہے کہ تم اس کی داد ایک غلط شخص سے چاہتے ہو۔ ہرچند جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ میں بھی نیرو بن جاؤں اور جس وقت ساری دنیا میں آگ لگی ہو، میں رنگ رلیوں میں مصروف رہوں۔ لیکن انسانیت کا یہ بلند مرتبہ مشکل ہی سے کسی کو حاصل ہوسکتا ہے ــــ دُنیا میں پیغمبر تو کافی پیدا ہوئے، لیکن چنگیز بہت کم ــــ پھر یہ اس وجہ سے نہیں کہ قدرت نے دُنیا پر رحم کھایا بلکہ شاید اس لئے کہ بگاڑ کر بنانا اس کے لئے بھی آسان نہیں۔ فرعون نے جس قوم کو ایک دن کے اندر اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا، موسیٰ چالیس سال کی

سرگردانی کے بعد بھی کوئی گھر نہ اس کے لئے بنا سکے!
تمھاری کامیابی پر مجھے خوش ہونا چاہئے، لیکن اسی کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ کامیابی تم کو کتنی مہنگی پڑی ہے تو زیادہ خوشی نہیں ہوتی ــ خدا کرے، یہ سب دیرپا ثابت ہو اور تم کو پھر اخلاق کا خون کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ہاں، ہاں - خوب جانتا ہوں اور بہت ڈرتا ہوں ــ تم نے دیکھا ہوگا بعض لبوں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں اور ہر وقت مسکراتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شاید تم یہ نہ جانتے ہوگے کہ یہ تبسم ایک قسم کا "زہر خند" ہے اور میں ایسے لوگوں سے بہت خایف رہتا ہوں۔
تم نے جن کا ذکر کیا ہے ان میں یہ کیفیت بہت زیادہ نمایاں ہے اس لئے میں اُن سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں - یہ درست ہے کہ بعض اوقات انسان خراب چیزوں کی طرف بھی مایل ہو جاتا ہے محض اس لئے کہ وہ حسین ہیں، لیکن یہ قدرت کا قانون نہیں بلکہ ہمارے جذبات کی اثر پذیری ہے۔ اس کی عمر بھی کم اور نتیجہ بھی خطرناک!
بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا - میں اسی کو غنیمت سمجھوں گا اگر تلخیاں جلد نہ شروع ہوں۔ مجھ سے داد نہ چاہو، کیوں اپنے لطف کو غارت کروگے۔

قبلہ، آپ نے بالکل درست فرمایا کہ انھوں نے میرے متعلق آپ سے جو کچھ کہا وہ کم از کم آپ کے لئے ضرور اطمینان بخش ہے۔ لیکن آپ اس بارہ میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔ دُنیا میں دو قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں ایک وہ جو کہتے اچھا ہیں اور دوسرے وہ جو سنتے اچھا ہیں، میں ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہوں اور وہ صاحب ان دونوں کے ماہر ہیں۔
جواب تو خیر بڑی بات ہے، مجھ سے تو "ہاں ہاں" بھی مشکل سے کہا جاتا ہے۔ وہ کہیں جو جی میں آئے اور آپ سمجھ لیں جو آپ کی سمجھ میں آئے، میری طرف سے سوائے خاموشی کے آپ اور کچھ نہ سنیں گے۔ یہ "عافیت طلبی" نہیں بلکہ میری نااہلی ہے۔ خدا کرے آپ اپنے یقین کی طرف سے شرمندہ نہ ہوں۔

لاحول ولا قوۃ! آپ نے بھی کس کا ذکر کیا۔ وہ جو پیدا ہوا ہے انسانوں میں لیکن زندگی بسر کرتا ہے حیوانوں کی سی! صرف "جسم ہی جسم" رکھنے والے انسان تو بہت ہیں، لیکن بغیر روح کے انسان کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ بھی ہیں جن کے آپ اس قدر دلدادہ ہیں۔ مجھے اُن سے بہت کم واسطہ پڑا ہے، لیکن انھیں جانتا اچھی طرح ہوں۔
انسان کا انسان نہ ہونا اور اس کا دشمنِ انسانیت ہونا، ان میں بڑا فرق ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ

اُسی کو انسان سمجھتے ہیں جو زندہ چیزوں کو کچلتا ہوا گزر جائے، جو پھولوں کو توڑتا اور مسلتا ہوا نکل جائے، جو خوب ہنسے لیکن صرف اُس وقت جب دوسرے مصائب میں مبتلا ہوں!

میرا یہ خط انھیں سنا دیجئے، لیکن جو کچھ وہ کہیں اس کو مجھ تک نہ پہونچائیے۔

مکرمی - کیا عرض کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا - ایک رباعی یاد آگئی، سنئے:-

پرسید یکے منزل آں مہرگسل ۔۔۔ گفتم کہ دلِ من ست اورا منزل

گفتا کہ دلت کجاست؟ گفتم بر او ۔۔۔ پرسید کہ او کجاست؟ گفتم، در دل!

مطلب یہ کہ نہ دل کا صحیح ٹھکانا معلوم نہ اس مہرگسل کا۔

کچھ کہتا ہوں تو آپ کو تکلیف ہوتی ہے، نہ کہوں تو آپ خاموش نہیں رہنے دیتے، پھر نہ آپ کی تکلیف گوارا، نہ اپنی خاموشی پسندیدہ، حیران ہوں، کیا کروں، کیا نہ کروں!

میں اس سے پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ مجھے ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور نہ کیجئے اور اب پھر وہی کہتا ہوں - لیکن اگر یہ اہتمام صرف اس لئے ہے کہ آخر میں الزام میرے ہی سر قایم رہے تو میں اس قربانی کے لئے طیار ہوں، لیکن جو کچھ کیجئے اس یقین و اعتراف کے ساتھ کیجئے کہ مجھے آپ سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔

دربار داری کا سلیقہ مجھے کبھی حاصل نہیں ہوا، اس لئے آپ کیوں بار بار اس بات کو چھیڑتے ہیں، جسکے متعلق میں اپنی رائے قطعی طور پر ایک بار ظاہر کرچکا ہوں - میں آپ کا سہی، لیکن میری رائے تو میری بھی پابند نہیں، کسی اور کا کیا ذکر ہے!

حضرت! گرامی نامہ پہونچا - یہ آپ نے کیا فرمایا - میں اور آپ کے عدم التفات کا گلہ مند!

زغارتِ چمنت بر بہار منت ہاست

کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

اس سے زیادہ "سپردگی و فتادگی" اور کیا چاہئے!

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً وہ شکایت بھی کرتا اور آپ سے تلافی بھی چاہتا، لیکن میں کہ آپ کی "بیگانہ وشی" کو بھی محبت و خلوص سمجھتا ہوں اس جُرم کا مرتکب کبھی نہیں ہوسکتا!

چشم خطا نظارہ ندانم چہ دیدہ است!

بندہ نواز!

آپ وہاں جا تو رہے ہیں، لیکن کس اہتمام کے ساتھ؟ اس کی خبر نہیں - جسوقت یوسف مصر جارہے تھے تو کیا وہ جانتے تھے کہ وہاں ایک زلیخا بھی ہے - ڈر رہا ہوں کہ مبادا آپ کے سفر کا بھی کچھ ایسا ہی انجام ہو۔

وہ تو خیر پیمبر تھے، کہ الزام عاید ہوا تو صفائی میں قمیص کا پچھلا دامن پھٹا ہوا دکھا دیا اور لوگوں نے اسے مان بھی لیا، لیکن آپ اپنی چاک دامانی کو کیونکر چھپائیں گے۔

اگر آپ کو اپنے صبر و ضبط کا امتحان لینا تھا، تو گھر بیٹھے بھی ہو سکتا تھا، وہاں جانا ضروری نہ تھا۔ بہر حال وہاں پہونچکر تو خیر کیا، لیکن وہاں سے واپس آنے کے بعد ضرور لکھئے گا کہ آپ کس عنوان سے پہونچے اور کس حال سے واپس آئے۔

جناب والا - مکرمت نامہ پہونچا۔ اگر آپ نے یہ نہ لکھا ہوتا کہ جواب کی ضرورت نہیں، تو شاید میں خاموش رہتا آپ کی تنبیہ کا شکریہ، لیکن اسی کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے، کہ جن کے "توبہ و استغفار" سے آپ اس قدر مرعوب ہیں، اُن کے "سجدۂ ریائی" کا رازدار مجھ سے زیادہ کوئی نہیں۔ آپ تو صرف نشانِ سجدہ دیکھتے ہیں اور میں ان کا دل دیکھتا ہوں جو اس سے زیادہ بڑے سیاہ داغ کا مالک ہے!

جی ہاں، میں نے ان کے سب سے بڑے دینی کارنامہ کو دیکھا ہے۔ آپ اسے تفسیر کہتے ہیں، میں اسے "تفضیح" کہتا ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ کے ذوقِ سلیم کو کیا ہو گیا ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ اگر میں چار دن اس شخص کے پاس رہوں تو استسقاء ہو جائے، چہرہ کا تو کہنا ہی کیا گویا جلد کے نیچے کچ لہو بھرا ہوا ہے اور بے رونقی کا تو خیر، کیا پوچھنا۔ معلوم ہوتا ہے کربلا میں خاک اُڑ رہی ہے۔

خدا کے لئے بتائیے، بعض دینداروں کی صورتیں کیوں مسخ ہو جاتی ہیں۔ آپ کہیں گے یہ "فرطِ انوار" ہے، میں کہوں گا خدا کی پھٹکار ہے۔

آپ نے اگر اس طنطنہ کے ساتھ خط نہ لکھا تھا تو شاید میں بھی اتنی صاف گوئی سے کام نہ لیتا۔ بہر حال اب بھی وقت ہے کہ آپ اس چیلنج کو واپس لے لیں ورنہ

تو دانی خرقۂ پشمینہ داری!

محترم - آپ نے بالکل درست فرمایا کہ زمانہ کا ساتھ نہ دیجئے تو وہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے، لیکن میں اس کا زیادہ موید نہیں، علاوہ اس کے سوال یہ بھی ہے کہ آپ "زمانہ" کسے کہتے ہیں۔ کیا زمانہ عزیز و اقارب کا نام ہے، محلہ والوں کا نام ہے، دوست احباب کو زمانہ کہتے ہیں، محلہ کے نمازیوں کا نام زمانہ ہے! مسجد کا موذن وامام زمانہ کہلاتا ہے۔

معاف فرمایئے، آپ نے زمانہ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ دنیا کے عام رجحان کا نام زمانہ ہے، اس رَو کا نام زمانہ ہے کہ اس کا ساتھ نہ دیجئے تو مصائب کا مقابلہ کیجئے۔ مثلاً ایک زمانہ تھا جب حکومت مذہب کی تھی ا عقل سے کام لینا گناہ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ لوگوں نے عقل سے کام لیا اور مصائب جھیلے۔ اسی طرح اب زمانہ ہے

سرمایہ داری کا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کا ساتھ دیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم غلامی یا ذلت و افلاس کے اس قدر عادی ہوجائیں کہ ہمارے احساس کو کوئی تکلیف نہ ہو، لیکن جن میں غیرت و خودداری ہے وہ ہمیشہ اس کا مقابلہ کریں گے اور پامال ہوتے رہیں گے، یہاں تک کہ دُنیا میں سوشلزم کا زمانہ آجائے۔ میں نہیں کہتا کہ سوشلزم، انسانیت کا انتہائی مقصد ہے۔ لیکن مدعا تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ زمانہ کا مفہوم زیادہ وسیع قرار دیجئے اور اس کی مخالفت کو گناہ نہ سمجھئے۔

انسان ایک حال پر قایم نہیں رہ سکتا۔ اگر دُنیا فردوس ہوجائے تو بھی ایک نہ ایک دن وہ اسے جہنم میں ڈال کر باہر نکل آئے گا۔ انسان کے ابتدائی عہد کا حال تو معلوم ہے، لیکن اس کا مستقبل کیا ہوگا، کسی کو خبر نہیں بندگی کے دور سے گزر کر وہ خدائی کے مرتبہ تک تو فرعون ہی کے زمانہ میں آچکا تھا، لیکن اب وہ خدا بننا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اس سے پوچھئے کہ اس سے زیادہ ارتقاء، اور کیا ہوسکتا ہے؟ وہ کہتا ہے یہ عہد تاریکی کی باتیں تھیں، یعنی جب انسان جاہل تھا تو خدا بنانے میں اپنا وقت ضایع کرتا رہا، لیکن اب عقل آئی ہے، اور وہ انسان بنانا چاہتا ہے۔ خدا کی تعمیر میں تو بڑی آسانی تھی کہ جو چیز سمجھ میں نہ آئی، اس کو خدا کہدیا، لیکن انسان تو وہی چیز بن سکتی ہے، جو سمجھ میں آجائے، پھر سمجھ جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اتنا ہی بہتر انسان بنتا جائے گا، یہاں تک کہ خدا کا وجود جو اسوقت کائنات میں صرف بادل کے چھوٹے سے دھبہ کی طرح نظر آرہا ہے وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے گا اور انسانیت بالکل پہلی مرتبہ صحیح معنے میں آزادی کی سانس لے گی!

سنا آپ نے، یہ ہے آجکل کی رَو اور یہ ہے زمانہ کا رجحان! پھر کیا آپ اس کا ساتھ دینے کے لئے طیار ہیں؟

اس میں شک نہیں انسانیت سخت مصیبت میں مبتلا ہے، لیکن اسکا درد ابھی اس حد سے نہیں گزرا کہ دوا ہوجائے۔ فی الحال تو اُسے اسی طرح تڑپنا ہے اور ہم کو آپ کو بھی، کیونکہ شاید ہم لوگ اس مرتبہ کے نہیں کہ منبر سے دار تک پہونچنے کی جرأت کرسکیں۔

چراغاں

(شمع سے لیکر بجلی تک)

تاریخی نقطۂ نظر سے

یہ زمانہ نور و حرارت کا دور کہا جاتا ہے۔ ایک طرف روشنی نے ساری دُنیا کو جگمگار کھا ہے اور دوسری طرف حرارت نے مصنوعات کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔ لیکن شاید کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ عہدِ حاضر کی جگمگاتی ہوئی روشنیاں، رقص گاہوں کی خوبصورت نور پاشیاں، اور عکاس خانوں کی دلفریب ضو باریاں کہاں سے آئیں اور اس باب میں اولیت کا فخر کسے حاصل ہے ؟

یہ تو اکثر حضرات کو معلوم ہے کہ علم الکیمیا، علم الطب، جبر و مقابلہ اور اسی طرح کے بہت سے علوم جن پر اہلِ مغرب کو ناز ہے، عربوں کی ملکیت تھے، لیکن شاید یہ معلوم نہ ہوگا کہ یورپ نے چراغاں کا فن بھی عربوں ہی سے حاصل کیا۔

قدیم یونان میں، گھروں کے اندر روشنی کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ستونوں پر مثلث شکل کے ظروف رکھکر ان کے اندر آگ جلا دیتے تھے یا لکڑی کی مشعل بناکر اسے روشن کر دیتے تھے۔ لیکن اس سے دھواں بہت پھیلتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عربوں میں چراغ کا رواج عام ہو چکا تھا اس لئے جب اہل رومہ اور یونانیوں کے تعلقات عربوں کے ساتھ قایم ہوئے تو انھوں نے بھی عربوں کی تقلید میں چراغ جلانے شروع کئے۔ جس کا ثبوت ان کے آثار سے ملتا ہے۔

انھوں نے پہلے صرف مٹی اور معمولی دھاتوں کے چراغ بنائے اور پھر سونے چاندی کے چراغ بناکر معبدوں کو بھی روشن کیا منروا کے بُت کے سامنے قلعۂ ایتھنس میں جو چراغ معلق رہتا تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں پورے سال کے لئے ایک ہی دفعہ تیل بھر دیا جاتا اور وہ رات دن روشن رہتا تھا۔

اس کے بعد صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں لیکن کوئی ترقی اس فن میں نہ ہوئی، یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کے مغربی ملاح و کاشتکار بھی یونانیوں کی تقلید میں چراغ ہی جلاتے تھے اور شاید اُن سے زیادہ ادنےٰ قسم کے۔

چراغ کے بعد شمع آئی، لیکن اس کی ابتدا بھی عربوں نے کی تھی۔ عرب سے یہ فینیسا (وینس) میں آئی اور پھر آٹھویں صدی تک تمام یورپ میں پھیل گئی، لیکن اس کا استعمال صرف امراء کے یہاں ہوتا تھا یا خاص خاص تقریبوں میں۔ دیواروں پر، سڑکوں کے دونوں طرف، دروازوں اور کوٹھوں پر شمعدانوں میں شمعیں روشن کر دیجاتی تھیں اور اس طرح مسرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔

اس کے بعد چودھویں صدی میں فانوس کا رواج شروع ہوا، اور یہ بھی وینس یا فینیسیا سے آیا (فانوس ماخوذ ہے فینیسا سے)

وینِس والے مذہبی تقریبوں اور خوشی کے مواقع پر گھروں کے اندر اور کشتیوں پر سیر کے وقت فانوس ہی روشن کرتے تھے ......

...... یہ فانوس کاغذ کے نہ ہوتے تھے بلکہ مختلف رنگ کے باریک ریشمی کپڑوں سے طیار کئے جاتے تھے اور ان پر پھولوں اور چڑیوں کی تصویریں منقوش ہوتی تھیں۔ یہاں کے بعض ملاح چین گئے تھے، اور وہاں سے واپس آکر انھوں نے اس نقاشی کو رواج دیا۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں پیرس کے حکام تمام تقریبوں میں چراغاں کا خاص اہتمام کرتے تھے اور پبلک کو بھی حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے گھروں کی دیواروں اور دروازوں پر چراغاں کریں لیکن اس پابندی کے ساتھ کہ دھواں اور آواز پیدا نہو اس قسم کے چراغاں کا رواج انیسویں صدی کی ابتدا تک قایم رہا۔ لیکن اس کے بعد جب گیس ایجاد ہوئی تو سنہ ۱۸۲۲ء میں سب سے پہلی مرتبہ پیرس کے شاہی محل میں گیس روشن کی گئی اور پھر اس کا رواج عام ہوگیا۔

گیس کے بعد بجلی آئی اور اس نے رات کو دن بنا دیا۔ اس سلسلہ میں دولٹا کا بیٹری ایجاد کرنا اور ہمفری کا کہربائی شرارے پیدا کرنا، خاص ایجادیں تھیں جنھوں نے بجلی کی روشنی کو عام کرنے میں بڑی مدد پہونچائی۔

اب بجلی کے ذریعہ سے جس جس طرح روشنی کی جاتی ہے، اور جو جو جدتیں اس میں پیدا کی گئی ہیں اُن کے اظہار کی ضرورت نہیں لیکن سب سے زیادہ قوی مظاہرہ سرچ لائٹ (کشافہ) کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ رات کو دن سے زیادہ روشن بنا دیتی ہے۔

نمایشوں میں جس جس طریقے سے روشنیوں کی نمایش کی جاتی ہے، اُن میں ہندسی شکلیں بھی پیدا کی جاتی ہیں اور پانی کے فواروں کے ساتھ بجلی کی روشنی کا امتزاج تو حقیقتاً بالکل فردوسی چیز ہے۔

روشنی کا مستقبل ابھی اور بہت سے امکانات اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اب سے ایک صدی بعد کی روشنی کیا چیز ہوگی۔

نیرنجات کا بادشاہ

ہوڈنی

(مسلسل)

پچھلے مہینے ہم نے بتایا تھا کہ ہوڈنی ایک مقفل بائیلر کے اندر سے باہر نکل آیا حالانکہ وہ بدستور مقفل تھا۔ اس میں وہ کیونکر کامیاب ہوا؟ اس کا تعلق بھی کسی روحانی طاقت سے نہیں بلکہ ہوشیاری و تدبیر سے تھا۔

یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ ہوڈنی کے نقشہ کے مطابق ہی بائیلر طیار کیا گیا تھا اور تماشہ سے ۲۴ گھنٹے پہلے اس کے پاس بھیجدیا گیا تھا۔ بائیلر بنانے والے کو چونکہ اس کی مضبوطی پر یقین تھا اس لئے اس نے بائیلر ہوڈنی کے پاس بھیجدیا تھا ہوڈنی نے یہ کیا کہ اندر کی دو سلاخوں کو جن کے ذریعہ سے بائیلر کا ڈھکنا بند ہوتا تھا بدلدیا یعنی صورت تو اس نے وہی رکھی لیکن لوہا بہت نرم استعمال کیا۔

جب کمیٹی کے لوگوں نے تماشہ کے وقت بائیلر اور سلاخوں کو دیکھا تو بظاہر کوئی فرق نہ تھا، اسلئے انھیں یہ شک گزر ہی نہ سکتا تھا کہ سلاخیں بدلدی گئی ہیں۔ جب ہوڈنی بائیلر کے اندر بند ہوا تو اس نے ایک ریتی سے جو اس کے پاس چھپی ہوئی تھی ان سلاخوں کو ریتنا شروع کیا۔ ریتنے کی آواز پبلک تک اس لئے نہ پہونچ سکتی تھی کہ بینڈ پورے زور کے ساتھ بج رہا تھا۔ چونکہ لوہا بہت نرم تھا اس لئے آسانی سے کٹ گیا اور اس طرح ہوڈنی باہر نکل آیا، لیکن باہر آنے کے بعد اس نے پھر اصلی سلاخیں لگادیں اور ریتی ہوئی سلاخوں کو بانس کے خول کے اندر جن پر اس کا خیمہ تنا ہوا تھا چھپادیا۔

(۳) تیسرا واقعہ جس نے لوگوں کو بہت زیادہ حیرت میں ڈالدیا یہ تھا کہ وہ ایک کاغذ کے تھیلے سے باہر آگیا اور تھیلا بدستور جوں کا توں بند رہا۔

ایک تھیلا بڑے لفافہ کی شکل کا طیار کیا گیا جس کے اوپر کے حصہ میں گوند لگی ہوئی تھی اور وہ لفافہ پر چپکایا جا سکتا تھا چنانچہ جب ہوڈنی اس کاغذی تھیلے کے اندر داخل ہوا تو لفافہ چپکا دیا گیا اور جوڑ کی جگہ پر کمیٹی والوں نے دستخط کردئے۔ اس کے بعد اس کے چاروں طرف پردہ کھینچدیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہوڈنی پردہ کھول کر باہر آگیا اسی حال میں کہ تھیلا اس کے ہاتھ میں اسی طرح بند تھا اور لوگوں کے دستخط موجود تھے۔

اس عمل کے لئے اسے زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑی۔ جب وہ تھیلے کے اندر بند ہوا تو اس نے استرے کا پھل لیکر چاروں طرف سے اسے کاٹ دیا اور باہر آکر اسے پھر گوند سے چپکا دیا۔ اس طرح یہ تو ضرور ہوا کہ لفافہ دو انچ چھوٹا ہوگیا لیکن یہ

ایسی بات نہ تھی کہ لوگ اسے محسوس کرتے، کیونکہ لفافہ پہلے بھی ناپا گیا تھا۔
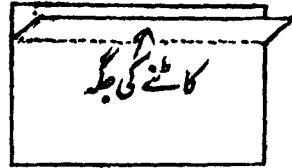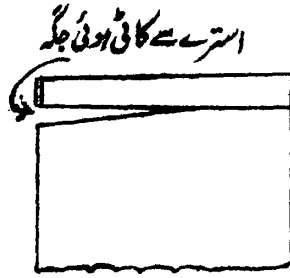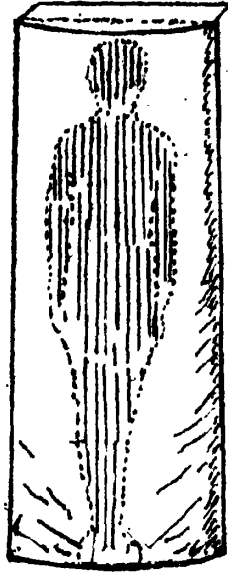
اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ تھا کہ وہ امریکہ میں ڈاک کے تھیلے سے باہر نکل آیا۔ اس واقعہ نے وہاں کے علمی حلقوں میں ہلچل پیدا کر دی اور بہت سے پروفیسروں نے اپنے اپنے گھروں پر ہر طرح کوشش کی کہ ڈاک کے تھیلے سے نکل آئیں لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ ہوڈنی اس میں کس طرح کامیاب ہوا، اس کے سمجھنے کے لئے پہلے تھیلے کی شکل ملاحظہ کیجئے:
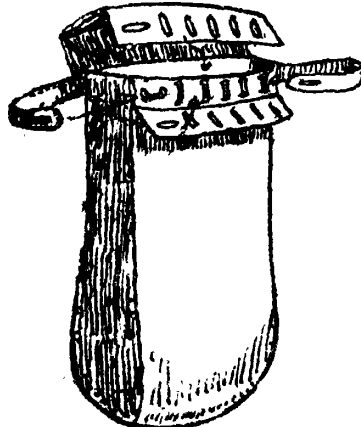
ڈاک کا تھیلہ کھلا ہوا　　ڈاک کا تھیلہ بند

ہوڈنی کو پہلے سے معلوم تھا کہ ڈاک کے تھیلوں میں کس قسم کے قفل استعمال ہوتے ہیں اور ایک کنجی وہ اسکی حاصل کر چکا تھا۔ جسوقت وہ تھیلے میں بند ہوا تو کنجی اس کے پاس چھپی ہوئی تھی۔ اس نے ڈھکنے کے نیچے سے کنجی کو باہر نکالا اور قفل کھول لیا۔ کنجی کا قفل تک

پہونچنا اور اس کو گھمانا بیشک مشکل کا کام تھا، لیکن ہوڈنی ان ترکیبوں کا ماہر تھا اور چونکہ تھیلا کرمچ کا تھا اس لئے کھینچ کھانچ کر اس نے کنجی کو قفل تک پہونچا ہی دیا اور جب باہر نکل آیا تو پھر قفل لگا دیا۔

(۵) ہوڈنی کا سب سے بڑا کارنامہ وہ سمجھا جاتا تھا جب وہ زمین کے اندر دفن کر دیا گیا اور زندہ رہا۔ زمین میں ایک گڑھا چھ فٹ گہرا کھودا گیا اور ہوڈنی کا تابوت اس کے اندر اُتار کر مٹی ڈالدی گئی۔ یہ تماشہ دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ ہر طبقہ کے موجود تھے اور بے چینی سے گھڑی دیکھ رہے تھے، کیونکہ ۵۰ منٹ کے بعد تابوت کو اندر سے نکالنا تھا۔

جب مقررہ وقت ختم ہوا تو گڑھا کھود کر تابوت باہر نکالا گیا جس کے اندر ہوڈنی صحیح و سلامت موجود تھا۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ وہ اپنے ساتھ آکسیجن گیس لے گیا تھا، بعض نے یہ کہا کہ وہ تابوت کے اندر تھا ہی نہیں، لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہوڈنی نے سانس بڑھانے کی اتنی مشق کر لی تھی کہ وہ آسانی سے ایک گھنٹے تک ایک جگہ بند رہ سکتا تھا ہوڈنی نے تابوت میں بند ہو کر، بہت چھوٹی چھوٹی سانسیں لینا شروع کیں تاکہ آکسیجن کی مقدار جو تابوت کے اندر موجود ہے جلد ختم نہ ہو جائے

(۶) ایک مرتبہ ہاتھوں میں ہتکڑی ڈلال کر وہ لکڑی کے بکس میں بند ہوا اور کرین کے ذریعہ سے اس بکس کو پانی کے اندر ڈالدیا گیا بکس کے پیندے میں سوراخ بھی کر دیا گیا تاکہ پانی اندر بھر جائے، لیکن ہوڈنی پھر بھی زندہ باہر نکل آیا۔ ہوڈنی کے اس عمل پر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی۔ لیکن اس کی کامیابی کا راز صرف یہ تھا کہ ہتکڑی خود اسی کی بنائی ہوئی تھی جو ایک کمانی دبانے سے از خود کھُل جاتی تھی اور اُس کے پاس کیل کاٹنے کا اوزار چھپا ہوا تھا۔ جب بکس پانی کے اندر ڈالا گیا تو اس نے فوراً ہتکڑی کھولی اور پھر اندر ہی اندر اُس اوزار سے کیلیں کاٹیں اور بیچ کا تختہ اُبھار کر باہر نکل آیا اور تختہ کو پھر اس کی جگہ پر رکھکر دبا دیا۔ ہوڈنی چونکہ تیرنے میں بھی بڑا مشاق تھا اس لئے وہ یہ تمام کام اندر ہی اندر آسانی سے کر سکا۔

(۷) ایکبار ہوڈنی نے یہ تماشہ دکھایا کہ وہ ایک سپید لباس میں ایک گھوڑے پر سوار اسٹیج پر آیا۔ اسکے ساتھیوں نے ایک بڑے پنکھے سے اس کی آڑ کر دی لیکن چند سکنڈ کے بعد جب پنکھا ہٹایا گیا تو ہوڈنی غائب تھا۔

اس کا راز صرف یہ تھا کہ ہوڈنی کا سپید لباس کاغذ کا بنا ہوا تھا اور نیچے وہی لباس تھا جو اسٹیج پر دوسرے کام کرنے والوں کا تھا۔ جب پنکھے کی آڑ کی گئی تو اس نے کاغذ کا لباس پھاڑ ڈالا اور اسٹیج کے دوسرے آدمیوں کے گروہ میں ملگیا۔ چونکہ یہ آدمی متعدد تھے اور ان کا شمار کیا نہ گیا تھا اس لئے ایک آدمی کے بڑھنے کا پتہ نہ چل سکا۔

ایک مرتبہ اس نے یہ تماشہ دکھایا کہ بہت سے سوئیاں اور تاگے کے ٹکڑے منہ میں رکھے اور جب اُن کو منھ سے نکالا تو سب سوئیوں میں تاگہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی اصلیت بھی سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ تاگہ پڑی ہوئی کُھل سوئیاں وہ پہلے ہی سے اپنے منھ میں چھپائے ہوئے تھا۔

(باقی)

دار المصنفین کا تازہ کارنامہ

ہندوستان کی تاریخ

نصف صفحہ میں سات غلطیاں

اعظم گڑھ دار المصنفین نے حال میں ایک کتاب "مختصر تاریخ ہند" کے نام سے شائع کی ہے جو سلسلہ دار المصنفین کی اونچا سد یں کڑی ہے اس کے مولف مولانا سید ابوالظفر صاحب ندوی رفیق دار المصنفین ہیں، اس کے دیباچہ میں مولانا سید سلیمان تحریر فرماتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ یہ کتاب ملک میں قبول کی نظر سے دیکھی گئی اور حوصلہ سے بڑھکر قدر کی گئی، سرکار بہار نے اسکو اپنے سرکاری مدرسوں میں جاری کیا۔ یو۔پی کے محکمۂ تعلیم نے اس کے پانچسو نسخے اپنی لائبریریوں کے واسطے خرید کئے۔ میسور کی حکومت نے بھی اپنی لائبریریوں کے لئے منظور کیا قومی مدرسوں میں بھی یہ داخل نصاب کی گئی"۔

اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع میں ایک اچھی کتاب کا درجہ رکھتی ہوگی مگر مطالعہ کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ کیا اتنی غلط کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے اور دُنیا اُس کی یوں قدر کر سکتی ہے۔ دو سو صفحے کی کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے وقت چاہیئے لہذا نصف صفحہ کی غلطیاں پیش کی جاتی ہیں۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

پہلی غلطی: صفحہ ۱۹۹ پر ارشاد ہوتا ہے:-

"دلی کی سلطنت کی طرف سے برہان الملک سعادت خاں اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا کچھ دنوں کے بعد یہ خود مختار ہوگیا"

یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کا ارتکاب اسی شخص سے ہو سکتا ہے جو اِدھر اُدھر کی سنی سنائی باتوں سے کتاب لکھنے بیٹھ جائے اور تاریخ کی کتابوں کو ہاتھ نہ لگائے اگرچہ کام بڑی جرأت کا ہے مگر کرنے والے کیا کچھ نہیں کر ڈالتے۔

سعادت خاں برہان الملک ایک ایسا شخص ہے جس نے ابتدائے عروج سے آخر زندگی تک شہنشاہ دہلی کی رفاقت و اطاعت کی سعادت خاں کے انتقال کے بعد بھی اودھ کا فرمانروا حکومت دہلی کی طرف سے مقرر کیا گیا۔ سعادت خاں کی زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے اُن کی وفاداری اور اطاعت گزاری کا حال معلوم ہوجانا کوئی دشوار نہیں۔

ان کا اصلی نام محمد امین ہے باپ کا نام محمد نصیر سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے۔ نیشاپور وطن ہے انکے باپ اور بھائی ۱۱۲۵ھ میں ہندوستان آئے اور پٹنہ عظیم آباد میں سکونت اختیار کی دو برس کے بعد محمد امین بھی اپنے وطن

نیشاپور سے ہندوستان آئے تو معلوم ہوا کہ باپ سفرِ آخرت اختیار کر چکا دونوں بھائی دہلی پہونچے قسمت کا ستارہ بلندی پر تھا
پہونچتے ہی شاہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا یہ کام اس خوبی سے انجام دیا کہ شہرت ہوگئی اور یہ لوگوں کی نظر میں ہوشیار اور کارگزار
آدمی سمجھے جانے لگے، دربار سے سعادت خاں خطاب ملا اور امرائے دربار میں گنے جانے لگے اُسی زمانہ میں اکبر آباد کے صوبہ دار
کی بیٹی سے نکاح ہوگیا اب اعلیٰ طبقہ کے امرا میں شمار کئے جانے لگے، اُن کی فطری سنجیدگی اور کارکردگی سے اہم اُمور کی انجام دہی
کی امید کی جاتی تھی اس زمانہ میں سادات بارہہ کا بڑا زور تھا، حسین علی خاں کے قتل کے بعد اُن کے بھتیجے عزت خاں کی سرکردگی
میں سادات بارہہ نے ایک بہت بڑا لشکر ترتیب دیکے یورش کی اسوقت سعادت خاں ہی وہ شخص تھا جس پر قرعہ انتخاب پڑا اور
اُس نے پانچہزار سواروں کے ساتھ اُن کی کثیر جماعت کا مقابلہ کیا ایسی شکست دی کہ ہمیشہ کے لئے اُن کا زور ختم ہوگیا اور پھر وہ
سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے، سعادت خاں دربار سے ہفت ہزاری منصب اور سات ہزار سواروں کی سرداری کے ساتھ
برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا اور اکبر آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔

اودھ کا صوبہ ایک مدت سے سرکش صوبہ تھا ہمیشہ اس کا نظام درہم و برہم رہا کرتا تھا جو صوبہ دار مقرر ہوتا تھا وہ
برائے نام رہتا تھا، شیخ زادگان لکھنؤ سخت شورہ پشت تھے کسی کا دباؤ نہ کھاتے تھے۔ برہان الملک کی کارروائی اور کارپردازی پر
نظر کر کے انھیں اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا اور اُس کے ساتھ ہی شاہی توپ خانہ کی داروغگی عطا ہوئی صوبہ کا انتظام انھوں نے
اس بیدار مغزی سے کیا اور شیخ زادگان لکھنؤ کو اس حکمت عملی سے زیر کیا کہ بڑے بڑے تجربہ کار حیران ہوگئے اور توپ خانہ کو
ہاتھ میں لیکے ایسی قوت پیدا کی کہ اُس زمانہ میں سارے ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ تھی اس توپ خانہ کی آتش فشانی
نے انھیں عوام میں بھڑ بھونجا مشہور کر دیا تھا بے شک اس زمانہ میں سعادت خاں سپاہیانہ قوت میں شہنشاہ دہلی پر فوقیت
رکھتے تھے لیکن اپنے کو بدستور خدمت گزار سمجھتے رہے، چنانچہ اس زمانہ میں کوڑہ کے تعلقدار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے منھ موڑ کر
بڑا زور باندھ رکھا تھا جو افسر اُس کے سر کچلنے کو بھیجا جاتا تھا وہ مارا جاتا تھا آخر برہان الملک اس مہم پر مامور
ہوئے وہ یلغار کرتے ہوئے پہونچے بھگونت سنگھ یا بلونت سنگھ سورما راجپوتوں کو لئے ہوئے نکلا اور اس بے جگری سے آکے گرا
کہ بڑے بڑوں کے حواس جاتے رہے لڑائی کا رنگ بگڑ گیا راجپوتوں نے سعادت خاں کو گھیر لیا مگر اس نے بھی ایسی بہادری سے
تلوار چلائی کہ دشمنوں کے منھ پھیر دئے بلونت سنگھ جو بڑھ بڑھ کے حملے کر رہا تھا برہان الملک کے ہاتھ سے مارا گیا اُس کی فوج میدان
چھوڑ کے بھاگی اور برہان الملک مظفر و منصور واپس ہوا۔

اس زمانہ میں مرہٹوں نے بہت قوت پکڑ لی تھی، انھوں نے اپنے لئے چوتھ مقرر کی تھی اور حکمرانوں سے بزور وصول کرتے تھے
گویا وہ ایک طرح کا خراج لیا کرتے تھے اسی چوتھ وصول کرنے کے لئے باجی راؤ جو بالاجی بشوناتھ راؤ کا لڑکا تھا ساٹھ ہزار سوار
لیکر عین اسوقت جبکہ دہلی کو کالکا کے میلے نے دلہن بنا رکھا تھا اُس پر ٹوٹ پڑا اور قتل و غارت کی آندھی بن کر ہر طرف چھا گیا
ناچار بادشاہ نے اُس کے مطالبوں کو پورا کیا اور وہ لوٹتا مارتا واپس ہوا۔ برہان الملک یہ خبر سنتے ہی آندھی کی طرح اُٹھا اور مرہٹوں
کا راستہ روک کے پہاڑ کی طرح ڈٹ گیا مرہٹوں نے بھی قیامت کی تلوار چلائی مگر نتیجہ میں شکست کھائی اور میدان چھوڑ کے بھاگے۔
برہان الملک ایک مدبر جنگ آزما تھا وہ اس گُر سے واقف تھا کہ وقتی فتح پر خوش ہو کے حریف سے بے خبر نہ ہونا چاہئے لہذا اُس نے
مرہٹوں کا تعاقب شروع کر دیا۔

اِدھر امرائے دربار اس کارگزاری پر حسد کے انگاروں پر لوٹ رہے تھے آخر امیر الامرا خان دوران خاں نے جو دربار میں اہل حل وعقد کا سرگروہ و پیشوا تھا یہ فقرہ برمحل سوچا کہ باجی راؤ اور بادشاہ سے جو معاملت ہوئی ہے وہ بطور مصالحت ہوئی ہے اب اس پر حملہ شاہی رکھ رکھاؤ کے خلاف اور باعث بدنامی ہے، برہان الملک کا بغیر ایمائے شاہی باجی راؤ پر حملہ کرنا اور شاہی معاملت کا احترام نہ کرنا انتہائی جسارت ہے۔ سادہ لوح بادشاہ جس کو اپنے نفع نقصان کی پہچان نہ تھی اس فقرہ میں آگیا ایک عتاب آمیز شقہ روانہ کیا گیا جس میں اظہار ناراضی کے ساتھ تعاقب موقوف کرکے اپنے صوبہ پر واپس جانے کی تہدید تھی۔ برہان الملک جو اپنی کارگزاریوں اور جاں نثاریوں پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور دربار سے بڑی امیدیں باندھے بیٹھا تھا یہ شقہ دیکھتے ہی ہکا بکا ہو گیا۔ لیکن نہایت ہوشیاری سے تین شرطوں پر مرہٹوں کو امان دینے کا اعلان کیا:

(۱) مرہٹے اودھ سے کبھی چوتھ کا مطالبہ نہ کریں۔

(۲) برہان الملک کو کوئی مہم پیش آئے تو اُن کی مدد کریں۔

(۳) بغیر اُن کی اجازت کے کبھی دکن سے ادھر آنے کا رُخ نہ کریں۔

مرہٹے جو اپنی جان سے عاجز آرہے تھے اتنا سہارا بہت سمجھے اور یہ شرطیں منظور کرکے صلح کرلی اور برہان الملک اپنے صوبہ پر واپس آ گئے۔

اس واقعہ کے غالباً تین سال کے بعد نادر شاہ درانی نے ہندوستان پر حملہ کیا جب اُس کا لشکر اٹک پار اُتر آیا تو ادھر کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں دکن سے آصف جاہ اودھ سے برہان الملک طلب ہوئے باوجودیکہ برہان الملک کے پاؤں میں گاگا نکلا ہوا تھا جو نہایت اذیت چیز ہے مگر وقت کی ضرورت اور موقع کی نزاکت پر نظر کرکے فوراً کوچ بولدیا جس دن وہ شاہی لشکر میں داخل ہوا اُس روز نادر شاہ بھی سامنے پہونچ گیا تھا سب سے پہلی ٹکر اُس سے برہان الملک ہی سے ہوئی اور اُسی زمانہ میں جبکہ نادر شاہ دہلی میں مقیم تھا برہان الملک نے تپ محرقہ میں انتقال کیا۔

میں نے برہان الملک کی زندگی کا ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کردیا اس میں کہیں خودسری کا رنگ نہیں جھلکتا نہیں معلوم مولف نے کہاں سے اس رازِ سربستہ کا پتہ لگایا۔

دوسری غلطی:- فرماتے ہیں:

"برہان الملک کے بعد اس کا لڑکا شجاع الدولہ نے حکومت کی باگ سنبھالی"

یہ غلطی پہلی غلطی سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ اس غلطی کے دو جزو ہیں:

(الف) برہان الملک کے بعد شجاع الدولہ حکمراں ہوئے۔

(ب) شجاع الدولہ برہان الملک کے بیٹے تھے

یہ دونوں جزو غلط ہیں نہ برہان الملک کے بعد شجاع الدولہ حکمراں ہوئے نہ شجاع الدولہ برہان الملک کے بیٹے تھے۔ برہان الملک کے کوئی لڑکا نہ تھا اس وجہ سے اُن کے بھانجے اور داماد مرزا مقیم ابوالمنصور صفدر جنگ حکمراں ہوئے جو منصور علی خاں صفدر جنگ کے نام سے مشہور ہیں اُن کے بیٹے شجاع الدولہ تھے ــــ عبارت کی یہ ترکیب بھی قابل لحاظ ہے:-

"اس کا لڑکا" "ـــ نے"

تیسری غلطی: ارشاد ہوتا ہے:-

"اس کی (آصف الدولہ) وفات پر اُس کا بھائی نواب سعادت علی خاں اس کی جگہ نواب ہوا۔ اس نے روپیہ سے انگریزوں کی بڑی مدد کی"

اس غلطی کے بھی دو جزو ہیں:-

(الف) آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں اُن کے قایم مقام ہوئے۔

(ب) سعادت علی خاں نے روپیہ سے انگریزوں کی بڑی مدد کی۔

آصف الدولہ کے بعد اُن کے متبنیٰ مرزا وزیر علی خاں اودھ کے فرماں روا ہوئے اُن کی بے عنوانیوں سے ارکان سلطنت نے جن میں آصف الدولہ بہادر کی ماں بھی شریک تھیں انگریزوں سے سازکر کے اُن کو معزول کر دیا اُن کے بعد سعادت علی خاں متمکن ہوئے یہ بہت کنجوس آدمی تھے نقد روپیہ بھلا ان سے کوئی کیا لے سکتا تھا ہاں ان کے بیٹے غازی الدین حیدر نے اپنے زمانہ میں انگریزوں کو بہت روپیہ دیا۔

چوتھی غلطی: کہتے ہیں:-

"اُس (نصیر الدین حیدر) نے انگریزوں کے اشارے سے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا"

واقعہ یہ ہے کہ نصیر الدین حیدر کے باپ غازی الدین حیدر نے انگریزوں کے اشارے سے اپنی شاہی کا اعلان کیا جس کو مصنف نے بیٹے کی طرف منسوب کیا یہ غلطیاں صاف بتاتی ہیں کہ مصنف نے اودھ کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی نہیں کیا۔

پانچویں غلطی: فرماتے ہیں:-

"اس کے بعد اس کا (نصیر الدین حیدر کا) لڑکا امجد علی شاہ سلطنت کا مالک ہوا"

نصیر الدین حیدر کے بعد اُن کی بیوی نے فریدوں بخت مرزا مناجان کو تخت پر بٹھانا چاہا مگر نصیر الدین حیدر مناجان کے شاہی نسل سے ہونے کے منکر تھے اس وجہ سے رزیڈنٹ نے نصیر الدین حیدر کے چچا سعادت علی خاں کے بیٹے نواب نصیر الدولہ محمد خاں کو تخت پر بٹھانا چاہا بادشاہ بیگم مناجان کے لئے مصر تھیں اُن کی زبردستی سے جنگ کی نوبت آئی اس طرف کیا تھا معمولی سی جنگ کا بھی تحمل نہ ہو سکا، مناجان تخت چھوڑ کے بھاگے جو گرفتار کر کے قلعۂ چنار بھیجدئے گئے اور نصیر الدولہ محمد علی خاں اب ترسٹھ برس کی عمر میں معین الدین سلطان الزماں نوشیرواں محمد علی شاہ ہوئے انھیں محمد علی شاہ کے بیٹے امجد علی شاہ تھے جن کو مصنف نے نصیر الدین حیدر کا بیٹا بنایا۔

چھٹی اور ساتویں غلطی: لکھتے ہیں:-

"اب اس کے (امجد علی شاہ کے) لڑکے محمد علی اور پھر اُس کے لڑکے واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے"

محمد علی شاہ امجد علی شاہ کے بیٹے نہ تھے بلکہ باپ تھے، نہ واجد علی شاہ محمد علی شاہ کے بیٹے تھے بلکہ پوتے تھے۔ اور اس ترتیب سے بادشاہت منتقل ہوتی رہی یعنی محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اُن کے بعد واجد علی شاہ ہوئے۔

یہ ہے دار المصنفین کی تاریخ دانی کا حیرت انگیز کارنامہ جس پر یو۔ پی گورنمنٹ نیز حکومت بھوپال و میسور نے قدر دانی کے پھول برسائے ہیں۔

محمد باقر شمس

باب الاستفسار

مُردوں کا جَلانا

(جناب مرزا عبدالغنی صاحب - سارن)

مسیح کی تعلیمات میں مُردوں کے جَلانے کا حکم نہیں ہے، لیکن اب سُنا ہے کہ یورپ میں مُردے عام طور پر جلائے جاتے ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس کی ابتداء وہاں کب سے ہوئی ؟

(**نگار**) مُردوں کو جَلا کر اُن کی خاک کو محفوظ رکھنا قدیم زمانہ میں تقریباً ہر جگہ رائج تھا، لیکن بعد کو اسے ترک کر دیا گیا، یہاں تک کہ قرون وسطیٰ میں سوائے ہندوستان کے یہ رواج ہر جگہ سے اُٹھ گیا۔ یورپ والے اس سے بالکل آشنا نہ تھے لیکن انیسویں صدی میں یہاں بھی اس کا آغاز ہوا اور سب سے پہلے ۱۸۷۴ء میں جرمنی کے شہر برسلاؤ میں فنی حیثیت سے ایک بھٹی مُردوں کے جلانے کے لئے قایم ہوئی۔ اس کے دو سال بعد ۱۸۷۶ء میں اٹلی کے شہر میلان کے ایک امیر بیرن کللر کی لاش اس کی وصیت کے مطابق بھٹی میں جلائی گئی۔ اس نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ اس کے ترکہ سے شہر میلان میں ایک باقاعدہ بھٹی اس غرض کے لئے طیار کی جائے۔ اس کے بعد یہ رواج نہایت تیزی کے ساتھ یوروپ میں پھیلنے لگا۔ ان لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق اس کے فواید بتانا شروع کئے جن میں ایک فایدہ یہ بھی بتایا گیا کہ جلانے سے مُردہ کے تمام جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں اور انھیں فضا میں منتشر ہو کر دوسروں کو بیمار ڈالنے کا موقع نہیں ملتا۔

اس تحریک کے مخالف کہتے تھے کہ جلانے سے قانون و عدالت کو نقصان پہونچتا ہے۔ کیونکہ دفن کرنے کے بعد تو لاش کی جانچ کر کے موت یا قتل کی وجہ دریافت کی جا سکتی ہے، لیکن جلا دینے کے بعد اس کا امکان باقی نہیں رہتا۔

چونکہ اس تحریک کی مخالف بڑی جماعت تھی اور کلیسہ کی طرف سے بھی اس کی سخت مخالفت کی گئی، اس لئے حکومت نے اسکو قانوناً ناجایز قرار دیا۔ فرانس میں تو البتہ اس رواج کو جاری رکھا گیا، لیکن ایک قانون یہ بنا دیا گیا کہ جلانے سے قبل دو ڈاکٹر اچھی طرح لاش کا معاینہ کریں۔ ایک ڈاکٹر حکومت کا، دوسرا وہ جو مرنے والے کا معالج تھا۔

مذہبی حیثیت سے اسلام اور کیتھولک مسیحیت دونوں کے نزدیک یہ طریقہ ناجائز ہے لیکن پروٹسٹنٹ جماعت اس کو نہ صرف جایز بلکہ زیادہ مناسب جانتی ہے، یہودیوں میں مخالف و موافق دونوں پائے جاتے ہیں۔

ابھی تک تمام یوروپ میں یہ رواج نہیں پھیلا، چنانچہ ہالینڈ، بلجیم، اسپین، آسٹریا اور پروشیا میں اس کی ممانعت ہے

لیکن اور بہت جگہ یہ رائج بھی ہے -
فرانس میں سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں ایک بھٹی اس غرض سے طیار کی گئی اور ۴۹ لاشیں اس سال جلائی گئیں - آیندہ ۲۰ سال میں یہ تعداد ۱۴۰۰ ہو گئی اٹلی میں اسوقت ۴۰ بھٹیاں بڑے بڑے شہروں میں قایم ہیں - انگلستان میں بیس بھٹیاں ہیں اور سنہ ۱۹۰۹ء میں ۸۸۵ لاشیں ان میں جلائی گئیں، لیکن اب تعداد بہت بڑھتی جاتی ہے -
جرمنی کے بعض حصوں میں اس کا رواج نہ تھا اور بعض میں تھا، چنانچہ یہاں ۲۵ بھٹیاں ہیں جنمیں سالانہ ہزاروں لاشیں جلائی جاتی ہیں - سوئٹزرلینڈ میں بھی آٹھ بھٹیاں پائی جاتی ہیں، اور سویڈن، ناروے، ڈنمارک میں دو دو -
شمالی امریکہ میں ان کی تعداد ۳۵ ہے، اور جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، چین و جاپان میں بھی ایسی بھٹیاں موجود ہیں -
یہ بھٹیاں عموماً دو قسم کی ہوتی ہیں - ایک گیس سے گرم ہونے والی - دوسری پتھر کے کوئلہ سے -
لاش کو ایک آہنی تختہ پر لٹا کر بھٹی میں رکھدیا جاتا ہے اور بھٹی کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے - اس کے بعد ہوا پہونچا کر بھٹی کی آگ کو تیز کیا جاتا ہے - چنانچہ ایک گھنٹے کے اندر لاش بالکل راکھ ہو جاتی ہے اور یہ راکھ ایک شیشے میں بند کرکے وارثوں کو دیدیجاتی ہے -
اب بجائے گیس یا کوئلوں کے زیادہ تر بجلی کی بھٹیوں سے کام لیا جانے لگا ہے اور چند منٹ کے اندر لاش راکھ بن جاتی ہو

ایک سرمایہ دار کی ریاضی

مزدور روزانہ ۸ گھنٹے سوتا ہے یعنی سال میں	۱۲۲	دن
روزانہ ۸ گھنٹے آرام کرتا ہے یعنی سال میں	۱۲۲	دن
ہفتہ میں ایک دن اتوار کو کام نہیں کرتا یعنی سال میں	۵۲	دن
سنیچر کو بعد دوپہر کام نہیں کرتا یعنی سال میں	۲۶	دن
بیماری وغیرہ میں کام نہ کرنے کا اوسط سال میں	۲۸	دن
سال میں دو ہفتے کی چھٹی یعنی	۱۴	دن
میزان	۳۶۴	دن

گویا سال کے ۳۶۵ دنوں میں وہ ۳۶۴ دن کام نہیں کرتا اور صرف ایک دن کام کرتا ہے -
حیرت ہے کہ اب بھی مزدوروں کو سرمایہ دار کی طرف سے ظلم کی شکایت ہو !

مطبوعات موصولہ

عجائب زار منطق لکھنوی

آپ نے فطرت کے کھلنڈرے پن کی بہت سی مثالیں دیکھی ہوں گی، لیکن دماغ انسانی کے ساتھ اس کا کھلنڈرا پن بہت پُرلطف ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس کی کوئی نہایت دلچسپ مثال دیکھنا ہو تو منطق لکھنوی کا یہ دیوان مطالعہ کیجئے۔ منطق صاحب ایک قدیم کایستھ خاندان کے فرد ہیں اور نظم و نثر دونوں میں کمال رکھتے ہیں۔ انکی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی ہے، لیکن دماغ و قلم کی شوخی سے ابھی تک شباب ٹپکتا ہے۔ انکے دیوان کا تعارُف خود اُنھیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو

"چند سطر پُر اثر، متعلق غزل عشق و معرفت عل بہ دلایل مکمل و مدلل و مفصل میرا اسلوب بیان عارفانہ و عاشقانہ بصورت حسن مجازی معشوقانہ بخلاف شعراء زمانہ نیا رنگ جداگانہ پیدا کرتا ہے"

ظاہر ہے کہ اس تعارُف کے بعد کسی اور تنقید و تبصرہ کی ضرورت نہیں، لیکن آپ کو ایک بڑے لطف سے محروم رکھوں گا، اگر اُن کے بعض اشعار سُنائے بغیر اس ذکر کو ختم کر دوں:

وہ زلف پریشاں فی اللہ فنا ہے گا   دیوانہ عجب شان سے دیوانہ بنا ہے گا
جوبن ہیں المست، بجُا دست، بغل بست   دے کھول وہ گلگشت مزہ جس میں سنا ہے گا
یک دانہ چنا جم کے وہ انبار ہوا تھم کے   سچ کہئے میاں، ہم سے یہ نہیں وہی چنا ہے گا
جب لمپ جلے نیچ جُھکے نور سمٹ بیٹھے،   اوپر کو چلے نیچ تو کیا نور تنا ہے گا
کلمہ قرآن تیرے ہر عضو میں لکھا ہے   آؤں نماز کو میں، تو جانماز ہو جا
تنزیب پھوڑ سُرخی، جوبن نے چھاپ مارا   اے چھاپ دل میں منطق نقش و طراز ہو جا
دل مکدر کا مسیحا تو ہی تھا   پاس تیرے دل کا کیا مُسہل نہ تھا

سارا دیوان انھیں لطائف سے بھرا پڑا ہے۔

اگر آپ واقعی اپنا غم غلط کرنا چاہتے ہیں تو ۵ر کے ٹکٹ بھیجکر اس کی ایک کاپی دفتر نگار سے طلب کر لیجئے۔

نقش ناتمام

جناب سحر رام پوری کی چند نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب سحر آجکل کے خوش فکر نوجوانوں میں سے ہیں اور نظم و غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

کس کو قبول عرض محبت کی تلخیاں   کس کو غرض کہ دل کو مجالِ قرار دے
کیوں تکلف آپ کو کچھ مجھ سے فرمانے میں ہو   ایک فقرہ کی کمی مدت سے افسانے میں ہے
اعتبار یا حُسنِ اعتبار، کیا کہئے   وہ اُدھر بھُلاتے ہیں دل اِدھر بہلتا ہے
جگمگا چلے تارے، گنگنا اُٹھے دھارے   مضطراب مگر ابتک کروٹیں بدلتا ہے

انتشار کی دنیا، انتظار کا عالم پھول جب مہکتے ہیں، چاند جب نکلتا ہے،

اس میں شک نہیں کہ جناب سحر کے کلام میں ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی اور کہیں کہیں مصرعے غیر مربوط ہو جاتے ہیں، لیکن جس حد تک احساس و اہلیت کا تعلق ہے، وہ یقیناً فطری شاعر ہیں اور ان کا مستقبل بہت امید افزا ہے۔ خدا کرے ان کے احباب یہ زعم ان میں پیدا نہ کردیں کہ جو کچھ انھیں ہونا تھا وہ ہو چکے۔

اس مجموعہ کی قیمت ۲ روپے اور ملنے کا پتہ: مرزا عباس علی بیگ۔ باغچہ غازی مظفر خاں۔ ریاست رام پور۔

گناہ کا خوف

جناب چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی کے چند ادبی مقالات کا مجموعہ ہے۔ ہیں تو یہ فسانے لیکن میں انکو ادبی مقالات کہتا ہوں، کیونکہ ان کی زبان، ان کا انداز اور ان کا تار و پود فسانویت سے کسی قدر علحدہ ہے۔

ان مقالات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بجائے تحریر کے تقریر معلوم ہوتے ہیں اور ان کو پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چودھری صاحب باتیں کر رہے ہیں ـــــ چودھری صاحب علیگڈھ کے اس ابتدائی دور کے فرزند ہیں، جب وہاں تعلیم و تربیت کے ساتھ انسان میں زندگی بھی پیدا کی جاتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ چودھری صاحب اُس زمانہ کے سب سے زیادہ زندہ انسانوں میں سے ہیں ـــ جن حضرات کو آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کی خوشدلی اور بذلہ سنجی کا کیا عالم ہے اور ان کے مزاح میں کتنی لطافت پائی جاتی ہے۔ انگریزی میں آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برنارڈ شا (جو صرف آسکر وائلڈ اسکول کا خوشہ چیں ہے) Paradox کے مشہور لکھنے والے ہیں۔ اُردو میں اس رنگ کی کچھ جھلک خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کے یہاں پائی جاتی تھی لیکن چودھری صاحب کے یہاں یہ رنگ زیادہ گہرا ہے۔

چودھری صاحب نہایت وسیع مطالعہ کے انسان ہیں، جس کا ثبوت ان کے مقالات سے بھی ملتا ہے۔ ان کی زباندانی کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہوں کہ جب وہ ٹھیٹھ ٹکسالی زبان لکھنے پر آجاتے ہیں تو اس کتابی اُردو کے زمانہ میں وہ کسی اور ملک کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں "امامن مہری" والا فسانہ بالکل اسی رنگ کا ہے ـــ وہ لوگ جو زبان اور نفسیاتی تجزیہ کا امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں انکے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ: چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی ضلع بارہ بنکی

ہندوستان ۔ فلسطین

آکسفورڈ یونیورسٹی نے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے جن میں حالات حاضرہ اور اُن سے متعلق پچھلے تاریخی و سیاسی معاملات سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ رسالے ماہرین سے لکھوائے جاتے ہیں اور بہت کم قیمت پہ فروخت ہوتے ہیں۔

اب اُردو میں بھی ان کا ترجمہ شائع ہونے لگا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں رسالے اسی سلسلہ کے ہیں۔ فلسطین کے مسئلہ پر جیمز پارکس نے سیاسی و تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان پر رشبروک ولیمز نے۔ ترجمہ بھی صاف و سلیس ہے اور قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے یعنی تین تین آنے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی، کلکتہ یا مدراس سے خط و کتابت کی جائے۔

مسافر کی ڈائری

یہ خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ ہے جس میں انھوں نے اپنی سیاحت دنیا کا حال دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔

سفرناموں کا مطالعہ یوں بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا، لیکن اگر ان میں کام کی باتوں کا ذکر ہو تو مفید بھی ہوتے ہیں

کشکول

اڈیٹروں کے توجہ کے قابل

چکاگو کے ایک مقالہ نگار نے کسی میگزین کو ایک مضمون لکھ کر بھیجا۔ اڈیٹر نے اس مقالہ کی اشاعت منظور کرلی اور معاوضہ بھی طے ہوگیا۔ مقالہ نگار کو اس کی اشاعت کے انتظار ہی انتظار میں سات سال گزر گئے اور جب مضمون نگار نے اپنے وکیل کے ذریعہ سے یاد دہانی کی تو جواب یہ ملا کہ "اپنے موکل سے کہہ دو کہ ذرا صبر سے کام لیں"۔

اسی طرح ایک اخبار کے کسی اڈیٹر کو جو حال ہی میں آیا تھا، پُرانے مسودات میں ایک مضمون ملا جو اسے بہت پسند آیا۔ اس نے مضمون نگار کو اطلاع دی کہ اس کا مقالہ شایع ہونے والا ہے۔ مضمون نگار نے شکریہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ میرے مقالہ کو شایع کر رہے ہیں لیکن از راہ کرم اس میں ایک تبدیلی کر دیجئے وہ یہ کہ اس میں اپنا ذکر کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ میں دو بچوں کا باپ ہوں، لیکن اب بجائے دو کے چھ کر دیجئے"۔

پانی کے نلوں کے اندر آبادی

جنوبی آسٹریلیا میں ایک شہر ہے جس کا نام "Pipe-town" یا "نلوں کی آبادی" ہے۔ ایکبار یہاں کی میونسپلٹی نے چھ چھ فٹ قطر کے بہت سے نل منگائے تاکہ ان کے ذریعہ سے پانی دور دور تک پہونچایا جائے، لیکن مصارف کا اندازہ بہت بڑھ گیا، اس لئے یہ اسکیم ترک کر دی گئی اور ان نلوں میں بڈھے پنشن خوار لوگوں نے رہنا شروع کر دیا، کیونکہ ان کا کرایہ ادا کرنا نہیں پڑتا تھا، ان نلوں میں سونے کے کمرے کھانے کے کمرے اور ملاقات کے کمرے بھی بنا لئے گئے ہیں اور میز کرسی سے آراستہ ہیں۔ ان کو برابر برابر قطاروں میں رکھا گیا ہے اور ان کے سامنے سڑکیں بھی بنا دی گئی ہیں، تاکہ لوگوں کو آمد و رفت میں آسانی ہو۔

دلائی لاما کا نیا نام

تبت کے دلائی لاما کا نام اب بدل دیا گیا ہے اور آیندہ سے اس کا نام سرکاری کاغذات اور پبلک میں اس طرح لکھا جائے گا:۔

"جمپل گوانگ لوب سانگ وائی شی تنزنگ گیاتسو"

اس کا مفہوم یہ ہے:۔

"بڑی عظمت والا، بڑا تقریر کرنے والا، غیر معمولی ذہین عقل مطلق، اصول کا پابند اور سمندر کی طرح وسیع"

کیا اچھے دن تھے

جب اول اول رھوڈیشیا میں ریل جاری ہوئی تو انجن میں بجائے کوئلہ کے لکڑی استعمال ہوتی تھی اور جب راستہ میں لکڑی ختم ہو جاتی تھی تو انجن ورک کر ڈرائیور، فائرمین اور مسافر سب جنگل سے لکڑی کاٹنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

اس وقت مسافر گاڑیوں کی چھتوں پر بیٹھ جاتے تھے تاکہ دو طرفہ جنگلی جانوروں کو دیکھتے جائیں اور اگر کوئی مسافر کسی جانور کا شکار کرنا چاہتا تھا تو ڈرائیور ریل کو ٹھیرا بھی دیتا تھا

انسانی مشینری کے عجائب قلب کے ضربات کا اوسط فی منٹ ۷۲ ہے، یعنی رات دن میں ۱۰۳۸۶۰ مرتبہ - یہ بات کس قدر معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح کیجئے کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر قلب کی یہی ضربات خون کو تمام رگوں کے اندر اتنی مرتبہ دوڑا دیتی ہے کہ اگر پیمایش کی جائے تو یہ سفر ایک ارب ۶۸ کروڑ میل کا قرار پاتا ہے - گویا ۶۶۴۰ مرتبہ کرۂ ارض کا طواف کرلیا!

جس وقت دماغ کسی بات سے متاثر ہوتا ہے تو وہ آناً فاناً میں کم از کم ۷۵۰ بڑے بڑے عضلات میں حرکت و جنبش پیدا کردیتا ہے اور اس طرح دماغ کو رات دن میں ستر لاکھ خلایا (Cells) سے کام لینا پڑتا ہے -

۲۴ گھنٹے کے اندر انسان کا جسم اتنی قوت صرف کرتا ہے کہ اس سے ۴۵۰ ٹن وزنی چیز کو ایک فٹ اوپر اٹھایا جاسکتا ہے اس لئے انسان کو کم از کم آٹھ گھنٹہ روز سونا چاہئے تاکہ اس کی تلافی ہوسکے -

دندان سازی کی ابتدا دندان سازی کا فن قدیم مصریوں کی اختراع ہے - چونکہ وہاں کے بعض مجرموں کو دانت اکھاڑ دینے کی سزا بھی دیجاتی تھی، اس لئے بالکل قدرتی بات تھی کہ اس سزا کے بعد انسان پھر کھوئے ہوئے دانتوں کی کمی کو پورا کرسکے اور اس طرح وہاں دندان سازی کا رواج ہوا - وہاں بعض مومیائی شدہ لاشیں ایسی دیکھی گئی ہیں جن کے دانت مصنوعی ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کب یہ دانت بنائے گئے -

لاسلکی کا موجد کون تھا عام طور پر مشہور ہے کہ لاسلکی کا موجد مارکونی تھا، حالانکہ یہ صحیح نہیں - اس ایجاد کا سہرا ایک فرانسیسی عالم کے سر ہے جس کا نام اڈوارڈ برانلی تھا - سنہ ۱۸۸۹ء میں ایک جرمن عالم ہیر ٹیز نے ایک طریقہ ایسا ایجاد کیا جس کے ذریعہ سے بجلی کی موجیں فضا میں منتشر کی جاسکتی تھیں - اس کے تین سال بعد برانلی نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کے اندر سے یہ منتشر موجیں گزار لی جاسکتی تھیں اور لاسلکی ٹیلی گراف محض اسی آلہ کی وجہ سے وجود میں آیا

تین آدم اور فرعون مصر (رعمسیس ثانی) کے ۱۶۲ اولاد تھی جن میں ۱۱۱ لڑکے اور ۵۱ لڑکیاں تھیں -

سیام کے بادشاہ راما نیجم جن کا انتقال سنہ ۱۸۸۱ء میں ہوا، تین سو بیویاں رکھتے تھے - ان سے ۳۷۰ اولاد تھی، ۱۳۴ لڑکے اور ۲۳۶ لڑکیاں -

مولا اسماعیل سلطان مراکش (جن کا انتقال سنہ ۱۷۲۷ء میں ہوا ہے) ۸۸۸ اولاد کے باپ تھے، ۵۴۸ لڑکے اور ۳۴۰ لڑکیاں -

عینک کا موجد کون تھا اکثر مورخین کا خیال ہے کہ عینک کا موجد، بوہیمیا کا ایک راہب کا پوسٹی تھا - یہ سنہ ۱۵۹۰ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۶۶۰ء میں مرا - لیکن فرانس والے کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل غلط ہے، عینک کا موجد ایک فرانسیسی تھا - اس کا نام شوریا تھا اور پیرس میں آنکھوں کا ڈاکٹر تھا - اس نے سب سے پہلے سنہ ۱۶۲۵ء میں لوئس سیزدھم کے لئے عینک طیار کی تھی -

دماغی تفریح

انعام پانے والے لڑکے پچھلے مہینے دماغی تفریح کے سلسلہ میں جو کچھ پیش کیا گیا تھا، اس طرف بچوں نے کافی توجہ کی۔ جادو کے مربعہ پر بہت سے بچوں نے کامیاب غور کیا، لیکن سب سے پہلے مشیر حسین نے خسرو باغ الہ آباد سے اس کا صحیح جواب بھیجا اس لئے اردو ٹلکٹ کی ایک کاپی ان کے نام روانہ کر دی گئی۔

کاغذ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر حرف M سب سے پہلے نظام الدین احمد ساکن جھوسی (الہ آباد) نے بھیجا اور دیا سلائی کی تین تیلی والا معمہ بھی انھوں نے صحیح حل کیا، اس لئے جذبات بھاشا اور شاعر کا انجام ایک ایک جلد ان کے پاس بھیجدی گئی۔

شفیق احمد صاحب مدار منزل کٹنی نے بھی تین تیلیوں کا صحیح حل بھیجا۔ شاعر کا انجام ایک جلد ان کے پاس بھی بھیجدی گئی۔

جادو کے مربعہ کا حل یہ ہے:۔
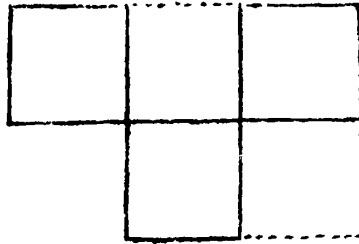
نقطوں کی جگہ کی تین تیلیاں علحدہ کرنے سے تین مربعے رہ جاتے ہیں

تین تیلیوں سے چار مثلث اس طرح بنتے ہیں
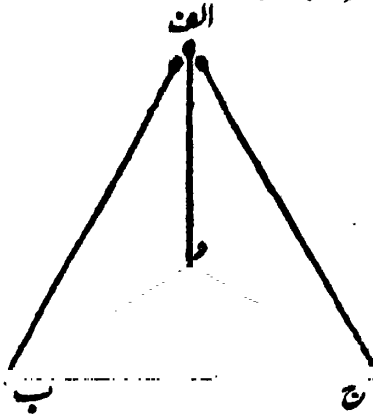
تیلیوں کو عمودی شکل میں اس طرح رکھنے سے چار مثلث بن جائیں گے

ایک مثلث (الف ۔ ب ۔ ج) دوسرا (الف ۔ ج ۔ د) تیسرا (الف ۔ ب ۔ د) چوتھا (ب ۔ د ۔ ج)

عقلی جنتری

مصر کے ایک مہندس نے سنہ ۳۲ء کی ایک عقلی جنتری طیار کی تھی جس سے بہ آسانی معلوم ہو سکتا تھا کہ اس سنہ کی فلاں تاریخ کو کونسا دن تھا۔ جنتری یہ تھی :-

(۱)

جنوری	فروری	مارچ	اپریل	مئی	جون	جولائی	اگست	ستمبر	اکتوبر	نومبر	دسمبر
۵	۱	۲	۵	۰	۳	۵	۱	۴	۶	۲	۴

(۲)

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر
۱	۲	۳	۴	۵	۶	صفر

فرض کیجئے ہم معلوم کرنا چاہیں کہ ۹ اگست کو کونسا دن تھا، تو ۹ میں ۱ کا اضافہ کریں (جو اگست کے نیچے درج ہے) یہ ہو گیا ۱۰ اب ۱۰ کو ہفتہ کے سات دن سے تقسیم کر دیں تو باقی ۳ بچے گا اور تیسرا دن منگل ہوتا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ ۹ اگست سنہ ۳۲ء کو منگل کا دن تھا۔

کیا کوئی صاحب سنہ ۴۱ء کی بھی ایسی ہی جنتری بنا سکتے ہیں؟ نگار کا ہندی نمبر سب سے پہلے کامیاب شخص کی خدمت میں مفت پیش کیا جائے گا۔

ایک عجیب و غریب عدد

۲۰۱۶ عجیب و غریب عدد ہے جو ایک سے لیکر ۹ تک ہے ہر عدد سے برابر تقسیم ہو جاتا ہے کیا آپ کوئی اور عدد ایسا ہی بنا سکتے ہیں؟

دو اور دو ہمیشہ چار نہیں ہوتے

کس قدر عجیب بات ہے! آپ کسی سے پوچھئے کہ دو اور دو ملکر کتنے ہوتے ہیں تو وہ بلا تامل چار کہدے گا، لیکن بعض صورتوں میں دو اور دو چار نہیں ہوتے مثلاً آپ دو گیلن پانی دو گیلن پٹرول میں ملا دیں تو یہ چار گیلن نہ ہوگا بلکہ صرف ۳٫۸ گیلن ہوگا۔

سیگریٹ کے کاغذ کی وسعت

سگریٹ کا کاغذ بہت باریک اور تقریباً ۳ انچ لمبا اور ڈیڑھ انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ ایک آدمی اس کے اندر سے گزر سکتا ہے تو آپ یقین نہ کریں گے لیکن آپ ایک تیز استرا لیکر حسب ذیل نقشہ کے مطابق اُسے کاٹ لیجئے اور پھر دیکھئے کہ آپ اس کے اندر سے کس قدر آسانی کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔
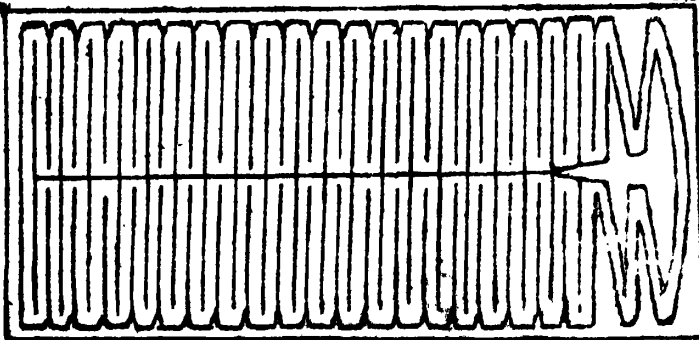
غور کیجئے

ہمارے پاس زمین کا ایک ٹکڑا ہے اور اُنیس درخت، ہم انھیں نو خطوط مستقیم میں نصب کرنا چاہتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہر قطار میں پانچ درخت شمار کئے جا سکیں۔

سب سے پہلے جس کا حل آئے گا اسے جذبات بھاشا کی ایک جلد مفت ملیگی۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰ اپریل تک اس کا حل پہونچ جانا چاہئے۔

"عدم" کی دو نظمیں

مسائلِ لطیف:-

بے کیفیٔ خزاں تھی کہ رنگِ بہار تھا — جو کچھ بھی تھا معاملۂ اعتبار تھا
ہر چیز ہنس رہی تھی مرے آس پاس کی — عہدِ شباب خندۂ بے اختیار تھا

دل کے پروں پہ زیست تھی پرواز آزما — چھوٹے سے اک بگولے پہ صحرا سوار تھا
اب لذتِ فریب پرستی بھی مٹ گئی — میرا یہ حسنِ ظن بھی اُنھیں ناگوار تھا
کیوں ہنس رہی ہے موت یہ کیا ماجرا ہوا — مجھکو تو زندگی پہ بڑا اعتبار تھا
صرف اتنی داستاں ہے مرے حادثات کی — اک رند سے مقابلۂ روزگار تھا
کب آشنائے زخم ہوا یہ نہیں خبر — دیکھا جو ایک دن تو مرا دل فگار تھا
احسانِ ناموافقتِ روزگار سے — میں اس بھرے جہاں میں غریب الدیار تھا
یوں آ گیا ہے حادثۂ مرگ ناگہاں — جیسے مجھے اسی کا فقط انتظار تھا
رنگِ بہار بن کے عدم اُڑ گیا شباب — گویا کسی بلند فضا کا غبار تھا

گرمیوں کی ایک دوپہر:-

دوپہر کو ترے محفوظ و حسیں کمرے میں — تیرے اصرار پہ وہ میرا غزلخواں ہونا
میرے رنگین تغزل کی اثر خیزی کا — تیرے ہنستے ہوئے چہرے سے نمایاں ہونا
گرم موسم کی مچلتی ہوئی تحریکوں کا — پے بہ پے ملتہب و تیز و درخشاں ہونا
تیری زلفوں کا بہ اندازِ جنوں ہنس پڑنا — تیرے ہونٹوں کا بہارِ صنمستاں ہونا
تیرے جذبات کا موجوں کی روش پر بہنا — تیری باتوں کا نمایندۂ طوفاں ہونا
پھر نگاہوں سے حکایات کا دفتر کھلنا — پھر تبسم سے خرابات کا ساماں ہونا
پھر کنایات بہ مژگاں کا فسوں بندھ جانا — پھر روایات بہ انفاس کا رقصاں ہونا
پھر مرا خاص سوالات کی صورت بننا — پھر ترا خاص جوابات کا عنواں ہونا
پھر مرا تیری عنایات کا مرکز بننا، — پھر ترا میری شکایات کا درماں ہونا
مسکراتی ہوئی آنکھوں کی دل آویزی سے — پھر بیابانِ توقع کا گلستاں ہونا
لہلہاتی ہوئی زلفوں کی جنوں خیزی سے — پھر خیالاتِ فسردہ کا درخشاں ہونا
اتنی آسانی سے ہر صورتِ امکاں کے خلاف — سر کا پھر نازکشِ زانوئے جاناں ہونا،
اتنی تکمیل سے حالاتِ زبوں کے باوصف — پھر نتائج کا بہ افراط درخشاں ہونا
دوپہر جو تری خلوت میں گزر جاتی ہے — زیست کے وہم میں اک رنگ سا بھر جاتی ہے

مجبوریاں

جب لطف و کرم دل کو تڑپائیں تو کیا کہئے
بے یاد کئے بھی وہ یاد آئیں تو کیا کہئے

وہ پرسشِ پیہم سے، دل داریِ ہردم سے
تسکین کے پردے میں تڑپائیں تو کیا کہئے

شکوہ کا محل کوئی ڈھونڈے بھی نہیں ملتا
ازراہِ نوازش وہ ترسائیں تو کیا کہئے

مجبور و حزیں دل کے لبریز پیالے کو
وہ جوشِ ترحّم سے چھلکائیں تو کیا کہئے

ہیجانِ تمنا سے دم رُکتا ہے رُک جائے
نظروں سے بھی وہ نظریں شرمائیں تو کیا کہئے

وہ جنبشِ لب کی بھی دیتے ہیں اجازت کب
ایمائے تکلم سے گھبرائیں تو کیا کہئے

کچھ کہئے، جو ہو کوئی انداز جُدا اُن کا
ہم سے ہی اگر وہ بھی ہو جائیں تو کیا کہئے

چتون ہو وہ بہکی سی، شوخی ہو سو کھوئی سی
اس پر بھی جو وہ ہم کو بہلائیں تو کیا کہئے

جو عشق کا عالم ہے وہ حُسن کا عالم ہے
غمناک ہوں جب دونوں دنیائیں تو کیا کہئے

اُن کے بھی تو پہلو میں پتھر نہیں دل ہی ہو
بے تاب ہوں خود، ہم کو سمجھائیں تو کیا کہئے

ہمراز نگاہوں کو آسان ہے بہکانا؟
ہمدرد جو غمخواری فرمائیں تو کیا کہئے

ملتے ہی اگر پیاسی تپتی ہوئی آنکھوں سے
ہنستی ہوئی وہ آنکھیں بھر آئیں تو کیا کہئے

جن آنکھوں میں شوخی کے تارے سے جھلکتے ہوں
وہ آنکھیں اگر موتی برسائیں تو کیا کہئے

جن پلکوں کی ہر جنبش لب ریزِ تبسم ہو
اُن پلکوں پہ جب آنسو تھرّائیں تو کیا کہئے

ہم نے ہی بایں وحشت کیا راہ نکالی ہو
مجبور ہیں وہ بے بس ہو جائیں تو کیا کہئے

پھولوں کا تو اے کوکب انجام ہے مرجھانا
آغاز ہی میں کلیاں کملائیں تو کیا کہئے

کوکب (شاہجہانپوری)

جوگن

۱

جُھکی جھکی چشم سُرگیں میں لئے ہوئے حشر زندگی کا، کنارِ آبِ روانِ گنگا کھڑی ہے اک نوجوان جوگن
ہے چال الھڑ مگر لچیلی لٹیں ہیں شانوں پہ گیلی گیلی، رندھی رندھی اُمنگڑیاں نشیلی شباب کے ولولوں کا مدفن
سلونے رخ پر بھبھوت جیسے چمن میں ہو شام کا دھندلکا سفید آنچل میں زلف سرکش ہو جیسے پانی میں کالی ناگن
نچوڑی زلفوں کے چند قطرے جبیں پہ یوں جھلملا رہے ہیں کہ جیسے مندر کے بام و در پر ہوں ننھے ننھے چراغ روشن

۲

کھڑی ہوئی ہے نہا کے جوگن اُفق سے سورج نکل رہا ہے اِدھر ہے کچھ صبح کا دھندلکا اُدھر شفق لہلہا رہی ہے
ادب سے گردن جھکی ہوئی ہے "خدائے مشرق" کی بارگاہ میں خدائے مشرق کے پاک ہونٹوں پہ مسکراہٹ سی آ رہی ہے
مجھے یہ ڈر ہے کہ کوئی دم میں طلسم ارض و سما نہ ٹوٹے کنوارے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ سے کل فضا تھرتھرا رہی ہے

۳

اری اچھوتی یہ پاپ نگری اچھوتیوں کے لئے نہیں ہے تو اپنی رعنائیوں کو لیکر اک ایسے سنسار میں چلی جا
جہاں نہ ہوں حسن کی دوکانیں جہاں نہ ہو روپ کی تجارت جہاں گناہوں کی ہو نہ منڈی جہاں محبت کا ہو نہ سودا
جہاں نہ ہو رسم گلفروشی جہاں نہ ہو دست شوق گلچیں، جہاں کسی کا حسین مکھڑا نہ ہو ہجوم نظر سے میلا۔۔
جہاں نہ معصومیت کے خوں سے گناہ کی آستیں ہو رنگیں جہاں نہ انسانیت کے سینے سے اُٹھے حیوانیت کا شعلہ
اک ایسی دنیا تلاش کر لے جہاں محبت میں ہو نہ لالچ اک ایسی دنیا تلاش کر لے جہاں سچائی پہ ہو نہ پہرا
اک ایسی دنیا کہ شاعری جس میں خواہشوں کا نہ گیت گائے
اک ایسی دنیا کہ جس میں منطق نہ پاپ کو فلسفہ بنائے

احسن احمد اشک ایم-اے (کلکتہ)

رباعیات گوہر

کیا صرف روایات کا قایل ہو جاؤں؟ کیا لغو و خرافات کا قایل ہو جاؤں؟
جو بات ہے گوہر مرے ایمان کی ضد کس طرح میں اُس بات کا قایل ہو جاؤں

جو مرتبۂ عقل و خودی جانتا ہے "مُلّوں" کی وہ ہر چال کو پہچانتا ہے
جنّت ہے اُسی کی جو ہے ان کا مُنکر دوزخ ہے اسی کی جو انھیں مانتا ہے

گوہر حسین گوہر

غزل : کاوش حیدرآبادی

اے جانِ تمنا! یاد تری جس وقت مجھے آجاتی ہے اک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے اک آہ لبوں پر آتی ہے
امید تو ہو کوئی جو کہوں افسانۂ حسرت، حالِ زبوں! میں نالے کروں یا آہ کروں نیند آپ کو آہی جاتی ہے
میں اور خیالِ بے اثری، وہ تو یہ کہو معصوم ہو تم جب آہ نکلتی ہے دل سے گردوں کی جبیں جھک جاتی ہے
روودادِ مصیبت ہے دنیا، گر عشق نہیں تو کچھ بھی نہیں کونین، فدا اُس ہستی پر جو زخمِ محبت کھاتی ہے
دنیا کے یہ لاکھوں نظّارے، دلکش بھی ہیں دلدوز بھی ہیں معلوم نہیں انساں کو مگر کس شے کی کمی تڑپاتی ہے!

ذلّت بھی ہوئی دُکھ بھی پاے اُس بزم میں لیکن اے کاوش!
معلوم نہیں وہ چیز ہے کیا جو مجھ کو وہاں لے جاتی ہے

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۶۶

قیمت ۸ر

ہمیشہ یاد رکھئے

اگر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

اگر آپ نے خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ نہیں دیا تو کوئی جواب نہیں دیا جائیگا

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۹	فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۵

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمارہ ۵	مئی سنہ ۵۱ء	جلد ۲۹

ملاحظات

معذرت

پچھلے مہینے ملاحظات کے سلسلہ میں، میں نے "ندویوں کے اخلاق" کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا تھا اور پٹنہ کے ایک اخبار "دورِ جدید" کی ایک عبارت نقل کرتے ہوئے اسے مسعود عالم صاحب ندوی سے منسوب کیا تھا

مینے یہ ایک تراشہ کی بنا پر لکھا تھا جو پٹنہ کے ایک صاحب نے بھیجا تھا اور جسکے ایک گوشہ میں سُرخ روشنائی سے "اڈیٹر: مسعود عالم ندوی" تحریر تھا

اب مجھے معلوم ہوا کہ مسعود عالم صاحب ندوی، اس اخبار کے اڈیٹر نہیں ہیں اور وہ عبارت ان سے منسوب نہیں کیجا سکتی میں سمجھتا ہوں کہ مسعود عالم صاحب ندوی کو اس نسبت سے تکلیف ہوئی ہوگی کیونکہ وہ تحریر ہی ایسی تھی جس کی نسبت سے ہر انسان کو ننگ و عار آنا چاہئے اور اس لئے میں معذرت خواہ ہوں

اس اشاعت کے مقالات

اس مہینے میں سب سے پہلا مقالہ "تقسیم دولت" سے متعلق ہے جس کے حل کرنے کے لئے اس وقت ساری دنیا بیتاب ہے۔ وہ لوگ جو ملوکیت یا آمریت کے طرفدار ہیں انھیں تو خیر اس کا دشمن ہی ہونا چاہئے، لیکن جمہوری حکومتیں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتیں۔ اس کا اگر یہ سبب نہیں ہے کہ جن حکومتوں کو جمہوریت سے منسوب کیا جاتا ہے وہ در اصل خود سرمایہ داری کی بنیاد پر قایم ہیں، تو پھر ان کا فرض ہے کہ وہ اس تحریک ہی میں اصلاح کرکے اُسے جمہوریت بنائیں، اگر اُن کی جمہوریت اُس سطح تک نہیں پہونچ سکتی

سرمایہ و عمل کی جنگ کو اتنا زمانہ ہوچکا ہے کہ اب زیادہ عرصہ تک نتیجہ کا انتظار نہیں کیا جا سکتا اور اگر ارباب سیاست دو...

نے کوئی درمیانی راہ صلح و آشتی کی جلد پیدا نہ کی، تو پھر یہ سیلاب قابو سے باہر ہو جائے گا اور سیلاب کا پہلا کام تخریب ہی ہے ؛

دوسرا مقالہ "اقبال کی شاعری" سے متعلق ہے جس کا کچھ حصہ لکھنؤ کے لاسلکی اسٹیشن سے نشر ہوا تھا۔ اقبال کی شاعری فنی حیثیت سے یقیناً بہت بلند چیز ہے لیکن پیغام کے لحاظ سے وہ بہت محدود ہے۔ اگر اقبال، اسلام و اسلامیات سے بلند ہو کر بجائے "مردمومن" کے "انسانِ محض" کو پیش کرتا تو اسکی حیثیت ایک کائناتی شاعر کی سی ہو جاتی۔ لیکن شاید اقبال کا ماحول اس کا مقتضی نہ تھا!

"لکھنؤ کی زبان"، پر مولوی سید محمد باقر شمس لکھنوی کا مقالہ اس مہینے ختم ہو گیا۔ انھوں نے لکھنؤ کی زبان کی حمایت و طرفداری میں اتنے اقتباسات و حوالہ جات پیش کئے ہیں کہ ان کی مخالفت ممکن نہیں، تاہم اگر کوئی صاحب اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنا چاہیں تو نگار کے صفحات حاضر ہیں

تاریخ اودھ کے سلسلہ میں اس مہینے "مُنّا جان" کی ولادت کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ واقعہ تاریخ اودھ کا سخت اختلافی مسئلہ ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تاریخ اودھ پر ماہرانہ نظر رکھنے والے اس پر اظہارِ خیال فرمائیں۔ جناب تصدق حسین صاحب لکھنوی کو میں خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں

مولوی محمود علی خانصاحب بھوپالی کے "جدید رسم خط"، پر اسوقت تک بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے، حالانکہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور محمودی رسم خط اپنے اندر بہت سی ایسی خصوصیات رکھتا ہے جو اس وقت تک کے ایجاد کئے ہوئے کسی رسم خط میں نہیں پائی جاتیں

آیندہ مہینے ایک اور رسم خط پیش کیا جائے گا، جو دہلی کے کسی صاحب نے ایجاد کیا ہے

"دماغی تفریح" کا سلسلہ زیادہ تر طالب علموں کے لئے ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ ہم آپ کبھی بچہ بننے کی کوشش ہی نہ کریں

گہے طفلے شو و مستانہ می رقص!

اب کیا ہوگا؟

جس کا اندیشہ تھا وہ آخر پورا ہو کر رہا، یعنی یوگوسلیویا ختم ہو گیا اور یونان بھی دم توڑ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان خدا کی قہاریت و جباریت کا مظہر بن جاتا ہے تو "قدوسیت" کو اس کے سامنے سپر ڈالنا ہی پڑتی ہے

بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یوگوسلیویا اور یونان نے حماقت کی کہ خواہ مخواہ پہاڑ سے سر ٹکرا کر اپنے آپ کو ہلاک کیا، لیکن ہلاکت ہی کی بعض داستانوں کے اندر زندگی کے سبق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ معرضِ ہلاکت میں آنے والے ہمارے تجربات ہوا کرتے ہیں نہ کہ اُصول۔ اس لئے یونان و یوگوسلیویا کی شکست کوئی اُصولی نتیجہ نہیں بلکہ تجرباتی نتیجہ ہے اور تجربات میں قربانیاں کرنا ہی پڑتی ہیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان دونوں ملکوں نے صرف برطانیہ یا امریکہ کی مدد کے بھروسہ پر مقابلہ کیا تھا، کیونکہ وہ خود سمجھتے تھے کہ بحالاتِ موجودہ جبکہ برطانیہ خود اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہے کوئی معقول مدد نہیں دے سکتا تھا، اس لئے ان کی جنگ صرف اُصول کی حمایت میں تھی اور یہ ضروری نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ وہی ہو جو ہونا چاہئے یا وہ کبھی نہ ہو جو نہ ہونا چاہئے

اب لڑائی کا رُخ کیا ہوگا۔ اس کی بابت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اب یہ بادل مغرب کی طرف سے مشرق کی طرف بڑھتے نظر آ رہے ہیں

جن لوگوں نے بحیرۂ روم کے نقشہ کا غور سے مطالعہ کیا ہے، اُن سے یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا کہ اگر مغرب میں جبرالٹر اور مشرق

اور اس کا دھڑ دو
میں نہر سویز انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ برطانوی حکومت کی کمر کاٹ دی گئی
ایسے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا جن کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے ہٹلر کی انتہائی تمنا یہی ہو سکتی ہے کہ وہ مشرق
کی طرف نہر سویز پر قابض ہو جائے اور مغرب کی جانب جبرالٹر پر، تاکہ بحر روم پر برطانیہ کا اقتدار بالکل ختم ہو جائے۔ لیکن یہ
اسوقت تک ممکن نہیں، جب تک افریقہ کے تمام ساحلی مقامات اور خصوصیت کے ساتھ مصر و اسکندریہ پر اس کا قبضہ نہ ہو جائے
اور اسپین بھی اس کا شریک نہ ہو۔ اس لئے ممکن ہے کہ اب لڑائی کا رُخ کچھ ایسا ہی ہو اور یہ رُخ یقیناً فیصلہ کُن ہوگا، کیونکہ
اس کے بعد ترکی اور روس کی پالیسی بھی متعین ہو جائے گی، جاپان کے ارادے بھی واضح ہو جائیں گے اور امریکہ کو بھی
کھلم کھلا میدان میں آجانا پڑے گا

اور خلیج فارس میں
چنانچہ روس کے متعلق ابھی سے یہ خبریں آنے لگی ہیں کہ وہ ایران کے صوبۂ آذربیجان کو لینا چاہتا ہے
اور اس لئے اگر کسی
بھی کچھ مطالبات پیش کرنے والا ہے۔ جاپان کے فوجی اجتماعات سے بھی برما سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں
کسی وقت ایشیا کو بھی گھیر لے تو تعجب نہیں

اور
یوگوسلیویا اور یونان کی فتح کے بعد جرمنی کا دیرینہ خواب برلن سے بغداد تک یقیناً دائرۂ تعبیر کے اندر آجائے گا
ہٹلر انتہائی کوشش کرے گا کہ وہ موصل و عراق کے پٹرول پر قبضہ کرکے جلد سے جلد اس تعبیر کو پورا ہوتے ہوئے دیکھے!

جنگ کے شعلے اور ہندوستان

کیا خود
اب سے ڈیڑھ سال پہلے جب لڑائی پولینڈ میں شروع ہوئی تو ہندوستان
یورپ میں بھی زیادہ عرصہ تک اس کے جاری رہنے کا یقین لوگوں کو نہ تھا اور
لیکن یہ
عام طور پر یہ خیال قایم کیا گیا تھا کہ پچھلی لڑائی کی طرح یہ بھی مغربی یورپ تک محدود رہے گی اور وہیں ختم ہو جائے گی،
خیال غلط ثابت ہوا اور جنگ کے زمانی و مکانی دونوں حیثیت سے وسعت اختیار کرلی

اٹلی کو جو کامیابیاں
جب فرانس کو شکست ہوئی اور اٹلی بھی لڑائی میں شریک ہو گیا تو جنگ کی نوعیت بھی بدلی اور ابتداء میں
لیکن
افریقہ میں ہوئیں، اُن سے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر نہر سویز و عدن پر اس کا قبضہ ہو گیا تو ہندوستان پر بھی وہ ضرور حملہ کرے گا۔
اٹلی کی کامیابیاں بہت عارضی ثابت ہوئیں اور اپنی بحر روم کی ناکامیوں کا انتقام لینے کے لئے اس نے یونان پر حملہ کر دیا جس کا نتیجہ
اس کے موافق نہ نکلا

اور ہندوستان کے لئے
اسی دوران میں محوری طاقتوں نے جاپان کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا اور اس واقعہ نے مشرق
مشرق میں جنگ
سخت خطرہ پیدا کر دیا۔ کیونکہ جاپان کا محوری طاقتوں کے ساتھ شامل ہو جانا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ اگر اس نے
اس نے اس معاہدہ
شروع کی تو یہ جنگ برطانیہ کے خلاف ہوگی اور اس صورت میں ہندوستان کا محفوظ رہنا محال ہے۔
ہونے لگا اور ڈچ ایسٹ انڈیز
کے بعد ہی انڈوچائنا میں اپنے اثرات قایم کرنا شروع کئے، چین کے بعض شمالی جزائر میں بھی فوجی اجتماع
آہستہ آہستہ
پر دباؤ ڈالکر فراہمی پٹرول کا انتظام بھی اس نے کر لیا اور یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جاپان
ہندوستان کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کی نیت اچھی نہیں ہے

لڑائی کے شعلے
مشرق میں جاپان یہ چالیں چل ہی رہا تھا کہ لڑائی نے ایک اور رُخ بدلا یعنی وسطی یورپ میں بھی
وسطی یورپ پر
بھڑک اُٹھے۔ یقیناً ہٹلر بلقان میں لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور چاہتا تھا کہ اس کے اثرات تمام

قایم ہو جائیں، چنانچہ ہنگری، رومانیا اور بلغاریا میں وہ کامیاب بھی ہو گیا، لیکن یوگوسلیویا نے آخر وقت میں انکار کر دیا اور اس طرح ہٹلر کو اپنی فوجیں یونان اور یوگوسلیویا کی طرف بڑھانی پڑیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے افریقہ میں بھی اقدام شروع کیا اور بعض اہم ساحلی مقامات انگریزوں سے واپس لے لئے

ان تمام باتوں سے ہٹلر کا مدعا یہ ہے کہ وسطی یوروپ سے برطانیہ کو بالکل نکال باہر کرے اور نہر سویز چھین لے۔ وہ جانتا ہے کہ نہر سویز برطانوی حکومت کی شہ رگ ہے اور اگر یہ کٹ گئی تو پھر ایشیائی مقبوضات سے اُس کے تعلقات بالکل منقطع ہو جائیں گے اور اس صورت میں ہندوستان پر حملہ ہونا بالکل یقینی ہے خواہ جاپان کی طرف سے ہو یا مشرق ادنیٰ کو عبور کر کے ایران و بلوچستان کی طرف سے

اسی کے ساتھ جو خبریں جبرالٹر کے متعلق آ رہی ہیں وہ بھی کم تشویشناک نہیں۔ برطانیہ کا وہاں کی قلعہ بندیوں کو اور مضبوط کرنا، شمال کی طرف خشکی کے حصہ میں گہری خندقیں کھودنا اور روزانہ لڑائی کے سامان کا وہاں پہونچتے رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ برطانیہ اُس طرف سے بھی مطمئن نہیں ہے اور جنرل فرانکو نے جو بیان حال میں شایع کیا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اسپین کو یقین ہو گیا کہ برطانیہ کی مخالفت کر کے وہ فایدہ اُٹھا سکتا ہے تو شاید وہ بھی ہٹلر کا شریک ہو جائے

فرانس کی وشی حکومت نے ابھی تک ہٹلر کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا، لیکن وہاں کی حکومت خود متزلزل حالت میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہاں پھر لیوال کا اقتدار قایم ہو جائے اور ہٹلر کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں

ہٹلر نے انگلستان کے ساحلی مقامات پر بھی بمباری جاری رکھی ہے اور اٹلانٹک میں بھی اس کی آبدوز کشتیاں برطانوی جہازوں کو نقصان پہونچا رہی ہیں، یعنی اگر ہٹلر اپنی صرف ایک محاذ والی اسکیم میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس نے برطانیہ کے لئے بھی کئی محاذ پیدا کر دئے ہیں۔ یہ بھی ہندوستان کے لئے سخت خطرہ کی بات ہے کیونکہ اس صورت میں برطانیہ اپنی ساری قوت ہندوستان کی حفاظت پر صرف نہ کر سکے گا

یوگوسلیویا اور یونان کے بعد ہٹلر غالباً شام پر دباؤ ڈالے گا اور وشی حکومت اس دباؤ کے ماننے پر مجبور ہوگی۔ شام سے فلسطین کی سرحد بالکل ملی ہوئی ہے اور یہاں سے نہر سویز بالکل قریب واقع ہے۔ اس لئے یونان میں ہٹلر کی کامیابی نہر سویز کے لئے نہایت سخت خطرہ ہے، اور نہر سویز کا ہر خطرہ ہندوستان کا خطرہ ہے۔ عراق و فلسطین میں برطانوی فوجوں کا اجتماع ہو رہا ہے اور اگر ہٹلر نے ادھر بڑھنے کا قصد کیا تو اس میں شک نہیں کہ یہ جنگ بڑے معرکہ کی ہوگی

یونان سے فلسطین آنے کے دو راستے ہیں، ایک ترکی کی طرف سے دوسرا سمندر کی طرف سے۔ اگر ترکی نے جرمن فوجوں کو ملک سے گزرنے کی اجازت نہ دی تو عراق سے پہلے یہیں بڑا معرکہ ہوگا جس میں عراق کی برطانوی فوجیں بھی ترکی کی پوری مدد کریں گی اور بصورت ناکامی ہٹلر کو مجبوراً سمندر کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور یہ پہلو برطانیہ کی موافقت میں ہے، کیونکہ خشکی کی لڑائی میں جرمنی خواہ کتنا ہی قوی ثابت ہو لیکن پانی میں یقیناً وہ برطانیہ کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ جرمنی، ترکی کی طرف سے عراق کی طرف بڑھنے کی پوری کوشش کرے گا

جاپان کے مشرقی اقدام کے لئے اسوقت تک سب سے بڑی روک روس تھا کیونکہ جاپان و روس کے درمیان دیرینہ دشمنی چلی آتی ہے اور جاپان کو اندیشہ تھا کہ اگر اس نے بحر ہند یا بحر پاسفک میں لڑائی چھیڑ دی تو ممکن ہے روس، سائبیریا کی طرف سے پیچھے کو پر

کر دے۔ لیکن روس اور جاپان کے درمیان جو پانچ سال کا عہد نامۂ صلح و غیر جانبداری حال ہی میں ہوا ہے، اس نے جاپان کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا ہے اور زیادہ اطمینان کے ساتھ ہندوستان کی طرف بڑھنے کی صورتیں اس کے لئے پیدا ہو گئی ہیں

الغرض نہر سویز اور جاپان دونوں طرف سے لڑائی کی آگ آہستہ آہستہ ہندوستان کی طرف بڑھتی آ رہی ہے اور ہمکو ہر وقت اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار رہنا چاہئے

ترکی کی گزشتہ و موجودہ پالیسی

چونکہ یونان کی فتح کے بعد ترکی کے مسئلہ نے بہت اہمیت اختیار کر لی ہے اور عجب نہیں کہ درۂ دانیال وغیرہ کے متعلق جرمنی کے مطالبات اس سے شروع ہو جائیں اس لئے نامناسب نہ ہو گا اگر آپ ترکی کی موجودہ سیاست کو سمجھ لیں

گزشتہ جنگ میں ترکی جرمنی کا حلیف تھا، اس لڑائی میں ابھی تک اس کی حیثیت بالکل غیر جانبدار ہے، لیکن وہ یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ اپنے معاہدات کا احترام ضرور کرے گا۔ یہ غور طلب بات ہے کہ ترکی نے پچھلی لڑائی کے واقعات کو کیوں فراموش کر دیا اور اپنے سابق حریف (برطانیہ) کی طرف اب کیوں مایل نظر آتا ہے، برطانیہ، جس کی دوستی کی طرف ترکی کا رجحان بتایا جاتا ہے، وہی برطانیہ ہے جس کے ایک وزیر اعظم نے کہا تھا کہ "اب ترکی کو یوروپ سے نکل جانا چاہئے" اور دوسرے وزیر اعظم نے فرانس اور روس کے ساتھ عثمانی حکومت کے حصے بخرے کرنے کا خفیہ معاہدہ کیا تھا، پھر ترکی ان باتوں کو کیوں بھول گیا اس کے سمجھنے کے لئے ہم کو پچھلے واقعات پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے

سنہ ۱۴ء کی لڑائی میں ترکی و جرمنی کے اتحاد کی ذمہ داری بڑی حد تک اطالیہ کے سر تھی۔ جزیرۂ ڈوڈاکینز میں اطالویوں کی موجودگی ایک طرف ایشیائے کوچک کے لئے اور دوسری طرف اُن بحری راستوں کے لئے جو درۂ دانیال، استنبول، رومانیہ اور روس کو جاتے ہیں ہمیشہ مصیبت کا سبب رہی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں روس اور اطالیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا جو معاہدۂ راکونی جی (Racconigi) کے نام سے مشہور ہے، اس معاہدہ میں اطالیہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ درۂ دانیال اور آبنائے باسفورس میں روسی مفاد کا احترام کرے گا۔ اصل قصہ یہ تھا کہ سابق معاہدہ کی رو سے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال صرف ترکی جنگی بیڑے کی آمد و رفت کے لئے مخصوص تھا اور اس راہ سے روس کا یا کسی اور سلطنت کا جنگی بیڑہ آ جا نہیں سکتا تھا، لیکن زار کی دیرینہ تمنا تھی کہ باسفورس اور درۂ دانیال اس کے جنگی بیڑے کے لئے بھی کھول دیا جائے

سنہ ۱۱ء میں اطالیہ نے اسی معاہدۂ راکونی جی کی بنا پر ترکی کو جنگ کا الٹیمیٹم دیدیا اور سنہ ۱۲ء میں درۂ دانیال پر اطالویوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی سال بلغاریہ، سرویہ، مانٹی نیگرو اور یونان نے ملکر ترکی کے خلاف ایک محاذ قایم کیا اور اس متحدہ محاذ کا نام "بلقان لیگ" رکھا، جو زار روس کے اشارہ پر وجود میں آئی تھی

اکتوبر سنہ ۱۲ء میں معاہدۂ لوزان کے ساتھ اطالیہ اور ترکی کی لڑائی ختم ہوئی اور یہ طے پایا کہ ترکی سپاہی جونہی لیبیا خالی کرینگے ویسے ہی اطالوی سپاہی ڈوڈاکینز کے جزیرے کو خالی کر دیں گے، لیکن ابھی اس معاہدہ کی روشنائی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ یونان و ترکی کی لڑائی چھڑ گئی۔ اس موقعہ پر یونانیوں نے اطالیہ کو مجبور کیا کہ وہ ڈوڈاکینز کے جزیرے کو خالی نہ کریں۔ اطالیہ پہلے بھی شاید اس کے لئے طیار نہ تھا اب اُسے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانا ہو گیا

ترکی نے مجبوراً اس محاذ کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کی طرف نگاہ کی، لیکن برطانیہ نے اپنی معذوری کا اظہار کیا،

کیونکہ اُس وقت زار کی حکومت کے خلاف وہ کوئی قدم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا، اس لئے ترکی کے سامنے صرف ایک راہ رہ گئی، اور وہ یہ کہ ترکی جرمنی کی حمایت حاصل کرے

اسی دوران میں جب اطالیہ نے ڈوڈاکینز کا جزیرہ ترکوں کے حوالہ کرنے سے انکار کیا تو برطانیہ اور فرانس کو تشویش پیدا ہوئی کیونکہ اس طرح اطالیہ کو بحیرہ روم میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی جاتی تھی۔ اس موقعہ پر برطانیہ اور فرانس نے ترکی اور یونان دونوں کو صلح کرنے پر مجبور کیا اور یہ طے پایا کہ لندن میں ایک کانفرنس ہو اور وہ کانفرنس جو کچھ طے کردے دونوں حکومتیں اُس کو مان لیں۔ کانفرنس ہوئی لیکن اُس کی پالیسی سے ترکی متفق نہ ہوسکا اور اُس نے احتجاج شروع کیا۔ جرمنی ایسے موقعہ کی تاک ہی میں بیٹھا تھا، اُس نے ترکی کی حمایت کی اور اس طرح ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں ترکی، جرمنی کا حلیف بن گیا

لیکن اس لڑائی میں ترکی کیوں برطانیہ کی طرف مایل ہے، اس کے کئی سبب ہیں۔ سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ ترکی میں جمہوریت کی روح بہت قوی ہوگئی ہے اور قدرتاً اسے انھیں حکومتوں کے ساتھ دلچسپی ہونا چاہئے جو اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہتی ہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ جس وقت مصطفےٰ کمال نے نئی ترکی کی بنیاد ڈالی تھی تو یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ترکی خالص قومی حکومت ہوگی اور یوروپ کی طرف بڑھنے کا خیال وہ ترک کردیگا، لیکن درۂ دانیال کا مسئلہ سخت نزاعی مسئلہ تھا، اس لئے مغربی حکومتوں نے آبنائے باسفورس سے لیکر درۂ دانیال تک کا حصہ بدستور ترکی کے پاس رہنے دیا اور اسی کے ساتھ یوروپ کا اتنا ٹکڑا بھی جو درۂ دانیال کی حفاظت کے لئے ترکی کے پاس رہنا ضروری تھا

چونکہ درۂ دانیال خود ترکی کے حفظ و بقا کے لئے بھی ضروری ہے، اس لئے قدرتاً اسے برطانیہ ہی کی طرف مایل ہونا چاہئے کیونکہ درۂ دانیال کی حفاظت کے لئے بحری امداد کی ضرورت ہے اور یہ زیادہ تر برطانیہ ہی سے ملسکتی ہے

تیسرا سبب یہ ہے کہ تجارتی حیثیت سے بھی ترکی کا فایدہ برطانیہ کا ساتھ دینے میں ہے، چنانچہ یہاں کی پیداوار کا اکثر حصہ برطانیہ ہی میں جاتا ہے اور اس کی مجموعی قیمت سوا کرور پونڈ سالانہ سے کم نہیں

ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ ترکی کے جغرافیائی تعلقات جزائر نمائے عرب اور عراق سے بہت زیادہ ہیں اور یہاں برطانوی فوجوں کا اتنا زبردست اجتماع رہتا ہے کہ ترکی کو قدرتاً دبنا ہی چاہئے۔ الغرض یہ ہیں وہ اسباب جن کی بناء پر ترکی کو برطانیہ کے ساتھ ہمدردی ہونا چاہئے، لیکن میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ یہ ہمدردی ترکوں کو لڑائی کی حد تک کھینچ لاسکے گی

اگر ترکی، جرمنی کے خلاف لڑائی پر آمادہ ہوسکتا، تو یہ فرض اسی لڑائی کے دوران میں کئی بار اس پر عاید ہوچکا ہے اور وہ کبھی کا شریک جنگ ہوچکا ہوتا

جب جرمن فوجوں نے بلغاریا کی سرحد پر اجتماع کیا تو ترکی نے کہدیا کہ وہ بلغاریا کے اندر سے جرمن افواج کا عبور گوارا نہ کرے گا، لیکن وہاں جرمن فوجیں پہونچ بھی گئیں اور ترکی خاموش رہا، اس کے بعد ترکی نے اعلان کیا کہ اگر یونان پر جرمنی نے حملہ کیا تو وہ ضرور اس کی مدد کرے گا، لیکن آج جرمن جھنڈا یونان کے پایۂ تخت پر لہرا رہا ہے اور ترکی بدستور خاموش ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر چند ترکی، برطانیہ کا ساتھ دینا چاہتا ہے لیکن لڑائی کی آگ میں کودنے کو طیار نہیں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگا یا نہیں۔ اسوقت صورت حال یہ ہے کہ جرمنی بلقان کی تمام ریاستوں پر تو قابض ہوچکا ہے لیکن برطانیہ کی سلطنت کا کوئی حصہ اس کے قبضہ میں نہیں آیا

یونان اور بحر ایجین کے بعض جزایر لینے کے بعد نہر سویز اور عراق و فلسطین سے وہ قریب تر ہو گیا ہے اس نے کوئی وجہ نہیں کہ وہ آگے نہ بڑھے اور بلقان کی لڑائی یونان ہی تک پہونچکر ختم ہو جائے

اس صورت میں یقیناً وہ ترکی سے کہے گا کہ اپنی حدود سے جرمن فوجوں کو گزرنے کی اجازت دے، چنانچہ ترکی کے بعض ذمہ دار لوگوں کی نقل و حرکت سے پتہ چلتا ہے کہ شاید اس قسم کی گفتگو شروع بھی ہو گئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ترکی اس کی اجازت دیدے گا ؟

اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اگر ترکی نے اجازت نہ دی تو جرمنی اس پر بھی حملہ کر دیگا یقینی ہے کہ اس صورت میں برطانوی فوجیں جو عراق و موصل میں موجود ہیں، ترکی کی پوری مدد کریں گی اور ہو سکتا ہے کہ جرمنی کو اس طرح کچھ عرصہ تک اُلجھایا جا سکے، لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ نازی سیلاب کو بالکل اس طرح روک دیا جائے گا۔ کیونکہ روس کی طرف سے بھی ترکی کو پورا اطمینان نہیں ہے اور اگر یہ خبر صحیح ہے کہ اس نے ایران سے صوبہ آذربیجان کا مطالبہ کیا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کی پالیسی یقیناً برطانیہ کے خلاف ہوتی جاتی ہے

جاپان کے ساتھ روس کا معاہدہ یقیناً کسی خاص اندرونی سمجھوتے کی بنا پر ہوا ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ یہ سمجھوتا یہی ہو کہ روس ایشیا میں اپنے اثرات وسیع کرے گا اور جاپان، برما اور ہندوستان کی طرف بڑھے گا

اسی کے ساتھ آپ اس خبر کو بھی شامل کیجئے کہ پرتگال اور اسپین میں نازی اثرات بڑھ رہے ہیں تو آیندہ نقشۂ جنگ کی صورت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ غالباً جبرالٹر اور سواحل افریقہ سے لیکر نہر سویز، بحر ایجین، درۂ دانیال ترکی، عراق بلکہ ایران و ہندوستان تک ہر جگہ یہ آگ ایک ساتھ بھڑک اُٹھے گی، لیکن ان خطرناک حالات میں ہمیں مایوس نہ ہو جانا چاہئے کیونکہ امریکہ بھی جلد اس لڑائی میں برطانیہ کے ساتھ شریک ہونے والا ہے جس سے برطانیہ کی قوت مقاومت یقیناً بہت بڑھ جائے گی اور یہی وہ چیز ہے جس پر ہمیشہ لڑائیوں کی کامیابی کا انحصار رہا ہے اور اب بھی برطانوی حکومت کو اس پر پورا یقین ہے

مسٹر چرچل کی تازہ ترین تقریر

بلقان کی لڑائی کے بعد مسٹر چرچل وزیر اعظم انگلستان نے سب سے پہلی تقریر ۲۸ اپریل کو کی اور جیسا کہ مسٹر چرچل کا قاعدہ ہے، انھوں نے پوری صفائی کے ساتھ اپنی مایوسیوں کا بھی ذکر کیا اور اُن غلطیوں کا بھی جو اس جنگ کا باعث ہوئیں، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا کہ اگر امریکہ نے برطانیہ کا ساتھ دیا جس کا پورا یقین ہے تو پھر ان کے ذرایع جنگ و دفاع اتنے وسیع ہو جائیں گے کہ جرمنی کو آخر میں [illegible] کیا جا سکے گا۔ مسٹر چرچل نے جنگ کے مستقبل کی طرف سے بھی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ بحر روم اور [illegible] مراکش و اسپین، بلکہ روس و ترکی تک اس آگ کے پھیل جانے کا اندیشہ ہے، اور ہو سکتا ہے کہ [illegible] کے اندر آجائیں اور بحر کا سپین میں بھی اس کا اقتدار قائم ہو جائے لیکن اسی کے ساتھ انھیں [illegible]

[illegible]

میرزا غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی

میرزا غالب مرحوم نے کلیاتِ فارسی کی ترتیب و طباعت کے بعد جس قدر فارسی اشعار لکھے تھے اُنھیں "سبدِ چین" کے نام سے اپنی زندگی میں شایع کر دیا تھا۔ لیکن یہ تتمہ اُن کے تمام تازہ شعروں پر حاوی نہ تھا۔ وہ قصیدے، قطعے، اور رباعیاں جنکی نقول اُن کے پاس محفوظ نہ تھیں، یا بروقتِ اشاعت کہیں سے دستیاب نہ ہو سکی تھیں، اس مجموعہ میں بار نہ پا سکیں۔ چنانچہ ایسی متعدد فارسی رباعیاں "مکاتیبِ غالب"[1] میں چھپ چکی ہیں، جو "سبدِ چین" کے پہلے ایڈیشن میں نہیں ملتیں۔

میرے کرم فرما جناب مالک رام صاحب نے "مکاتیبِ غالب" کی اشاعت کے بعد "سبدِ چین" کا دوسرا اڈیشن شایع کیا، تو اُس میں "مکاتیبِ غالب" کے حوالہ کے ساتھ وہ فارسی اشعار بھی درج کر دئے۔ لیکن اب بھی میرزا صاحب کے فارسی کلام کا کچھ حصہ باقی ہے، جو یا تو ابھی تک شرمندۂ طباعت نہ ہو سکا اور یا اُس کی شہرت نہ ہونے پائی۔ موخر الذکر صنف میں اُن کی ایک فارسی مثنوی کا شمار ہو سکتا ہے، جو اُنھوں نے اپنے حقیقی بھانجے، میرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ مثنوی "دعاء الصباح" کا ترجمہ ہے، جو امیر المومنین حضرت علی بن ابیطالب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

نسخہ کی کیفیت اس مثنوی کا قلمی نسخہ کتاب خانۂ رامپور کے ایک مجموعہ میں نیازمند کو دستیاب ہوا، جو ۷ ½ × ۴ ¾ سائز کے ۲۲ صفحات پر سنہ ۱۲۸۳ھ میں امروہہ کے ایک بزرگ محمد علی بن سید برخوردار علی نامی نے نقل کیا تھا۔

اس قلمی نسخہ میں اولاً اصلِ دعا کا عربی متن سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اُس کے نیچے منثور فارسی ترجمہ شنگرفی روشنائی سے اور ترجمۂ نثر کے نیچے منظوم ترجمہ، متنِ عربی کی ہمرنگ سیاہ روشنائی سے تحریر ہے۔ عبارت کے چاروں طرف قرمزی دُہری جدول ہے اور متنِ عربی، ترجمۂ نثر، اور ترجمۂ نظم کو باہم جدا کرنے کے لئے بھی قرمزی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ یہ کتاب مجموعہ کے ورق ۵۶ ب سے شروع ہو کر ۶۷ ب پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن کاتبِ مجموعہ نے ہر رسالہ کے اوراق پر جداگانہ ہندسے ڈالے ہیں۔ کاغذ باریک یورپی ہے۔ کہیں کہیں پیوندکاری اور اکثر جگہ کرم خوردگی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

مثنوی کا آغاز مفاتیح النجات، مصنفہ محمد باقر بن محمد مومن خراسانی السبزواری، کے ایک اقتباس سے ہوتا ہے جس میں اس دعا کی فضیلت اور اس کے نام کا ذکر ہے اور کسی بزرگ کی زبانی یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلم کا

---

[1] مکاتیبِ غالب، میرزا صاحب کے اُن ۱۱۵ غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے، جو نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں [illegible] کو مختلف اوقات میں میرزا صاحب نے لکھے تھے۔ یہ مجموعہ ایک مفصل دیباچہ اور تشریحی حاشیوں کے ساتھ نہایت عمدہ ٹائپ میں شایع کر دیا گیا ہے، اور چار روپیہ قیمت میں کتاب خانۂ ریاست رامپور سے مل سکتا ہے۔

ایک صفحہ پر دعا، جس کی تاریخ کتابت ۱۲۸۴ھ تھی۔ اس میں درج تھا کہ دعا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے
تمہید کا عنوان "اسناد دعاء صباح" ہے، جو شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک دعا لکھی ہے جو دعاء الصباح سے پہلے
پڑھی جانا چاہئے۔ اس کا عنوان ہے "ہٰذا الاعتصام لیقرأ اربع مرات"۔ اور یہ بھی شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد دوسرے ورق کے دوسرے صفحہ سے "دعاء صباح" شروع ہوتی ہے۔ اس کے آغاز میں دعاء الصباح شنگرفی
روشنائی سے ایک دُہرے خط کے نیم شنگرفی نیم دائرہ کے اندر لکھا گیا ہے۔ اس صفحہ پر جدولوں کے بالائی گوشوں میں دو شنگرفی چھوٹے
چھوٹے دائرے بھی بنائے گئے ہیں۔

دعاء الصباح ورق ۱۱ ب پر ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد ۱۲، الف و ب پر امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول دُعا،
ایک اُردو عنوان کے نیچے ترجمۂ نثر و نظم کے ساتھ درج ہے۔ اس کے خاتمہ پر کاتب نے لکھا ہے:

"دعای ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام معہ ترجمۂ نثر و نیز ترجمۂ منظوم مرزا اسد اللہ خاں غالب موسوم بہ دعای صباح
حسب الایمای مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ، بمطبع منشی نول کشور رونق طبع یافتہ۔ بہ دو بست و سوم
شہر رجب سنہ یکہزار و دو صد و ہشتاد و چہار ـــ بندہ حقیر فقیر محمد علی بن سید برخوردار علی امروہوی نقل بر داشت۔"

مندرجہ بالا عبارت کے جن الفاظ کے ذریعہ ۱۲۸۴ھ ظاہر کیا گیا ہے، یہاں غالباً کاتب نے سالِ طباعت کتاب نقل کیا تھا۔
لیکن بعد ازاں اُس کو مٹا کر سالِ کتابت لکھا ہے۔ بہر حال اس سے اتنا یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمۂ منظوم میرزا عباس بیگ
صاحب کی فرمایش پر منشی نول کشور کے مطبع لکھنؤ میں میرزا غالب (متوفی ۱۲۸۵ھ) کی زندگی میں چھپا تھا، اور ان کے انتقال سے ایک
سال، تین مہینے، کچھ دن قبل نسخۂ مطبوعہ سے اس کی نقل کی گئی۔

کاتب کے خاتمہ کے ظاہری الفاظ سے، جو در اصل نسخۂ مطبوعہ کا خاتمہ ہے، یہ مترشح ہوتا ہے کہ دونوں ترجمے میرزا غالب
کے ہیں، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف ترجمۂ منظوم میرزا صاحب کا ہے، نثر کا ترجمہ کسی عربی داں عالم نے کیا ہوگا جس پر لفظی اصلاح
ممکن ہے میرزا صاحب نے بھی دیدی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب زبانِ عربی کے ایسے ادیب نہ تھے کہ دعاء الصباح کی
عبارت کا از خود ترجمہ کر لیتے۔ میرے اس خیال کی تائید خاتمہ کی عبارت کو بغور پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ اگر دونوں ترجمے میرزا صاحب
کے ہوتے، تو عبارت یوں ہونی چاہئے تھی: "معہ ترجمۂ نثر و ترجمۂ منظوم از مرزا اسد اللہ خاں غالب"۔ یقیناً خاتمہ نگار نے نیز کا اضافہ
کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس عبارت میں صرف موخر الذکر فقرہ غالب سے متعلق ہے۔

مثنوی کا رتبہ بلحاظِ شعریت میرزا صاحب کی یہ مثنوی کوئی بلند پایہ نظم نہیں معلوم ہوتی۔ غالباً اسی باعث سے میرزا صاحب نے
اس کا تذکرہ کسی جگہ نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے شاگردِ رشید حالی مرحوم بھی یادگارِ غالب میں اسکا ذکر نہ کر سکے
لیکن جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ میرزا صاحب نے اصل دعا کے مطلب اور مفہوم کو شعر فارسی میں پورا
پورا ادا کر دینے میں کمال کر دکھایا ہے، حتی کہ بہت سے فقروں کا ترجمہ اُتنے ہی مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے، جتنے مختصر الفاظ اصل عربی
کے تھے اور شاید ہی کسی جگہ اصل عربی کا کوئی لفظ میرزا صاحب کے ترجمہ کی گرفت سے بچ نکلا ہو۔ مثلاً دعا کا ایک ٹکڑا ہے:

یا مَن اَرقَدَنی فی مِهادِ اَمنِهٖ
وَاَیقَظَنی اِلٰی ما مَنَحَنی بِهٖ مِن مِنَنِهٖ وَاِحسانِهٖ

اس کا ترجمہ میرزا صاحب کی زبان سے اس طرح ادا ہوتا ہے:

ای کہ در گہوارۂ امن و امان، خواب را در چشم من کردی نہان!
باز چشم من بہ بیداری کشاد، چون بہ احسان و عطائی کو بداد

یا مثلاً دعا کا فقرہ ہے:

وَاَجْرِ اللّٰھُمَّ بِھَیْبَتِکَ مِنْ آمَاقِیْ زَفَرَاتِ الدُّمُوْعِ
وَاَدِّبِ اللّٰھُمَّ نَزَقَ الْخُرْقِ مِنِّیْ بِاَزِمَّۃِ الْقُنُوْعِ

میرزا صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

دایم از بیم خودت، اے کردگار! اشکہا از گوشۂ چشمم ببار
سبکی تا دانیم تادیب کن از شکیبائی مرا تہذیب کن

لیکن بعض اُن مقامات پر جہاں اصل عربی الفاظ زیادہ مطالب پر حاوی تھے، میرزا صاحب کو ایک یا دو توضیحی شعروں کا اضافہ بھی کرنا پڑا ہے۔ مثلاً دعا کا فقرہ ہے:

"یَا مَنْ قَرُبَ مِنْ خَطَرَاتِ الظُّنُوْنِ، وَبَعُدَ عَنْ مُلَاحَظِ الْعُیُوْنِ"

میرزا صاحب فرماتے ہیں:

ای کہ نزدیکی بخطراتِ ظنون! دور تر ہستی ز دید ارِ عیون!
یعنی از دیدہ شدن ذاتش بری ست برکرانہ از جہاتِ پیکری ست
گوہر او از پس و پیش است بیش گرد ہستی را محاطِ علمِ خویش،

اسی طرح جہاں میرزا صاحب کو اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار کا مناسب موقع ملا ہے، وہاں بھی متعدد شعر بڑھائے ہیں۔ مثلاً دعا کا فقرہ ہے:

"وَبَابُکَ مَفْتُوْحٌ لِلطَّلَبِ وَالْوُغُوْلِ"

میرزا صاحب فرماتے ہیں:

بابِ تو مفتوح باشد جاودان بر رخ خواہندہ و ناخواندگان
طالبان را ہم طفیلی آشکار، بر درِ بکشادہ ات یابند بار
ہر کہ می خوانیش، می آید بزود، وانکہ ناخوانیش نیز آید فرود
این درت بر روی کس بربستہ نیست خواندہ و ناخواندہ چون اینجا یکیست
از کمالِ جودِ تو این فتحِ باب، تا ہمہ گردند از تو بہرہ یاب
بخششِ خود را تو زنجیرِ دراز برکشیدی، ای خدای بے نیاز
خود نمی بندی درت بر روی کس جز بہ رحمت می نبینی سوی کس
لطفِ تو عام ست و ہرگز نیست خاص دور تر رفتہ از این در اختصاص

بستہ نبود بر رخِ کس باب تو — ہرکسی رخشاں بود از تابِ تو
ابرِ تو ریزد بہ ہر دامن گہر — ہرکسی را فیضِ تو آید ز در
ممسکی و بخل در تو یافت نیست — آنکہ در ہستی بود بی بہرہ کیست؟

اگرچہ ان اشعار اور اسی قسم کے بعض اور شعروں میں نسبتاً زیادہ لطف پیدا ہوگیا ہے، لیکن یہاں بھی شاعر کی فکر اصلِ الفاظ کی قید سے مطلقاً آزاد ہوکر پرواز نہیں کرسکی ہے۔ اس لئے میرزا صاحب کی دوسری فارسی مثنویوں کے حمدیہ یا مناجاتی اشعار جیسی والہانہ کیفیت ان میں نہیں پائی جاتی۔

بہرحال یہ مثنوی اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہمیں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کے ترجمہ کی کوشش کا علم ہوتا ہے۔ چونکہ مطبع نول کشور سے اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا، اور نہ کسی کتاب خانہ کی فہرست میں اس کا ذکر نظر سے گزرا، اس لئے میں نے کچھ اُس دلچسپی کی بنا پر جو مجھے میرزا صاحب کی شاعری سے ہے، اور زیادہ تر اپنے دوست مالک رام صاحب کے اصرار پر، جو سبدِ چین اور ذکرِ غالب کے ذریعہ "غالب نوازی" کا ثبوت دے چکے ہیں، اس نظم کو شایع کر دینا مناسب خیال کیا۔

اس میں شک نہیں کہ میرزا صاحب کے ترجمہ کی خوبی اُسی وقت اچھی طرح منکشف ہوسکتی تھی، کہ اس کے ساتھ عربی دعا بھی چھاپی جاتی، لیکن عربی ادب کے ساتھ دلچسپی اس قدر کم ہوچلی ہے کہ مجھے خطرہ ہوا، مبادا اربابِ ذوق کی نازک طبیعتوں پر میری یہ جرأت بار گزرے۔ اس لئے سردست صرف ترجمہ کی اشاعت پر اکتفا کی گئی۔ اگر حالات نے مساعدت کی اور کبھی اس مثنوی کی طباعت بشکلِ کتاب ممکن نظر آئی، تو اُسی طرح چھاپی جائے گی، جیسے مطبع نول کشور میں میرزا صاحب کی حیات میں چھپی تھی۔

اصلاحِ متن

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ میرزا صاحب کے اس ترجمۂ منظوم کی نقل میں کاتب نے متعدد غلطیاں کی تھیں۔ چونکہ محل و موقع سے ان کے خلاف شہادت بسہولت دستیاب ہوتی تھی، اس لئے میں نے زیرِ نظر متن میں اُن کی تصحیح کرکے حاشیہ میں اصل کا لفظ لکھ دیا ہے، تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو آزادانہ رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔

یہاں مثال کے بطور ایک غلطی کا تذکرہ کرتا ہوں۔ قلمی نسخہ میں ایک شعر اس طرح لکھا ہے:

ہرکرا خواہی، تو روزی میدہی — بیش از اندازہ مقدارش دہی

ظاہر ہے کہ اگر اس شعر میں دہی کو ردیف قرار دیا جائے، تو قافیہ ندارد ہے۔ اور اگر اسکو قافیہ مانیں، تو چونکہ لفظاً و معناً قافیہ دونوں مصرعوں میں ایک ہے، اس لئے تکرارِ قافیہ لازم آتی ہے جو ایک شعر کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے ایطائے جلی کی کھلی ہوئی مثال ہوگی۔ میرے عقیدہ میں میرزا صاحب سے اس قسم کی غلطی کے سرزد ہونے کا امکان ہی نہیں، اس لئے میں نے اس کو کاتب کی تصحیف پر محمول کیا ہے، اور مصرعۂ ثانی کے الفاظ "مقدارش" کو "مقداری" بنا لیا ہے، تاکہ دہی ردیف اور تی اور مقداری قافیہ بن جائیں۔ چونکہ خطِ شکست میں "مقداری" کی تی کو ش پڑھا جا سکتا ہے، جس کا تجربہ ہر ادیب کو ہوگا، اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس ادبی جرأت کو اربابِ فن قبول فرمالیں گے اور میرزا صاحب کے مذکورہ شعر کو اس طرح پڑھیں گے:

ہرکرا خواہی تو روزی می دہی — بیش از اندازہ مقداری دہی

امتیاز علی عرشی

دعاء الصباح

ای خدای داوری[۱] کو برگشاد / از درخشیدن زبانِ بامداد
پاره های تارِ شب را آفرید / پرده های تارِ ظلمت درکشید
کرد صنعِ چرخِ گرداں استوار / در مقادیرِ تزیین آشکار
ای خداوندی کہ تاب آفتاب / کرد یکجا با فروغِ التہاب
چہرۂ مہرِ درخشاں برفروخت / باہمہ تابش در آتش نخت سوخت
ای کہ ذاتش را بذاتش رہبری / گشت از ہمجنسیِ عالم بری
درجہاں مثلش[۲]، ہمجنس کیست / ہیچ مخلوقی ورا ہمجنس نیست
برتر از کیفیت آمد گوہرش / کیفیتہا نیستی گیرد برش
ای کہ نزدیکی بخطراتِ ظنون! / دور تر ہستی زدیدارِ عیون
یعنی از دیدہ شدن ذاتش برکناست / برکرانہ از جہاتِ پیکری است
گوہرِ او از پس و پیش است بیش / کرد ہستی را احاطِ علمِ خویش
ہرچہ در عالم بہ ہستی رو نمود / پیش از ہستی بعلمِ او کشود
ای کہ در گہوارۂ امن و اماں / خواب را در چشمِ من کردی نہاں
باز چشمِ من بہ بیداری کشاد / سوی احسان و عطائی کو بداد
دستِ او بجہت دست ہمزباں / قدرتِ او از بدی دادم اماں
بزرست، ای داورِ ہستی! درود / برکسی کو سوی تو راہم نمود،
در شبِ تاریک تر شد رہنما / سوی درگاہِ تو، ای گیتی خدا!
از سبب ہای تو، ای ربِ لامعین! / از شرف گیرندۂ حبل المتین[۳]،
آں فروزاں گوہری ویژہ نژاد / آنکہ بر دوشِ بلندی پا نہاد
آنکہ پیدا در نخستیں روزگار / پاکی او بر جانِ لغزاں استوار
نیز بر آلش کہ از بس طاہر اند / پاک دین و برگزیدہ ظاہر اند

نیک کرداراں و یزداں برگزین / برگزیدہ گوہرانِ پاک دین
ای خدا! بگشا مصابیح الصباح / از برای ما، بمفتاح الفلاح
یعنی ای دادارِ گیتی دادگر! / برگشا بر ما تو درہای سحر
از کلیدِ لطف درہا باز کن / بہر ما سامانِ رحمت ساز کن
بہتریں پیرایۂ رشد و سداد / دربرم پوشاں تو، اے رب العباد!
برنشاں در من ینابیع الخشوع / از روانم کن رواں عین الخضوع
پیشگاہِ عظمت، اے بے نیاز! / کن رواں از چشمِ من آبِ نیاز
دایم از بیمِ خودت، اے کردگار! / اشکہا از گوشۂ چشمم ببار
سبکیِ نادانیم تادیب کن، / از شکیبائی مرا تہذیب کن
گر نباشد از تو آغازِ کرم / ورنہ توفیقِ تو باشد ہمرہم
کس نیارد بردنِ من سوے تو / در کشادہ تر رہی در کوے تو
گر مرا حلمِ تو بسپارد بہ آز / برکشد زنجیرۂ حرصم دراز
کس نیامرزد گناہم اے خدا! / سرنگوں افتادنِ من در ہوا
نصرتِ تو گر مرا ناید[۴] معین / گاہِ جنگِ نفس و شیطانِ لعین
ایں چنیں خذلاں بحرمانم کشد / در ہمہ رنج و تعب جانم کشد
خود مرا می بینی، اے ہستی خدا! / کآمدم سویت با امید و رجا
دوست پیوستم باطراف الحبال / چوں گنہ افگندہ دورم از وصال
چوں بدوری در شدم از بارگاہ / زانکہ چیرہ شد بمن دستِ گناہ
زشت مرکوبی کہ نفسِ من برآں / از ہوا و حرص شد دایم رواں
وا! از تسویلِ نفسِ ذو فنون / کاں بود از آرزوہای دگرگوں
آہ! زاں خواہش کزو برخاستہ / آرزوہا آرزوش آراستہ

---

۱ اصل: داور ۲ اصل: ہمتی (ش) - چونکہ میرزا صاحب نے سرورق کے نام کے خطوط میں تصریح کر دی ہے کہ بجز اُس لفظ کے جس کے آخر میں ت ساکن ماقبل مفتوح ہو، اور تمام الفاظ کے ساتھ ہی تہ تم بحسن ظاہر لکھے جاتے ہیں، بنابریں یہاں بھی متن میں ظاہر لکھا گیا ہے۔ ۳ اصل: المتین ۴ اصل: ناید

هر زمان گامی بهر سو پیش برد
بر درازیها کشد طول امل

نیست، نادان نفس فرمان ناپذیر
جرأت و گستاخی و عصیان کند

ای خداوندا! من از دست رجا
سوی تو بگریختم با اضطرار

در پناهای تو، ای گیتی خدا!
درگزار[1] از من تو، ای ربّ الورا!

لغزشی گر ز من بیاید آشکار
عفو کن افتادنِ من در بلا

زانکه هستی سرور و معبودِ من
در زمان هر کجا گردیدنم

خود چه سان میرانی، ای پروردگار
یعنی آن مسکین که آدر دست رو

از گناهِ خود گریزان آمده
ره پژوهی راکه خواهد راهِ تو

سوی درگاهِ تو باشد تیزگام
تشنه را بازمیداری چرا؟

آب جریان آمده بر چشمه سار
زینهار این حوضِ تو پر از زلال

بابِ تو مفتوح باشد جاودان
طالبان و هم طفیلی آشکار

هر که بیخواهش می آید بزود
این درت بر روی کس بسته نیست

وکلالِ جودِ تو این فتحِ باب
بخششِ خود را تو زنجیرِ دراز

فرشِ خواهشها بهر سو گسترد
تا بدوری افتد از حسنِ عمل

کو بود پیشِ خدا دشمن ولی
سرکشی از طاعتِ یزدان کند

کوفتم در وازهٔ رحمِ ترا
از وفورِ خواهشِ نااستوار

باز پیوستم سرانگشتِ ولا
هر چه کردم از گناه و از خطا

درگزار از من تو، ای پروردگار!
باز دار از هر چه زاید زان عنا

غایتِ هر خواهش و مقصودِ من
نیز در هنگامِ آرامیدنم

بینوائی کامدت با اضطرار
با همه صد ناشکیبی، سوی تو

وز خطای خود پشیمان آمده
قصدِ او باشد همه درگاهِ تو

میکنی دورش چرا از راهِ کام؟
آنکه سوی حوضِ تو شد رهگرا

تا لبِ خود تر کند زان آبشار
پُر بود هنگامِ قحط و خشک سال

بر رخِ خواهنده و ناخواندگان
بر درِ بگشاده ات یا بندبار

وانکه ناخوانش نیز آید فرود
خوانده و ناخوانده، جود اینجا یکیست

تا همه گردند از تو بهره یاب
برکشیدی، ای خدای بی نیاز

خود بخود [illegible]
لطف تو [illegible]

[illegible] باب تو
هر تو ریزد بهره دامن [illegible]

[illegible] و بخل در تو یافت نیست
غایتِ امول و مسؤلم توئی

این زمامِ نفسِ خود را، ای خدا!
مرکبِ نفسم که از بس سرکش است

با رضایت کرده ام فرمان پذیر
هر چه ریزندش، همه گیرد بسر

هر چه پیش آیدش، گیرنده شود
گر همه تلخی بریزندش بکام

خواهشِ خود را نماید بی نشان
از گناهم بود بس بارِ گران

بی نشانش کردم از الطافِ تو
وین هوای نفسِ من گمراه کن

سوی لطف و رافتت بسپردمش
ای خدا! بر من بیار این باملاد

وین سحر را کن تو، ای پروردگار
شام گاهم را بکن بهرم سپهر

نیز آن شامم مرا کن پاسدار
با خدمت، بر هر چه می خواهی توان

ملکِ خود را باز بستانی همین
هر کرا خواهی، تو عزت میدهی

نیکی و خوبی همه در دستِ تست
بر همه هستی توانائی تراست

هر جهت [illegible]
دور تر رفت از [illegible] اختصاص

هر کسی [illegible] بود از [illegible]
هر کسی را فیضِ تو آید [illegible]

آنکه در هستی بود بی بهره کیست
آخر مقصود و مامولم توئی،

کرده ام بر بستهٔ بندِ رضا
هر زمان سر بر فلک چون آتش است

تا بود در مجلسِ فرمان اسیر
سر نتابد از قضا و از قدر

هر چه بربندش، پذیرنده شود
در کشد یکسر چنان کز شهد جام

خواهشِ تو پیش گیرد جاودان
رافت و رحمِ تو کردش بی نشان

ساختم معدومش از اعطافِ تو
از طریقِ راستی بیراه کن

سوی غفاری و عفوت بردمش
با فروغِ راستکاری و رشاد

از برای دین و دنیا پاسدار
از فریبِ دشمنانِ کینه ور

از هوا و ز مهلکاتِ روزگار
هر کرا خواهی، دهی ملکِ جهان

از کسی کش خواهش کردی چنین
هر کرا خواهی، تو ذلت میدهی

هر چه باشد هستیش، با دستِ تست
دیگری را این توانائی کجاست؟

[1] اصل: بگذار - لیکن میرزا صاحب کے املا کے خلاف تھا اس لئے اصلاح کردی گئی ہے - [2] اصل: بستہ جود بہر سو آمدہ -

[illegible] آدمی ہمیں — باز [illegible] درونِ خبث چنیں
آوری زندہ را از مردہ تن — می برآری مردہ از زندہ بدن
خوں ز جسم و جسم را از آب و خوں — از توانِ خود ہمی آری بروں
بیضہ از مرغ و مرغ از بیضہ را — می برآری تا شود ہستی گرا
یارتا فانی معدا را ناشناس — عالمی یزداں شناو باسپاس
بلناز دانا تو ناداں آوری، — کو بَرَد ری اقتدار از دانشوری
ہر کرا خواہی تو روزی می دہی — بیش از اندازۂ مقداری دہی[۱]
ہرچہ خواہد عفوِ تو خود آں کند، — چارۂ آں جرم و آں عصیاں کند
برزداید ہرچہ کردم از گناہ — برکرانم آرد از کارِ تباہ
لطفِ او نگذاردم[۲] در بندِ آز — تا نمانم بستۂ بندِ نیاز
جز تو معبودی نشد ہستی گرا — بہر تو آریم تسبیح و ثنا
مر ترا دایم ستایش گستریم — در ستایشہا نیایش آوریم
کیست آں کو داند حلم و تواں — پس نیایدیم تو او را بجاں ؟
کیست آں کو انچہ ہستی داندت — پس ز تو نا ترسد و ناخواندت ؟
از توانِ تست تالیف الفِرَق، — باشد از رحمِ تو تفلیق الفلق
فرقہ ہای مختلف یکجا کنی، — صبح را از تارِ شب پیدا کنی
تارِ شب را ساختی رخشندہ رخت — آب را کردی رواں از سنگ سخت
آب را کردی دو گونہ آشکار — یک بود شور و دگر شیریں گوار
از فشارندہ کہ آں باشد سحاب — خود فرود آوردۂ ریزندہ آب
ساختی خورشید و مہ را آشکار — در جہاں مثلِ چراغِ نوربار

بی نیازاں گر احتمالِ رنج و درد — ماندگی آید ترا از کار کرد
ای یگانہ! با ہمہ عز و بقا — بندگاں را پست کردی در فنا
ای خدای پاک و ای ربِ ودود! — از فراز بر فرود آور درود!
بر محمد مصطفیٰ و آلِ او، — آں گزیدہ گوہرانِ پاک خو!
بشنو آوازم، پذیرا کن دعا — دشمنانم را گزیں بہرِ فنا
از کرم، امیدِ من کن استوار — ای کہ خوانندت پیِ کشفِ ضرار!
ای بعسر و یسر ما مولیِ ہمہ! — وی ز تو انجاحِ مسئولِ ہمہ!
حاجتِ خود پیشِ تو آوردہ ام — ناگزیری بر تو عرضہ کردہ ام
پس بہ ناکامی مگردانم ز جود — از گزیدہ بخششِ خود ای ودود!
ای دہشور، ای دہشور مہرباں! — مہرباں ترا ز ہمہ رحمت کناں!

یا الٰہی[۳]! قلبِ من محجوب و تنگ — عقلِ من مغلوب و نفسِ من بہ ننگ
حرصِ من پیوست بر من چیرہ دست — کثرتِ عصیاں، طاعت اندک است
معترف آمد زبانم در ذنوب — چیست تدبیرِ من؟ علام الغیوب؟
ای گنہ آمرز و ستار العیوب! — عفو کن از من، ببخشایم ذنوب
ای بہ ہنگامِ عقوبت سخت گیر! — وی بہ حلم و مغفرت پوزش پذیر!
حاجتِ من بہرِ قرآں کن روا! — وز برای حضرتِ خیر الوریٰ!

ای خدا، از آسماں آور فرود!
بر نبی و آلِ اطہارش درود!

---

[۱] اصل: مقدارش دہی۔ [۲] اصل: نگذاردم۔ [۳] یہاں سے امام زین العابدین علیہ السلام کی مناجات کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔

وقت کا سب سے بڑا مسئلہ

کس قدر عجیب بات ہے کہ دنیا جتنی ترقی کرتی جا رہی ہے، امن و سکون اتنا ہی زیادہ مفقود ہوتا جاتا ہے اور انسان کی ذہنی و علمی دستگاہ جس قدر وسیع ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی زیادہ اختلاف دنیا میں بڑھتا جاتا ہے

جب تک دنیا میں مذہب کی حکومت رہی اس نے فتنہ و فساد برپا رکھا اور اب کہ علم و حکمت کی ترقیاں ہیں ان کے مظالم سے سر چھپانے کی فرصت نہیں۔ اس کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں، لیکن سب سے بڑا سبب جسے مرکزی حیثیت حاصل ہے یہ ہے کہ انسان ابھی تک کوئی قابل اطمینان اجتماعی نظام ایسا قایم نہیں کر سکا کہ تمام افراد انسانی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کر سکیں

اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ تقسیم دولت کا ہے اور جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے دُنیا کو چین نہیں مل سکتا۔ انسان جب وحشی تھا تو غذا کے لئے لڑتا تھا اور اب کہ وہ مہذب و شائستہ ہو گیا ہے، اسباب عیش و تنعم کے لئے لڑ رہا ہے۔ الغرض اس نزاع کا سبب ہر زمانہ میں یہی رہا ہے کہ ایک کے پاس ضروریات و تنعمات حاصل کرنے کے ذرایع زیادہ ہیں اور دوسرے کے پاس کم اور جب تک اس تفاوت کو مٹا کر دنیا کے اقتصادی نظام میں کوئی خاص توازن نہ پیدا کیا جائے گا لڑائی برابر جاری رہے گی۔

پچھلی لڑائی کے بعد اشتراکیت و بالشویت کا ظہور بھی اسی اقتصادی کشمکش کا نتیجہ تھا اور موجودہ جنگ کے بعد بھی جو کچھ ہونا ہے وہ بھی اسی مسئلہ سے متعلق ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ غریب و امیر کی لڑائی قدیم زمانہ میں بھی پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ اب غربت و امارت میں بہت زیادہ تفاوت ہو گیا ہے اور امیر بہت زیادہ امیر اور غریب بہت زیادہ غریب ہو گیا ہے اس لئے یہ اختلاف بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

یہی وہ چیز تھی جس نے سب سے پہلے "مساوات" کا خیال پیدا کیا اور ہر چند سیاست، تعلیم اور مدنیت وغیرہ میں ایک حد تک مساوات پیدا ہو گئی ہے لیکن دولت میں ابتک وہی تفاوت پایا جاتا ہے۔

ایک طرف وہ طبقہ ہے جس کو لذیذ غذائیں، نفیس ملبوس، بڑے بڑے محلات، قیمتی موٹریں، اچھی صحتیں اور عزتیں حاصل ہیں، دوسری طرف وہ طبقہ ہے، جس کے پاس نہ کھانے کو غذا ہے، نہ پہننے کو لباس، نہ رہنے کو مکان ہے، نہ چلنے پھرنے کے لئے سواری صحت بھی خراب ہے اور عزت بھی مفقود۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دونوں طبقے ایک سطح پر کیونکر آ سکتے ہیں اور نیچا طبقہ اونچے طبقہ سے کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دولت سب میں برابر تقسیم ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں؟

اگر انسانی افراد ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرتے ہوتے تو شاید یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا، لیکن چونکہ نظام تمدن میں ہر شخص دوسرے کا محتاج ہے اس لئے تقسیم دولت کا سوال بہت مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ نظام کی حالت ایک بازار کی سی ہے جس میں ہر وقت سودا ہوتا رہتا ہے اور جو چیز ہمارے پاس نہیں ہے، اسے

قیمت یا اُجرت پر دوسروں سے حاصل کرتے ہیں۔ پھر جب کسی چیز کی مانگ زیادہ ہوتی ہے تو اس کی قیمت بڑھا دی جاتی ہے اور جب مانگ کم ہوتی ہے تو قیمت گھٹ جاتی ہے۔

کاشتکار کا اپنی پیداوار فروخت کرنا۔ مکان کے مالکوں کا اپنے مکانات کرایہ پر دینا، ساہوکاروں کا سود پر روپیہ چلانا اور جن کے پاس روپیہ نہیں ہے ان کا اپنی جسمانی و ذہنی قوت پیش کرنا سب اسی قانون عرض وطلب (Supply + demand) کی وجہ سے ہے اور اسی نے اقتصادی مد وجزر پیدا کر رکھا ہے۔

پھر غور طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ قانون عرض وطلب ٹھیک ہے یا نادرست؟۔ ماہرین اقتصاد کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ قانون بالکل فطری قانون ہے اور جس طرح ہم فطرت کے دوسرے قوانین پر اعتراض نہیں کر سکتے اسی طرح اس پر بھی نہیں کر سکتے زمین کا ایک حصہ قدرت نے خشک رکھا، دوسرے کو پانی سے سیراب کر دیا، کہیں سردی زیادہ کر دی کہیں گرمی زیادہ۔ تو کیا ہم اس پر اعتراض کر سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ پھر قانون عرض وطلب پر کیوں اعتراض کریں۔

ایک اور جماعت اس کو بالکل قرین انصاف بتاتی ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ چیزوں اور خدمات کی قیمت خود پبلک اپنی خوشی سے مقرر کرتی ہے اور یہ تمام سودا بغیر کسی جبر واکراہ کے ہوتا ہے اس لئے اس میں خلاف انصاف کوئی بات نہیں۔

لیکن ایک جماعت اس قانون کو خلاف انصاف قرار دیتی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ قانون بیشک دوسرے فطری قوانین کی طرح ہے، لیکن فطرت کے اور قوانین کب انصاف پر مبنی ہیں کہ اس کو قرین انصاف قرار دیا جائے۔ پھر انسان نے جس طرح فطرت کے اور تمام قوانین کو عقل سے کام لیکر اپنے موافق بنایا ہے اسی طرح اس قانون کو بھی بدلنا چاہئے۔

ایک کاشتکار ہماری زندگی کے لئے غلہ پیدا کرتا ہے، ایک خاکروب ہماری صحت کے لئے سڑکیں صاف کرتا ہے، لیکن اسے کیا ملتا ہے؟ شاید صرف اتنا کہ وہ زندہ رہ سکے، لیکن برخلاف اس کے ایک مشہور گانے والا، ایک مشہور شعبدہ باز، ایک مشہور پہلوان چند گھنٹے کے اندر سیکڑوں روپیہ حاصل کر لیتا ہے، درانحالیکہ ان میں سے کسی چیز کی ہم کو ضرورت نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ یورپ میں کسی ملکہ نے ایک گانے والی کو بلایا، جب اس کی فیس دریافت کی تو معلوم ہوا کہ بہت زیادہ ہے۔ ملکہ نے کہا کہ جو کچھ تم مانگتی ہو وہ تو ملک کے وزیروں کو بھی نہیں ملتا۔ گانے والی نے جواب دیا "تو پھر وزیروں سے کہئے کہ وہ گانا ہی سیکھیں"۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا کا موجودہ نظام "حقِ ملکیت" پر قائم ہے، لیکن یہ "حقِ ملکیت" کیا چیز ہے، اسے بھی سمجھ لیجئے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ انسان مجبور ہے کہ وہ اشیا کو اپنے تصرف میں لائے اور بہر صورت چیزوں سے فایدہ اُٹھانے کی سعی کرے۔ روٹی سے فایدہ اُٹھانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے کھائے، کپڑے سے مستفید ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے پہنے، مکان سے فایدہ حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ وہ اس میں رہے اور زمین پر تصرف کا مقصود یہ ہے کہ کاشت کرے۔ لیکن اس سے "حقِ ملکیت" قائم کرنے کا خیال انسان کو کیوں پیدا ہوتا ہے۔

اس کے متعلق علماء اقتصاد مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ بعض حقِ ملکیت کو بالکل فطری حق ظاہر کرتے ہیں، لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر ملکیتیں چند آدمیوں کے لئے مخصوص ہو جائیں گی تو پھر اکثر آبادی اس سے کیونکر فایدہ اُٹھائے گی۔ اگر کہا جائے کہ وہ کرایہ، ٹھیکہ یا مزدوری کی حیثیت سے فایدہ اُٹھا سکتی ہے تو نتیجہ وہی ہوگا جو آجکل سرمایہ و عمل کی جنگ میں نظر آتا ہے اور امن وسکون پر بھی مفقود رہے گا۔

بعض کہتے ہیں کہ حق [illegible] ایک انسان کی محنت سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس پر حق [illegible] قایم ہوتا ہے اور قایم ہونا چاہئے۔ لیکن یہ کہنا واقعہ وحقیقت کے خلاف ہے۔ آپ امراء کی املاک پر غور کیجئے، کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان کی محنت کا نتیجہ ہے، کیا مکان جس میں وہ رہتے ہیں، خود انھوں نے تعمیر کیا تھا، کیا ان کے عیش و تنعم کی تمام چیزیں خود ان کی بنائی ہوئی ہیں۔ یقیناً یہ سب انھوں نے دوسروں کی محنت سے حاصل کیا اور اس محنت کا معاوضہ روپیہ سے دیا جو خود بھی انھوں نے اپنی محنت سے حاصل نہ کیا تھا۔

ایک اور فریق حق ملکیت کی طرفداری میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ یہ نظام سوسائٹی اور ہیئت اجتماعی کے لئے مفید ہے، کیونکہ اس طرح لوگوں کو زیادہ محنت وعمل کی رغبت ہوتی ہے اور اس طرح ملک کی دولت بڑھتی ہے۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں بن سکتے، تو پھر وہ جی توڑ کے محنت بھی نہ کریں۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اگر حق ملکیت قایم کیا جائے تو اس کا تعلق کسی مخصوص فرد سے نہ ہونا چاہئے بلکہ پوری جماعت کو اس سے فایدہ اُٹھانا چاہئے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ ایک کارخانہ دار، ایک زمیندار، مزدوروں اور کاشتکاروں کی محنت سے جتنا فایدہ اُٹھاتا ہے اس کا نہایت ہی قلیل حصہ اُجرت کی شکل میں صرف کرتا ہے، باقی خود لے لیتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی دولت سے تمام ملک برابر کا فایدہ نہیں اُٹھاتا بلکہ چند مخصوص افراد اس سے متمتع ہوتے ہیں۔

اس وقت حق ملکیت کا یہ حال ہے کہ ایک انسان ہر قسم کی ثروت کو حاصل کر سکتا ہے لیکن قدیم زمانہ میں یہ صورت نہ تھی۔

اول اول حق ملکیت بعض مخصوص چیزوں تک محدود تھا اور وہ چیزیں ایسی تھیں جنھیں آجکل دولت و ثروت بھی نہیں سمجھا جاتا، مثلاً غلام اور عورت۔ پھر غلاموں اور عورتوں کے ساتھ زیور، اسلحہ اور مویشی بھی حق ملکیت میں شامل ہوئے اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی آدمی مرتا تھا تو اسی کے ساتھ یہ چیزیں بھی دفن کر دیجاتی تھیں۔ اس کے بعد گھر کی ملکیت کا سوال پیدا ہوا، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے والوں کی روحیں اپنے گھروں میں آتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے پسماندگان مکان سے قطع تعلق کر کے اپنے آبا و اجداد کی روحوں کو پریشان نہ کر سکتے تھے۔

زمین کی ملکیت بہت بعد کی چیز ہے کیونکہ عبرانی زبان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے "زمین کی ملکیت" کا مفہوم ظاہر ہوتا ہو، لیکن ایک بار "زمین کی ملکیت" کا سوال پیدا ہونے کے بعد اس میں سختی بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ آج ملکیت کے مسئلہ میں سب سے اہم عنصر زمین ہی کا ہے۔

جدید قوانین میں ملکیت سے مراد "مطلق حق" ہے، یعنی مالک کو اختیار ہے کہ شے مملوکہ کو جس طرح چاہے کام میں لائے یہاں تک کہ اگر وہ اسے تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کرے تو بھی کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ دوسری چیز ملکیت کا دوام ہے، یعنی جب تک وہ شے باقی ہے حق ملکیت بھی قایم رہے گا۔ الغرض "دوام اور تصرف" حق ملکیت کی ممتاز صفتیں قرار دیجاتی ہیں، لیکن ملکیت کا یہ مفہوم بھی رفتہ رفتہ قایم ہوا ہے۔

اول اول ایک شخص صرف ان غلاموں سے کام لے سکتا تھا جو اس کی ملکیت تھے، اس کے بعد وہ اُجرت دیکر دوسرے لوگوں سے بھی کام لینے لگا، پھر مالک کو اس بات کا بھی مستحق قرار دیا گیا کہ وہ اپنی ملکیت جس کو چاہے دے ڈالے یا ہبہ کر دے۔

اس کے بعد فروخت کرنے اور ٹھیکہ پر دینے کا حق حاصل ہوا اور پھر مرنے کے بعد حق ملکیت باقی رکھا گیا، یہاں تک کہ اگر مرنے والا خود اپنی املاک کی تعیین نہیں کرتا تو قانون ملکیت متعین کرتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ ان حقوق سے کیا خرابیاں پیدا ہوئیں۔ وراثت و ہبہ سے تو دولت بالکل عملی دنیا سے علٰحدہ ہو جاتی ہے کیونکہ پانے والا تو بغیر کسی محنت و کوشش کے اسے حاصل کر لیتا ہے اور آبادی کا بڑا حصہ اس سے محروم رہتا ہے۔

قرض یا اجارہ کی صورت میں انسانیت دو فریق میں منقسم ہو جاتی ہے دائن و مدیون یا اجیر و مستاجر اور اگر دولت سے کام لیا جائے تو پھر سرمایہ دار اور مزدور دو طبقے علٰحدہ ہو جاتے ہیں۔ الغرض ملکیت کی تمام صورتیں ہیئتِ اجتماعی میں تفریق و انتشار پیدا کرنے والی ہیں۔

اب آیئے غور کریں کہ اس کا علاج کیا ہے اور حق ملکیت کو دور کرنے کے بعد اقتصادی نظام کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے متعلق ارباب نظر کا فیصلہ یہی ہے کہ دولت کو تمام آدمیوں میں منقسم ہونا چاہئے اور اسی کا نام اشتراکیت ہے۔ اشتراکیت کے متعلق مختلف رائیں ہیں اور متعدد نظرئے اس باب میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ انتہا پسند نظریہ ہے جسے بالشویت کہتے ہیں، دوسرا وہ معتدل نظریہ ہے جو اینگلو سیکسن اقوام نے پیش کیا ہے۔

اشتراکی مذاہب کی رو سے دولت کی تقسیم حسب ذیل صورتوں میں کی جا سکتی ہے:

(۱) تمام انسانوں میں اسے برابر برابر تقسیم کر دیا جائے۔
(۲) ہر شخص کی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے۔
(۳) ہر شخص کے استحقاق کے لحاظ سے اس کو بانٹا جائے۔
(۴) ہر شخص کے عمل کو سامنے رکھ کر اسکی تقسیم کی جائے۔

اب آیئے ان پر علٰحدہ علٰحدہ غور کریں:

پہلی صورت اشتراکیت کی بہت قدیم صورت ہے، چنانچہ اگلے زمانہ کے قانون سازوں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام افراد قبیلہ میں زمین برابر تقسیم کرتے تھے اور جب طویل زمانہ گزرنے کے بعد یہ مساوات باقی نہیں رہتی تھی تو پھر از سر نو تقسیم ہوتی تھی۔ لیکن اب اس تقسیم پر عمل نہیں ہو سکتا، کیونکہ پہلے تو دولت و ثروت صرف زمین پر منحصر تھی اور اب اس کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے، اس لئے موجودہ زمانہ کے اشتراکیت پسند دنیا کی تمام دولت و ثروت کی برابر تقسیم تو نہیں چاہتے، لیکن وہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ امراء کو ان کی دولت سے محروم کر کے غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اگر اس پر عمل کیا جائے تو کیا نتیجہ ہوگا، اس پر بھی غور فرمایئے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں امیروں کی تعداد بہت کم ہے، اتنی کم کہ اگر ان کی دولت کو غریبوں میں تقسیم کیا جائے تو بالکل وہی حال ہوگا جیسے آپ کسی حوض میں ایک پیالہ پانی کا ڈال دیں۔ مثلاً آپ فرانس کو لیجئے کہ اگر وہاں کے تمام ترکوں کو جن کی قیمت فی ترکہ ۴۰ گنی سے زیادہ ہے تمام فرانس کے باشندوں پر تقسیم کیا جائے تو ہر شخص کو سالانہ ۴۰ فرانک سے زیادہ آمدنی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر انگلستان کے ترکوں کو جن کی قیمت فی ترکہ ۵۰ ہزار گنی سے زیادہ ہے برابر برابر انگلستان کی آبادی میں تقسیم کیا جائے تو فی کس سالانہ ۴۱ فرانک سے زیادہ آمدنی نہ ہوگی اور یہ اتنی حقیر رقم ہے کہ ضروریات زندگی کے لئے بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ چہ جائیکہ خوشحالی!

(۲) اب دوسری صورت کو لیجئے، یعنی ضرورت کے لحاظ سے دولت کی تقسیم۔ اس سے مراد ہے کہ لوگوں کو جتنی ضرورت ہو اتنی دولت ان کو مہیا کی جائے۔

یہ اشتراکیت کا نہایت قدیم خیال ہے اور زندگی کے پہلے دور میں انسان دولت سے اسی طرح فائدہ اٹھاتا تھا اور اب بھی مشترکہ خاندانوں میں اس کا رواج ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ درمیان میں یہ خیال کچھ مٹ سا گیا تھا کہ اشتمالیت پسندوں نے پھر اس کو زندہ کیا۔ اس مذہب کے اصول یہ ہیں کہ انسان چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنائے اور جماعت کے تمام افراد دولت و ثروت سے حسب ضرورت فائدہ اٹھائیں۔

اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ موجودہ دولت و ثروت لوگوں کی تمام حاجتیں پوری کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ضرورتیں اسی نسبت سے پیدا ہوتی ہیں جس نسبت سے وہ پوری ہوتی ہیں، اس لئے یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ فلاں شخص کی فلاں ضرورت پوری کرنے کے قابل ہے یا نہیں کسی حاکم کی ضرورت ہوگی۔ اشتمالیت پسند کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ آپس کی رضامندی سے طے ہو سکتا ہے لیکن یہ فطرتِ انسانی کے بالکل خلاف ہے۔

ہرچند انسان نے عہدِ قدیم میں اسی اصول پر زندگی بسر کی ہے اور اب بھی امریکہ میں بعض جماعتیں وہاں کے قدیم باشندوں کی ایسی پائی جاتی ہیں جو اسی اصول پر کاربند ہیں، لیکن اس کو عام تجربہ میں لانے کے لئے بعض شرطوں کا خیال ضروری ہے۔

سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ جماعتیں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہوں۔ کیونکہ ایک جماعت میں جتنے کم افراد ہوں گے اتنی ہی زیادہ اجتماعیت ان میں پیدا ہو سکے گی، لیکن تمدن کے موجودہ دورِ ترقی میں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ نوعِ انسانی چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہو کر اپنے آپ کو کفیل بالذات بنائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سوسائٹی کا نظام قائم کرنے کے لئے جماعت کے افراد کو خاص خاص قوانین کی پابندی کرنا پڑے گی اور اشتمالیت پسند اس کو گوارا نہیں کرتے کہ انسان کی شخصیت پر کوئی خارجی دباؤ ڈالا جائے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ استحقاق کے لحاظ سے دولت تقسیم کی جائے۔

اس باب میں حکماء کے متعدد اقوال پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور فرانس کے علماء فوریہ، سان سیمون، لوئیس بلان اور پرودون ہیں

فوریہ کا خیال تھا کہ مختلف جماعتوں کو ملکر ایک وحدتِ اجتماعی بنانا چاہئے اور عمل میں سب کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ اس نے اجرتوں کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پانچ حصے مزدور کے لئے، چار سرمایہ دار کے لئے اور تین حصے مہارت رکھنے والوں کے لئے ——— لیکن اگر اس پر عمل کیا جائے تو بھی مساوات باقی نہیں رہتی جو اشتراکیت کی غایت اصلی ہے

سان سیمون کے اصول پر پچھلی صدی میں بہت زیادہ میلان ظاہر کیا گیا اور اس کے بہت سے متبعین فرانس وغیرہ میں پیدا ہو گئے۔ اس نے یہ اصول پیش کیا تھا کہ صاحب ثروت اور کام کرنے والے دونوں کے لئے حکومت کی طرف سے وظائف مقرر کئے جائیں جس کا تعین ان کی اہلیت کے لحاظ سے ہونا چاہئے اور اہلیت کا اندازہ اس فائدہ کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے جو ان کی ثروت و عمل سے حاصل ہوتا ہے اس طرح مساوات تو خیر پیدا نہیں ہوتی لیکن حقِ وراثت اور حقِ ملکیت البتہ دونوں

ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تمام تحریکات سے کوئی اور فایدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن یہ ضرور ہوا کہ مختلف قسم کی تعاونی (Co-operation) سوسائٹیاں قایم ہو گئیں۔ مزدوروں کی علحدہ، اہل حرفہ کی علحدہ، کاشتکاروں کی جدا اور اس سے مختلف طبقات میں اجتماعی حیثیت سے آگے بڑھنے اور مسابقت (Competition) کی اہلیت زیادہ پیدا ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ سرمایہ داروں پر بھی دباؤ پڑا کہ وہ مزدوروں کی اصلاح حال اور اُجرت بڑھانے پر توجہ کریں۔

(۴) چوتھا مذہب یہ تھا کہ کام کے لحاظ سے دولت تقسیم کی جائے۔ اس سے مراد یہ تھی کہ دولت پیدا کرنے کے تمام ذرایع کسی خاص شخص یا جماعت کی ملکیت نہ قرار پائیں۔ اس مذہب کا نام "Collectivism" ہے۔

اشتراکیت کا یہ مذہب دوسرے مذاہب سے اس لئے ممتاز ہے کہ یہ ایک علمی بنیاد رکھتا ہے اور اسی لئے اس کے متبعین اس کا نام "اشتراکیت علمی" رکھتے ہیں۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ اگلے زمانہ میں ملکیت انفرادی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ محنت بھی انفرادی تھی۔ ایک ہی شخص محنت کرتا تھا اور اس سے فایدہ اُٹھاتا تھا، لیکن اب کہ کوئی صنعت و تجارت بغیر بہت سے آدمیوں کی مدد کے کامیاب نہیں ہو سکتی، سب کو فایدہ حاصل کرنا چاہئے اور انفرادی ملکیت کی جگہ اجتماعی ملکیت کو لے لینا چاہئے۔

کمیونزم اور اس مذہب میں یہ فرق ہے کہ وہ عمل کے ذرایع و نتایج دونوں کی تقسیم سب میں برابر کرنا چاہتی ہے، لیکن یہ تمام ذرایع عمل و نتایج کو برابر برابر بانٹنا نہیں چاہتی۔ اگر کوئی شخص تنہا کام کرتا ہے تو اس کو تنہا فایدہ اُٹھانا چاہئے، لیکن جو کام اجتماعی حیثیت سے کئے جاتے ہیں، اُن کا فایدہ البتہ سب کو برابر اُٹھانا چاہئے۔

اس مذہب والوں کا دعویٰ ہے کہ اس طرح ہر شخص کی آزادی قایم رہ سکتی ہے، لیکن ہمارے خیال میں یہ دعویٰ بے بنیاد ہے، کیونکہ انفرادی حیثیت سے فایدہ اُٹھانے والا بھی اپنی دولت کو ان کے قانون کے مطابق کسی ایسے کام میں نہیں لگا سکتا جو نفع بخش نہیں ہے اور اس طرح وہ تصرف حقیقی سے محروم رہتا ہے۔

اس مذہب کے مدعی یہ بھی چاہتے ہیں کہ کارخانوں پر کام کرنے والوں کا غلبہ ہو جائے، لیکن یہ بات بھی خطرہ سے خالی نہیں کیونکہ مزدوروں کی نظر زیادہ وسیع نہیں ہے اور نہ وہ اقتصادی قوانین کو سمجھ سکتے ہیں۔

ان کا مطالبہ یہ بھی ہے کہ ہر مزدور کو کام کے گھنٹوں کے لحاظ سے اُجرت دیجائے، حالانکہ اصولاً یہ ہونا چاہئے کہ کام کے نتیجہ کے لحاظ سے اُجرت دیجائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مزدور کاہل و نااہل ہو اور وہ ۲۴ گھنٹے میں بھی اتنا کام نہ کر سکے جتنا دوسرا آٹھ گھنٹے میں کرتا ہے۔

بہرحال اس وقت سرمایہ و عمل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور جس طرح سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی حفاظت کی فکر میں ہیں اسی طرح مزدوران کے سرمایہ سے زاید از زاید فایدہ اُٹھانا چاہتے ہیں اور یہ کشمکش یقیناً ایک بار موجودہ اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اصل سوال دنیا کے امن و سکون کا ہے، اور یہ مدعا صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب دنیا سے "مادیت" ختم ہو جائے اور اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

دھوکا

(افسانہ)

باجے کی آواز انل کے کانوں میں آرہی تھی۔ کیسا سریلا باجا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "بچے راستے میں کھیلتے کھیلتے رک گئے ہونگے جوانوں کے دلوں میں یہ آواز امنگیں پیدا کر رہی ہوگی، بوڑھے بھی اپنی جوانی کا زمانہ یاد کر کرکے لطف اُٹھا رہے ہوں گے"۔
انل کے دل میں یہ آواز نشتر کی طرح چبھ رہی تھی۔ اس نے دروازے بند کرلئے، مگر پھر بھی جس طرح دھوپ چھن چھن کر شیشوں میں سے اندر آجاتی ہے اسی طرح سے آواز بھی اندر آرہی تھی۔ مگر وہ اب ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے گوشت کے اندر کوئی دھیرے دھیرے نشتر چبھو رہا ہو۔

باجے کی سریلی آواز میں وہ کسی کے رونے کی آواز بھی سُن رہا تھا وہ باجے جو دو ہستیوں کو ایک دوسرے سے ملا دینے کی خبر دنیا کو سُنا رہے تھے، جدائی کا راگ بھی الاپتے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ ایسا خیال کر رہا تھا کہ باجے اس پر ہنس رہے ہیں اس کی زندگی پر طنز کر رہے ہیں۔

یہ خیال کرکے وہ تلملا اُٹھا۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کا خیال کرنے لگا —— اس نے سرد آہ بھری! آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ مگر اس نے ان کو کُرتے کی آستین سے پونچھ ڈالا۔

کسی نے کواڑ کھٹکھٹائے —— دوبارہ کواڑوں پر دستک ہوئی۔ انل خاموش بیٹھا تھا اور خاموش ہی رہنا چاہتا تھا مگر دروازہ کی دستک بند نہیں ہوئی —— وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح کمرہ کی تنہائی اسے نگل لے اور وہ دُنیا کی نگاہ سے اوجھل ہوجائے۔ لیکن دستک کی آواز بند نہ ہوئی اور پھر کسی نے اس کا نام لیکر پکارنا شروع کیا۔ وہ جان گیا کہ یہ آواز کس کی ہے، مگر وہ سوچنے لگا کہ آج وہ اس کے گھر پر کیوں آیا! اس کے ماں باپ نے تو اس سے کہدیا تھا کہ اگر اب انل کے گھر جاتا دیکھیں گے تو تیری ٹانگ توڑ دیں گے۔ پھر وہ کیوں انل کے گھر پر آیا۔

انل نے کواڑ کھول دئے!

شیل کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کوئی بات آآکر رہ جاتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں انل کے چہرہ پر دوڑائیں۔ وہ سوچکر آیا تھا کہ آج انل بہت اُداس ہوگا کیونکہ آج اس کی آرزوؤں کا خون ہو رہا ہے۔ کیونکہ آج اس کی پریا اپنے گھر سے رخصت ہو رہی ہے، لیکن وہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

شیل خیال کر رہا تھا کہ وہاں آنا اس کا فضول ہی تھا اور پریا نے واقعی دھوکا کھایا اس نے سوچا کہ وہ بغیر کچھ کہے

وہاں سے چلا جاوے ۔ مگر نہیں !۔ اس نے خیال کیا کہ بعض پہاڑ بھی بظاہر ایسے ہی خاموش نظر آتے ہیں مگر ان کے اندر آگ ہی آگ ہوتی ہے ! ممکن ہے انل کے دل کا بھی یہی حال ہو اور یہ سوچ کر اس نے پھر اس کی طرف دیکھا ۔ انل نے شیل کی طرف سے نگاہ ہٹالی اور شیشوں کے باہر دیکھنے لگا ۔

شیل : "میں تمھیں بلانے آیا ہوں ۔ انل"

انل نے شیل کی طرف دیکھا اور تعجب سے پوچھا "کیوں"

ایک سال سے زیادہ زمانہ ہوا کہ انل نے شیل کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا ۔ پھر انل اسے کیوں بلانے آیا ۔ وہ شیل کا منھ دیکھ رہا تھا تاکہ کچھ جواب دے مگر کیا جواب دے یہ سمجھ میں نہ آتا تھا ۔

شیل نے کچھ انتظار کے بعد کہا "پریا کا بیاہ ہے ۔۔ یہ تو تمھیں معلوم ہے ؟"

انل نے رکتے ہوئے جواب دیا : "معلوم تو ہوا تھا"

شیل : "تم ایک روز بھی نہیں آئے"

انل کا سر اس سوال پر چکرانے لگا ، وہ سوچنے لگا کیا میں اپنی دنیا کو اجڑتے ہوئے دیکھنے کے لئے وہاں جاتا ۔۔۔۔۔۔

مگر اس نے سنبھل کر کہا : "ہاں نہیں آیا ، نہیں آسکا"

شیل : کیوں نہ آسکے ۔۔۔۔۔ سب نے تمھیں پوچھا اور ماں نے بھی کہا کہ کیا انل نے ہم لوگوں کی محبت بالکل ہی چھوڑ دی ہے !

انل بولا : "میں نے محبت ہی کب کی تھی ۔ جس کو میں چھوڑ دیتا !" انل آگے کہتا کہتا رک گیا تاکہ شیل کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ ماں کے طعنے کو دہرا رہا ہے

شیل : "آج تو چلو ، پھر تو پریا چلی ہی جاوے گی ۔ آج سے وہ ہماری نہیں رہے گی ۔ ہمارا اس کے اوپر زور نہیں رہے گا ۔ پریا روزانہ تمھاری راہ دیکھتی ہے ۔ جب تم نہیں آئے تو اس نے مجھکو یہاں بھیجا تاکہ وہ آخری مرتبہ تم کو دیکھ لے !!"

یہ سنکر وہ بیتاب ہوگیا اور جی میں آیا کہ دونوں ہاتھوں سے وہ شیل کا منھ بند کر دے مگر جیسے مچھلی پانی سے باہر تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہے اسی طرح سے اس کا دل بھی تڑپ کر رہ گیا !

وہ سوچنے لگا کہ وہاں کون کون ہوگا ۔ میرے جاننے والے بھی ہوں گے اور نہ جاننے والے بھی ! جاننے والے میری طرف انگلیاں اٹھائیں گے اور نہ پہچاننے والے کانا پھوسی کریں گے ۔ "یہ کون ہے ، آج تک تو اس کو یہاں دیکھا نہیں ! پھر کیوں آیا" اور اگر کسی پہچاننے والے نے نمک مرچ لگا کر میری تعریف کر دی اور موڈ تو ڈاکر میرے یہاں آنے کا مقصد ظاہر کر دیا تو میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ جاوے گا ۔۔ اور پھر اگر کسی کا شک پریا پر ہوا ، تو وہ کہیں کا نہ رہے گا ۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نہیں جاوے گا ، جس طرح وہ آج تک اپنے کمرہ میں پڑا رہا ہے اب بھی پڑا رہے گا اور روتا رہے گا ، جس طرح لوگ اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ انل کے دل میں پریا کی محبت صرف ظاہری تھی ، اسی طرح اب بھی ان کو سمجھنے دے گا ۔ اور پریا کی خوشی کو برباد نہیں کریگا

باجے کی آواز زیادہ تیز ہوگئی ۔ باجے والوں کو بھی شاید ضد ہوگئی تھی کہ انل نہ سننے کی جتنی کوشش کرے گا اتنا ہی وہ زیادہ تیز بجاویں گے ۔ انل کے دل میں اسوقت ایک بھیانک شور و غل مچا ہوا تھا ۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے دل پر لگاتار چوٹ مار رہا ہے !۔ وہ سوچ رہا تھا :۔۔۔ شیل ابھی گھر نہیں پہونچا مگر اس کے دل میں میری طرف سے کیا خیال آرہا ہوگا ۔۔ یہی کہ بلانے پر بھی نہیں آیا ۔ کبھی اس نے شیل سے اپنے دل کی باتیں کھول کھول کر کہی تھیں ،

اور تبھی سے شیل اور انل ایک ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ انل شیل کے ساتھ اس کے گھر پر جایا کرتا اور وہاں پریما بھی مل جاتی تھی مگر جب انل اور پریما کی محبت کا چرچا ہونے لگا تو پریما کی ماں غصہ سے لال ہوگئی۔ وہ بہت بوڑھی تھی، اس نے زمانہ دیکھا تھا اُسکو ساٹھ برس کا تجربہ تھا وہ سمجھتی تھی کہ محبت ایک بلا ہے! اور اس بلا میں پڑنا کنواری لڑکیوں کا کام نہیں!!

اس کا نظریہ یہ تھا کہ لڑکیوں کو بیاہ تک اپنے گھر میں بالکل خاموش پڑا رہنا چاہیئے، اور اپنے دل کو محبت ایسی گندی چیز سے صاف رکھنا چاہیئے، ان کو زیادہ بات نہیں کرنا چاہیئے، ان کو صرف گھر کا کام ہی کرنا چاہیئے، ان کو اپنے دل کی بات ظاہر کرنے کا کوئی حق نہیں — اور بیاہ کے بعد ان کو اپنے پتی کا ہو کر رہنا چاہیئے۔ کسی دوسرے مرد کی شکل بھی نہ دیکھنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ — بوڑھی کی رائے ماننے کے قابل تھی کیونکہ وہ برسوں سے دیکھتی آئی تھی کہ ایسے ہی لڑکیاں رہتی ہیں اور اب بھی ایسے ہی کیوں نہ رہیں!! — اس نے اپنے بچوں کو بتایا تھا کہ محبت دھوکے کی چیز ہے — یہ کالج کے لڑکے دھوکا دینے کے لیے لڑکیوں سے پریم جتاتے پھرتے ہیں! ان کو سوائے تاک جھانک کے کوئی کام نہیں — یہ سب پریما کی ماں نے انل کے سامنے ہی کہہ ڈالا تھا اور یہ سنکر انل سناٹے میں آگیا تھا۔ پریما جو اس کے پاس کھڑی تھی آہستہ آہستہ سرک کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور انل سوچنے لگا تھا کہ کیا میں نے پریما سے پریم اسی لئے کیا تھا کہ میں اسے دھوکا دوں گا۔ اور کیا مجھے یہ لوگ اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ میں پریما کو بدنام کرکے اس سے منھ چھپالوں گا۔ وہ یہی سوچتا ہوا دھیرے دھیرے پریما کے گھر سے نکل آیا تھا اور پریما کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا مگر پریما سے محبت نہیں چھوڑی تھی۔ شاید اس کے گھر والوں نے یہ خیال ضرور کیا ہو کہ اس کی محبت "کچھ ایسی ہی" تھی اسلئے تو اس نے گھر پر آنا بالکل چھوڑ دیا۔ مگر انل دن رات اسی آگ میں پھنستا رہتا تھا!!

سورج غروب ہوگیا تھا۔ آسمان پر دھند لکا چھانے لگا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف گرد و غبار چھایا ہوا ہے شیل دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کا منھ ذرا سا نکل آیا تھا۔ وہ ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہنسی کے بجائے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے قبرستان سے لوٹا ہو!!

انل راستہ پر کھڑا ہوا کچھ سوچ رہا تھا — لیکن کیا؟ — اسے شیل نہ سمجھ سکا۔ انل اس کے لئے اب ایک معمہ بن گیا تھا۔ شیل سوچکر آیا تھا کہ انل سے وہ کم از کم اتنا ضرور پوچھے گا کہ کیا پریما چلی گئی؟ مگر انل کے ہونٹ ہلے تک نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے پاس ایسے کھڑے تھے جیسے دونوں کے منھ میں زبان ہی نہ ہو!!

انل سوچ رہا تھا کہ پریما اپنے دل میں کہہ رہی ہوگی کہ اس نے اس کو آخری بار بھی نہیں دیکھا! اور شاید اس نے انل سے پریم کرنے میں دھوکا کھایا!!

کچھ دیر بعد شیل بولا: "پریما تو چلی گئی"

انل "ہاں"۔ کہکر خاموش ہوگیا اور سوچنے لگا کہ اس کی واپسی کے متعلق پوچھے یا نہیں۔

شیل نے کہا "وہ جب گئی ہے تو بہت رو رہی تھی اور جب وہ چلنے لگی تھی تو اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ انل کہاں ہے! مگر تم تھے ہی نہیں!! اور جب تم نہ دکھائی دیے تو وہ اور زیادہ رونے لگی"

شیل کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے مگر انل اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہا تھا۔

شیل بولا: "چار پانچ روز کے بعد وہ آجائے گی۔ اور جب وہ آئے تو تم اس سے ضرور ملنا! — اگر تم نے اس سے محبت کرتا

چھوڑ دی ہے تو کیا۔ وہ تو اب بھی کرتی ہے" انل نے کوئی جواب نہ دیا اور سوچتا رہا کہ کیا وہ سچ کہتا ہے۔

شیل نے پوچھا: "بتاؤ — جب پریا آجاوے گی تو اس سے ملوگے!!"

انل نے کہا: "اچھا جاؤ شیل — اب جاؤ — ہوسکا تو ضرور ملوں گا!!"

شیل چلا گیا۔ انل وہیں کھڑا رہا۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ درختوں میں سے چاندنی زمین پر چھن چھن کر آرہی تھی۔ اسکا دل چاہ رہا تھا کہ اس چاندنی میں رات بھر اِدھر اُدھر گھومے — اور وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اس کے دل میں پریا ہی کا خیال تھا۔ اور اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس کے آنے کے بعد وہ اس سے ضرور ملے گا!!

لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سوچنے لگا کہ جب پریا اس کی نہ ہوسکی تو پھر اس زندگی کے کیا معنی ہیں۔ مردہ دل کو اپنے جسم میں چھپائے پھرنا، کوئی زندگی نہیں، اس لئے اگر وہ اپنے جسم کو بھی چھوڑ دے تو اسے نہ ملنے کا اچھا بہانہ مل جائے گا۔

پریا کے واپس آنے میں دو روز رہ گئے تھے۔ شیل روز آجاتا اور انل کو یاد دلا دیتا — اور انل سوچنے لگتا کہ جب وہ پریا کے گھر پر جائے گا تو اس کی ماں کہے گی کہ میں نے دھوکا دیا! اور پریا بھی کہے گی کہ اب میں نے محبت کرنا چھوڑ دیا۔ وہ اسکی ماں کی باتوں کا کیا جواب دے گا وہ پریا کو اپنی محبت کا یقین کیونکر دلائے گا۔ میں پریا کے سامنے اب بھی نہیں جا سکتا، چاہے وہ مجھے دھوکہ باز ہی کیوں نہ خیال کرے۔

پریا کے ایک دن آنے سے پہلے انل کہیں چلا گیا تھا۔ اس کے ملازم کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں گیا کیونکہ وہ اس سے کچھ بھی کہکر نہیں گیا تھا۔ شیل دو چار مرتبہ آیا بھی مگر مایوس واپس چلا گیا تھا۔ جب رات بھی گزر گئی اور انل نہ آیا تو شیل کو فکر ہوئی وہ اسکے کمرہ میں آکر میز پر کاغذوں کے ٹکڑے ڈھونڈھنے لگا تھا کہ شاید انل اپنا پتہ کسی کاغذ پر لکھ کر چھوڑ گیا ہو مگر شیل کو کوئی کاغذ ایسا نہ ملا۔

وہ سوچنے لگا "پریا آنے ہی والی ہے، وہ ضرور پوچھے گی کہ انل آئے گا یا نہیں پھر میں کیا جواب دوں گا۔ کہدوں گا کہ وہ یہاں ہے نہیں۔ مگر وہ ملے گا ضرور کیونکہ اس نے وعدہ کر لیا تھا اور شاید کل صبح تک آجائے!!

پریا آگئی لیکن انل نہیں آیا۔ پریا نے انتظار کیا مگر اس کی امید ٹوٹتی گئی۔ وہ اپنے جی میں خیال کر رہی تھی کہ کیا واقعی اسنے پریم کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور ملے گا۔ تو کیا وہ اپنے وعدہ کو بھول گیا۔

ایک دن اخبار پڑھتے ہوئے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ معلوم ہوتا تھا اس کے جسم میں خون ہی نہیں ہے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ:

"ایک مسافر جس کے سر میں چوٹ لگی تھی اسپتال میں لایا گیا، وہ بالکل بے ہوش تھا۔ اس کے سر میں ٹانکے بھرے گئے۔ جیسے ہی اس کی بے ہوشی دور ہوئی اس کی حالت عجب پاگلوں کی سی ہوگئی۔ اس کو ڈاکٹروں نے بولنے کے لئے منع کر دیا تھا مگر پھر بھی وہ بولے ہی جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے وہ پریشان تھا۔ اس نے ایک ڈاکٹر سے کہا "مجھے مرنے سے پہلے گھر پہونچا دو!..." اور وہ اپنے بستر پر سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سر کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ خون پھر سے جاری ہوگیا وہ کہنے لگا "کیا میں پریا کو نہ دیکھ سکوں گا!!" تھوڑی دیر بعد مر گیا۔ پریا کون ہے اور وہ کون تھا اس کا پتہ اب تک نہیں لگ سکا ہے"

شنکر سروپ بھٹناگر (ایم۔اے)

لکھنؤ کی زبان

(مسلسل)

دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں کس کو ترجیح حاصل ہے

ابتک ہماری بحث کا صرف ایک پہلو تھا اور وہ یہ کہ ہر زبان کو مرکز کی ضرورت ہے، لیکن آج ہم یہ بتائیں گے کہ دہلی، لکھنؤ میں سے کس مرکز کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

آپ کے سامنے یہ اُصول پیش کیا جا چکا ہے کہ زبان کا مرکز ہونا صرف اس امر سے متعلق ہے کہ ایک جگہ اصلاح زبان کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جب تک دہلی کو یہ اہلیت حاصل تھی اُسوقت تک اُس کو مرکزیت کا فخر حاصل تھا اور جب یہ خصوصیت اس کی باقی نہ رہی تو مرکزیت کے شرف سے محروم ہو گئی اور لکھنؤ کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہو گیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

"دہلی میں اگلے دنوں یہ اخلاقی اُصول یقیناً سب جگہ سے بڑھے ہوئے ہوں گے اس لئے کہ وہاں کا دربار سب سے بڑا تھا اور صدیوں سے قایم چلا آتا تھا مگر وہاں تجارت پیشہ اقوام کی سوسائٹی پر غالب آنے کی وجہ سے اگلی ساری تہذیب خاک میں مل گئی ...... جہاں تجارت کو فروغ ہوگا اور تاجروں کی معاشرت خوش باش امیروں اور شریفوں پر غالب آجائے گی وہاں اخلاقی قانون باقی نہیں رہ سکتا چنانچہ اس چیز نے دہلی کے اگلے عظیم الشان درباروں کی ساری آن بان مٹا کے رکھدی اور وہ بات نہیں رہی جو اُس کی ناموری کی تاریخ کے شایان شان تھی۔

دہلی کی تہذیب کو جب تاجروں کا ہجوم تباہ کرنے لگا تو اُس نے اپنے قدیم وطن سے بھاگ کر لکھنؤ کے چھوٹے دربار میں پناہ لی جو اگرچہ چھوٹا تھا مگر اُس کی سواد میں داخل ہونے کے بعد کسی کو نظر آسکتا تھا کہ دنیا میں یہاں سے بڑا کوئی دربار بھی ہے پھر یہاں آزادی سے بیٹھ کے شرفائے دہلی نے اپنے قوانین نشست و برخاست کو برتنا شروع کیا تو چندہی روز میں یہ حالت ہو گئی کہ اکیلا لکھنؤ ہی سارے ہندوستان میں تہذیب و شایستگی آداب نشست و برخاست کا مرکز تھا اور تمام شہروں کے مہذب لوگ اہل لکھنؤ ہی کی پیروی اور تقلید کر رہے تھے"[1]

سید انشاء اللہ خاں انشا دہلوی کا بیان ہے:

"لکھنؤ بر شہرہائے دیگر شرفے دارد و جان شاہجہاں آباد است زیرا کہ فصحا و سلیقہ شعار کہ جان آں شہر باشند دریں شہر مجتمع اند پس شاہجہاں آباد حکم قالب بے جان دارد و لکھنؤ جان اوست"[2]

---

[1] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۵۸ تا ۲۵۹ — [2] دریائے لطافت صفحہ ۸۲۔

میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی اپنے رشید شاگرد میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے ارے اب اہل دہلی ..... یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی یا گورے ہیں ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے لکھنؤ کی آبادی میں فرق نہیں آیا ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کی تعریف کئے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اُردو نہ رہا اُردو بازار کہاں ؟ دلی اب شہر نہیں کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر"[۱]

غالب کے مشہور شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی کہتے ہیں :

"دلی جس کو اُردوئے معلی کا مسقط الراس اور جنم بھوم کہنا چاہئے وہاں ناظم و ناثر پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں"[۲]

اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی حالت یہ بیان کرتے ہیں :

"لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا وہاں شاعری کا چرچا دلی سے بہت زیادہ سننے میں آتا ہے وہاں ناول ڈراما برابر ملک میں شایع ہوتے رہتے ہیں"[۳]

یہ تو بعد کی حالت ہے، جب دلی کو مرکزیت کا درجہ حاصل تھا اُس وقت کی حالت دہلی کے رہنے والے اور زبان کی ماہیت جاننے والے سید انشا یہ بیان کرتے ہیں :

"فصاحت در دہلی ہم نصیب ہر کس نیست منحصر است در اشخاص معدودہ ہرچہ بامتحاں راقم رسیدہ است این است ہیچ محلہ خالی از آدم فصیح نیست در بعضے جائے دو فصیح دور بعضے جا سہ و در بعضے جا چہار و ہم چنیں شاید کدام محلہ خالی از آدم فصیح نیز باشد لیکن بیشتر چنیں است"[۴]

دیکھئے انشاء اللہ خاں اپنے ذاتی تجربہ سے کہتے ہیں کہ دہلی میں فصاحت ہر شخص کو نصیب نہیں، اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں :

"دریں شہر ہر محلہ محلہ فصیحان است بخلاف شاہجہاں آباد و انکار ایں معنی از دانائی بعید است"[۵]

اس میں شک نہیں کہ خاصی و عامی زبان میں فرق ہوتا ہے اسی سبب سے خواص کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے لیکن زبان کی ترقی اس کا نام ہے کہ عوام کی زبان بھی ایک حد تک فصیح و بلیغ ہو جائے۔ یہ شرف دہلی کو کبھی نصیب نہیں ہوا اور لکھنؤ کو یہ منزلت اس وقت حاصل تھی جب اُس کو استقلال کی سند نہیں ملی تھی اور ناسخ کی بدولت تو یہ دولت عام ہو گئی حضرت غالب فرماتے ہیں :

"ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا اس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی زبان ایک ہو گئی"[۶]

مرزا رجب علی بیگ سرور کا قول ہے :

جو گفتگو لکھنؤ میں ہے کہ بکو ہے[۷]

---

[۱] دریائے لطافت صفحہ ۷۰ ــ [۲] ادبی خطوط غالب ــ [۳] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۸ ــ [۴] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۸ ــ [۵] دریائے لطافت

[۶] دریائے لطافت صفحہ ۲۶ ــ [۷] تذکرۂ جلوۂ خضر صفحہ ۲۳۰ ــ [۸] فسانۂ عجائب مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ

صفیر بلگرامی کا حسب ذیل بیان سرور کے اس قول کی گویا توضیح ہے:

"لکھنؤ کے عوام و خواص کی زبان یکساں درست ہے اور بندش فقرات کی جاہل و عالم میں یکساں ہے ——— لکھنؤ کے عوام الناس کی زبان شعراء کی ترکیب و بندش سے ملاکے دیکھو لو"[1]

اب صرف لکھنؤ زبان کا مرکز ہے

زبان کو اس نقطۂ کمال پر پہونچا دینے کی وجہ سے اب صرف لکھنؤ زبان کا مرکز ہے۔ حضرت صفیر بلگرامی تحریر فرماتے ہیں:

"جس قدر مدارج زبان کی درستی کے تھے وہ لکھنؤ میں تمام ہوئے اب جو طریق نکلے گا وہ لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان سے باہر نہ ہوگا"[2]

اس کے مقابلہ میں دہلی کی زبان کی یہ حالت بیان کرتے ہیں:

"وہ صاف شدہ زبان جیسی میر و میرزا نے اختیار کی دہلی میں وہی زبان ابتک مروج معلوم ہوتی ہے اور ولی کی زبان سے کچھ ایسا فرق نہیں معلوم ہوتا چنانچہ مولوی صہبائی دہلوی جو حال میں گزرے ہیں اس کے قایل ہیں اور اپنے رسالہ صرف و نحو اردو میں لکھتے ہیں اور میں بھی اُس نمونے کے اشعار (ولی دکھنی کی زبان کے) ذوق و مومن تک کے کلام سے دکھا دونگا پھر زبان کیا صاف ہوئی"[3]

یہی شکایت دہلی کی زبان سے مرزا غالب مرحوم کو بھی تھی چنانچہ انھوں نے اپنے دیوان کے خاتمہ میں اس کا اقرار ان لفظوں میں کیا ہے:

"میرے کلام میں جو الفاظ اور محاورے ناقص بندھ گئے ہیں کیا کروں دلی کی زبان ہی ایسی ہے میں اُنکو ناپسند کرتا ہوں"[4]

دہلی کی اسی زبان کو جو میر و سودا کی تھی لکھنؤ والوں نے درست کیا صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:

"ولی کی زبان کو دہلی والوں نے درست کیا اور دہلی والوں کی زبان کو لکھنؤ والوں نے درست کیا اور چونکہ ان تینوں مقاموں کا زمانہ یکے بعد دیگرے ہوا تو لکھنؤ کا زمانہ جو سب کے بعد ہوا اس رو سے اُس کی اصلاح قابل پذیرائی ہوگی"[5]

سید انشاء اللہ خاں انشا دہلوی کہتے ہیں:

"فضل زبان و پوشاک و حرکات محبوبان لکھنؤ بر کلام و لباس و ادہاے معشوقان دہلی واضح مبرہن است زیرا کہ اہل لکھنؤ خورش و پوشش و زبان و دیگر چیزہا از پدر و مادر خود یاد گرفتہ اند پس دریں چیزہا مثل آنہا باشند و ہرچہ خود از قبیل نزاکت صدا و حسن تکلم و حرکات دلنشین و قطع پوشاک ایجاد نمودہ اند زیادہ از معلومات بزرگان ایشان است مختصر اینکہ اینہا فصیح و بلیغ و لطیف تر از اہل شاہجہاں آباد اند"[6]

رام بابو صاحب سکسینہ تحریر فرماتے ہیں:

"ناسخ کو یہ شرف حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج انھیں کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے"[7]

اسی وجہ سے زبان کے رمز شناسوں نے لکھنؤ کو زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہے چودھری نظیر الحسن صاحب فوق کہتے ہیں:

"لکھنؤ کو حسن شناسان سخن نے زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہے"[8]

---

[1] تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول ــــ [2] تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۲۰۰ ــــ [3] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۴۲ ــــ [4] خاتمہ دیوان غالب مطبوعہ مطبع اسون جان آگرہ ــــ [5] جلوۂ خضر ص۲۰۲ ــــ [6] دریائے لطافت ص۱۹۰ ــــ [7] تاریخ ادب اُردو ص۱۲ ــــ [8] المیزان ص۱۰

میر مہدی مجروح کو مرزا غالب کی فہمائش آپ سن چکے ہیں ایک قول اُن کا اور سنئے :

"میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ والوں نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا مگر میرے نزدیک تو وہ تراش خراش کی گنجایش ہی نہیں چھوڑ گیا ہاں قواعد نہیں لکھ گیا قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے ہماری دلّی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی"[1]

دہلی کے مشہور انشاپرداز شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے اس کا متعدد جگہ اعتراف کیا ہے :

"شیخ صاحب (ناسخ) اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دہلی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دیدی اب جو چاہیں کہیں ہم نہیں روک سکتے"[2]

لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا منھ نہیں کیونکہ جس خاک سے ایسے باکمال اٹھیں وہاں کی زبان خود سند ہے۔[3]

دہلی والوں نے اہلِ لکھنؤ کی تقلید کی

صرف اتنا ہی نہیں کہ لکھنؤ کی زبان کو دہلی والوں نے مستند مانا ہو بلکہ اُس کی تقلید کی نواب مرزا داغ دہلوی نے جنکا بچپن قلعۂ معلّیٰ میں گزرا اور جن کی زبان خاص قلعۂ معلّیٰ کی زبان سمجھی جاتی ہے انھوں نے اہلِ لکھنؤ کی تقلید میں دہلی کی بہت سی لفظیں ترک کر کے لکھنؤ کی لفظیں اختیار کیں، مولانا علی حیدر طباطبائی نے شرح دیوان غالب میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور صفیر بلگرامی لکھتے ہیں :

"دو شخصوں نے اپنے اُستادوں کی زبان کو ترک کیا اور لکھنؤ کی ترکیب و بندش اور طریق کو اختیار کیا ان میں اول اصغر علیخاں تسیم شاگرد مومن، دوم داغ شاگرد ذوق مگر نسیم میں کچھ کچھ بو رہ گئی جو اُن کے کلام سے ظاہر ہے اور کیونکر نہ رہتی پہلے طرز کے مشاق ہو چکے تھے مگر حضرت داغ نے انصاف کو کام فرمایا اور ع

متاعِ نیک ہر دو کان کہ باشد

پر عمل کیا اور اپنی زبان بہت حد تک درست کرلی"[4]

مولانا آزاد دہلوی فرماتے ہیں :

"اب وہ زمانہ آتا ہے (ناسخ و آتش کا) کہ انھیں (اہل لکھنؤ کو) خود صاحب زبانی کا دعویٰ ہوگا اور زیبا ہوگا اور جب دلی کے محاورے میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورہ کی فصاحت پر دلایل قایم کریں گے بلکہ انھیں کے بعض نکتوں کو دلی کے اہلِ انصاف بھی تسلیم کریں گے"[5]

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :

"ان لوگوں (ناسخ و آتش) نے اُن کے بعض ہمعصروں نے زبان کے باب میں اکثر قیدیں واجب سمجھیں کہ دلی کے مستند لوگوں نے بھی بعض بعض باتوں کی رعایت اختیار کی"[6]

حضرت آزاد کو اس کا اعتراف تو کرنا ہی پڑا کہ دہلی والوں نے اہلِ لکھنؤ کی تقلید کی لیکن دہلی زبان سے پروفیسر اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم۔ اے لکچرار الہ آباد یونیورسٹی یوں کہتے ہیں :

"ناسخ و آتش نے وہ کمال حاصل کیا کہ دہلی والوں نے بھی اُن کو اُستاد مان لیا بلکہ اُن کی تقلید کو ایک زمانہ تک فخر سمجھا"[8]

---

[1] تذکرۂ جلوۂ خضر ص ۲۲۔ [2] آب حیات ص ۲۷۔ [3] آب حیات ص ۳۶۶۔ [4] تذکرۂ جلوۂ خضر ص ۲۱۹۔ [5] آب حیات ص ۲۲۸۔ [6] آب حیات ص ۳۲۳۔ [7] مختصر تاریخ ادب

ان پر زور لفظوں کی تائید غالب کے اس قول سے ہوتی ہے:

میاں جب ناسخ کا کلام دلّی میں پہونچا جیسا تم نے دلّی کے دیوان کا حال سُنا ہوگا کہ دلّی میں آیا تو جیسے کسی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں اسی طرح اُس کے کلام پر گر پڑے ———— مگر وہ زبان نظم کر دینا تھا اس میں کچھ دقت نہ ہوئی ———— مگر ناسخ کے کلام نے جس کو علم درکار تھا اور قاعدے کے پرتو پر ڈالا گیا تھا دلّی میں آکر سب کو حیران کر دیا اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا یہاں تک کہ شعراء نے اس کو رغبت کی نگاہ سے دیکھا ————

یاد رہے کہ زبان لکھنؤ کی مستند ہے[1]

غالب کے اس قول کو حضرت اثر عظیم آبادی نے ان لفظوں میں نقل کیا ہے:

اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت (غالب) فرماتے تھے کہ میری غزل گوئی کی ابتدا تھی ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہونچا شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی میں نے اور مومن نے ان کا تتبع ہونا چاہا[2]

یہ غالب کا قول ہے جو ہمیشہ شاہراہ عام سے کٹ کے اپنے لئے دوسرا راستہ نکالتے تھے اور کسی کی تقلید ننگ سمجھتے تھے — لوگ غلطی سے ناسخ کی اصلاحوں کو چند لفظوں کے ترک و اختیار یا تذکیر و تانیث کی تعلیم تک محدود سمجھتے ہیں، حالانکہ اُن کا اصلی فخر زبان کو با اُصول بنانا ہے۔ ان سے پہلے اُردو کوئی با اُصول زبان نہ تھی اور انداز بیان اور صرف و نحو میں زیادہ تر فارسی کی تابع تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کلام میں تعقید اور گنجلک پائی جاتی تھی اور ناسخ نے اسی نقص کو دور کیا۔ مثلاً ہم میرامن کی باغ و بہار سے چند فقرے نقل کرتے ہیں اور اسی کے مقابل میں لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان بھی پیش کرتے ہیں:

دہلی کی زبان	لکھنؤ کی زبان
ایسی ایسی تباہی کھا کے ویسے شہر سے کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال میں گڑا ہے جلا وطن ہوا۔	ایسی ایسی تباہی اُٹھا کے اس شہر سے جلا وطن ہوا جو میرا جنم بھوم ہے اور جہاں آنول نال گڑی ہے۔
منشی میر بہادر علی جی کے وسیلہ سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔	منشی میر بہادر علی صاحب کے وسیلے سے جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے حضور تک رسائی ہوئی۔
اے عزیزو سُن میں بادشاہ زادہ جگر سوز اس قلیم نیمروز کا ہوں۔	اے عزیزو سُن میں اس اقلیم نیمروز کا جگر سوز شہزادہ ہوں۔
احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو۔	فرمایا کہ شہزادوں کے ستاروں کا حال دیکھو۔
بلکہ ایک اُستاد دانا کار آزمودہ واسطے میری تربیت کے معین کیا۔	بلکہ ایک دانا اور کار آزمودہ اُستاد میری تربیت کے واسطے معین کیا۔

فارسی میں مضاف کے بعد مضاف الیہ آتا ہے جیسے "اسپ من" "وطن ما" بالکل اسی قاعدے پر میرامن لکھتے ہیں:

"وطن اور جنم بھوم میرا ہے"

ناسخ کے نزدیک یہ ترکیب فصیح نہ تھی، اس لئے انھوں نے اس کو اُلٹ دیا یعنی "میرا وطن اور جنم بھوم" صحیح قرار دیا، اس سے معلوم ہوا کہ خود اُردو کا کوئی انداز بیان نہ تھا بلکہ وہ فارسی کی اُنگلی پکڑ کے راستہ چلتی تھی ممکن ہے اس کا جواب یہ دیا جائے کہ

---

[1] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول ص۳۳۶ — [2] کاشف الحقائق ص۱۴۲

میر امن نے تو فارسی قصہ کا ترجمہ کیا ہے اس لئے اُس کی سند نہیں اس کا جواب ہمارے پاس یہ موجود ہے کہ ترجمہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مسند و مسندالیہ کی ترتیب میں بھی اصل کی متابعت کی جائے چنانچہ اس کتاب میں بھی لفظی ترجمہ کی پابندی نہیں کی گئی اور اسکا ثبوت ایک تو یہی ہے کہ قصہ کا نام تک بدل گیا ہے یعنی بجائے چہار درویش کے باغ و بہار رکھا گیا ہے جس کو اصل نام سے کوئی مناسبت نہیں، میر امن خود لکھتے ہیں :

"جان گلکرسٹ صاحب بہادر نے ــــــــــــ لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو، مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے خاص و عام بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو موافق حکم حضور کے میں نے بھی اُسی محاورے میں لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"

اس کے علاوہ ہم نے ایسے فقرے بھی لکھدئے ہیں جو خاص میر امن کے ہیں اور اصل قصہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس پر بھی اگر کسی کو اصرار ہو تو غالب کی یہ عبارت دیکھئے :۔

خور اور خرشید یہ دونوں اسم آفتاب کے ٹھیرے جب عرب و عجم مل گئے تو اکابر عرب نے کہ وہ منبع علوم ہوئے واسطے رفع التباس خر میں واو معدولہ بڑھا کر خور لکھنا شروع کیا ہر آئینہ متاخرین نے اس قاعدے کو پسند کیا۔ (ادبی خطوط غالب ص۹۵)

غالب ایک اور جگہ لکھتے ہیں : "جو آپ پر معلوم ہو وہ مجھ پر مجہول نہ رہے"

یہ بالکل فارسی کا ترجمہ ہے یعنی "انچہ بر شما ظاہر است بر ما مجہول نماند"

اس سے ثابت ہے کہ اُسوقت خود اُردو کا کوئی مستقل انداز بیان نہ تھا اور سب سے پہلے ناسخ نے اس طرف توجہ کی اور غالب بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ زبان کو اگر زبان کر دکھایا تو لکھنؤ والوں نے"۔ اُن کی یہ عبارت آپ پہلے سُن چکے ہیں حضرت اثر عظیم آبادی بھی غالب کے موئید ہیں :

"ناسخ نے اُردو کو اپنے کلام معجز نظام سے ایک شستہ اور پاکیزہ زبان بنا ڈالا"[۱]

انصاف یہ ہے کہ ناسخ کی شخصیت اس لحاظ سے بالکل منفرد نظر آتی ہے۔ مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں :

"اسی دور نے ترقی کر کے متوسطین کے زمانہ میں شیخ ناسخ جیسا مصلح زبان و مجدد فن پیدا کیا جنھوں نے الفاظ کی تنقیح و تہذیب نہایت مکمل طور پر کردی اور اُن کے بعد شعراء اسی زبان کی پیروی کرتے ہیں"[۲]

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

شیخ ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شایستہ بنا دیا اور آج تمام شعراء اُسی زبان کے مقلد ہیں"[۳]

صفیر بلگرامی کہتے ہیں :

اور میں کیا جتنے انصاف پسند اور صاحبانِ ادراک ہیں سب جانتے ہیں کہ اسوقت کی زبانِ اُردو جو تمام ہندوستان میں شعراء و فصحا کے برتاؤ میں ہے لکھنؤ کی درست کی ہوئی ہے، اس پر قواعد و ضوابط کی کتابیں درست ہوئی ہیں"[۴]

جب زبان باُصول بن چکی اور وہ اُصول مقبول ہو چکے تو اب جو قلم اُٹھائے گا وہ بے ارادہ لکھنؤ کا مقلد بن جائے گا چنانچہ عہد ناسخ کے بعد

---

[۱] کاشف الحقائق ص۳۳ ــ [۲] شعر الہند ص۱۰۰ ــ [۳] شعر الہند ص۱۵۱ ــ [۴] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول

ملک کے شاعروں میں ایک بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس نے ناسخ کے مقرر کئے ہوئے قاعدے کی خلاف ورزی کی ہو اور ناسخ سے پہلے کی دہلوی زبان کی تقلید کی ہو، اس طرح سارے ملک پر لکھنؤ کی زبان چھا گئی اب جو تغیر ہوگا وہ جزوی ہوگا اسی بنا پر صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:

"اب جو تغیر ہوگا وہ لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان سے باہر نہ ہوگا"

اتنا سب جانتے ہیں کہ اُردو شاعری کے ابوالاباء ولی دکھنی ہیں۔ دہلی مدت سے سلاطین تیموریہ کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے اہل کمال کا مرکز تھی، ولی بھی چلتے پھرتے آنکلے اور فارسی کے سانچہ میں اُردو کے ڈھلے ہوئے سکے پیش کئے۔ اسوقت یہاں فارسی شعرا میں مرزا معز موسوی خاں فطرت، مرزا عبدالغنی قبول، مرزا عبدالقادر بیدل، قزلباش خاں امید، سلیمان قلی خاں داؤد، علی قلی خاں ندیم، سراج الدین علی خاں آرزو، میر شمس الدین فقیر، شیخ سعداللہ گلشن، ایسے صاحبان فضل وکمال کا مجمع تھا، اس جدید چیز میں کچھ ایسی لذت تھی کہ سب کے سب اس کی طرف جھک پڑے اور تفنناً اس میں بھی کہنا شروع کیا۔

ملا عبدالواسع ہانسوی ایک کتاب لغات اُردو کی مرتب کر چکے تھے اور اس کا نام انھوں نے غرائب اللغات رکھا تھا۔ اب اُردو کی تدوین کا خیال پیدا ہوا تو سراج الدین علی خاں آرزو نے اس غرائب اللغات پر نظر ثانی کر کے بہت سے الفاظ اضافہ کئے غلطیوں کو صحیح کیا اور نوادر الالفاظ نام رکھا جب اور لوگوں کو بھی اس زبان میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا تو لازماً انھیں ارباب فضل وکمال کے دامن کے سایہ میں اپنے ذوق شعری کو پروان چڑھایا ان صاحبان کمال میں خان آرزو نے سب سے زیادہ توجہ کی اس لئے وہی سب کا مرجع بن گئے اور سب اُن کے قلم کے سایہ کے نیچے جمع ہو گئے انھیں سے رموز سخن دانی سیکھے عروض وقافیہ کے باریک راستے معلوم کئے زبان کے حدود اور قاعدے سمجھے کلام پر اصلاح بھی لی چنانچہ بیشتر اہل معنی انھیں کے خوان ذوق کے ریزہ چیں تھے اگرچہ سن میں بڑے تھے، جیسے شاہ مبارک آبرو بقول حضرت آزاد:

"باوجودیکہ بڈھے شاعر اور پُرانے مشاق تھے مگر خان آرزو کو اپنا کلام دکھا لیتے تھے"[1]

دوسرے شیخ شرف الدین مضمون ہیں جن کے بارے میں حضرت آزاد لکھتے ہیں:

"باوجودیکہ مضمون سن رسیدہ تھے اور خان آرزو سے سن میں بڑے تھے مگر انھیں غزل دکھاتے تھے اور اصلاح لیتے تھے"[2]

ان وجوہ سے خان آرزو کو دور متقدمین کی صف اول میں جگہ ملنا چاہئے

حضرت آزاد کہتے ہیں:

"خان آرزو کو اُردو پر وہی دعویٰ پہونچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ اور منطق پر ہے جب تک کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اُردو خان آرزو کے عیال کہلائیں گے"[3]

سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی تحریر فرماتے ہیں:

"اسوقت کے جتنے شعراء تھے سب ان کو اپنی غزل دکھاتے تھے"[4]

---

[1] آب حیات ص۹۲ - [2] آب حیات ص۱۰۳ - [3] آب حیات ص۱۱۵ - [4] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول

اس زمانہ (دور اول) کے شعراء یہ ہیں :

شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، شاہ حاتم، محمد شاکر ناجی، مصطفےٰ خاں یکرنگ ۔ اگرچہ ان لوگوں کی شاعری کوئی درجۂ اعتبار نہیں رکھتی۔ لیکن ان کا ذکر محض سلسلۂ تاریخ کی کڑیاں جوڑنے کے لئے کر دیا جاتا ہے۔ اس دور کے شعراء نے اصلاح زبان کی طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ یہ وہ شعراء تھے جن سے دہلی میں شاعری کی صبح ہوئی اسوقت اورنگ زیب عہد کی شام ہو چکی تھی جس کی رات اتنی طولانی تھی کہ گیارہ سال چودہ روز گزر گئے اور مہیب اک اتنی کہ نو بادشاہوں کے جنازے گئے اسکے بعد اگرچہ محمد شاہی اقبال کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب سے نکلا مگر ابھی کچھ ہی بلند ہوا تھا کہ نادر شاہ درانی گھٹا کی طرح ساری دلی پر چھا گیا اور تین روز تک تلواروں کی بجلیوں میں سروں کی بارش ہوتی رہی۔

آپ نے دیکھا کہ شاعری کے آغاز ہی سے دتی کے اطمینان کا خاتمہ ہو گیا۔ شاعری تو ہمیشہ بزم کو ڈھونڈھتی ہے، دہلی کی بزم گاہ رزم گاہ بن چکی تھی لہٰذا شاعری نے بھی کھسکنا شروع کیا۔

سعادت خاں برہان الملک کو اودھ کا صوبہ مل چکا تھا اور وہ شرفاء و سردار ان فوج جو اُردو کے مالک تھے اودھ کی طرف آنا شروع ہو گئے تھے۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ (بہادر شاہ اول) اُن کے بعد عالمگیر ثانی کا زمانہ آیا یہ دونوں عہد بارہ سال میں ختم ہو گئے، اس مدت میں احمد شاہ ابدالی نے دو دفعہ دہلی کو تہ و بالا کیا سلطنت کی یہ کمزوری دیکھ کے مرہٹوں کا طوفان اس زور سے آیا کہ مغل اعظم کی عظمت کا چراغ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا وہ قلعہ معلیٰ جس کی طرف نگاہ کرنے میں رستم و اسفندیار کے کلیجے کانپتے تھے مرہٹوں کی جولانگاہ بن گیا اور وہ دیوان عام جس میں قدم رکھنے والا نقیب کے باادب نگاہ روبرو دیکھتے ہی لرزہ براندام ہو جاتا تھا اُس دیوان عام کی وہ سقف طلائی جس کے نیچے آلِ تیمور کی عظمت کا آفتاب چمکتا تھا مرہٹوں کی دست درازیوں کی نذر ہو گئی۔

شاہ عالم نے سلطنت کی کمزوری، مرہٹوں کی سرشوری، سکھوں کی سینہ زوری، اور نمک خواروں کی کورنگی سے بے بس ہو کر انگریزوں کے دامن میں پناہ لی اور سلطنت دیکر پندرہ لاکھ کے گزارہ پر قناعت کر کے گوشہ نشین ہو گئے اس زمانہ کی حالت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل دہلی پر وہاں کی زمین تنگ ہو گئی تھی۔ سودا کا شہر آشوب اور قصیدہ تضحیک روزگار پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیمی امیرزادے نان شبینہ کو محتاج ہو گئے تھے۔ انشاءاللہ خاں لکھتے ہیں :

"شاہجہاں آبادیاں در شہر خود بیشتر محتاج بنان شبینہ و کمتر نان میخورند"

مثل مشہور ہو گئی تھی :

"شاہ عالم ثانی نہ چولھے پہ توا نہ گھڑے میں پانی"

اس عالم میں متوسطین کا دور شروع ہوا جس مملکت میں پشتینی رئیس زادے فاقہ کر رہے ہوں وہاں شاعروں کا کہاں ٹھکانا لگ سکتا ہے سب کے دل اچاٹ ہو گئے لیکن اب جائیں تو کہاں ؟

اودھ کا دربار حقیقت میں دہلی ہی کا دربار تھا اور اسی راہ کا سالک معاشرت میں وہی تکلف و نفاست اہل علم کی وہی سرپرستی شعراء کی وہی قدر دانی نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی برباد ہو گئی اور لکھنؤ آباد ہو گیا۔ رام بابو صاحب سکسینہ لکھتے ہیں :

"اس عام بدامنی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کے بھاگنے لگے وہ شاعر جو دامنِ دولت سے وابستہ تھے مثلاً میر،

سودا، میر حسن، انشا وغیرہ انھوں نے بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا جو ان کا اس وقت قدر شناس اور اُن کے واسطے دولت خیر خواہ تھا اور علم کی قدر دانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا شعرائے دہلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے سلطنت کی طرف سے اُنکے واسطے جاگیریں، وظائف، انعام و اکرام مرحمت ہوئے اور اُن کی نازک مزاجیاں اور بد دماغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر انھیں صفات کی تعریف کی جاتی تھی، سلسلۂ روابط کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے نوابانِ عہد اور امرائے وقت نے اکثر شعرا کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو اپنا رفیق و مصاحب بنا لیا"[1]

حقیقت میں لکھنؤ کا دربار دہلی کے دربار کی تصویر تھا فرق یہ تھا کہ دہلی کی تصویر کا رنگ اُڑ چکا تھا اور لکھنؤ کی تصویر میں بلا کی رنگینی تھی اس لئے دہلی کا رہا سہا رنگ بھی اُڑ گیا زمانہ کے مصور نے وہ رنگ پریدہ بھی لکھنؤ کی تصویر میں بھر دیا یعنی تمام اہلِ کمال خواہ وہ کسی فن کے ہوں دہلی چھوڑ کے لکھنؤ چلے آئے۔ میر انشا اللہ خاں اسوقت کی حالت یہ بیان کرتے ہیں:

"کثرت دہلویان فصیح دریں شہر بہ رجہ است کہ حصر امکان ندارد"[2]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"سپاہی و مصاحب پیشہ و لطیفہ گو و بذلہ سنج و مطرب و قصہ خواں دریں شہر ہمہ از دہلی آمدہ اند"[3]

ایک اور جگہ یوں تحریر فرماتے ہیں:

"در لکھنؤ از سبب قرب تمام شاہجہاں آبادیاں فصیح و غیر فصیح جمع شدہ اند دامن شہر شاہجہاں آباد شدہ است لکھنؤ نماندہ است"

انشا کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی جس کے کوچے اوراق مصور تھے صفحہ سادہ بن گئی ہر طرح کے اہلِ کمال اُس کے سواد سے نکل کے لکھنؤ چلے آئے اور لکھنؤ شاہجہاں آباد بن گیا۔ یہاں صرف اُن شعرا کے نام لکھے جاتے ہیں جو دہلی چھوڑ کے لکھنؤ چلے آئے۔

(۱) مرزا محمد رفیع سودا (۲) میر محمد تقی میر (۳) میر محمد سوز (۴) مرزا جعفر علی حسرت (۵) میر حیدر علی حیران (۶) قیام الدین قائم (۷) اشرف علی خاں فغاں (۸) خواجہ حسن حسن (۹) مرزا فاخر مکیں (۱۰) میر ضاحک (۱۱) بقاء اللہ خاں بقا (۱۲) میر حسن حسن (۱۳) میر قمر الدین منت (۱۴) میر ضیاء الدین ضیا (۱۵) شیخ قلندر بخش جرأت (۱۶) میر انشاء اللہ خاں انشا (۱۷) شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔ (۱۸) سعادت یار خاں رنگین (۱۹) مرزا محمد حسن قتیل۔

یہاں چند باتیں ذہن نشین کرکے آگے بڑھنا چاہئے:

(۱) دہلی سے لکھنؤ آنے کا خیال اُسی کو ہوتا تھا جس کا کمال دہلی میں مسلم ہو چکا تھا یہ لوگ ایسے ہی صاحبان فضل و کمال تھے جن کا کلام لوگ دہلی سے تحفۃً لے جاتے تھے۔

(۲) اس زمانہ میں دہلی شعرا سے خالی ہو گئی لکھنؤ سے آیا ہوا کلام گرمی محفل کا سبب بن تا تھا اس طرح لکھنؤ سے دہلی متاثر ہو رہی تھی۔

(۳) اس دور (متوسطین) کے شعرا وہ تھے جنھوں نے اصلاح زبان میں پہلا قدم اُٹھایا اور وہ سب دہلی چھوڑ کے لکھنؤ آ چکے

---

[1] تاریخ ادب اُردو ص۲۵۹ - [2] دریائے لطافت ص۲۲ - [3] دریائے لطافت ص۱۸ - [4] دریائے لطافت ص۸

تھے لہذا دہلی کی زبان میں جو کچھ ترقی و اصلاح ہوئی وہ لکھنؤ میں ہوئی اور اُن کو قبول کرنے میں دہلی والوں کو تامل نہ ہوا کیونکہ ایک تو اصلاح کرنے والے دہلوی تھے دوسرے اُن کے کمال کا سکہ دلوں پر بیٹھ چکا تھا اسو جہ سے دہلی والوں سے ایک طرف تو اصلاح زبان کا مادہ سلب ہوتا رہا، دوسری طرف وہ اس کے عادی ہوتے گئے کہ لکھنؤ میں جو اصلاحیں ہوں ان کو قبول کرکے اپنی زبان درست کریں اس طرح وہ لکھنؤ کی تقلید کے عادی ہوتے گئے۔

(۴) اصلاح زبان کی قوت لکھنؤ میں نشو و نما پا رہی تھی اور اہل لکھنؤ میں یہ استعداد پرورش پا رہی تھی جب زمانے نے دہلی والوں کی جگہ خالی کی تو لکھنؤ والے اُن کی جگہ پر آ گئے اور زبان کے مالک بن گئے یہ دور دہلی کے بھی سنبھالے کا زمانہ تھا یعنی اس زمانہ کے شعراء دہلی میں رہے لیکن چونکہ ان شعراء نے ایسی فضا میں آنکھ کھولی تھی جس پر لکھنؤ کی تقلید چھائی ہوئی تھی اور یہ بات دلی والوں کی جبلت بن گئی اس لئے ان شعراء نے آنکھ بند کرکے بے ارادہ لکھنؤ کی تقلید کی۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کہتے ہیں:

"جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہونچا جیسا تم نے دلی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ جس طرح لوگ نئی چیز پر گرتے ہیں اسی طرح اُسکے کلام پر گر پڑے ــــــ مگر ناسخ کے کلام نے دہلی میں آ کر سب کو حیران کر دیا اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا یہاں تک کہ شعراء نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا"[1]

ان وجوہ سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان تقریباً ایک ہو گئی اسی بنا پر دہلی کے مشہور انشاپرداز حضرت آزاد لکھتے ہیں:

"اب جو زبان دہلی میں بولی جاتی ہے وہ گویا انھیں (اہل لکھنؤ) کی ہے"[3]

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی لکھتے ہیں:

"جو لوگ دہلی کے فصحا و نقاد و مالک زبان و قلم ہیں ان کا کلام لکھنؤ کی زبان سے مطابقت رکھتا ہے کس وجہ سے کہ جب سے میر و سودا لکھنؤ میں آ کے رہ پڑے اُسی زمانہ سے دلی گوش بر آواز لکھنؤ ہو گئی پھر انشاء اللہ خاں اور جرأت کے کلام نے اُن کی توجہ کو ادھر سے پھرنے نہ دیا اُن کے بعد ناسخ و آتش کے شاعروں نے متوجہ کر لیا اخیر میں میر صاحب کے مرثیوں نے خاص و عام سب کی زبان پر اثر ڈال دیا اس زمانہ میں نواب مرزا شوق کی تینوں مثنویاں گھر گھر پڑھی جانے لگیں کہ لوگوں کو حفظ ہو گئیں، پھر امانت انھیں دنوں میں اندر سبھا کہہ کے اُردو میں ڈرامے کے موجد ہوئے اس کے علاوہ نامہ تعلق و اسوخت امانت اور شہروں کی طرح دلی کی گلیوں میں لوگ گاتے ہوئے پھرنے لگے زبان کی شہرت کے اسباب پر جب غور کیجئے تو یہی لوگ معلوم ہوتے ہیں جن کے نام گزرے اور ان کے کلام کی شہرت نے اس زبان کو اس قدر مانوس کر دیا یہاں تک کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان تقریباً ایک ہو گئی اس پر آزاد سلمہ اللہ کی شہادت کافی ہے"[2]

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان تقریباً ایک ہو گئی حضرت آزاد بھی گویا کی لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ بالکل ایک نہیں ہوئی کچھ فرق رہ گیا، یہی فرق دونوں جگہ کی زبان میں حد فاصل اور صورت امتیاز پیدا کر سکتا ہے اور اسی سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہ فرق اس وقت صاف نظر آ جائے گا جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ دہلی والوں نے لکھنؤ والوں کی تقلید کس حد تک کی، گزشتہ مضمون میں اس پر پوری بحث کی جا چکی ہے کہ دہلی والوں نے ترتیب نحوی میں پوری پوری

---

[1] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۲۳۶ ۔ [2] شرح دیوان غالب مصنفہ طباطبائی صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۲ ۔ [3] آب حیات صفحہ ۴۰۴ ۔

تقلید کی۔ پھر بھی زبان جیسی صاف ہونا چاہئے تھی نہیں ہوئی۔ اس کی دو وجہیں ہیں ایک وجہ ثاقب کی زبانی سنئے:

"ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جن کے سبب سے تمام لکھنؤ کی زبان ایک ہوگئی وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہونچتے ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہوا وہ کیا مگر یاد رہے کہ ۔ زبان لکھنؤ کی مستند ہے"

دوسری وجہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں ناسخ نے تقریری زبان کو اتنا درست کیا کہ تمام ناتراشیدہ لفظیں اور ترکیبیں دور ہوکے زبان ادبی بن گئی دہلی میں تقریری زبان اتنی ترقی نہ کر سکی کچھ بھونڈی لفظیں، بھدی ترکیبیں باقی رہ گئیں ۔ صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:

"اگرچہ یہ بات مانی گئی ہے کہ ہر مقام کی زبان تقریری اور تحریری علٰحدہ علٰحدہ ہوتی ہے مگر ناسخ نے جب اردو زبان کی اصلاح کی تو کلیہ یہ قایم کیا کہ زبان تقریری کو ایسا درست کرو کہ تحریر میں بھی ویسا ہی لکھو یعنی تقریر و تحریر میں کچھ فرق نہ ہو اس کا فائدہ یہ ہے کہ زبان کی درستی کا خیال رہے گا اور محاورات صحیح یاد رہیں گے اور سب کی سمجھ میں مطلب یکساں آئیں گے چنانچہ لکھنؤ کے عوام وخواص کی زبان یکساں ہے اور بندش فقرات کی جاہل و عالم میں یکساں ہے ——— لکھنؤ کے عوام الناس کی زبان شعراء کی ترکیب و بندش سے ملا کے دیکھ لو ——— بخلاف دہلی کے کہ تقریر و تحریر عوام وخواص کا فرق تو جیسا ہے ویسا ہے شعراء کا اختلاف ایسا نظر آیا کہ قواعد اور محاورات جو کتابوں میں لکھتے ہیں وہ بہت صحیح اور درست لکھتے ہیں اور شعر میں ان قواعد کو مستعمل نہیں کرتے"[۱]

میرا خیال ہے کہ ہر جگہ کے لوگوں نے ادبی زبان میں لکھنؤ کی پوری تقلید کی اس لئے وہ درست ہوگئی اور اس میں یکسانیت پیدا ہوگئی اور تقریری زبان میں ہر جگہ کے لوگوں نے نحوی ترتیب کو تو بالکل لکھنؤ کی زبان کے مطابق کر لیا لیکن بہت سے ناتراشیدہ الفاظ وہاں کی تقریری زبان میں رہ گئے ۔ حضرت انشاء فرماتے ہیں:

"ہر شہر را زبانے است مخصوص زبان شہر ہر کس در آنجا متولد می شود و بزبان شہر حرف می زند"[۲]

انشاء اللہ خاں اہل زبان بننے کے لئے چار شرطیں ضروری قرار دیتے ہیں:

"(۱) ماں باپ اہل زبان ہوں ۔ (۲) اہل زبان کی صحبت میں رہے ۔ (۳) تحصیل وتحقیق زبان میں ہر وقت مشغول رہے ——— (۴) طبع نقاد اور ذہن وقاد رکھتا ہو"[۳]

ان چار شرطوں میں سے اگر پہلی شرط فوت ہو جائے مگر طلب صادق ہو تو کامیابی ممکن ہے لیکن باقی شرطیں بالکل ضروری ہیں اسی بنا پر نواب امداد امام اثر کہتے ہیں:

"ہم لوگوں کا بڑا کمال یہی ہے کہ زباندان کہلائیں اہل زبان ہونا تو تمامتر خارج از امکان ہے"[۴]

بعض حضرات لکھنؤ کی زبان پر فارسیت کے غلبہ کا الزام رکھ کے اس کو ٹکسال باہر قرار دیتے ہیں ۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ زبان کو جتنی صفائی کی ضرورت تھی وہ میر و میرزا کے زمانہ میں حاصل ہوگئی اس کے بعد لکھنؤ میں جو اصلاح ہوئی اس سے زبان کی اصلی لطافت جاتی رہی کیونکہ اس میں فارسی کا غلبہ ہو گیا، اگر غور کیا جائے تو یہ اعتراض اصول و تاریخ کسی حیثیت سے کوئی وزن نہیں رکھتا ۔ اصولی حیثیت سے یوں کہ زبان کو کسی منزل پر تعمیر و اصلاح سے روک دینا اس کی زندگی ختم کر دینا ہے

---

[۱] تذکرۂ جلوۂ خضر ص۳۵ ۔ [۲] دریائے لطافت ص۸ ۔ [۳] دریائے لطافت ۔ [۴] کاشف الحقایق

علاوہ اس کے لکھنؤ کی زبان میں فارسیت کا عنصر غالب بتانا بھی حقیقت پر مبنی نہیں اُر دو نثر کی وہ کتابیں جو لکھنؤ اور دہلی میں ایک ہی زمانہ میں لکھی گئی ہیں اُن کا مقابلہ میرے بیان کی تائید کرے گا اور اگر نظم کے سرمایہ کو بھی لے لیا جائے تو فارسیت کے غلبہ میں دہلی کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ لکھنؤ ایک مدت سے مسلمانوں کا علمی مرکز ہے اس وجہ سے وہاں ایسے لوگوں کی کافی تعداد موجود رہتی ہے جو عربی و فارسی کی تحصیل میں کافی وقت صرف کرتے ہیں اور اس لئے انکی زبان پر عربی لفظوں کا چڑھ جانا فطری امر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ کی ٹکسالی اُردو میں عربی فارسی کی لفظیں اُسی نسبت سے ملیں گی جس نسبت سے وہ دہلی کی اُردو میں پائی جاتی ہیں اور لکھنؤ میں بھی وہی لوگ اُردو کے ماہر سمجھے جاتے ہیں جن کو ہندی لفظوں اور محاوروں کے استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے، لکھنؤ کی زبان سے ہمارا مقصود یہی چیز ہے اور اسی کی تقلید ضروری بتائی جا رہی ہے ورنہ عربی فارسی لفظوں کے استعمال میں جو درجہ اہلِ لکھنؤ کو حاصل ہو وہ اور شہروں کے افراد کو بھی حاصل ہے ہم ہرگز اس کے حامی نہیں ہیں کہ عربی فارسی لفظوں۔ کے استعمال میں اہل لکھنؤ کی تقلید کی جائے اگر اہلِ لکھنؤ عربی فارسی لفظیں زیادہ استعمال کرتے ہیں تو بُرا کرتے ہیں اور اس معاملہ میں وہ ہرگز لائق تقلید نہیں بلکہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ لکھنؤ والوں نے جو کچھ زبان کو ترقی دی وہ ہندی لفظوں کے استعمال کے ذریعہ سے، اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

سید محمد باقر شمس

تاریخ اودھ کا ایک ورق

بادشاہ بیگم

(مسلسل)

تیسرا باب

(رفیع الدین حیدر محمد مہدی فریدوں بخت معروف بہ منا جان کی پیدائش کا حال اور انکی ولدیت کے متعلق تحقیق)

نصیر الدین حیدر کی خواص، سکھ چین (افضل محل) کے بطن سے ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ (۱۴ ستمبر ۱۸۲۰ء) کو وضع حمل کے مقررہ وقت کے بیس مہینے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کو ماؤں اور اصیلوں نے غروب آفتاب سے ۴ گھنٹہ قبل غسل دیکر بادشاہ بیگم کی گود میں دیا۔ بادشاہ بیگم کو بے حد خوشی ہوئی اور اس نومولود کا نام محمد مہدی رفیع الدین حیدر رکھا گیا اور منا جان عرفیت قرار پائی بادشاہ بیگم نے محسن الدولہ کے ذریعہ سے طلائی مہریں شاہی نذر کے لئے بھیجیں اور سلیمان جاہ کو بھی خود نذر پیش کرنے کے لئے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ لیکن راجہ امرت لال عرض بیگی، (ظفر الدولہ منتظم الملک کپتان) فتح علی خاں (بہادر ہیبت جنگ) اور شیدی عبدالکریم داروغہ دیوان خانہ نے کہا کہ شاہی حکم ہے کہ آپ لوگ دربار میں نہ جائیں دوسرے دن امرت لال کی اطلاع پر بادشاہ نے پھاٹک کے تمام سپاہیوں کو برطرف کر دیا اور اُن کی جگہ فوجی پہرہ بٹھلا دیا گیا۔

دو دن کے بعد وقایع نگاروں نے جان لکناٹن رزیڈنٹ کو ان واقعات سے مطلع کیا، یہ بادشاہ کی ملاقات کے لئے گئے اور شکایت کی کہ آپ نے اپنے پوتے کی پیدایش کی مجھکو مطلق اطلاع نہ دی۔ یہ سنکر بادشاہ کے چہرہ پر استعجاب کی کیفیت ظاہر ہوئی، اس پر رزیڈنٹ نے دوبارہ شکایت کی اور نومولود کی پیدایش کے متعلق جو کچھ سنا تھا اُس کا بھی اعادہ کیا بادشاہ یہ سنکر متفکر ہو گئے اور کہا کہ وقت مناسب نہیں ہے پھر کبھی اس مسئلہ پر گفتگو ہو گی۔ رزیڈنٹ کو یہ سنکر تعجب ہوا اور دریافت کیا کہ بچہ کی پیدایش کے متعلق جو کچھ افواہ سُنی جاتی ہے کیا وہ صحیح ہے؟ اور کیا یہ بھی واقعہ ہے کہ سلیمان جاہ اور محسن الدولہ کو دربار میں آنے کی ممانعت ہو گئی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ جب بچہ پیدا ہوا تو ولی عہد خاصہ برداروں کے ساتھ شام کو حاضری کے لئے معہ تھے لیکن چونکہ لڑکا ایک دھوبن کے بطن سے پیدا ہوا تھا اس لئے میں نے مراسم مروجہ کی ادائی سے انکار کر دیا۔ اُن کا اس سے مطلب صرف یہ تھا کہ اس ولادت کی شاہی تصدیق ہو جائے۔ رزیڈنٹ نے کہا کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ سلیمان جاہ اور بادشاہ بیگم کے دشمنوں نے یہ خبر تصنیف کر کے آپ تک پہونچائی ہو۔ بادشاہ نے کہا کہ اس مسئلہ کی میں نے پوری تحقیقات کر لی ہے۔

رزیڈنٹ نے ان تمام باتوں کی اطلاع اپنی حکومت سے ۔۔۔ میں لکھا کہ ولی عہد جو اپنا باپ ہونا تسلیم کرتے ہیں لیکن بادشاہ اس کو نہیں مانتے"۔

سکریٹری امورِ خارجہ نے ۴؍ اکتوبر کو رزیڈنٹ کے مکتوب مورخہ ۱۲؍ ستمبر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ اس باب میں پوری تحقیقات کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ولی عہد اس نومولود کے حقیقی باپ ہیں یا نہیں۔

رزیڈنٹ نے حکم دیا کہ مفرور دھوبن کے شوہر کا اظہار لیا جائے۔ اس لئے میر منشی نے اس کو نوکر رکھ لیا اور پھر اُس کا اظہار لیا گیا۔ جب دوبارہ بادشاہ کی خدمت میں رزیڈنٹ گئے تو انھوں نے ایک کاغذ بادشاہ کو دیا اور درخواست کی کہ آیندہ قصوں جھگڑوں کا سدباب کرنے کی غرض سے جو کچھ وہ اُس نومولود کے متعلق جانتے ہوں اُسے تحریر فرمادیں اور یہ بھی درخواست کی کہ جہاں پناہ خود محل میں تشریف لے جاکر اُس نومولود کو ملاحظہ فرمالیں۔ لیکن جہاں پناہ نے تحریر دینے سے قطعی انکار کیا اور کہا کہ نومولود اُن کا پوتا نہیں ہے اور اسی لئے انھوں نے حسب رواج قدیم اس موقع پر کوئی مروجہ رسم ادا نہیں کی اور یہ بھی کہا کہ اگر اس نومولود کی پیدائش میں کوئی راز نہ تھا تو بادشاہ بیگم کے پاس کوئی معقول وجہ محل کی دیگر خواتین کو طلب نہ کرنے کی نہ تھی، حالانکہ اس کے متعلق میرا صریح حکم تھا۔ بادشاہ نے دائی کو طلب کرنے کا حکم دیا اور خود ایک خط اس سلسلہ میں بادشاہ بیگم کو بھی لکھا۔ ان تمام حالات سے پتہ چلتا ہے کہ رزیڈنٹ نے ہر ممکن طریقے سے نفس معاملہ کی صحت کے متعلق جستجو کی۔

وقایع نگاروں نے ۲۵ جمادی الثانی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۳؍ مئی ۱۸۱۷ء کو رزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ بادشاہ نے ۳ کنیزوں کو جنھیں منتظم الدولہ مہدی علی خاں نے نذر کیا تھا، میمنت خواجہ سرا کے ذریعہ سے بادشاہ بیگم کے پاس بھیجا تھا جن میں سے دو مرگئیں اور تیسری افضل محل زندہ تھی۔ جو اس نومولود کی ماں تھی اور یہ بھی مطلع کیا گیا کہ نومولود افضل محل کے سینہ سے دودھ پیتا تھا اور ولی عہد اور بادشاہ بیگم کو اطمینان تھا کہ اگر بادشاہ کو کچھ بھی شبہ ہوگا تو وہ زچہ اور بچہ دونوں کو بچشم خود ملاحظہ کرلیں گے۔

اس سلسلہ میں پیرا دھوبی نے جو بیان دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے: "میری ۱۰ سالہ بیوی تقریباً ۸ مہینہ ہوئے غائب ہوگئی ہے، وہ حاملہ تھی۔ یہ واقعہ ۱۰؍ اگست ۱۸۲۰ء مطابق ۷، ذیقعدہ ۱۲۳۵ھ کا ہے دن کے دو گھڑی گزرے تھے کہ وہ پرورش علی کے مکان کپڑے لیکر گئی اور پھر اُس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ دوپہر کو منیا دلالہ میرے مکان آئی اور اُس کے متعلق گفتگو و شنید کی۔ میری ساس نے جواب دیا کہ وہ پرورش علی کے گھر کپڑے لیکر گئی ہے۔ میں گھر چلا آیا اور شام تک اُسکی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ میں پرورش علی کے گھر گیا معلوم ہوا کہ وہ واپس گئی۔ کچھ لوگوں نے مجھ کو خبر دی کہ منیا دلالہ نے پرورش علی کی سازش سے میری عورت کو بیچ ڈالا ہے۔ میں دلالہ کے گھر گیا وہ موجود نہ تھی اُس کے لڑکے نے کہا کہ وہ دو دن سے باہر گئی ہوئی ہے اور ابھی واپس نہیں آئی ہے۔ آخر کار تیسرے دن وہ مجھکو ملی اور میں نے کوتوال سے سب قصہ بتلا کر اُس کو گرفتار کرا دیا۔

۴ دن کے بعد دلالہ نے میری عورت کو واپس لانے کا وعدہ کیا اور وہ چھوڑ دی گئی لیکن اُس کا تام روزنامہ حاضری کے لئے کوتوالی میں لکھ لیا گیا۔ کوتوال نے بہت کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی، میں مایوس ہو کر خاموش ہوگیا اور

دلا دی بھی ۲۴ محرم کو چھوڑ دی گئی - میں اس افواہ پر یقین رکھتا ہوں کہ وہ رنگ محل میں ۱۵۰ روپیہ پر بیچ ڈالی گئی"

رزیڈنٹ نے ۲۰ دسمبر کو یہ بیان گورنر جنرل بہادر کو بھیج دیا اور اُس ملاقات کا بھی ذکر کیا جو اس سلسلہ میں بادشاہ سے ہوئی تھی۔

اسی زمانہ میں ایک دن جہاں پناہ نے محسن الدولہ سے دریافت کیا کہ اُن کے ماموں نصیر الدین حیدر شاہی عیادت کے لئے کیوں نہیں آئے، حالانکہ جہاں پناہ کے ٹانگ میں زخم تھا۔ محسن الدولہ نے جواب دیا کہ وہ جہاں پناہ کے احکام کے منتظر ہیں۔ جہاں پناہ نے فرمایا کہ جاؤ اُن سے کہو کہ وہ مع نومولود کے فوراً حاضر خدمت اقدس ہوں۔ محسن الدولہ نے بادشاہ بیگم کو مطلع کیا اور انھوں نے منا جان کو مع نصیر الدین حیدر کے شاہی دربار میں بھیجدیا۔ ولی عہد بہادر دربار میں تشریف لے گئے شاہی قدموں پر سر رکھنے کا شرف حاصل کیا اور جہاں پناہ نے اُن کو اُٹھا کر سینہ سے لگایا اور بہت روئے اور نومولود کو بھی اپنی آغوش میں لیا اور دونوں کو خلعت عطا کئے اور حسب دستور قدیم رخصت کیا۔

مسٹر ریپر منصرم رزیڈنٹ نے اس واقعہ کی اطلاع بھی اُسی دن (۱۰ اپریل ۱۸۲۱ء) کو گورنر جنرل کو دیدی۔

اور وجوہ کے علاوہ جو اس نومولود کی ولادت کو مشکوک ثابت کرتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسٹر میڈرک سابق رزیڈنٹ کے زمانہ میں بادشاہ بیگم نے بیان کیا تھا کہ حمل کی مدت ۲ سال سے زاید بھی ہوسکتی ہے۔ علاوہ اس کے ایک خبر یہ بھی مشہور تھی جس کی تصدیق نواب معتمد الدولہ نے بھی کی تھی کہ نصیر الدین حیدر پیدائشی ناکارہ تھے اور اسی بنا پر دار السلطنت میں ہر شخص اس سے واقف تھا کہ فریدوں بخت، نصیر الدین حیدر کے نطفہ سے نہ تھا اور اُس کی تبنیت محض اسی بنا پر عمل میں آئی تھی کہ جہاں پناہ لاولد تھے۔

منتظم الدولہ کا یہ بیان بھی اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ: نصیر الدین حیدر نے صریحاً یہ بیان کیا کہ کیوان جاہ اور فریدوں بخت اُن کے لڑکے نہ تھے اور یہ کہ انھوں نے لاولد ہونے پر اظہار افسوس بھی کیا تھا۔ علاوہ بریں نصیر الدین حیدر نے تخت نشین ہونے کے بعد فریدوں بخت کے ولی عہدی کی تصدیق نہ کی تھی بلکہ کیوان جاہ کو جو اُن کے لڑکے نہ تھے ولی عہدی کے لئے نامزد کیا تھا۔

ان حالات کی اطلاع بھی یکم جنوری ۱۸۳۱ء - ۱۶ رجب ۱۲۴۶ھ کو رزیڈنٹ نے گورنر جنرل کو دیدی تھی۔

کچھ افراد جو اس مقدمہ کے واقعات سے باخبر تھے وہ کانپور میں رہتے تھے اس لئے مندرجۂ ذیل بیانات مسٹر اولڈ فیلڈ جج کانپور نے وہاں اُن لوگوں نے حاصل کئے۔

بیان پرورش علی خاں: "منیا دھوبن جو ذی الحجہ میں میرے مکان پر کپڑے دھو کر لائی تھی۔ اُسوقت بادشاہ بیگم کی خادمہ بدھی خانم معروف بہ امانی خانم جو میرے یہاں آکر مہمان رہتی تھیں آئی تھیں۔ میری موجودگی میں انھوں نے منیا سے کہا کہ تم حاملہ ہو لیکن تمھارے مرد سے تمھاری بنتی نہیں ہے، محل میں ایک حاملہ عورت کی تلاش ہو رہی ہے میں تم کو بیگم صاحب کے پاس پہونچا دوں، اگر خوش قسمتی سے لڑکا ہوا تو تمام دنیاوی عیش و آرام مہیا کیا جائے گا۔ چونکہ منیا اپنے مرد سے خوش نہ تھی اس لئے وہ اور بدھی خانم دونوں ایک محافہ میں بیگم کے محلسرا چلی گئیں۔ مرزا عنایت علی محافہ کے ساتھ محلسرا کی ڈیوڑھی تک گیا۔ مرزا ابھی لکھنؤ میں رہتا ہے۔ میں اس ماہ کی چوتھی کو بدھی خانم سے لا وہ بخار میں مبتلا تھی اور ساتویں کو اُس کا

انتقال ہو گیا۔

سوال — مُنیا کے محل میں جانے کے کتنے دنوں بعد تم کو معلوم ہوا کہ مُنیا کے بچہ ہوا ہے ؟

جواب — ۱۵ یا ۱۶ دن بعد۔

مرزا عنایت علی کا بیان : ذی الحجہ کے مہینہ میں (دن تاریخ مجھکو یاد نہیں) ایک دن پرورش علی خاں کی ڈیوڑھی پر بیٹھا تھا کہ امانی خانم بادشاہ بیگم کی خادمہ آئیں اور مجھ سے کہا کہ میں اُن کے ہمراہ محلسرا تک چلا چلوں، میں نے اُس عورت کے متعلق تفتیش کی جو امانی خانم کے ساتھ تھی تو معلوم ہوا کہ وہ پیرا دھوبی کی عورت تھی اُس کا نام منیا تھا۔ چونکہ میں منیا دھوبن کو جانتا تھا اس لئے میں نے دریافت کیا کہ حاملہ عورت کو محل میں لے جانے سے کیا فایدہ ہے، مجھ کو جواب ملا کہ محل میں آجکل اسی قسم کی ایک عورت کی شدید ضرورت ہے۔ وہ دونوں ایک محافہ میں بیٹھیں اور میں محلسرا کے پھاٹک تک ساتھ گیا۔ گو اُن لوگوں نے مجھ کو بڑی قمیں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ایک چھدام بھی نہ دی۔

سوال — تمھاری دانست میں محل میں جانے کے منیا کے کتنی مدت بعد لڑکا ہوا ؟

جواب — ۱۵ - یا ۱۶ دن کے بعد۔

شیخ زین اللہ کا بیان : "میں امانی خانم کی ملازمت میں تھا وہ ایک حاملہ عورت بادشاہ بیگم کی خدمت میں لے گئیں اور مجھ کو حکم تھا کہ میں ساتھ جاؤں، محلسرا کی ڈیوڑھی تک میں بھی ہمراہ گیا تھا۔

سوال — منیا کے محل میں جانے کے کتنے دنوں بعد تھارے علم میں بچہ ہوا ؟

جواب — ۱۵ یا ۱۶ دن کے بعد۔

مسماۃ مہتاب قابلہ کا بیان : بادشاہ بیگم نے مجھے طلب کر کے محل میں رہنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ سکھ چین خواص حاملہ ہے میں اکثر سکھ چین کے بستر پر اُس کے ساتھ سوئی اُس کے پیٹ پر بھی بارہا ہاتھ پھیرا لیکن میں نے اُس میں کوئی آثار حمل کے نہ پائے۔ ۹ ماہ بعد بیگم صاحبہ مجھ سے ناراض ہوگئیں اور جواب طلب کیا کہ اب تک بچہ کیوں پیدا نہ ہوا ؟

میں نے جواب دیا کہ جب رحم مادر میں کوئی بچہ نہیں ہے تو وہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس جواب سے اُس کا غصہ بھڑک اُٹھا اور مجھے باہر بھیج دیا۔

ایک دن سہ گھڑی رات گزری ہوگی کہ فیض النسا میرے پاس آئیں اور کہا کہ سکھ چین کے درد شروع ہو گئے ہیں اور میری خوش نصیبی پر مجھکو مبارکباد بھی دی، میں اُن کے ساتھ سکھ چین کے پاس گئی وہاں کوئی آثار وضع حمل کے نہ تھے، مجھ کو مایوسی ہوئی لیکن سزائے موت کے ڈر سے خاموش رہی۔ ایک گھڑی کے بعد یہ اطلاع دی گئی کہ لڑکا پیدا ہو گیا ہے میں محل واپس چلی گئی مجھ کو اچنبھا ہوا۔ فیض النسا اور دوسری مغلانیاں بچہ کو میرے پاس لائیں، میں نے اُس کی نال کاٹی اور ہزار روپیہ اور جڑاؤ کنگن انعام پایا، میں نے تیل اور کپڑا زچہ کی مالش کے لئے طلب کیا لیکن مجھکو جواب ملا کہ یہ رسم غربا کے یہاں رائج ہے اور امرا کے یہاں یہ دستور نہیں ہے۔ فیض النسا نے ۲۰۰ روپیہ مجھ سے اُسی وقت لے لئے ۸۰۰ میرے پاس بچے تھے۔ جب شاہ زمن غازی الدین حیدر نے مجھ سے یہ ماجرا دریافت کیا تو میں نے یہی ان سے بھی کہدیا تھا۔

سوال — بچہ کی پیدائش کس سال اور کس مہینہ اور کس دن ہوئی ؟

جواب — غالباً ذی الحجہ کا مہینہ تھا۔ دن تاریخ تو اچھی طرح یاد نہیں ہے۔

سوال — جب بچہ پیدا ہوا تو کیا یہ تم کو علم ہوا کہ اُس کی ماں کون ہے؟

جواب — ۸ - ۹ دن کے بعد فیض النسا نے مجھ سے کہا افواہ ہے کہ یہ دھوبن کے پیٹ سے ہے تو اُس پر میں نے کہا کہ ناحق میں نے ایک دھوبن کے لڑکے کی نال کاٹی۔ اس جواب پر فیض النسا خفا ہو گئیں اور بگڑ کر کہنے لگیں۔ تجھ کو ہمیشہ یہی کہنا چاہئے کہ یہ سکھ چین کے پیٹ سے ہے۔ میں نے جواب دیا میں ناحق جھوٹ کیوں بولوں!

دلاور خاں کا بیان: میں شاہ زمن غازی الدین حیدر شاہ اودھ کا قدیم نمک خوار ہوں جب مُنیا دھوبن قید کی گئی تو وہ میرے ہی حراست میں تھی۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ تو کیوں قید کی گئی ہے تو اُس نے جواب دیا کہ "وہ پیرا دھوبی کی عورت ہے اور جب وہ حاملہ تھی تو بادشاہ بیگم کی مغلانی امانی خانم اُس کو دھوکہ سے محل لے گئی۔ جب اُس کے بچہ ہو گیا تو نوبتی خانم مغلانی اُس کو اپنے گھر لے گئیں اور جن دواؤں کی اُس وقت ضرورت تھی اُنھوں نے کیں، اور اُس کی دیکھ بھال بھی کی۔ شاہی ملازم اُس کی تلاش میں تھے۔ مغلانی نے مجبوراً اُس کو عباس بیگ کے حوالہ کر دیا جو اُس کو معتمد الدولہ کے پاس لے گیا۔ معتمد الدولہ نے اُس کو فرح بخش بادشاہ کی خدمت میں تحقیقات کے لئے بھیجدیا۔ عباس بیگ کو تھوڑی دیر کے لئے سپاہیوں کے دستہ کی حراست میں بھی رہنا پڑا تھا" شاہی احکام کی رو سے میں منیا کو معتمد الدولہ کے پاس لے گیا۔ کچھ دنوں سے اب میں کانپور میں مقیم ہوں، اس مہینہ کی ساتویں کو مجھ سے ایک لاش دیکھنے کے لئے کہا گیا تھا میں نے شناخت کی کہ وہ لاش مُنیا دھوبن کی تھی۔

نوبتی خانم کا بیان: میں خوب واقف ہوں کہ منا جان سکھ چین کے پیٹ سے نہیں ہیں، وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی اور کبھی کوئی بچہ اُس کے پیدا نہیں ہوا۔

سوال — زچگی کے لئے کس قابلہ کو طلب کیا گیا تھا؟

جواب — مسماۃ مہتاب دائی بلائی گئی تھی۔

سوال — کیا تم نے سکھ چین کو زچگی کے بعد دیکھا تھا

جواب — ہاں میں نے اُس کو محل میں اچھے خاصے طریقے سے چلتے پھرتے دیکھا تھا۔

معتمد الدولہ نے رزیڈنسی کے دفتر میں جو رپورٹ پیش کی اس کا خلاصہ یہ ہے:

"جب بادشاہ بیگم نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ سکھ چین حاملہ ہے تو بادشاہ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ بغیر میری ایما کے یہ لڑکی نصیر الدین حیدر کے پاس کیوں بھیجی گئی کیونکہ لارڈ ہسٹنگس اور میری رائے تھی کہ نصیر الدین حیدر کی شادی کسی معزز امیر کی لڑکی سے کی جائے تاکہ پہلا لڑکا نجیب الطرفین ہو، بادشاہ نے مقررہ مدت ۹ ماہ تک انتظار کیا اور جب کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ یہ چال سمجھ گئے اور انھوں نے بادشاہ بیگم کے پاس پیام بھیجا کہ "بچے کی ولادت میں اس قدر تعویق حیرت ناک ہے"، انھوں نے جواب دیا کہ بچہ پیدا ہونے کے لئے طیار ہے لیکن ارواح خبیثہ اُس کی ولادت میں ہارج ہیں۔ اس جواب سے بادشاہ کے شبہات قوی تر ہو گئے۔ جہاں پناہ نے حکم دیا کہ بچے کی پیدائش اُن کی بہنوں پھوپھیوں اور دوسری محل کی معزز بیگمات کے سامنے ہونا چاہئے۔ اس امر کو بھی ۲۰ ماہ گزر گئے۔ بادشاہ کے شکوک بڑھتے گئے اس عرصہ میں

یہ افواہ بھی گرم ہوئی کہ محل میں بادشاہ بیگم کے ملازمین کسی حاملہ عورت کی تلاش میں ہیں اور یہ کہ ایک حاملہ عورت جو محمد باقر
کے ملازمت میں تھی غائب ہے۔ یہ افواہ سنکر بادشاہ نے دوسرا پیام بادشاہ بیگم کو بھیجا کہ بچہ کی پیدایش کے وقت خانوادہ
منصوریہ کی جملہ بیگمات کو مدعو کیا جائے تاکہ بچہ اُن کی موجودگی میں پیدا ہو، کچھ دنوں کے بعد دفعتاً جہاں پناہ کو بچہ کی پیدایش
کی اطلاع ہوئی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ ولی عہد بہادر نذر پیش کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں اور یہ بھی سنا گیا کہ ولی عہد
بہادر حسب دستور قدیم شاہی محل میں نومولود کی پیدایش کی تصدیق کے لئے سلامی کی توپیں سر ہونے کی استدعا بھی کریں گے
جہاں پناہ نے ناراض ہو کر فرمایا کہ اگر یہ میرا پوتا ہوتا تو توپوں کی سلامی ضرور ہوتی۔ ولی عہد بہادر یہ سنکر مایوس واپس چلے گئے
کچھ عرصہ کے بعد ولیعہد اور محسن الدولہ اُس بچہ کو جہاں پناہ کے حضور میں لے گئے اور بادشاہ نے غصہ سے اُس
بچہ کی شکل دیکھنے سے انکار کر دیا اور اس واقعہ کی اطلاع منتظم الدولہ کے ذریعہ سے رزیڈنٹ کو بھی دیدی تھی رزیڈنٹ نے
اس کو سنکر کہا کہ میں نے سنا ہے کہ بادشاہ نے بچہ کو گود میں لیا تھا۔ لیکن منتظم الدولہ نے جواب دیا کہ کسی شخص نے رزیڈنٹ کو
غلط اطلاع دی ہے۔ منصرم رزیڈنٹ کرنل ریپر اور مسٹر ریکٹ رزیڈنٹ کے عہد حکومت میں بھی بادشاہ نے ان واقعات
کی اطلاع دیدی تھی کہ یہ بچہ نصیر الدین کے نطفہ سے نہ تھا۔

اس کے بعد دوبارہ بادشاہ بیگم نے اعلان کیا کہ سکھ چین حاملہ ہے بادشاہ بیگم نے شاہی طبیب اور ایک فرنگی ڈاکٹر
کو ایک ہندوستانی ڈاکٹر کے ساتھ اس خبر کی تصدیق کے لئے محل میں بھیجا لیکن بادشاہ بیگم نے اس معاینہ کی اجازت نہ دی
سکھ چین کے حمل کی داستان ۴ سال تک مشہور رہی لیکن کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔

مسٹر میڈک اور کرنل لو کے زمانہ میں تحقیقات کی کارروائی روک دی گئی تھی۔ منتظم الدولہ مہدی علی خاں شعبان ۱۲۴۷ھ
۲ فروری ۱۸۳۲ء کو تاج الدین خاں کے ساتھ رزیڈنٹ سے ملے اور اس سلسلہ میں کچھ مزید معلومات کا اظہار کیا اور انھوں نے
یہ بھی بیان کیا کہ کیوان جاہ اور منا جان کے متعلق جو کچھ آپ سے گزشتہ زمانہ میں کہا گیا تھا وہ جہاں پناہ کی جانب سے نہ تھا لیکن اب
جو اطلاع دی جا رہی ہے وہ شاہی احکام کے موجب ہے، جہاں پناہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ دونوں لڑکے اُن کے نہیں ہیں
اور وہ دونوں کو محل سے علحدہ کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ دولت خانہ یا اور کہیں باہر جا کر رہیں یہ سنکر رزیڈنٹ نے پوچھا کہ:
جہاں پناہ کو کیسے معلوم ہوا کہ فریدوں بخت اُن کے لڑکے نہیں ہیں اور یہ کہ اُن کے خیال میں فریدوں بخت کا باپ کون ہے؟
رزیڈنٹ نے نواب منتظم الدولہ کو یہ بھی یاد دلایا کہ ایام گزشتہ میں بھی اُن کو کچھ اس سلسلہ میں شکوک تھے، نواب منتظم الدولہ نے جواب
دیا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جہاں پناہ کے والد کے حیات میں نصیر الدین حیدر ایک دن محل میں گئے اور انھوں نے میر فضل علی کو افضل محل
سے کچھ بے عنوانیاں کرتے دیکھا وہ اُسی وقت دونوں کو قتل کر دینا چاہتے تھے لیکن میر فضل علی معاً محل سے بھاگ گیا اور بادشاہ بیگم
نے دونوں کی جان بچائی، یہ امر نصیر الدین حیدر کو حد درجہ ناگوار گزرا اور وہ محل چھوڑ کر معتمد الدولہ کے ساتھ چلے گئے اور تین دن وہیں
رہے، لیکن شاہی احکام کے موجب اُن کو محل میں واپس جانا پڑا۔ دوسری بار دوبارہ انھوں نے محل چھوڑا اور حسن باغ میں اقامت
اختیار کی۔ اس کے بعد بادشاہ بیگم نے افضل محل سے تجدید تعلقات کی پھر سعی کی اور مختلف ذرایع سے وہ حاملہ بھی ہو گئی۔ اس
زمانہ میں نصیر الدین افضل محل کے پاس نہیں گئے اس طرح وہ
شرمناک واقعہ کے ۶ ماہ بعد فریدوں بخت پیدا ہوئے۔ منتظم الدولہ نے کچھ واقعات بیان کئے
اور بادشاہ دونوں مطمئن ہیں کہ فریدوں بخت اُن کا لڑکا نہیں ہے۔ کیوان جاہ کے متعلق بھی

اور کہا کہ بادشاہ حد درجہ شرمندہ ہیں کہ بادشاہ کی طرف سے کہ وہ فریدوں بخت کو رزیڈنسی دعوت میں نہیں لے گئے بادشاہ بیگم کو بہت قلق ہوا اور سارا الزام انھوں نے مجھ پر لگایا حالانکہ بادشاہ نے خود فرمایا تھا کہ فریدوں بخت کے دعوت میں نہ لیجانے کے وہ خود ذمہ دار ہیں اور میرا کوئی دخل نہ تھا، لیکن بادشاہ بیگم نے یہ بات تسلیم نہ کی اور وہ مجھ سے ناراض ہوگئیں انھوں نے بہت سی خبریں بھی مشتہر کی تھیں کہ "منتظم الدولہ دو گھنٹے سے زیادہ نہ رہیگا" اور معتمد الدولہ کو دربار میں واپسی کا حکم بھی صادر کر دیا گیا تھا۔ بادشاہ بیگم کا قاصد جو ساحل گنگا پر گرفتار کر لیا گیا تھا وہ ہنوز حراست میں ہے وہ اس واقعہ کے متعلق اظہار رائے کر سکتا ہے۔ جہاں پناہ چاہتے ہیں کہ بادشاہ بیگم دار الخلافت کو چھوڑ کر کہیں اور جاکر رہیں اور زیادہ بہتر ہوگا کہ اگر وہ فیض آباد میں قیام کریں۔

رزیڈنٹ نے ۳ فروری کو ان تمام واقعات کی اطلاع صدر دفتر کو دیدی اور ۹ فروری مطابق ۲ رمضان کو منتظم الدولہ رزیڈنٹ اور بادشاہ میں ڈنر کے بعد ایک خفیہ کانفرنس ہوئی، رسمی گفتگو کے بعد جہاں پناہ نے شرمندگی سے کہا، بیس دن کے بعد ماہ صیام ختم ہو جائے گا اور قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ فریدوں بخت اور کیوان جاہ شاہی ساز و سامان کے ساتھ عید آصفی میں نماز عید کے لئے جایا کرتے تھے۔ لیکن ہم یہ رسم منسوخ کر دینا چاہتے ہیں۔ رزیڈنٹ نے اپنی اور رنیز گورنر جنرل بہادر کی ہمدردیوں کا یقین دلاتے ہوئے اس رسم قدیم کے منسوخ کر دینے کی وجہ دریافت فرمائی، نواب منتظم الدولہ بہادر نے جہاں پناہ سے شاہی وجوہ بیان کرنے کی استدعا کی۔ بادشاہ نے نہایت صفائی سے کہا کہ میں آپ کو بہ حیثیت ایک دوست تصور کرتے ہوئے یہ مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ فریدوں بخت اور کیوان جاہ میرے لڑکے نہیں ہیں۔ اور دوسرے اُمور کے متعلق نواب معتمد الدولہ نے آپ کو مطلع کر دیا ہوگا۔ اس کی تفصیل بھی وہی سب بتلائیں گے اس کے بعد نواب معتمد الدولہ نے جملہ واقعات دوبارہ تفصیل سے بیان کئے۔ اس کے بعد جہاں پناہ نے فرمایا کہ یہ افواہ کہ دونوں میرے لڑکے ہیں، بالکل غلط ہے۔

رزیڈنٹ نے نواب گورنر جنرل بہادر کو ان تمام واقعات سے مطلع کر دیا۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے رزیڈنٹ کو حکم دیا کہ چونکہ جہاں پناہ لاولد ہیں اس لئے مناسب امر یہ ہے کہ نواب سعادت علی خاں کی اولاد نرینہ میں سے سب سے بڑی ہستی جو موجود ہو اس کو جانشینی کے لئے نامزد کیا جائے۔

(باقی) **مشیر احمد علوی**

"نگار" کے پُرانے پرچے

۲۶ء: جنوری ۸ر — ۲۷ء: اگست ۵ر — ۲۸ء: مئی ۵ر — جون ۵ر — ۳۰ء: مئی ۱۲ر — ۳۱ء: جولائی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ — ۳۲ء: جنوری ۱۲ر، فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، نومبر ۸ر فی پرچہ۔ دسمبر ۵ر — ۳۳ء: فروری ۸ر — ۳۴ء: فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ — ۳۶ء: دسمبر ۱۲ر — ۳۷ء: فروری، مارچ ۱۲ر فی پرچہ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ، ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ر فی پرچہ — ۳۸ء: فروری، اپریل تا دسمبر ۵ر فی پرچہ — ۳۹ء: فروری تا جولائی ۴ر فی پرچہ — اکتوبر و نومبر ۸ر فی پرچہ —

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلة والمناظرہ

اُردو کا جدید رسم خط

مکرمی نیاز صاحب

آپ نے مارچ کے نگار میں رسم الخط کے متعلق میرا مضمون اور رسم الخط کے نمونے شایع کئے۔ شکریہ۔ آپ نے اس جدید رسم خط پر جو تنقید کی ہے اُس کا بھی شکریہ۔ لیکن اس تنقید کے متعلق مجھے کچھ کہنا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر آپ غور سے میرے جوابات دیکھیں گے تو بڑی حد تک میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

۱۔ آپ کہتے ہیں کہ ٹائپ کی کامیابی کا انحصار کم سے کم حروف تہجی پر ہے، اور اس رسم خط میں ۴۲ حروف ہیں۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ کم سے کم حروف والا ٹائپ زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے، لیکن میرے ایجاد کردہ رسم خط میں حروف کی تعداد زیادہ نہیں اس لئے کہ یہ تعداد انگریزی کے مقابلہ میں پھر بھی کم ہے کیونکہ انگریزی حروف کی تعداد اگرچہ بظاہر ۲۶ ہے لیکن عملی اعتبار سے یہ تعداد ۵۲ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ چھوٹے بڑے دونوں قسم کے حرفوں سے یکساں طور پر کام لیا جاتا ہے، ناموں کی ابتدا بڑے حرفوں سے ہوتی ہے، ہر جملہ بڑے حرف سے شروع ہوتا ہے اس کے علاوہ اور بھی متعدد صورتوں سے بڑے حرفوں کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا اس رسم خط کا ٹائپ جاننے میں انگریزی سے کچھ زیادہ وقت صرف نہ ہوگا۔

۲۔ آپ لکھتے ہیں کہ اس نقص کو دور کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ زبان کو املا کی پابندی سے آزاد کر دیا جائے میرے خیال میں زبان کو املا کی پابندی سے آزاد کرنا رسم خط ایجاد کرنے والے کا کام نہیں بلکہ یہ خود اہل زبان کا کام ہے۔ اگر اُردو زبان کے مستند اصحاب اور ادارے اس پر اتفاق کرلیں تو یہ حروف رسم خط خود بخود الگ ہو جائیں گے، مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا لسانی اعتبار سے ایک ایسی زبان کے لئے کہاں تک درست ہے جس میں پچاس سے لیکر پچھتر فی صد تک عربی اور فارسی الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اور یہ زبانیں ابھی تک زندہ ہیں اور اُسی رسم خط میں لکھی جاتی ہیں جس میں ہماری اُردو لکھی جاتی ہے لہٰذا ث، ص، اور س کی جگہ صرف س کو اور اسی طرح ت اور ط کی جگہ صرف ت کو قایم رکھنا اصولاً غلط ہوگا، الفاظ کے ماخذ اور اُس کے مشتقات کو سمجھنے کے لئے الفاظ کو اُسی املا سے لکھنا ضروری ہے جس املا میں وہ اصل زبان زبانوں میں لکھے جاتے ہیں

۳۔ آپ لکھتے ہیں کہ ی میں صرف ی کافی ہے "چھوٹی اور بڑی کی تعیین کچھ نہیں" یہ تجویز تو کسی طرح صحیح نہیں اس لئے کہ چھوٹی ی یائے معروف کا تلفظ بتاتی ہے اور بڑی ے یائے مجہول کا، اور جب کہ یہ دونوں حرف بالکل علٰحدہ علٰحدہ تلفظ کی نمایندگی کرتے ہیں تو ان کی شکلیں بھی علٰحدہ علٰحدہ ہونی چاہئیں۔ ورنہ لڑکے اور لڑکی کے تلفظ کا فرق کس طرح بتایا جائے گا۔

۴ - آپ لکھتے ہیں کہ "نون غنہ کے لئے نون کا نقطہ اُڑا دینا کافی ہوگا" - یہ ممکن تو ہے - مگر ایسا کرنے سے حرفوں کا باہمی التباس بڑھ جائے گا، اس لئے کہ اگر ب یا پ کے نقطے لگانا بھول جائیں تو محاورے سے صحیح لفظ پڑھ لیں گے لیکن نون غنہ پر نقطہ نہ لگانے سے التباس کی ایک صورت اور بڑھ جائے گی، اس لئے نقطہ اور علامت دونوں کے ساتھ اُن کا لکھنا زیادہ ٹھیک ہوگا، اور آپ کی تجویز سے کوئی حرف کم بھی نہیں ہوتا، غنہ کے اظہار کے لئے علٰحدہ حرف رکھنا لازمی ہے خواہ وہ بغیر نقطے کے ہو یا نقطے کے ساتھ -

۵ - آپ لکھتے ہیں کہ "واؤ مخلوط کا تلفظ ہماری زبان میں نہیں" میرا مطلب واؤ معروف سے واؤ کا وہی تلفظ ہے جو کمزور ہوتا ہے جیسے تواَ، ہوَا اب اس کمزور واؤ کو خواہ مخلوط کہئے یا کچھ اور مگر اس کی علٰحدہ رکھنا ضروری ہے -

۶ - آپ کھنچے ہوئے زیر اور پیش کے لئے علامت چاہتے ہیں، لیکن در اصل اس کی کوئی ضرورت نہیں - زبر، زیر، اور پیش کا کھنچا ہوا تلفظ الف، ی اور واؤ معروف بنے یا مجہول، گُولا اور بوٹا کی مثال غلط ہے، گولے میں واؤ مجہول ہے اور بوٹے میں معروف، جن کے لئے رسم خط میں علٰحدہ علٰحدہ شکلیں موجود ہیں -

۷ - دھ، تھ، اور گھ وغیرہ کا تلفظ، آپ کہتے ہیں، د، ت اور گ وغیرہ میں کچھ تغیر کرکے پیدا کرنا چاہئے، آپ کی یہ تجویز بھی درست نہیں، اس لئے کہ پھر وہی حروف کی کثرت کا سوال پیش آجائے گا، جس کی آپ کو پہلے سے شکایت ہے، کیونکہ ہائے مخلوط والے حرف دس ہیں، اور اُن کو علٰحدہ رکھنے سے تعداد ۴۲ سے ۵۲ ہو جائے گی -

۸ - آپ کہتے ہیں کہ ا ٹیڑھی کھیر ہے لیکن خود آپ نے گ کی جو شکل بنائی ہے وہ بھی کچھ کم ٹیڑھی کھیر نہیں، در اصل یہاں دشواری اس وجہ سے پیش آئی ہے کہ مرکز والے ک کو ٹائپ کی نشست میں بٹھانا مشکل تھا، اس لئے یہ شکل تجویز کی گئی، تاکہ اصل سے قریب تر رہے، البتہ زیادہ آسانی کے لئے گ کو یوں ⸸ لکھ سکتے ہیں -

مجھے امید ہے کہ آپ میرے یہ تمام جوابات آئندہ پرچے میں شایع کر دیں گے، تاکہ پڑھنے والوں کو اس رسم خط کے صحیح اُصول سے واقفیت ہو سکے اور اُن کو اپنی رائے دینے میں آسانی ہو -

محمود علی خاں (بی-اے) بھوپالی

(نگار) (۱) یہ صحیح ہے کہ انگریزی میں بڑے چھوٹے حروف ملا کر ۵۲ ہو جاتے ہیں، لیکن بڑے حروف کا استعمال بہت کم ہوتا ہے اور آپ کے یہاں سبھی کا استعمال بکثرت ہوگا، علاوہ اس کے ٹائپ رائٹر میں انگریزی کے بڑے چھوٹے حروف ایک ہی کمانی سے متعلق ہوتے ہیں، اور آپ کے رسم خط پر اگر ٹائپ رائٹر طیار کیا گیا تو اس میں یہ آسانی ممکن نہ ہوگی -

(۲) املا بدلنے کا طرفدار تو میں بھی نہیں ہوں، لیکن رسم خط کی تبدیلی کے ساتھ یہ سوال بھی ضرور سامنے آتا ہے، کیونکہ غیر ملک والوں کو زبان سیکھنے میں آسانی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ الفاظ کے مخارج کو نظر انداز کرکے صرف صوتی (Phonetic) اُصول پر رسم خط قایم کیا جائے -

(۳) چھوٹی ی اور بڑی ے کے فرق کو علامات حرکت سے ظاہر کیا جا سکتا ہے -

ہندی میں زیر کی تین صورتیں ہیں:

کہ (کاف بیانیہ) = कि

کی (یائے معروف) = की

کے (یائے مجہول) = के

میرا ادعا تھا کہ یائے معروف و یائے مجہول کو صرف علامات حرکت سے ممیز کیا جائے۔

(۴) نون غنہ کے لئے علٰحدہ حرف ٹائپ میں رکھنا طوالت سے خالی نہیں۔ چونکہ ٹائپ رائٹر میں نقطوں کے لئے علٰحدہ کمانی مقرر کرسکتے ہیں، اس لئے ہم کو اختیار ہوگا کہ جب چاہیں اسے ن، ت، ث بنادیں اور جب چاہیں نون غنہ کردیں۔

(۵) واؤ معروف کا تعلق آپ کی واؤ مخلوط سے بالکل نہیں ہے۔ واؤ معروف اور واؤ مجہول کے متعلق تو میں نے غور ظاہر کیا ہے کہ ان کے لئے علامات علٰحدہ علٰحدہ ہونا چاہیئے۔

(۶) کھنچے ہوئے زیر اور پیش کا تلفظ محض یٓ اور واؔ سے نہیں ظاہر ہوسکتا۔ کِی اور رکے یا کُو اور رکُو کا فرق آپ محض یٓ اور واؔ سے کیونکر ظاہر کرسکتے ہیں۔

(۷) ہائے مخلوط کے متعلق بیشک آسانی اسی میں ہوگی کہ اسے علٰحدہ حرف کی حیثیت سے رکھا جائے۔

(۸) کاف کی شکل کا سوال زیادہ اہم نہیں۔

آپ کے مضمون کو دیکھ کر ایک شخص نے دہلی کے کسی صاحب کا تجویز کیا ہوا رسم خط پیش کیا ہے اور اسے قابل ترجیح قرار دیتے ہیں۔ اگلے مہینے اسے بھی پیش کروں گا۔

مکتوبات نیاز

"تو، و طوبیٰ و ما و قامتِ دوست!" بجا ارشاد ہوا۔ اس سے غالباً طوبیٰ ہی کو فخر حاصل ہوا ہوگا، "قامتِ دوست" کا مرتبہ تو اس سے کہیں بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر انسان اس قدر بر خود غلط نہ ہو تو دنیا ویران ہو جائے!

دو باتیں عرصہ سے سنتا چلا آتا تھا۔ ایک یہ کہ دنیا کا کوئی انسان پورا انسان نہیں، دوسرے یہ کہ حُسن کا تعلق صرف "محالات" سے ہے۔ یعنی اچھے سے اچھے انسان کی طرف سے بھی ہر وقت بدتمیزی کی توقع رکھنا چاہئے اور حُسن نام ہے صرف "عدمِ دسترس" کا۔ اب آپ اور آپ کے "قامتِ دوست" نے ان دونوں کا یقین دلا دیا۔ بہرحال آپ انسانِ کامل بنیں یا نہ بنیں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تصدق ہونے کے لئے "قامتِ دوست" کا سایہ آپ کو ایکبار ضرور میسر آجائے!

خدا آپ کو صحیح و سلامت رکھے، کہ اس بیسویں صدی میں قیس و فرہاد کا نام آپ ہی کے دم سے زندہ ہے، ورنہ یوں تو دنیا میں آپ کی طرح بہت سے بیفکرے نظر آتے ہیں، لیکن "عشق" کا سلیقہ کسی کو حاصل نہیں!

یہ آپ نے خوب لکھا کہ "آزمائش شرط ہے" یہ اشتہار والی ذہنیت آپ میں کیونکر پیدا ہوگئی۔ آپ کو معلوم ہے میں ---- مرحوم کی اخبار نویسی کو صرف اس لئے پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ "انتقال" کے ساتھ "پُرملال" اور "حضور" کے ساتھ "فیض گنجور" ضرور لکھتے تھے اور اپنے اخبار میں اشتہارات حاصل کرنے کے لئے اس فقرہ کے علاوہ کبھی کچھ نہیں لکھا کہ "اس میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے"

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ معاملۂ خاص میں کہاں تک اُن پر اعتماد کیا جائے، آپ فرماتے ہیں "آزمائش شرط ہے"۔ معقول! اس کے بعد یہ بھی کیوں نہ لکھدیا کہ "فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس"!

یہ تو میں جانتا تھا کہ معاملہ کو معاملہ کی طرح طے کرنا آپ کی ضعیف قوتِ ارادی سے مشکل ہے، لیکن رائے دینے میں اس قدر اُلجھاؤ کا اندیشہ کبھی نہ تھا

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ "احتیاط" اور "دھوکے" میں تھوڑا ہی سا فرق ہے! ازراہِ کرم میرے پچھلے خط کو پھر پڑھئے اور پھر اس کا جواب دیجئے۔

آپ بھی عجیب چیز ہیں۔ "لب لعل و خط زنگاری" کی فکر تو اتنی لیکن "کاروبارِ دلداری" میں جو اور ہزاروں

نکتے پوشیدہ ہیں، ان کی خبر نہیں، انسان یونتو ہر وقت اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہتا ہے، لیکن عورت اور مذہب کے باب میں اس کا دھوکا ایک مستقل فتنہ ہے۔ کوئی ان میں سے کسی ایک میں مبتلا ہوگا، آپ ماشاءاللہ دونوں کے مارے ہوئے ہیں۔ تہجد سے لیکر عشاء کے آخری تشہد تک آپ کو انسانیت میں آنے کی ایک لمحہ فرصت نہیں! خدا رحم کرے!

نصیحت کا مجھے حق نہیں، ہمدردی کی آپ کو ضرورت نہیں، پھر اس کا ذکر مجھ سے بار بار کیوں؟ شاید اس لئے کہ میں آپ کی اس زندگی سے لطف اُٹھاؤں، لیکن غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ

مستیم را نبود نغمہ وصہبا ساماں!

جب بے سروسامانی اس حد تک پہونچ جائے کہ "دعوتِ برگ و نوا" سے بینوائیاں اور بڑھنے لگیں تو پھر سولے فاتحہ پڑھ دینے کے اور کیا چارہ ہے۔ غالب کا ایک شعر سنئے:

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن
زخود رفتیم و باہم خویشتن بردیم دنیا را

اللہ، اللہ! وہ یاد فرمائیں اور میں کچھ نہ کہوں، وہ میرا ذکر کریں اور میں اپنے آپ میں رہوں!

شاد باش اے دل کہ آخر عقدہ ات وا می شود
قطرۂ ما می رسد جائے کہ دریا می شود!

تسلیم غائبانہ پہونچا دیجئے اور کہہ دیجئے کہ گو میرا قافلۂ دل جرس سے خالی ہے، لیکن خدمتِ فریاد بجالانے کی تمنا سے خالی نہیں

باہمہ کلفت و دوری بہمیں خورسندیم
کہ در آئینۂ ما حسرتِ دیدارے ہست!

بندہ نواز، محبت کی نگاہ بھی الگ ہوتی ہے اور زبان بھی، پھر میں کیونکر یقین کروں کہ آپ کو میرے ساتھ لاگ نہیں، لگاؤ ہے؟ آپ یہاں ہوں تو ملیں نہیں، وہاں ہوں، تو کسی سے پوچھیں نہیں، اور پھر اصرار یہ کہ آپ کی محبت کا اعتراف بھی کروں!

خدارا، آپ ہی انصاف فرمائیے کہ اس "شیوۂ ترکانہ" کو کیا سمجھوں اور کس امید پر بارگاہِ گرامی میں شرفِ ملازمت رکھنے کا دعویٰ کروں؟

باکدامیں ذرہ سنجم آبروئے اعتبار
آنقدر ہیچم کہ از خود شرمسارم کردہ اند

آپ اور مجھے یاد فرمائیں! لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ آپ یاد فرمائیں اور میں اس کا شکریہ

اداکروں ! دنیا میں کسی پر احسان کرنا اتنا دشوار نہیں، جتنا اعتراف احسان ! آپ کے لئے ان اداؤں کی کمی نہیں
اور میں جان صرف ایک ہی بار دے سکتا ہوں

زچاکِ سینہ آہے می نویسم　　کتانم حرفِ ماہے می نویسم
محبت نامہ پرد از ست امروز　　شرر بر برگِ کاہے می نویسم

اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں کتاں اور برگ کاہ کا کیا حشر ہو سکتا ہے !

حضرت المکرم - عطوفت نامہ پہونچا اور اُس وقت کہ اگر دو ایک دن اور انتظار کرنا پڑتا تو شاید میں نہ ہوتا۔ اس سے اپنی احتیاج و ضرورت کا اظہار مراد نہیں۔ بلکہ آپ کی چارہ سازیوں کی اہمیت کا اعتراف مقصود ہے
یہ آپ نے سچ فرمایا کہ عدو بھی سبب خیر ہو جاتا ہے اگر خدا چاہے۔ لیکن یہ آخری شرط ہی تو بڑی کٹھن ہے۔ مجھے عدو کی طرف سے اتنا اندیشہ نہیں، جتنا اس سے کہ خدا کیوں چاہنے لگا
میری خواہش تو یہ تھی کہ آپ خود اپنی سعی و تدبیر پر اعتماد کر کے مجھے کسی بات کا یقین دلاتے، لیکن آپ نے پھر معاملہ کو خدا پر چھوڑ دیا۔ اور خدا کا تصور میرے ذہن میں اتنا بلند ہے کہ اگر میں اپنی رسائی اس تک ممکن سمجھ لوں، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ میں نے خدا کے وجود کو محال تسلیم کر لیا، درانحالیکہ وہ واجب الوجود ہے !
آپ کو شاید یہ بات پسند نہ آئے، لیکن کیا کروں اپنی فطرت سے مجبور ہوں، اور "تذبذب" میں زندگی بسر کرنا میرے امکان میں نہیں۔ بہرحال آپ خود جس حد تک کوشش کر سکتے ہوں کیجئے اور نتیجہ سے مطلع فرمایئے۔ لیکن اگر آپ کچھ نہ کر سکتے ہوں تو بھی صاف صاف کہہ دیجئے، میں مایوسی و ناکامی سے ڈرنے والا انسان نہیں

محترمہ، اس دوران میں آپ کے دو خط مجھے ملے اور اس قدر جلد جلد کہ میں کچھ بدحواس سا ہو گیا۔ بدحواسی صرف اس لئے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو دیکھنا کیسا، سننے کی بھی تاب نہیں لا سکتے !
یقیناً وہ زمانہ مجھے یاد ہے جب آپ یہاں "مردانہ عزم و ثبات" کی زندگی بسر کر رہی تھیں اور میں آپ کی "مردشکن" نسائیت کو دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا ایک عورت کے لئے اس سے زیادہ عذاب ممکن ہے — لیکن خیر، شکر ہے، یہ زمانہ جلد ختم ہو گیا اور آپ اس "اعصابی کشاکش" سے آزاد ہو گئیں۔
اس کے بعد جب دہلی سے آپ کا خط آیا تو میں یک گونہ متردد ہو گیا کیونکہ اس میں آپ نے خود اُس بات کو چھیڑا تھا، جس کے جواب میں، ایکبار میں آپ کے "پُرحقارت تبسم" کا منظر دیکھ چکا تھا۔ یاد نہیں میں نے آپ کو کیا جواب دیا، لیکن اتنا ضرور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ کے ارادہ کی مخالفت نہ کی ہو گی۔
بہرحال وہ تو جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا، اب ماضی کی داستان دہرانا سوائے اس کے کہ تھوڑی دیر کے لئے میں بھی بدمزہ ہو جاؤں اور آپ بھی تیوریاں چڑھا کر منہ پھیر لیں، کوئی نتیجہ خیز بات نہیں — خیر،
ہاں، تو فرمایئے آپ مسوری کب جا رہی ہیں، اور وہاں آپ کیا کریں گی ؟ وہی گردشیا کی سلائی اور ...؟

کسی کی طرف نہ دیکھتے ہوئے انگلیوں کی مسلسل حرکت ! یعنی وہی

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز !

سچ کہتا ہوں آپ کی اس کم نوشتیا نے اتنا ستایا ہے کہ شاید ہی کوئی رقیب مجھے اتنا دُکھ دیتا ، اگر میرے آپکے تعلقات ایسے ہوتے تو واقعی کسی رقیب کا گزر ہو سکتا !

آپ پہلی مرتبہ مسوری جا رہی ہیں ، آپ کو معلوم نہیں وہاں جب کالے کالے بادلوں میں سُرخ سُرخ ڈلیا پھوٹتا ہے تو یہ "کاک ٹیل" دماغ انسانی پر کیا اثر کرتی ہے - مجھ پر اول اول جو اثر ہوا تھا ، اس کو میں اگر بیان کروں بھی تو آپ کو اعتبار نہ آئے گا اور اعتبار آ بھی جائے تو زبان سے کبھی اس کا اقرار نہ کریں گی ، اس لئے کہنا فضول ہے -

آپ کی اس "دعوت آب و ہوا" کو میں ضرور قبول کرتا ، اگر میں یہ جانتا کہ "موسم" سازگار ہے

خدا حافظ !

مکرمی - آپ کے مقالہ کو کئی بار پڑھا اور ہر بار نہایت غور سے پڑھا — خیال اچھوتا ، زبان دلکش ، انداز بیان پیارا — لیکن قصور معاف ، روح کا کہیں پتہ نہیں ! آپ پوچھیں گے کہ روح کیا ، اور میں اس کا کوئی جواب نہ دے سکوں گا

آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ ناک ، کان ، آنکھ ، لب سب اپنی اپنی جگہ نہایت اچھے ہیں اور نقشہ بھی بُرا نہیں ، لیکن خدا جانے نگاہ کیوں نہیں جمتی — بس یہی "خدا جانے" والی چیز آپ کے مقالہ میں نہیں ہے -

آپ نے اگر میری آزادرائے دریافت نہ کی ہوتی تو شاید میں یہ جرأت نہ کرتا اور اب بھی بہت ڈرتے ڈرتے لکھ رہا ہوں - لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو بات میں نے کہی ہے اس کے سمجھنے والے بہت کم ہیں ، آپ ضرور شایع کرائیے ، دُنیا ضرور داد دے گی

مکرمی - جی ہاں ، میں نے فروش والے اشعار دونوں حضرات کے دیکھے - ان میں سے ایک تو خیر معذور ہیں کہ انھوں نے فارسی پڑھی ہی نہیں - لیکن دوسرے اسکے مدعی ہیں اور اُن پر ضرور حیرت ہے ، آپ کی رائے سے میں بالکل متفق ہوں — فارسی میں اس لفظ کا استعمال ایک تو بالکل لغوی معنے میں ہوتا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے ، لیکن دوسرا استعمال ذرا مشکل ہے - کیونکہ اس میں زیادہ تر مجازی رنگ ہوتا ہے اور وہ بھی کبھی طنز کا رنگ لئے ہوئے اور کبھی فخر و مباہات کا جس کو یہ "حقیقی" شاعری کرنے والے کم سمجھتے ہیں - بیدل کہتا ہے :

تو و صد موج گوہر تمکیں   من و یک اشک اضطراب فروش

آپ نے دیکھا کہ اس میں ہلکا سا مفہوم تحقیر و طنز کا پوشیدہ ہے لیکن ذیل کے شعر میں فخر و مباہات کا رنگ ہے :

سایہ پرور دِ جلوہ یارم   خاک ما گیر و آفتاب فروش

آپ نے جو کلام بھیجا ہے ، اس میں اکثر جگہ فروش کا استعمال غلط کیا گیا ہے - لیکن آپ کیوں اس اُلجھن میں پڑیں - لکھدیجئے عرق نے گل کن و گلاب فروش !

باب الاستفسار

کلام مومن

(جناب سید سجاد علی میرزا - سہارنپور)

کلام مومن کی شرح کا سلسلہ کچھ عرصہ سے ملتوی ہے۔ آخری اشاعت میں جس غزل تک یہ سلسلہ پہونچا تھا اسکے بعد کے اشعار جو میرے نزدیک وضاحت طلب ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ براہ کرم ان پر اظہار خیال فرمایئے:

۱- اُس حسن پہ خلوت میں جو حال کیا کم تھا کیا جانئے کیا کرتا گر تو مری جا ہوتا

اس شعر میں "جو حال کیا کم تھا" تشریح طلب ہے۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ ظاہر کیا ہے کہ شاعر نے اپنی بیباکی و بدتمیزی کی معذرت کی ہے، لیکن کیا اس سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ اس نے اپنی انتہائی شیفتگی و دیوانگی کی معذرت کی ہے

۲- اچھی مری بدنامی تھی یا تری رسوائی گر چھوڑ نہ دیتا میں، پامالِ جفا ہوتا

۳- ہم بندگی بت سے ہوتے نہ کبھی کافر ہر جائے گر اے مومن موجود خدا ہوتا

اس شعر میں مومن نے یہ ظاہر کیا ہے کہ خدا ہر جگہ نہیں ہے، حالانکہ یہ عقیدہ اسلام کے منافی ہے

۴- وہاں ترقی جمال کو ہے یہاں محبت ہے روز افزوں شریک زیبا تھا بوالہوس بھی جو بیوفائی میں کم نہ ہوتا

اگر رقیب بیوفائی میں کم ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک حد تک وفادار بھی ہے، پھر مومن کو کیا شکایت ہے؟

۵- غلط کہ صانع کو ہو گوارا خراشہائے انگشتہائے نازک جواب خط کی امید رکھتے جو قول جف القلم نہ ہوتا

۶- ہوا مسلماں میں اور ڈر سے نہ درس واعظ کو سنکے مومن بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی عذاب ہجر صنم نہ ہوتا

"اور ڈر سے" کیا مراد ہے؟

۷- ملے ہو غیر سے بے پردہ تم انکار کے بعد جلوہ خورشید کا تھا کچھ اُدھر آخر شب

۸- صبحدم آنے کو وہ تھا کہ گواہی دے ہے رجعت قہقری چرخ و قمر آخر شب

۹- مو سفیدی کے قریب اور رہی غفلت مومن نیند آتی ہے بہ آرام دگر آخر شب

"بہ آرام دگر" کیا معنے

۱۰- ضبط نالہ بوالہوس کا ننگ کے باعث نہیں شرم سے آہ و فغاں بے اثر رکھتے ہیں آپ

۱۱- آوارگی ہے باعث نشو و نما کہ دیکھ سرسبز جب ہوئی کہ پھری در بدر بسنت

کیا "بسنت پھرنا" کوئی محاورہ ہے۔ اگر ہے تو اس کا مفہوم کیا ہے اور نشو و نما کا اس سے کیا تعلق؟

۱۲- مومن یہ کیا کہا کہ ہے رسم ہنود، اب کا ہیکو لائیں گے وہ مری گور پر بسنت

"گور پر بسنت لانا" کیا؟

۱۳- آئینہ میں ہو نہ موم جادو سوئے نہیں آپ تا سحر رات

"موم جادو" سے کیا مراد ہے؟

۱۴- پنجۂ شانہ سے تو زلفِ گرہ گیر نہ کھینچ دل سے دیوانہ کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

"دل سے مت چھیڑ" کیا؟

۱۵- اے ستم پیشہ مرے بعد کہاں نشۂ عشق دیکھ خمیازۂ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ

(نگار) ۱- اس میں شک نہیں کہ "جو حال کیا کم تھا" آپ کے ظاہر کئے ہوئے مفہوم کو بھی ظاہر کرتا ہے، لیکن دوسرے مصرعہ سے یہ بات مترشح ہے کہ مومن معذرت کررہے ہیں اور معذرت ہمیشہ بُری ہی کی ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں صرف انتہائی شیفتگی یا دیوانگی مراد نہیں ہو سکتی جو کوئی بری بات نہیں

۲- مومن اپنے محبوب سے ترک اُلفت کی وجہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اگر میں محبت ترک نہ کرتا تو تم جفا کرتے اور اس طرح تم بدنام ہوتے۔ اسلئے اگر میں ترک اُلفت سے بدنام ہوا تو ہوا، تم تو رسوائی سے بچ گئے

۳- یہ عقیدہ اسلام کے منافی نہیں ہے۔ لیکن اگر ہے تو پھر مومن کے اس اعتراض کا جواب اہلِ مذہب کو دینا چاہئے۔ کیونکہ اگر خدا واقعی ہر جگہ موجود ہے تو بُت کے اندر بھی ہے، پھر بُت پرستی کو کفر کہنا کیا معنی؟

۴- مومن کو صرف یہ شکایت ہے کہ رقیب بیوفائی میں بھی پکا نہیں، محبت میں کیا پکا ہو سکتا ہے

۵- بربنائے روایت حدیث مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہوتا تھا یا ہوگا اسے قلم لکھ کر قلم خشک ہوگیا (جف القلم بما ہو کائنٌ) اسلئے جواب خط کی امید رکھنا عبث ہے، کیونکہ قدرت نے یہ کبھی گوارا نہ کیا ہوگا کہ محبوب کی نازک اُنگلیوں کو جواب دینے کی زحمت میں مبتلا کیا جائے۔

۶- "اور ڈر" سے مراد "ہجر صنم" کا عذاب ہے

۷- آخر شب میں خورشید کی سی جھلک غیر کے مکان میں نظر آئی تو معلوم ہوا کہ تم اُس سے بے پردہ ہوئے ہو، "انکار کے بعد" کا پتہ آخر شب سے چلا۔ ورنہ ابتدار شب ہی میں یہ جھلک نظر آتی

۸- چونکہ اسے صبح کے وقت آنا تھا اس لئے صبح ہوتے ہوتے چرخ و قمر نے پھر الٹی گردش شروع کردی تاکہ صبح ہی نہ ہو

۹- "بہ آرام دگر" سے مراد زیادہ آرام ہے

۱۰- بوالہوس نے ضبطِ نالہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ اسے ننگ سمجھتا ہے بلکہ اس شرم سے نہیں کیا کہ اس کے نالہ و فغاں بے اثر ہے

۱۱- بسنت میں گیہوں کی نئی بالی لیکر احباب کے یہاں جاتے ہیں۔ اس کو بسنت پھرنا کہتے ہیں اور سرسبزی سے مراد اس رسم کی کامیابی ہے جو اس آوارگی یا در بدر پھرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے

۱۲- بسنت کے زمانہ میں قبروں پر پھول اور چادر چڑھاتے ہیں ——— ۱۳- جادو میں موم بھی جلاتے ہیں۔

۱۴- "دل سے مت چھیڑ" آپ نے کہاں سے لیا۔ سے، ایسے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی دل ایسے دیوانہ کو مت چھیڑ

۱۵- معشوق تلوار کھینچ کر مومن کو قتل کرنے آیا تو انھوں نے اسے سمجھایا کہ مجھے قتل تو کرتا ہے لیکن یہ سمجھ لے کہ میرے بعد ایسا نشۂ عشق رکھنے والا نہ ملیگا اسکی وہ شاعرانہ تعبیر یوں کرتے ہیں کہ جس تلوار سے تو مجھے قتل کر رہا ہے اسکا خم بھی خمیازۂ حسرت کا حکم رکھتا ہے، یعنی تلوار خود سمجھتی ہے کہ اب مومن ایسا نشۂ عشق رکھنے والا نہ ملے گا۔

معلومات

چینیوں میں ہر سال ایک عجیب و غریب تہوار منایا جاتا ہے، جسے "مکھن کی عید" کہنا چاہئے۔ اس دن مکھن کو مختلف رنگوں سے رنگ کر اس کی مورتیاں بنائی جاتی ہیں اور مندروں میں رکھی جاتی ہیں۔ ان کے گلے میں جو پھولوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں وہ بھی مکھن ہی کے ہوتے ہیں اور مکھن ہی کی بتیاں بناکر روشنی بھی کی جاتی ہے

یہ تہوار دسویں قمری مہینے کی ۲۵ کو پڑتا ہے اور صرف ایک رات قایم رہتا ہے، کیونکہ صبح تک مکھن کی دیویاں، روشنیاں اور آرایشیں سب گھل کر ختم ہو جاتی ہیں

روایت یہ ہے کہ ۱۴۱۸ء میں ایک دیوی جس کا نام انھوں نے "تسونج کا پا" رکھا تھا، اسی تاریخ میں ایک مندر کے اندر نمودار ہوئی تھی اور صبح کو آسمان پر چلی گئی تھی۔ اسی تقریب میں یہ تہوار منایا جاتا ہے اور اس دیوی کی مورتی مکھن سے اسی لئے طیار کی جاتی ہے کہ وہ بھی صبح تک غائب ہو جائے

شہر منچسٹر میں ایک عجیب و غریب انجمن ہے جس میں صرف عورتیں شریک ہو سکتی ہیں۔ اس انجمن میں روزانہ شرکت ضروری ہے اور یہاں کام صرف یہ ہوتا ہے کہ ہر عورت آدھ گھنٹے تک بالکل خاموش بیٹھی رہے، اگر اتفاق سے کوئی بات کسی کے منھ سے نکل جائے تو اس پر سخت جرمانہ کیا جاتا ہے

اس انجمن کے قیام کا مقصود عورتوں میں قوت ارادی پیدا کرنا ہے تاکہ خاموشی کے وقت وہ خاموش رہنا سیکھیں اور اپنی قوت گویائی کا بیجا صرف نہ کریں

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم کسی بلند مینار یا برج پر پہونچتے ہیں اور نیچے کی طرف دیکھتے ہیں تو سر چکرانے لگتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز نیچے کو کھینچ رہی ہے اور ہم گر پڑیں گے

اس کے دو سبب بیان کئے جاتے ہیں ایک یہ کہ زمین اپنی طرف کھینچتی ہے اور دوسرے یہ کہ ہم پہلے ہی سے گرنے کا خوف اپنے دل میں لیکر وہاں جاتے ہیں، لیکن دراصل اس کا سبب کچھ اور ہے

بات یہ ہے کہ جسوقت ہم کسی بلند مینار یا برج پر چڑھتے ہیں تو ہماری نگاہ ایک ہی وقت میں برج کی بلندی کو بھی دیکھتی ہے اور زمین کے نشیب کو بھی اور یہ دونوں زاوئے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ اعصاب بصارت میں ہیجان پیدا ہو جاتی ہے اور دوران سر کی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے

دنیا میں اس وقت سب سے بڑا سکہ تانبہ کا وہ سکہ ہے جسے ولایت سیس کے فرمانروا فیڈریک نے ۱۷۳۱ء میں رائج کیا تھا۔ اس کا قطر ۱۰ انچ تھا اور ۱۲ شلنگ قیمت ۔۔۔ اس قسم کا ایک سکہ لندن کی نمایشگاہ سکہ جات میں تقریباً چار گنی کو خریدا گیا ہے وہاں ابتک موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے بڑا سکہ کبھی نہیں بنایا گیا

امریکہ کے شہر پیٹسبرگ میں ایک کارخانہ کی عمارت ایسی طیار کی گئی ہے جس میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ یہ عمارت بہت بڑی ہے جس میں سیکڑوں کھڑکیاں ہونا چاہئے تھی، لیکن سیکڑوں کے بجائے اس میں ایک کھڑکی بھی نہیں ہے

یہاں روشنی کا انتظام صرف بجلی کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اور مختلف رنگ کی روشنیاں مختلف مقامات پر ڈالی جاتی ہیں۔ یعنی چھتوں پر جس رنگ کی روشنی پڑتی ہے وہ دیواروں کی روشنی سے مختلف ہوتی ہو اور فرش پر جس قسم کی روشنی ہوتی ہے وہ اس روشنی سے مختلف ہوتی ہے جو مشینوں کے پر پڑتی ہے

یہاں کے کام کرنے والے کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ اس عمارت میں کھڑکی نہیں ہے اور وہ سورج کی روشنی سے محروم ہیں۔ ہوا کا انتظام بھی یہاں بجلی ہی کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اور آکسیجن کی ضروری مقدار بھی بجلی ہی کی مدد سے فراہم کی جاتی ہے

نباتات کی حس کا تجربہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ روشنی اور حرارت کی حس تو خیر ظاہر ہی ہے، لیکن حال کے تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ سننے والی دواؤں کا بھی ان پر اثر ہوتا ہے اور جرمنی کے ایک عالم نے ثابت کیا ہے کہ نباتات موسیقی سے بھی بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اس نے ایک باغ میں مختلف پھولوں کے پودے نصب کئے اور پھر ان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک جگہ پیانو بجائے جانے کا انتظام کیا۔ چند دن کے بعد بالکل ظاہر طور پر محسوس کیا گیا کہ جن پودھوں کے پاس پیانو بجایا جاتا ہے ان کا نشو و نما بہت تیزی سے ہو رہا ہے اور جو پودھے اس نعمت سے محروم ہیں ان کا نشو و نما نسبتاً بہت سست ہے

روزویلٹ صدر امریکہ بہت چھوٹے تھے کہ ان کے والد ایک دن کسی ضرورت سے باہر سفر پر جانے لگے۔ جاتے وقت اپنے لڑکے (موجودہ صدر) کو بلایا اور کہا کہ دیکھو میں باہر جا رہا ہوں۔ میری غیبت میں اپنی ماں کی خبر رکھنا اور ان کا کہنا ماننا۔ رات کو سوتے وقت حسب معمول جب اس کی ماں خوابگاہ تک پہونچانے آئیں اور اس نے دوزانو ہو کر دعا مانگی تو اس کے الفاظ یہ تھے:

"اے خدا، تو میرے باپ کی خبر رکھ اور اسے جلد واپس کر دے۔ میری ماں کی فکر نہ کر، میں اس کا نگہبان ہوں"

روس میں جہاں بہت سی اصلاحیں ہوئی ہیں، وہیں ایک اصلاح قید خانوں کی بھی ہے۔ مجرموں کو سزائے قید دینا اور جیل میں رکھ کر ان سے کام لینا صرف انتقامی صورت رکھتا ہے، اور اس سے اخلاق و عادات کی اصلاح نہیں ہوتی

روسی حکومت نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر وہاں ایک "نو آبادی" قایم کی ہے جہاں ملک کے ہر گوشہ سے مجرموں کو بھیجا جاتا ہے اور انھیں کامل آزادی دیدی جاتی ہے کہ اپنی زندگی جس کام میں چاہیں بسر کریں۔ یہاں زراعت و باغبانی کے علاوہ اور بہت سی صنعتیں بھی یہاں سکھائی جاتی ہیں، لیکن کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ فلاں کام کرے اور فلاں کام نہ کرے، لیکن حکومت انکے کھانے پینے کی ذمہ دار صرف اسی صورت میں ہوتی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کام کریں

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی صنعت میں لگ جاتے ہیں اور چند سال میں ہیئت اجتماعی کے لئے ایک مفید عضو ثابت ہوتے ہیں

اہل امریکہ کی دولت اور انکے اسراف کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہو کہ وہاں شہر کنساس میں ایک ایسا موٹر طیار کیا گیا ہو جسکی قیمت چار لاکھ روپیہ ہے۔ مشینری کے علاوہ ہر چیز اس میں سونے چاندی کی ہو، یہاں تک کہ اسکی آرایش میں ایک لاکھ کے جواہرات صرف ہوئے ہیں۔ یہ یادگار ہو کارخانہ کی بنیاد رکھنے والے کی اور جس کی حفاظت کے لئے پولیس کا ایک دستہ ہر وقت متعین رہتا ہے

یورپ اور تمام دنیا میں قاعدہ یہ ہے کہ شادی کی درخواست مرد کی طرف سے کی جاتی ہے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن انگلستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر چوتھے سال (سال کبیسہ میں) عورتوں کو یہ حق دیا جاتا ہو کہ وہ جس مرد کو چاہیں پیام دیں۔

اس سے زیادہ عجیب بات اسکاٹ لینڈ کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔ وہاں ۱۲۲۸ء میں ایک قانون وضع کیا گیا تھا کہ ہر لڑکی کو اجازت ہو کہ وہ جس مرد کو چاہے شادی کا پیام دیسکتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ پیام زبان ہی سے ادا کیا جائے، ہاتھ کی حرکت، آنکھ کے اشارہ اور ابرو کی جنبش سے بھی یہ پیام دیا جا سکتا ہے اور مرد کا فرض ہے کہ وہ اس پیام کو قبول کرے۔

دماغی تفریح

پچھلے مہینے دماغی تفریح کے سلسلہ میں عقلی جنتری بنانے کی دعوت دیگئی تھی اور ۱۹ درختوں کے نصب کرنے کے لئے ۹ ایسے خطوط مستقیم دریافت کئے گئے تھے، کہ ہر خط میں پانچ درخت شمار کئے جا سکیں ان دونوں کا صحیح جواب سب سے پہلے محمد معین الاسلام نے رائے پور سے بھیجا ہے اس لئے ہندی شاعری نمبر اور جذبات بھاشا کی ایک ایک جلد بذریعہ پوسٹل سرٹیفکیٹ ۲۲ اپریل کو ان کے پاس بھیجدی گئی - ان کے بھیجے ہوئے حل یہ ہیں :

(۱) عقلی جنتری :　　سنہ ۱۹۴۱ء

جنوری	فروری	مارچ	اپریل	مئی	جون	جولائی	اگست	ستمبر	اکتوبر	نومبر	دسمبر
۲	۶	۶	۲	۴	۷	۲	۵	۱	۳	۶	۱

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر
۱	۲	۳	۴	۵	۶	صفر

فرض کیجئے ہم معلوم کرنا چاہیں کہ ۹ مئی کو کونسا دن پڑے گا تو ۹ میں ۴ کا اضافہ کیجئے (جو مئی کے نیچے درج ہے) اس کا مجموعہ ۱۳ ہوا - اسے آپ ہفتہ کے سات دن سے تقسیم کیجئے تو باقی ۶ بچے گا جو جمعہ کا دن ہے۔

(۲) درختوں والے معمہ کا حل اس طرح ہے :
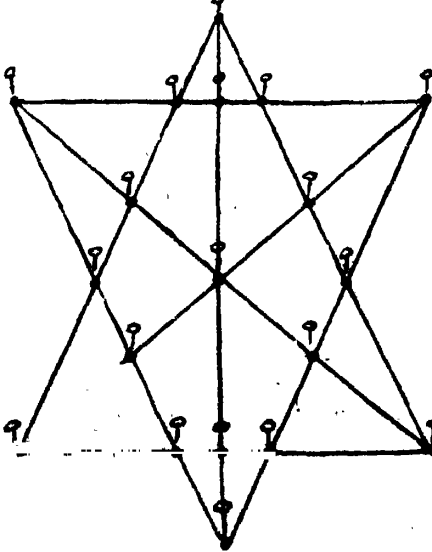
آپ دیکھیں گے کہ اس میں ۹ خطوط مستقیم ہیں اور ہر خط پر پانچ درخت شمار کئے جا سکتے ہیں درانحالیکہ کل درختوں کی تعداد ۱۹ سے زیادہ نہیں ہے -

اِس مہینے کی تفریحات : ذیل میں دیا سلائی کی بارہ تیلیوں سے چار ایسے مربعے طیار کئے گئے ہیں، جو مل کر خود ایک بڑا مربع بناتے ہیں :-

(۱) کیا آپ ان تیلیوں کو اس طرح رکھ سکتے ہیں کہ ان سے تین مثلث بالکل برابر ناپ کے بن جائیں۔ سب سے پہلے جو اس کا جواب بھیجے گا اُسے "شاعر کا انجام" دیا جائے گا۔

(۲)
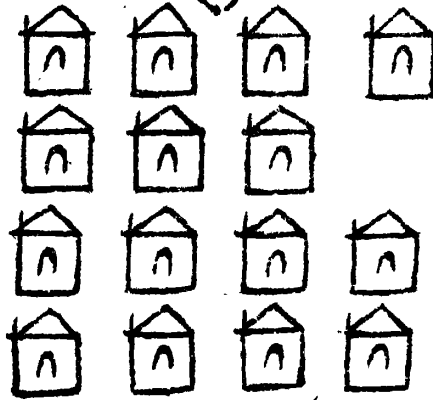
اوپر کے نقشے میں آپ پندرہ جھونپڑے دیکھتے ہیں جو ایک قبیلہ کے مختلف خاندانوں نے طیار کئے تھے ان میں ایک جھونپڑا سردار کا بھی تھا اس سردار کا فرض تھا کہ وہ روز صبح کو ہر جھونپڑے پر پہونچکر وہاں کی خیریت دریافت کرے۔ لیکن یہ کام اسے مشکل نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ ان جھونپڑوں پر اس طرح پہونچنا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ چھ خطوط مستقیم بنیں اور صرف پانچ مرتبہ اسے مڑنا پڑے، چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوگیا۔

آپ بتائیے کہ سردار کا جھونپڑا کونسا تھا اور اس نے یہ راستہ کیونکر مقرر کیا تھا۔

سب سے پہلے جس کا حل موصول ہوگا، اسے "جذبات بھاشا" کی ایک جلد دیجائے گی۔

(۳) احمد کو اس بات کا بڑا شوق تھا کہ جب وہ کسی سے ملے تو اس کی عمر دریافت کرے۔ ایک بار وہ اپنے بھائی کے یہاں مہمان گیا جس کے دو لڑکے تھے زکی اور مشتاق۔ احمد جب ان سے ملا تو چھوٹتے ہی سوال کیا کہ تمھاری عمر کیا ہے۔

یہ لڑکے اپنے چچا کے اس خبط سے واقف تھے اس لئے انھوں نے پریشان کرنے کے لئے سب ذیل جوابات دئے :

زکی۔ "میری عمر، میری ماں کی عمر کی تہائی ہے"

مشتاق۔ "میری عمر، میرے والد کی عمر کی چوتھائی ہے"

یہ سنکر زکی بولا۔ "لیکن بارہ سال کے بعد میری عمر میرے والد کی عمر کی نصف ہو جائے گی"۔

مشتاق نے کہا۔ "اُس وقت میری عمر بھی میری ماں کی عمر کی نصف ہوگی"۔

احمد یہ جواب سُنکر پریشان ہوگیا اور پھر اس نے کسی کی عمر نہیں پوچھی۔ آپ بتائیے کہ ان دونوں لڑکوں کی کیا عمر تھی؟ اور آپ نے کیونکر معلوم کی ـــــ سب سے پہلے جس کا حل پہونچے گا اسے "فراست الید" کی جلد ملے گی۔

نعرۂ شباب:

ہر اک گام پر ٹھوکریں کھا رہا ہوں
مگر بے تکلّف چلا جا رہا ہوں

نئی آفتوں کو یہ پیغام دے دو
کہ میں اُن کی تعظیم کو آ رہا ہوں

حوادث کو یہ حادثہ بھی سنا دو!
ابھی تک میں ہنس ہنس کے لہرا رہا ہوں

مجھے مت بلاؤ، مجھے مت ستاؤ
میں تسخیرِ کونین کو جا رہا ہوں

سمندر کے خوابوں میں ہے جو تموّج
میں اُس کی نگاہوں کا رُخ پا رہا ہوں

ہوا کے تصور میں ہیں جو بہاریں
میں اُن کو ذرا ہوش میں لا رہا ہوں

وہ بجلی جو ہے ذہن میں بادلوں کے
میں اُس کو فضاؤں پہ چمکا رہا ہوں

کھنکتے ہوئے جام ہاتھوں میں لے کر
مہکتے ہوئے رنگ برسا رہا ہوں

محبت کا مشعل اُٹھا کر نشے میں
ہر اک راستہ جیتا جا رہا ہوں

زمانے کے چہرے سے زلفیں ہٹا کر
شگفتہ دنوں کی قسم کھا رہا ہوں

فقط ایک ہلکا سا سایہ ہوں لیکن
زمان و مکاں پر عدم چھا رہا ہوں

حقائقِ رنگیں:

رَو میں سیلاب ہے، تھمتے ہی تھمے گا ساقی
رَم میں سیماب ہے، تھمتے ہی تھمیگا ساقی

زیست کا ساز ہے اور عشرتِ نغمہ کا جنوں
دل بیتاب ہے، تھمتے ہی تھمیگا ساقی

رُوح مضطر ہے، سکوں آتے ہی آئے گا اسے
دیدہ پُر آب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

عقل اِک سنگِ سبک وزن ہے کیا ٹھہرے گی
عشق سیلاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

ٹوٹتے ٹوٹے گا افسونِ فریبِ ہستی!!
رعشۂ خواب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

باؤلی آنکھ ہے، کھا جائے گی صورت کا فریب
شوق بیتاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

چاندنی رات میں ہم پیتے رہیں گے پیہم
دَورِ مہتاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

ناچتی جائے گی فطرت مری، غم ہو کہ خوشی
رقصِ اعصاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

ظلمتِ غم میں بھی چمکے گی جوانی کی جبیں،
سحرِ شب تاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

رَو میں حالات کی بہنا ہے عدم کو کچھ روز
ایک سیلاب ہے، تھمتے ہی تھمیگا ساقی

عدم
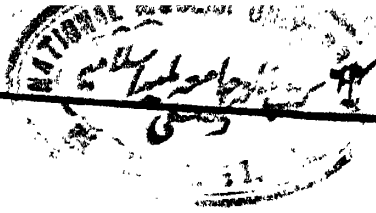
غزل : قیصر امراؤتی

دل خون ہو رہا ہے مگر اس خوشی کو دیکھ
اے غم نصیب باغ میں ہنستی کلی کو دیکھ

کیا کیا نیاز عشق کے احساں ہیں حسن پر
ہونے نہ پائے اس کی خبر بھی کسی کو دیکھ

حسرت بھری نگاہ اٹھی اٹھ کے رہ گئی
اے بے نیاز سجدہ مری بندگی کو دیکھ

یہ تنگیاں رہیں گی یہی دل کی عمر بھر
ہنستے ہوئے نشاط و غمِ عارضی کو دیکھ

اک درد لا دوا ہے خزاں کیا بہار کیا
اے چارہ ساز حسرتِ بیچارگی کو دیکھ

رسوا کبھی ہوا ہی نہیں ذوقِ اہلِ درد
پابندیِ رسومِ غمِ عاشقی کو دیکھ

تاریکیاں ہزار سہی اے دلِ حزیں
داغوں کی روشنی میں شبِ زندگی کو دیکھ

جلتا ہے آشیانہ جلے تو نہ دل جلا
قیصر چمن میں اہلِ چمن کی خوشی کو دیکھ

شاعر کا اضطراب

ابھی بے روح، جسمِ زندگی محسوس کرتا ہوں
ابھی بے جسم، روحِ زندگی معلوم ہوتی ہے

ابھی محتاجِ مشاطہ نظر آتا ہے ہر پیکر
ابھی ہر حسن میں مجھ کو کمی معلوم ہوتی ہے

ابھی الفاظ پر شاعر کو قدرت ہی نہیں گویا
کہ مبہم صورتِ معنی ابھی معلوم ہوتی ہے

وہاں کُل قوتِ تخلیق ہی ہے صرفِ زیبائی
یہاں تصویرِ "کن" بے رنگ ہی معلوم ہوتی ہے

ازل کے دن سے جس کی چشمِ بینا کو شکایت تھی
وہی بے دلکشی سی آج بھی معلوم ہوتی ہے

بجھے دل، پسلیاں ابھری ہوئی سی، گال بیٹھے سے!!
یہی تصویرِ شکلِ آدمی معلوم ہوتی ہے

بھکاری بھیک پا کر مسکرا دیتا ہے قسمت پر
مجھے یہ بھی ادائے بیکسی معلوم ہوتی ہے

غضب ہے رنجِ پیہم کا مسرت نام رکھا ہے
ابھی معدوم دنیا سے خوشی معلوم ہوتی ہے

نہیں معلوم مجھکو بھی مرا دل چاہتا کیا ہے
طبیعت ہر گھڑی بیتاب سی معلوم ہوتی ہے

"کسے معلوم میدانِ عمل ہے منتظر میرا"
ابھی احباب کو یہ شاعری معلوم ہوتی ہے

عمل کے جذبۂ بیتاب کا جب راز کھلتا ہے
تو ہر الزام سے فطرت بری معلوم ہوتی ہے

اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا ہے ہر طرف ہر سو
مگر کچھ دور کچھ کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے

اسی ظلمت کے آگے روشنی ہی روشنی ہوگی
وہی ظلمت جو حدِ آخری معلوم ہوتی ہے

محب عارفی۔ بی۔ اے (علیگ)

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے، بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعہ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کا اسے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال امور حیات، صحت و بیماری شہرت، نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یہ حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عار)

علاوہ محصول

نمبر خریدار ....
دفتر نگار ـــــــ لکھنؤ
رجسٹرڈ نمبر اے ۴۲

نمبر ۱۳۳

قیمت فی کاپی ۸ر
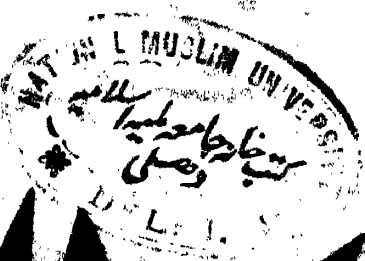
ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان، اسکی تخئیل، اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲۔ افسانے ۳۳ــ۳ تک کے درج ہیں ــ قدرت بیان، اعلیٰ تخئیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے ۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، مع تصویر حضرت نیاز، ۶۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

یہ سلسلۂ دماغی تفریح پچھلے مہینے کے سوال نمبر ۲ میں ایک غلطی رہ گئی ہے وہ یہ کہ: چھ روٹی آٹھ کباب کے برابر مانی جائیں

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ

ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۴	فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء	شمارہ ۴

آیندہ جنوری کے "نگار" کے متعلق صفحہ ۸ ملاحظہ فرمایئے

اڈیٹر : نیاز فتحپوری

شمار ۴	اکتوبر سنہ ۴۱ء	جلد ۴۰

ملاحظات

جنگ کی فیصلہ کن ساعتیں

یوں تو کوئی نہیں کہ سکتا کہ جرمنی اور روس کی موجودہ جنگ ختم ہونے پر لڑائی کی آگ اسی جگہ ٹھنڈی ہو جائے گی لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ لڑائی بڑی حد تک مستقبل کا فیصلہ کرتی رہے گی، اسی لئے ساری دنیا کی نگاہیں اسوقت لینن گراڈ کی طرف لگی ہوئی ہیں

لینن گراڈ روسی حکومت کا سب سے بڑا شہر اور اسلحہ سازی کا نہایت عظیم الشان مرکز ہے، اسی کے ساتھ بالٹک میں روسی بیڑے کے ہیڈکوارٹر ہونے کی بھی اہمیت اسے حاصل ہے

لینن گراڈ اپنی قلعہ بندیوں کے لحاظ سے اتنی مستحکم چیز ہے کہ آجتک کوئی حملہ آور اسے فتح کر ہی نہیں سکا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جس طرح آج جرمن فوجوں نے اس کا محاصرہ کیا ہے، اس سے پہلے کبھی اس کا محاصرہ بھی نہیں ہوا۔

جرمنی کے بیان کے مطابق، اس وقت یہاں ۲ لاکھ روسی فوج مدافعت کر رہی ہے، لیکن امن کے زمانہ کے جو حالات ہم کو معلوم ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ سے پہلے ہی یہاں ۸ لاکھ روسی فوج پائی جاتی تھی اور اب یقیناً اس میں کچھ اور اضافہ ہوا ہوگا۔ شہر سے مغرب کی طرف جو راستہ سمندر تک گیا ہے وہاں ایک سلسلہ پہاڑیوں کا پایا جاتا ہے۔ یہ پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں ہیں لیکن اتنی بلند ضرور ہیں کہ وہ دشمن کے توپ خانوں کو صحیح نشانہ قایم کرنے سے بہ آسانی باز رکھ سکتی ہیں

مشرق کی جانب لینن گراڈ کی حفاظت کا بڑا ذریعہ قلعۂ کول پین ہے اور جنوب کی طرف لیڈوگا جھیل کی دلدلی زمین ہے۔ اب سے چند دن پہلے جرمنی نے یہ پروپاگنڈا شروع کیا تھا کہ لینن گراڈ پر قبضہ کرنے کی اسے کوئی جلدی نہیں ہے، جس سے اسکا مقصود غالباً روس و برطانیہ دونوں کو بھلاوے میں ڈالنا تھا، لیکن اب وہ اپنی ساری قوت اسی طرف صرف کر رہا ہے تاکہ برفباری شروع ہونے سے پہلے ہی اس جھگڑے کو ختم کر دے، لیکن یہ جھگڑا آسانی کے ساتھ ختم ہوتا نظر نہیں آتا، کیونکہ اسوقت تک لینن گراڈ کی بیرونی قلعہ بندیاں بھی مسمار نہیں ہو سکیں اور چار لاکھ سے زیادہ جرمن سپاہی کام آچکے ہیں

اس میں شک نہیں کہ لینن گراڈ کا مسئلہ ہٹلر اور نازی حکومت کی موت و زندگی کا مسئلہ ہے، اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ ہلاکت پھیلانے کے جتنے ذرایع ہٹلر کے پاس موجود ہیں وہ سب اس جگہ استعمال کر دے گا اور اگر نصف جرمن قوم کو ہلاک کر دینے کے بعد بھی ہٹلر اس میں کامیاب ہو سکا تو وہ اس سے دریغ نہ کرے گا، اس لئے باوجود اس امر کے کہ روسی فوجیں انتہائی جرأت و بہادری کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہیں اور لینن گراڈ کی آبادی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک ایک ایک چپہ پر ان کی لاشیں نہ بچھ جائیں گی، وہ جرمن فوج کو یہاں داخل نہ ہونے دے گی، ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جرمنی کو اس معرکہ میں ضرور ناکامی ہوگی

کسی شہر کے محاصرہ میں سب سے بڑا سوال یہ ہوا کرتا ہے کہ قلعہ بند فوج اور محصور آبادی کے پاس لڑائی کا سامان اور کھانے پینے کی چیزیں کس مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اس وقت لینن گراڈ کی مضافاتی شہری آبادی کسی طرح ۳۰ لاکھ سے کم نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اتنی بڑی آبادی کو زندہ رکھنے کے لئے کتنے بڑے ذخیرہ کی ضرورت ہے چہ جائیکہ دشمن کے مقابلہ میں ذرایع مدافعت حاصل کرتے رہنا کہ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب اشیا کی درآمد برآمد میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور یہ کہنا کہ لینن گراڈ کے ذرایع درآمد برآمد بدستور محفوظ ہیں، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا، اس لئے ان تمام حالات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑے گا کہ لینن گراڈ اسوقت سخت خطرہ میں ہے، یہاں تک کہ اگر برفباری شروع ہونے سے پہلے اس پر جرمنی کا قبضہ نہ ہو سکا تو برفباری کے زمانہ میں بھی اس کی کوششوں کو ناکام رکھنے کی کوئی صورت فی الحال سامنے دکھائی نہیں دیتی

اس وقت روسی اور جرمن ذرایع سے جو خبریں آ رہی ہیں وہ ایک دوسرے کی متضاد ہیں، لیکن ان سے ہم اس نتیجہ پر ضرور پہونچتے ہیں کہ حملہ و مدافعت دونوں انتہائی قوت کے ساتھ جاری ہیں اور اسوقت پلہ جرمن کا بھاری نظر آ رہا ہے

اس لڑائی میں ٹینک، پیدل فوج، ہوائی جہاز سب بیک وقت کام کر رہے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں کونسا ذریعہ زیادہ کامیاب ثابت ہو رہا ہے، لیکن پچھلا تجربہ بتاتا ہے کہ تباہی پھیلانے اور شہریوں میں اضطراب و پریشانی پیدا کرنے کے لئے ہوائی جہازوں کا استعمال بہت کامیاب ثابت ہوا ہے اور لینن گراڈ پر بھی جرمنی اسی قسم کی بمباری کر رہا ہوگا جو وارسا میں کی گئی تھی، اس لئے روس کو اسوقت جس فوری مدد کی ضرورت ہے وہ ہوائی جہاز ہیں اور روسی حکومت بہت مطمئن ہے کہ برطانیہ و امریکہ دونوں زیادہ سے زیادہ ہوائی مدد پہونچانے کی تدبیریں کر رہے ہیں

یہ واقعہ ہے کہ فن لینڈ کی فوجوں نے جرمنی کی مدد کر کے روس کو کافی نقصان پہونچایا اور لینن گراڈ تک پہونچنے میں اس نے جرمنی کو بہت مدد دی۔ اس وقت فن لینڈ کی فوجیں تمام اس علاقہ پر قابض ہو چکی ہیں جو روس نے اس سے چھین لیا تھا، اس لئے اصولاً اب اس کو لڑائی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہئے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے روس کی منظوری

سے فن لینڈ کی حکومت کو ایک نوٹ بھیجا ہے کہ اگر وہ آیندہ لڑائی سے باز رہا تو اختتامِ جنگ کے بعد سرحد کے مسئلہ پر زیادہ فیاضی کے ساتھ غور کیا جائے گا، اور اگر فن لینڈ مان گیا تو اس میں شک نہیں کہ محاصرۂ لینن گراڈ بہت کمزور پڑ جائے گا، لیکن اس کی امید بہت کم ہے، کیونکہ اول تو وہاں نازی عنصر کا اثر بہت بڑھ گیا ہے اور دوسرے خود فن لینڈ کی آبادی میں روس کے خلاف جذبۂ انتقام اتنا مشتعل ہو چکا ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ نہیں دبایا جا سکتا، بہرحال اتحادیوں کی طرف سے فوجی و سیاسی تمام طریقے روس کی مدد کے لئے اختیار کئے جا رہے ہیں جو آہستہ آہستہ زیادہ منظم ہوتے جاتے ہیں

اس دوران میں سب سے اہم واقعہ جس نے جرمنی کی امیدوں کو زیادہ قوی بنا دیا ہے، کیف کا قبضہ ہے۔ یہ شہر اوکرائن کا خاص مقام ہے اور لکڑی، نلہ وغیرہ کا بڑا ذخیرہ یہاں رہتا ہے۔ اوکرائن کا علاقہ پیداوارِ غلہ کے لحاظ سے روس کا بہترین علاقہ ہے اور یہیں کی پیداوار روسیوں کی زندگی کا سہارا سمجھا جاتا ہے۔ یہ دریائے ڈنیپر پر واقع ہے اس لئے کشتیوں کے ذریعہ سے یہاں کا غلہ روس کے اکثر مقامات پر آسانی سے پہونچ سکتا ہے، اس شہر کی آبادی ۵ لاکھ سے زیادہ ہے اور ایک متمدن شہر کی تمام خصوصیات یہاں پائی جاتی ہیں۔ روسیوں نے بہت کوشش کی کہ یہ شہر جرمن فوجوں کے ہاتھ نہ آئے، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی

اسی کے ساتھ اڈیسہ کا محاصرہ بھی جاری ہے، جس کی شدت کیف کے قبضہ کی وجہ سے زیادہ بڑھ جائے گی اور اگر یہ صحیح ہے کہ جرمن فوجیں (Sea of Azov) تک پہونچ گئی ہیں اور کریمیا کا محاصرہ بھی شروع ہو گیا ہے تو اڈیسہ کا مستقبل بھی خطرہ میں ہے

یہ صحیح ہے کہ بحرِ اسود میں روس کی بحری قوت بہت زبردست ہے اور اسی لئے اڈیسہ ابھی تک جرمنی کے ہاتھ نہیں آیا، لیکن بلغاریا میں جو حالات رونما ہو رہے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ عجب نہیں بلغاریا بھی روس کے مقابلہ میں آجائے اور اس طرح بلغاریا اور اٹلی کے جہازوں کی مدد سے اس قوت کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن اس صورت میں سب سے اہم سوال ترکی کا سامنے آتا ہے کیونکہ اٹلی کے جہاز درۂ دانیال ہی کے راستہ سے بحرِ اسود میں آسکتے ہیں اور اُصولاً ترکی کو ان جہازوں کے داخلہ کی اجازت نہ دینا چاہئے

ترکی اسوقت تک اپنے آپ کو غیر جانبدار رہنے میں کامیاب ہوا ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی غیر جانبداری اخیر تک قایم رہ سکے گی۔ اس کا تجارتی معاہدہ جرمنی سے بھی ہے اور برطانیہ سے بھی، وہ ان میں سے کسی کے ساتھ لڑائی مول لینا نہیں چاہتا، لیکن وہ اپنی آزادی یا قومی وقار کو بھی کسی قیمت پر دینے کے لئے راضی نہیں اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کسی وقت اس کی آزادی کو صدمہ پہونچا تو اس کی ابتدا جرمنی ہی کی طرف سے ہوگی، کیونکہ برطانیہ کو ترکی سے چھیڑ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جرمنی کے لئے عراق اور باکو کے پیٹرول تک پہونچنے کی آسان صورت یہی ہے کہ ترکی اس کی فوجوں کو اپنے ملک سے گزر جانے کی اجازت دے۔ چنانچہ جرمنی برابر اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ ترکی کو کسی نہ کسی طرح محوری طاقت میں شامل کرے، لیکن ترکی جسے جمہوری حکومت ہونے کے لحاظ سے برطانیہ اور روس کی طرف زیادہ مایل ہونا چاہئے، کبھی اس کو خوشی سے منظور نہیں کر سکتا اور اگر جرمنی نے کسی وقت اس پر زیادہ دباؤ ڈالا تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ ترکی اپنی قسمت کا فیصلہ جمہوری حکومتوں کی قسمت کے ساتھ وابستہ کر دے

اس میں شک نہیں کہ ایران میں برطانوی و روسی فوجوں کے داخلہ نے ہٹلر کی اُن اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا ہے جو "ہندوستان" تک وسیع ہوتی معلوم ہو رہی تھیں، لیکن باکو اور عراق کے پٹرول تک پہونچنے کی تمنائیں بدستور ہٹلر کے دل میں باقی ہیں اور گمان غالب ہے کہ سردی شروع ہو جانے کے بعد جب روسی محاذ کی طرف لڑائی کی شدت میں کچھ کمی پیدا ہو جائے گی تو وہ مشرق وسطی کی طرف پہونچنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن قاف کی طرف روس و برطانیہ کی فوجوں نے اقدام شروع کر کے اس راہ میں بھی ہٹلر کے لئے کافی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ ان تمام حالات کے ساتھ جسوقت ہم امریکہ اور جاپان کی موجودہ سیاست پر غور کرتے ہیں تو ہم کو اس لڑائی میں مزید خطرناک امکانات کے بروئے کار آجانے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ جرمن آبدوزوں نے اس دوران میں امریکہ کے کئی جہاز آئس لینڈ کے قریب ڈبو دئے ہیں اور جرمنی و امریکہ میں تناؤ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عجب نہیں، امریکہ کا قانون غیر جانبداری منسوخ ہو جائے اور اُسے کھلم کھلا جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دینا پڑے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جرمنی اس بات سے نہیں ڈرتا کہ امریکہ کی شرکت سے اس کا پلہ کمزور ہو جائے گا اور کیا وہ برطانیہ و امریکہ کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے

یقیناً جرمنی اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہو، لیکن وہ سمجھتا ہے کہ امریکہ غیر جانبدار رہنے کی حالت میں زیادہ خطرناک دشمن ہے، کیونکہ وہ اس صورت میں ہر طرح کی مدد روس و برطانیہ کو پہونچا سکتا ہے، لیکن میدان جنگ میں آجانے کے بعد وہ سامان حرب اس قدر آزادی کے ساتھ دوسرے ملکوں کو نہ دے سکے گا بلکہ خود اپنے لئے محفوظ رکھے گا

جاپان کا خطرہ بھی مشرق بعید میں اسی نوبت پر ہے اور امریکہ سے جو بات چیت اس کی ہو رہی ہے وہ ہنوز غیر فیصلہ کن حالت میں پائی جاتی ہے۔ امریکہ کے مطالبات اس نوعیت کے ہیں کہ اگر جاپان نے انھیں مان لیا تو گویا چین کی طرف سے اسے ہاتھ دھونا پڑے گا اور یہ شاید وہ کبھی گوارا نہ کرے گا۔ جاپان میں عرصہ سے فوجی جماعت برسر اقتدار ہے اور اسکی جنگ جو پالیسی نے ملک کی اقتصادی حالت کو بہت خراب کر دیا ہے، لیکن جرمنی کی طرح اس کی حالت بھی چین کے معاملہ میں اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ لڑائی جاری رکھے بغیر کوئی چارہ نہیں اور لڑائی جاری رکھنے کی صورت میں برطانیہ اور امریکہ کی ٹکر کو برداشت کرنا دشوار ہے۔ اسی لئے وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے کیا کرنا ہے

امریکہ و برطانیہ نے اپنے اپنے ملکوں میں اس کے سرمایہ کو ضبط کر کے اس کی اقتصادی دشواریوں میں اور اضافہ کر دیا ہے اور اس کی تجارت جو تمام دُنیا میں پھیلی ہوئی تھی دفعتاً بالکل بند ہو گئی ہے، ظاہر ہے کہ اس کا اثر وہاں کے صنعتی اداروں اور عام پبلک پر بہت خراب پڑے گا اور ہمیں امید نہیں کہ وہ عرصہ تک اس دباؤ کو برداشت کر سکے

بحر جاپان کے آس پاس روس نے اپنے بندرگاہ ولاڈی واسٹک کے حفاظت کے لئے جو سرنگیں بچھا دی ہیں، ان پر جاپان کئی بار صدائے احتجاج بلند کر چکا ہے اور بعض خبروں سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ منچوکو کی طرف جاپان و روس کی فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں، لیکن ابھی تک روس و جاپان کی اس کشاکش نے کوئی صورت ایسی اختیار نہیں کی جس سے جرمنی فایدہ اُٹھا سکے، لیکن اگر لینن گراڈ اور اڈیسہ روس کے قبضہ سے نکل گیا تو ممکن ہے کہ جاپان کی امیدوں میں پھر جان پڑ جائے اور وہ کوئی جارحانہ قدم روس کے خلاف اُٹھائے۔ بحر پاسفک یا بحر ہند میں فی الحال جاپان کی طرف سے کسی اقدام کا

اندیشہ نہیں معلوم ہوتا اور اگر جرمنی کو روس میں ناکامی ہوئی تو شاید انڈو چائنا میں بھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور برطانیہ و امریکہ کے تمام مطالبات اسے ماننے پڑیں

بہرحال، اس وقت روس کے محاذ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اسی کے نتیجہ پر ملکوں کی پالیسی قایم ہونا ہے، لیکن جس حد تک برطانیہ کا تعلق ہے اس کے مقاصد میں کسی تبدیلی پیدا ہونے کا امکان نہیں کیونکہ وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ نازیت کو بہرنوع ختم کرنا ہے اور اگر روس کو شکست ہو گئی تو یہ سوال کہیں زیادہ اہم ہو جائے گا اور برطانیہ اپنے تمام ذرایع اس مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کر دے گا

اس دوران میں جرمنی کے ہوائی جہاز انگلستان کے بعض مقامات پر ہوائی حملے کرتے رہے، لیکن ان کے جواب میں برطانیہ نے برلن اور دوسرے اہم مقامات پر جو ہوائی حملے کئے ہیں، اُن کی شدت کا جرمنی کو بھی اعتراف ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ برطانیہ نے جو جارحانہ پہلو اختیار کیا ہے اس کے اثرات کو دشمن بھی تسلیم کر رہا ہے اور آیندہ لڑائی کی جو صورت ہوگی، وہ اُس سے مختلف ہوگی جو سنہ ۴۰ء میں پائی جاتی تھی

اس سے شاید دشمن کو بھی انکار نہ ہوگا کہ سنہ ۳۹ء کے مقابلہ میں، برطانیہ کی ہوائی طاقت اس وقت کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور جو دن گزرتا جاتا ہے اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اس لئے انگلستان پر حملہ ہونے کے امکانات تو تقریباً ختم ہو چکے ہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ نازی سیلاب اب افریقہ اور مشرق وسطی کی طرف بڑھے۔ جہاں نازی خطرہ کے مقابلہ کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ طیاریاں ہو چکی ہیں

بعض کا خیال ہے کہ اگر لینن گراڈ، روس کے قبضہ سے نکل گیا تو اُس کی شکست یقینی ہے، لیکن یہ گمان صحیح نہیں، کیونکہ فتح و شکست شہروں کے چھن جانے یا باقی رہنے کا نام نہیں، بلکہ اس کا تعلق آبادی اور فوج کی ہمت و نیت سے ہے۔ اگر لنن گراڈ، یا اوڈیسہ یا کریمیا۔ بلکہ آپ اس میں ماسکو کو بھی شامل کر لیں۔ سب کے سب ہاتھ سے نکل جائیں تو بھی یہ جنگ ختم نہیں ہوتی اگر روس کی آبادی اور وہاں کی فوج نے ہمت نہیں ہاری اور روس کی فوج جس ہمت سے لڑ رہی ہے اس کا اعتراف دشمن کو بھی ہے۔ بہرحال اس جنگ کو ایک دفعہ پھر پلٹا کھانا ہے اور جتنا زیادہ زمانہ گزرتا جاتا ہے، جرمنی کی کامیابی کے امکانات ضعیف ہوتے جا رہے ہیں اور عجب نہیں کہ آیندہ سال تک اُسے سپر ڈالدینا پڑے

برنارڈ شا نے یہاں میں لندن کے کسی جلسہ کے اندر اس جنگ کے متعلق خیال ظاہر کیا ہے کہ "اسٹالین، یقیناً ہٹلر کو کچل دے گا اور ہمیں سوائے اس کے کچھ نہیں کرنا کہ بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے رہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ یا تو ہٹلر اُس سے زیادہ بیوقوف ہے جتنا میں اسے سمجھتا تھا۔ یا پھر یہ کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے"

چونکہ برنارڈ شا، سوشلسٹ خیال کا انسان ہے اس لئے قدرتاً اسے روس کے ساتھ ہمدردی ہونا چاہئے، لیکن قطع نظر اس سے کہ ہمارا یا کسی کا جی کیا چاہتا ہے، یہ ماننا پڑے گا کہ جرمنی کو جتنا نقصان روس کے مقابلہ میں ہو رہا ہے، وہ ہٹلر کے اندازہ سے کہیں زیادہ ہے، اور اب وہ مجبور ہو گیا ہے کہ اپنے حلیف ملکوں کی زیادہ سے زیادہ کمک حاصل کر سکے

ترکی اور جنگ

تازہ ترین خبروں سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ جرمنی کی فوجیں کریمیا کی طرف بڑھ رہی ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ یہاں سے آگے باکو کے پٹرولی چشموں کی طرف بڑھیں گی، لیکن ہماری

رائے میں کریمیا کی طرف بڑھنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ وہ لینن گراڈ اور اسمولنسک کی طرف روس کے دباؤ کو کم کرنا چاہتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بحر اسود میں روسی بیڑے کے خلاف وہ کریمیا کے ساحلوں کو استعمال کرنا چاہتا ہے

اگر وہ کریمیا پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا تو بندرگاہ سباسٹوپول اس کے ہاتھ آجائے گا اور اگر اس وقت تک اڈیسہ بھی فتح ہوگیا تو روسی بیڑے کی نقل و حرکت میں وہ کافی روک پیدا کرسکے گا۔ لیکن چونکہ اس کے بعد بھی وہ رومانیا اور بلغاریہ کے چند جہازوں سے کام لیکر روس کی زبردست بحری قوت کو یہاں نہیں دبا سکتا، اس لئے وہ یقیناً اٹلی کے جہازوں کو لانے کی کوشش کرے گا اور یہی وہ وقت ہوگا جب ترکی کو بھی اِدھر یا اُدھر کوئی قدم اُٹھانا پڑے گا

چونکہ بین الاقوامی سمجھوتے کی رو سے ترکی کسی محارب قوت کے جہازوں کو درۂ دانیال سے گزرنے کی اجازت نہیں دے سکتی اس لئے ترکی کو سوچنا پڑے گا کہ وہ ایسے وقت میں جرمنی سے لڑائی مول لے یا روس و برطانیہ سے۔ اس میں شک نہیں کہ یونان اور اس کے بعض جزایر پر جرمن قبضہ ہوجانے کی وجہ سے ترکی کی سرحد بہت خطرناک ہوگئی ہے اور ترکی کے بعض مقامات پر پانی اور ہوا دونوں طرف سے حملے ہوسکتے ہیں، خاصکر ایسی حالت میں کہ بلغاریا بھی جرمنی کے زیر اثر ہے، لیکن اسی کے ساتھ دو باتیں ایسی ہیں جو ترکی کو جرمنی کے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور کریں گی، ایک یہ کہ ترکی اور روس کی متحدہ بحری قوت کا جواب اٹلی نہیں دے سکتا، دوسرے یہ کہ برطانیہ اور روس دونوں ترکی کو اطمینان دلا چکے ہیں کہ اگر کسی وقت ترکی پر حملہ ہوا تو وہ پوری مدد کریں گے

برطانوی مدد ایک طرف بندرگاہ سنجاق، موصل اور دمشق و حلب کے راستہ سے بہ آسانی پہونچ سکتی ہے اور دوسری طرف عراق، ایران اور ہندوستان سے ہوائی کمک پہونچنا ممکن ہے۔ روسی مدد، بحر اسود کے بندرگاہوں کے علاوہ طفلس اور باکو کی طرف سے بھی بذریعہ ریل پہونچ سکتی ہے

اس میں شک نہیں کہ باکو اور عراق کا پٹرول حاصل کرنا ہٹلر کا انتہائی نقطۂ نظر ہے، لیکن یہاں تک پہونچنے کے لئے کریمیا اور قاف کا راستہ اختیار کرنا قرین قیاس نہیں، کیونکہ اول تو یہ راستہ نہ صرف دشوار گزار بلکہ جاڑوں میں بالکل ناقابل عبور ہوجاتا ہے علاوہ اس کے اوکرائن اور روس کے تمام جنوبی علاقہ پر اتنا مستحکم قبضہ ہوجانا کہ جرمن فوجوں کی نقل و حرکت باکو کی طرف آسانی سے ممکن ہوسکے، کافی وقت چاہتا ہے

ان حالات میں جرمنی کے لئے عراق اور باکو تک پہونچنے کے لئے اگر کوئی آسان راستہ ہوسکتا ہے تو صرف ترکی کا، کیونکہ آسٹریا سے لیکر طفلس تک جو قاف کا پایۂ تخت ہے (براہ بلقان، قسطنطنیہ اور انقرہ) سیدھا ریل کا راستہ ہے اور اسی لئے گمان غالب یہی ہے کہ کریمیا میں کامیاب ہوجانے کے بعد وہ ترکی کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرے گا، کیونکہ اس صورت میں ترکی کو روس کی طرف سے کمک کی توقع کم ہوجائے گی اور ہٹلر کا خیال ہے کہ اس صورت میں ترکی پر زیادہ دباؤ پڑے گا، لیکن فی الحال یہ تمام باتیں قیاس ہی قیاس ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ لینن گراڈ اور اڈیسہ میں لڑائی کونسا رُخ اختیار کرنے والی ہے اور اس کا اثر ہٹلر کی آیندہ اسکیموں پر کیا اور کیسا پڑے گا

نگار میں ایک نئے باب کا آغاز

اس مہینے سے نگار کے حصۂ نظم کے دو صفحے مستقلاً اساتذۂ غزل کے انتخاب کلام کے لئے وقف ہوں گے، چنانچہ میر سے اس کا آغاز کیا گیا ہے۔ میر کے بعد سودا کو

ختم کر دیا جائے گا۔

یہ انتخاب صرف میرے ذوق کے مطابق ہوگا، اس لئے جس طرح میں اس کا ذمہ دار نہیں کہ آپ کو بھی ضرور پسند آئے، اسی طرح آپ کو بھی "چنیں وچناں" کا حق حاصل نہ ہوگا، اگر کوئی شعر مشکل نظر آیا تو اسکا مفہوم بھی مختصر الفاظ میں بیان کردیا جائیگا

آیندہ جنوری کے "نگار" کی اہمیت

کا اندازہ آپ یوں نہیں کرسکتے ۔ پہلے آپ جنوری سنہ ۴۱ء کے نگار کو سامنے رکھئے کہ وہ بجائے خود کتنی اہم چیز تھا اور پھر اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھئے کہ اگر تمام اُن اساتذۂ غزل کے کلام پر جن کا ذکر آپ جنوری سنہ ۴۱ء کے نگار میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، ملک کے بہترین نقادوں کی تفصیلی رائے ایک جگہ آپ کو معلوم ہو سکے تو یہ دونوں باتیں ملکر کتنی عظیم الشان ادبی خدمت قرار پائیں گی۔

جنوری سنہ ۴۲ء کے نگار میں انھیں تمام شاعروں کے متعلق ملک کے پانچ مسلم الثبوت نقادوں کی نہایت بسیط و مفصل رائے آپ کے سامنے پیش کی جائے گی اور آخیری مضمون اڈیٹر نگار کا ہوگا، جس میں تمام انتقادی مقالات کو سامنے رکھ کر بتایا جائے گا کہ اس میزان میں ان شاعروں کی قدر و قیمت کیا قرار پائی۔

اگر آپ کے پاس جنوری سنہ ۴۱ء کا نگار موجود ہے تو جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار حاصل کرنا آپ کے لئے ضروری ہے، کیونکہ یہ دونوں ملکر ایک مکمل چیز بنتے ہیں اور اگر جنوری سنہ ۴۱ء کا نگار آپ کے پاس نہیں ہے، تو جلد طلب فرما لیجئے، کیونکہ ممکن ہے پھر آپ کو نہ مل سکے۔

اگر آپ کی خریداری سالِ حال میں جنوری کے بعد کسی مہینے سے شروع ہوتی ہے تو اپنی خریداری جنوری سنہ ۴۲ء سے شروع کیجئے اور دفتر کو اطلاع دیجئے تاکہ جنوری اور اس کے بعد کے پرچے آپ کو بھیجے جائیں اس صورت میں جنوری سنہ ۴۱ء کا پرچہ آپ کو یونہی مل جائے گا۔ لیکن اگر آپ یہ مناسب نہیں سمجھتے تو صرف جنوری سنہ ۴۱ء کا پرچہ طلب فرما لیجئے، لیکن اِس صورت میں اس کی قیمت آپ کو علاوہ محصول دو روپیہ ادا کرنا پڑے گی۔

بہرحال آیندہ جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار نہایت اہم چیز ہے اور اگر آپ اس سے پورا لطف اُٹھانا چاہتے ہیں تو جنوری سنہ ۴۱ء کا نگار بھی آپ کے پاس ہونا ضروری ہے تاکہ ان دونوں کو آپ ایک جلد میں مجلد کرا سکیں۔

مینیجر نگار

انقلابِ روس
اور
مارشل وروشیلاف

۱۸۸۱ء میں روس کے جنوبی علاقہ ڈان بیسن میں ایک غریب خدمتگار عورت اور کان کنی کرنے والے ایک غریب مزدور کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام کیلیمنٹی وروشلاف رکھا گیا۔

اس وقت زار الکزنڈر سوم کی حکومت روس کے باشندوں پر سخت مظالم کر رہی تھی اور مزدوروں کی حالت تو خصوصاً ابتر تھی۔ جب وروشیلاف چلنے پھرنے لگا تو اس کی ماں اُسے اُس کی بڑی بہن آینا کے ساتھ سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لئے بھیجنے لگی۔ جب وروشیلاف سات برس کا ہوا تو اس کو ایک لوہے کے کارخانہ میں نوکری دلادی گئی، جہاں اس کو تقریباً دو آنہ روز ملجاتے تھے۔ بارہ سال کی عمر میں وروشیلاف ایک چھوٹے زمیندار کے یہاں چرواہا ہوگیا۔

یہاں اس کی ملاقات زرہاکوف نامی ایک اسکول ٹیچر سے ہوئی، اس نے تعلیم کی ترغیب دلائی، لیکن مالی پریشانیوں سے مجبور ہوکر دوہی سال بعد اسکول چھوڑنا پڑا اور اُس نے ایک کارخانہ میں ملازمت کرلی۔ یہ نکولس دوم کا زمانہ تھا جو بہت ظالم بادشاہ تھا۔ اس وقت وروشیلاف کی عمر سترہ سال کی تھی۔ وہ اگرچہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر پھر بھی اس کو کتابیں پڑھنے کا غیر معمولی شوق تھا وہ ہر اُس چیز کو بہت غور سے پڑھتا جو اس کے ہاتھ لگ جاتی۔ لوگانسک کی فیکٹری کی ملازمت کے دوران میں اُس کی ملاقات ایک انقلابی سے ہوئی جس نے وروشیلاف کو کچھ انقلابی لٹریچر پڑھنے کے لئے دیا۔ وروشیلاف نے صرف اُس لٹریچر کا بہت غور سے مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کی کئی نقلیں اپنے ہاتھ سے طیار کرکے اپنے ہمراز دوستوں میں تقسیم کیں۔ کچھ عرصہ بعد جب انقلابیوں نے وروشیلاف کو انقلابی جماعت سے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا تو اس کو ڈان بیسن میں انقلابی لٹریچر تقسیم کرنے کا کام سپرد کردیا۔ یہ لوگ اکثر راتوں کو چھپ کر جمع ہوتے اور مختلف مسائل پر گفتگو کرتے۔

اس وقت روس میں مزدوروں کی حالت تمام طبقوں سے ابتر تھی۔ ان کو مسلسل بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا، تنخواہیں بہت کم دی جاتیں اور اکثر مہینوں نہ ادا کی جاتیں۔ چنانچہ مجبوراً وہ سودی قرضہ لیتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ جب کبھی مزدوروں کو تنخواہ ملتی تو اُس میں تین چوتھائی سے زیادہ سود میں کاٹ لی جاتی، حکومت بھی مزدوروں کو اس قابل نہ سمجھتی کہ انکی حالت کو سُدھارنے کے لئے کوئی قانون بنائے۔

ڈان بیسن کا علاقہ اگرچہ ایک صنعتی علاقہ تھا مگر وہاں کے مزدوروں میں تنظیم بالکل نہ تھی۔ وروشیلاف نے اِن مزدوروں کو منظم کیا اور ان کو بتایا کہ ان کے پاس "ہڑتال" کا ایک زبردست ہتھیار موجود ہے جس سے وہ ہر سرمایہ دار کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

یہاں کے مزدوروں نے کبھی اسٹرائک کا نام بھی نہ سُنا تھا وہ یہ نیا تجربہ کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے لیکن ورو شیلاف نے اپنی کوششوں سے مزدوروں میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا اور مزدوروں نے اسٹرائک کر دی۔ مزدوروں کی یہ اسٹرائک کامیاب ہوئی اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ اگرچہ اس وقت وروشیلاف صرف اٹھارہ سال کا تھا مگر اُس میں جوش کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آخر کار وروشیلاف کو اپنی اس شورش پسندی کی سزا بھگتنی پڑی اور نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔

کئی سال کی مسلسل بیکاری کے بعد وروشیلاف کو "ہارٹمین" کے کارخانہ آہنگری میں پھر ملازمت مل گئی۔ اس کارخانہ میں وروشیلاف نے روس کی سوشل ڈیماکریٹک پارٹی (سوشلسٹ) کی شاخ قائم کی اور اس کا ایک سرگرم کارکن بن گیا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں وروشیلاف روس کی سوشلسٹ پارٹی کی شاخ لوگانسک کا صدر منتخب ہوا، اور اسی سال وہ ڈان بیسن کے علاقہ کے نمایندہ کی حیثیت سے کُل روس کی سوشل ڈیماکریٹک پارٹی کی کانفرنس میں شریک ہوا۔

یہ کانفرنس ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کانفرنس میں پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے جو بالشویک (اکثریت) اور مانشویک (اقلیت) کے نام سے مشہور ہیں۔ اِن دونوں جماعتوں میں اختلاف اس بات پر ہوا کہ پارٹی کا طریق عمل کیا ہو۔ مانشویک پارٹی کا خیال تھا کہ سوشلسٹ جماعتیں اور مزدور سرمایہ دار سیاسی جماعتوں سے اشتراک کر کے بتدریج تھوڑے تھوڑے اصلاحات حاصل کر سکتی ہیں اور اس طرح مزدور آہستہ آہستہ اتنے طاقتور ہو سکتے ہیں کہ پھر وہ قانونی حدود کے اندر رہ کر حکومت پر بھی قبضہ کر لیں۔ اس کے برخلاف بالشویک پارٹی کے لیڈر لینن نے بتایا کہ یہ خیال ہی غلط ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اور حکومت مزدوروں کو اتنا طاقتور ہونے دے گی کہ وہ حکومت پر قبضہ کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں لا سکیں۔ لینن نے بتایا کہ قانونی حدود کے اندر رہ کر روس میں سوشلسٹ حکومت قائم کرنا تو درکنار ہم اس طریقہ سے مزدوروں کے وہ حقوق بھی نہیں حاصل کر سکتے جو یورپ کے دوسرے سرمایہ دار ملکوں میں ان کو حاصل ہیں۔

وروشیلاف پہلے ہی سے لینن کا مداح تھا اور اس وقت بھی اُس نے لینن ہی کی پیروی کی۔ بہرحال کانفرنس کے بعد بالشویک پارٹی نے خفیہ طور پر مسلح بغاوت کی طیاریاں شروع کر دیں اور باغیوں کے منظم کرنے کا کام وروشیلاف کے سپرد ہوا اُس نے مزدوروں کے چھوٹے چھوٹے گروہ بنائے اور ان کو خفیہ طور پر آتشین اسلحہ سے لڑنے کی تعلیم دی گئی۔ اس عرصہ میں انقلابی جماعتوں کی طرف سے خفیہ طور پر بم۔ پستول اور دوسرے اسلحہ بھی انقلابیوں کے پاس پہونچتے رہے۔

اس دوران میں روس میں بکثرت ہڑتالیں ہو رہی تھیں اور ڈان بیسن کی پولیس اپنے علاقہ میں تمام شورشوں کا باعث وروشیلاف ہی کو سمجھتی تھی۔ چنانچہ اُسے گرفتار کرا لیا گیا۔ گرفتار کرنے کے بعد اس کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا جہاں روزانہ اس قدر زدوکوب کی جاتی کہ وہ بیہوش ہو کر گر جاتا۔ آخر کار اُس کے رفقا کو اس کی خبر ہوئی اور وروشیلاف کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک عام ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ پولیس اس اسٹرائک کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ تھی اس لئے وروشیلاف کو رہا کر دیا گیا۔

۱۹۰۵ء کا انقلاب

سنہ ۱۹۰۴ء اور سنہ ۱۹۰۵ء کا مختصر زمانہ روس کی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں روس اور جاپان کی جنگ شروع ہوئی اور روس کے باشندوں کا تنفر حکومت وقت سے تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا۔ روس کا جاگیردار طبقہ بھی بادشاہ کی مطلق نگرانی سے عاجز آ گیا تھا۔ خود

حکمران طبقہ میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے تھے جو حالات کی ابتری کو دیکھ کر یقین کرنے لگے تھے کہ ایک شخص کی مطلق العنانی یقیناً ملک کی تباہی کا باعث ہے۔ چنانچہ جنرل کروپاٹکن جو اس جنگ میں روسی افواج کا سپہ سالار تھا اپنی ڈائری میں محاذ جنگ پر جاتے ہوئے لکھتا ہے کہ "لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اٹھارہ کروڑ آدمیوں کی قسمت کا فیصلہ ایک مطلق العنان حکمراں کے ہاتھ میں دے دینا کتنا خطرناک ہے۔" انقلابی تحریک زوروں پر تھی یہاں تک کہ فوج کا ایک حصہ بھی انقلابی پروپگنڈے سے متاثر ہو چکا تھا۔ ملک کے اندر شورش پھیل رہی تھی۔ کئی سیاسی قتل ہو چکے تھے اور مقتولین میں ایک وزیر حکومت بھی شامل تھا غرضکہ انقلابیوں کی سرگرمیاں تیزی پر تھیں کہ انقلاب کی اس آگ کو ماسکو کے قتل عام نے اور تیز کر دیا۔ یہ دردناک حادثہ جس نے دُنیا پر حکومتِ روس کی خونخواری کو واضح کر دیا۔ جنوری ۱۹۰۵ء میں واقع ہوا۔

۲۲ جنوری کو ایک بہت بڑا جلوس جو زار کے سامنے اپنے معروضات پیش کرنے جا رہا تھا اور بالکل پُر امن تھا، افسرانِ اعلیٰ کے حکم کے مطابق مسلح پولیس اور فوج نے اُس پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس مجمع میں عورتیں اور بچے بھی بکثرت شامل تھے۔ نہتے باشندوں کا یہ قتلِ عام کئی گھنٹے تک جاری رہا کیونکہ بھاگنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا اور جو لوگ بھاگ رہے تھے ان کا پولیس برابر پیچھا کر رہی تھی۔ ماسکو کی تاریخ میں یہ قتل عام اپنی خونخواری کے لئے یادگار رہے گا۔ اس واقعہ کے بعد انقلابیوں کی سرگرمیاں اور تیز ہوگئیں۔ فروری ۱۹۰۵ء میں ایک انقلابی نے گرانڈ ڈیوک سرج کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اور اسکے بعد ماسکو میں بغاوت کا آغاز ہوا، جو آہستہ آہستہ تمام روس میں پھیل گئی۔ چند بڑے شہروں کے علاوہ یہ بغاوت باقاعدہ جنگ کی شکل نہ اختیار کر سکی۔ بیس بیس، پچیس پچیس کی مسلح ٹولیاں پولیس افسران اور سرکاری حکام کو قتل کرتی پھرتی تھیں۔ ان ٹولیوں کی اکثر کاسک فوج کے دستوں اور مسلح پولیس سے بھی مڈبھیڑ ہو جاتی۔ ان موقعوں پر انقلابیوں نے غیر معمولی ہمت و جرأت کے مظاہرے کئے۔ ڈان بیسن میں باغیوں کی تنظیم کا کام ورو شیلاف کے سپرد تھا۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے انقلابی گروہوں کو طیار کرنا اور ان کو منظم کرنا بڑی حد تک دشوار تھا لیکن ورو شیلاف نے اپنے اس فرض کو بھی نہایت خوبی سے انجام دیا۔

حکومت نے اس بغاوت کو دبا تو دیا لیکن اب اس کا بھی یقین ہوگیا کہ عوام اب زار کی مطلق العنانی کو برداشت کرنے کو طیار نہیں ہیں۔

آخر کار زارِ روس کو مجبور ہو کر روس کی نام نہاد اسمبلی ڈیوما (DUMA) کا اجلاس طلب کرنا پڑا۔ اسی دوران میں حکومت روس کو جاپان سے عبرت انگیز شکست ہو چکی تھی۔ اس لئے عوام کی بے چینی کو کم کرنے کے لئے زار روس نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ایک اعلان بھی کیا جس میں اُس نے شہری آزادی کے بہت سے مطالبات تسلیم کر لئے۔ لیکن زار روس کا یہ اعلان اس وجہ سے نہیں ہوا تھا کہ اس کو واقعی عوام کے مطالبات سے کچھ ہمدردی پیدا ہوگئی تھی بلکہ یہ اعلان اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ حکومت اس وقت سخت مالی دشواریوں میں مبتلا تھی اور ملک میں کسی بڑی شورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی

بہر حال، ڈیوما کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ممبروں کی ایک کثیر تعداد نے حکومت کی بیجا سختیوں پر اعتراض کیا۔ حکومت اس چیز کو کیسے برداشت کر سکتی تھی اُس نے فوراً ڈیوما کو معطل کر دیا۔

ڈیوما کے معطل ہونے سے عوام میں پھر شورش پیدا ہونے لگی۔ فروری ۱۹۰۷ء کو دوسری ڈیوما کا اجلاس

طلب کیا گیا لیکن اس میں بھی ایسے ہی ممبروں کی کثرت تھی جو زارِ روس کی مطلق العنانی کے مخالف تھے۔ اس لئے حکومت نے اس کو بھی معطل کر دیا اور چونکہ اس دو ڈھائی سال کے عرصہ میں حکومت کی مالی حالت سدھر چکی تھی اس لئے اُس نے پھر اپنی پرانی پالیسی پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

اس وقت بالشویک پارٹی کی ایک کانفرنس لندن میں ہونے والی تھی۔ وروشیلاف بھی اس میں شریک ہونے کیلئے لندن گیا۔ ڈان بیسن کی پولیس عرصہ سے ورو شیلاف کو گرفتار کرنے کی فکر میں تھی۔ جب ورو شیلاف، لندن سے واپس ہو رہا تھا تو اس کو بھی اطلاع ہو گئی۔ اُس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ ورو شیلاف اپنے کو گرفتاری سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ ۱۹۰۵ء کی بغاوت کے فرو ہونے کے بعد لوگ عموماً مانشویک پارٹی کے ہمنوا ہو گئے تھے اور مانشویک پارٹی کے ہمنوا ہو گئے تھے اور مانشویک لیڈروں کے خیال کے بموجب مسلح بغاوت کو حماقت سمجھنے لگے تھے۔ ضرورت اس چیز کی تھی کہ بالشویک پارٹی کے ممبر بہت جلد عوام کو اس غلط فہمی سے بچائیں اور لوگوں کو بالشویک پروگرام کے صحیح ہونے کا یقین دلا دیں۔ ورو شیلاف جب لوگانسک کے قریب پہونچا تو اس کو اطلاع ملی کہ پولیس چاروں طرف اس کو گرفتار کرنے کے لئے پھیلی ہوئی ہے اور اُن تمام مقامات کی تلاشیاں لی جا رہی ہیں جہاں ورو شیلاف کی موجودگی کا شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ آخر کار جب کہیں چھپنے کی جگہ نظر نہ آئی تو یہ طے کیا گیا کہ ورو شیلاف دریائے ڈان کے کنارے اُگی ہوئی پتوار کی جھاڑیوں میں پوشیدہ ہو جائے۔ ورو شیلاف نے اُن جھاڑیوں میں مسلسل کئی ہفتہ گزارے لیکن اِس عرصہ میں وہ بیکار نہیں رہا۔ بالشویک پارٹی کے ممبر اور ورو شیلاف کے دوست برابر چھپ چھپ کر راتوں میں اُس سے ملتے رہے جن سے وہ پارٹی کے کام متعلق برابر ہدایات کرتا رہا۔ اور اس طرح پارٹی کے کام میں کسی قسم کا فرق نہ آنے دیا۔ کچھ دنوں بعد لوگانسک کے مزدوروں نے نوٹنکی کا ایک تماشہ کیا۔ ورو شیلاف نے بھی بھیس بدل کر اس میں شرکت کی اور ایک ایکٹر کا پارٹ اپنے ذمہ لے لیا۔ تماشہ کے دوران میں ورو شیلاف نے ایک سخت انقلاب انگیز تقریر کی۔ پولیس تو ہر وقت اس کی تاک میں رہتی ہی تھی ورو شیلاف کی تقریر اور اس کی حرکات سے فوراً اس کو پہچان گئی۔ پولیس کا ایک گروہ اسٹیج کی طرف جھپٹا مگر ورو شیلاف اسٹیج سے اس طرح غائب ہوا کہ سخت کوششوں کے بعد بھی پولیس کے ہاتھ نہ آسکا اور خفیہ طور پر لوگانسک سے بھاگ کر کیف (Kiev) پہونچ گیا جہاں ایک محفوظ مقام پر اس کو چھپا دیا گیا۔ لیکن ایک شخص نے پولیس کو ورو شیلاف کے چھپنے کی جگہ کی اطلاع دیدی۔ چنانچہ اُسے فوراً گرفتار کر لیا گیا اور مختلف جرائم کی پاداش میں اس کو سائبیریا بھیج دیا گیا۔

اس عرصہ میں بالشویک پارٹی کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں اور ملک میں دوبارہ شورش پیدا ہو گئی۔ اسٹرائکوں کی پھر کثرت ہو گئی۔ اور روزانہ ہڑتال کرنے والوں پر پولیس فائرنگ کے واقعات پیش آنے لگے۔

حکومت کے اِن مظالم کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جون ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا۔

روس کی مالی حالت پہلے بھی اچھی نہ تھی اور اب جنگ میں شرکت کرنے سے زیادہ خراب ہو گئی۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۶ء میں یہ حال تھا کہ بازاروں میں روزانہ کی ضروریات کا سامان ملنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ فصلیں خراب ہو رہی تھیں۔ فوج کو سامان رسد بھی ٹھیک سے نہ ملتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سپاہیوں نے فوج سے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس وقت ورو شیلاف میعادِ قید ختم کر کے سینٹ پیٹرسبرگ آگیا تھا اور فوج میں بھرتی ہونے والوں میں خفیہ طور پر پروپگنڈا کر رہا تھا۔ اس کا یہ پروپگنڈہ اس قدر

کامیاب ہوا کہ فوج کے کئی دستے اُس کے ہم خیال بن گئے۔

جنوری ۱۹۱۷ء میں سینٹ پیٹرسبرگ میں مزدوروں نے ایک زبردست ہڑتال کی جس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا ہڑتال کو ختم کرنے کے لئے حکام نے فروری ۱۹۱۷ء کو فوج کا ایک دستہ طلب کیا۔ لیکن وہ سپاہی جن کو ہڑتالیوں پہ گولیاں چلانے کے لئے بلایا گیا تھا، ہڑتالیوں سے مل گئے۔

یہ فوج کی بغاوت کی ابتدا تھی۔ اُسی وقت بحیرۂ بالٹک کے بیڑے نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور اس کے دسویں دن ماسکو میں بھی مسلح بغاوت ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زار نکولس دوم کو بہت جلد تخت سے دست بردار ہونا بردار ہونا پڑا اور ڈیوما کے اُن ممبروں نے جو سینٹ پیٹرسبرگ میں موجود تھے ایک عارضی حکومت قائم کرلی۔

اس میں شک نہیں کہ مارچ کا یہ انقلاب عظیم الشان انقلاب تھا۔ اِس نے روس میں زارشاہی کا خاتمہ کر دیا اور سرمایہ دار دستوری حکومت کی بنیاد ڈالی جو یوروپ کی دیگر سرمایہ دار جمہوریتوں کا چربہ تھی لیکن بالشویک ایک منٹ کے لئے بھی روس میں سرمایہ دارانہ نظام کو با اقتدار نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے انقلاب مارچ کے بعد ہی روس میں ہر مقام پر مزدوروں اور سپاہیوں کی متحدہ مجلسیں یعنی سوئیٹ (Soviets) قائم ہوگئی تھیں۔

سینٹ پیٹرسبرگ اور دوسرے بڑے شہروں میں برابر بالشویک پارٹی کی طرف سے سرخ ملیشیا (Militia) کے دستے طیار کئے جا رہے تھے۔ اس وقت بالشویک پارٹی کا اس قدر زیادہ اثر پھیلا ہوا تھا کہ مینشویک پارٹی کے بہت سے ممبر بالشویک پارٹی میں شریک ہو رہے تھے۔ منشوک پارٹی کے اُن خاص لوگوں میں جنھوں نے اسوقت بالشویک پارٹی میں شرکت کی تھی ٹراٹسکی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وروشیلاف اِس وقت سرخ ملیشیا کے دستے تیار کرنے میں مشغول تھا۔ مگر عارضی حکومت بالشویک پارٹی کی سرگرمیوں کو زیادہ دیر تک برداشت کرنے کے لئے طیار نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے کمیونسٹ لیڈروں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ وروشیلاف پیٹروگریڈ (یا سینٹ پیٹرسبرگ) سے بھاگ کر ڈان بیسن جا پہونچا یہاں پہونچ کر اُس نے ہر ہر مقام پر بالشویک پارٹی کی شاخیں قائم کیں اور سُرخ افواج کے دستوں کو طیار کرنا شروع کر دیا۔

جون ۱۹۱۷ء میں بحیرۂ اسود کے بحری بیڑے نے عارضی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ جولائی میں پیٹروگریڈ سوئیٹ نے حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن ان بغاوتوں کو بہت جلد فرو کر دیا گیا۔

ستمبر کے مہینے میں جرمن افواج نے روس کے خلاف پھر پیش قدمی شروع کر دی۔ روس کی فوجیں اب کسی لحاظ سے بھی اس قابل نہ تھیں کہ وہ کسی طاقتور دشمن کے حملے کی تاب لاسکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روسی فوجوں کو پورے محاذِ جنگ پر شکستیں ہونا شروع ہوگئیں۔

روس کے عوام اور سپاہی اس جنگ کو جاری رکھنے کے خلاف تھے۔ اِن شکستوں نے مخالفت کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا۔ اس پر بالشویک پارٹی کے پروپگنڈہ نے اور بھی زہر کا کام دیا۔

آخرکار ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۷ء کی وہ تاریخ بھی آپہونچی جب دُنیا کی پہلی سوشلسٹ سلطنت وجود میں آئی۔ ۲۴ اکتوبر کی شب کو بالشویک پارٹی کی طرف سے ایک اعلان کیا گیا جس کی رو سے حکومت کے تمام اختیارات سوئیٹ نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

دوسرے دن حکومت کی طرف سے انقلاب کے ختم کرنے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ کرنسکی (عارضی گورنمنٹ کا وزیر اعظم اور منیشوک پارٹی کا لیڈر) اور اُس کی عارضی حکومت کے دوسرے وزرا دوسرے ہی دن پطرو گریڈ سے بھاگ گئے ۲۶ اکتوبر کو مزدوروں کی نمایندہ حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ سویٹ حکومت نے جرمنی سے گفتگوئے صلح شروع کی لیکن جرمنی کی طرف سے شرائط اس قدر سخت پیش کے گئے کہ پہلے بالشویک پارٹی کے بہت سے لیڈر اُن کو ماننے کے لئے طیار نہ ہوئے اور اس طرح ایک عرصہ تک جرمنی اور روس میں صلح نہ ہوسکی۔ مگر سویٹ گورنمنٹ کو مجبوراً جرمنی کے مطالبات آخر میں تسلیم کرنا ہی پڑے اور ۲۳ فروری ۱۹۱۸ء کو جرمنی اور روس کے درمیان صلح ہوگئی۔

جس دوران میں حکومتِ روس اور جرمنی کے درمیان صلح کی گفت وشنید ہو رہی تھی، زارشاہی کے ساتھیوں اور زار کی فوج کے جنرلوں نے پھر سر اُٹھانا شروع کیا اور مختلف مقامات پر حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانا شروع کی بعض دوسری حکومتوں نے بھی اس نئی حکومت کے قیام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اس کی دشمنی پر آمادہ ہوگئیں۔ چنانچہ اس نوزائیدہ حکومت کو ختم کرنے اور باغی جنرلوں کی امداد کے لئے مشرقِ بعید میں امریکہ اور جاپان نے اپنی فوجیں اُتار دیں اور شمال میں مرمانسک پر برطانیہ نے۔ ان فوجوں نے ماسکو فتح کرنے کی غرض سے اُس کی طرف پیش قدمی بھی شروع کردی۔ شمالی سمندر کے ایک دوسرے بندرگاہ آرچنگل پر بھی دولِ متحدہ کی فوجیں اُتاری گئیں اور ان فوجوں نے بھی ماسکو کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔

یوکرین کے علاقہ میں کراسنوف نامی زار کی فوج کے ایک افسر اعلیٰ نے بغاوت کردی اور جرمنی نے اپنے معاہدہ کے خلاف یوکرین میں کراسنوف کی امداد کے لئے اپنی فوجیں بھیجدیں۔ لیکن اس علاقہ کا اندرونی حصہ بالشویک حکومت کے ساتھ تھا۔ یوکرین میں ہر جگہ سرخ ملیشیا کے دستے موجود تھے جو جرمن فوجوں سے "گوریلا" جنگ کر رہے تھے مگر ماسکو چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ صرف زارزن (Tzaritzin) سویٹ گورنمنٹ کے قبضہ میں تھا جہاں سے یوکرین جانے کا راستہ ہے۔

انقلاب ہونے کے بعد وروشیلاف کو محکمہ جاسوسی (Cheka) کا ایک افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا لیکن وروشیلاف نے بہت جلد محسوس کیا کہ یہ جگہ اس کے لئے موزوں نہیں۔ اس کے بعد اس کو پیٹروگریڈ پولیس کا حاکم اعلیٰ بنا دیا گیا لیکن وروشیلاف نے اس کو بھی نہیں پسند کیا اور خود اُس کی درخواست کی بنا پر ڈان بیسن کے علاقہ میں واپس کر دیا گیا۔

وروشیلاف نے لوگانسک پہونچتے ہی تقریباً دو ہزار آدمیوں کی ایک فوج طیار کی اور اس کے بعد ایک مقامی سویٹ کا ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا جس میں فوج کے افسر اعلیٰ کے مقرر کرنے کا سوال پیش ہوا۔ لوگانسک میں اسوقت کوئی فوجی افسر موجود نہ تھا اس لئے وروشیلاف ہی کو اُس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔

لوگانسک میں وروشیلاف کی آمد کا حال سُن کر یوکرین کے ہر علاقہ سے والنیٹر فوج میں بھرتی ہونے کے لئے آنا شروع ہوئے اگرچہ کچھ دنوں بعد ایک چھوٹی سی فوج جو نئے بھرتی کئے ہوئے والنیٹروں اور سرخ ملیشیا کے دستوں پر مشتمل تھی طیار ہوگئی تھی مگر یہ چیز بالکل صاف تھی کہ اگر یہ فوج زارزن تک نہیں پہونچتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ بادی النظر میں اس فوج کا زارزن تک پہونچنا محال معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اول تو اس فوج کو غنیم کے مقبوضہ علاقہ سے گزرنا تھا اور دوسرے راستہ تقریباً ایک ہزار میل لمبا تھا

اور بہت سے دریا بیچ میں حایل تھے۔

لوگانسک سے زارزن تک ایک ریلوے لائن گئی تھی، وروشیلاف نے یہ طے کیا کہ اس راستہ کو جلد طے کرنے اور سامانِ جنگ کو دشمنوں کی لوٹ سے محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ فوج اور سامان جنگ کو ریل کے ذریعہ روانہ کیا جائے معمولی ریلوں کو توپوں اور دیگر سامانِ جنگ سے مسلح کیا گیا اور یہ مسلح ٹرین منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئی۔ جرمن افواج نے اس کمزور سی فوج کو تباہ کرنے کا پورا تہیہ کر لیا اور اس مسلح گاڑی پر روزانہ دشمن کے حملے ہوتے لیکن سرخ افواج غیر معمولی جرأت و ہمت کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہوئی برابر آگے کی طرف بڑھتی رہیں۔

کئی مقامات پر تو یہ ٹرین بالکل تباہی کے کنارے پہونچ گئی تھی مگر قسمت کی خوبی سے بچ گئی۔ کئی مرتبہ راستہ میں غنیم نے ڈائنامئٹ سے پل اُڑا دئے۔ ایک مرتبہ جب یہ گاڑی ایک بہت بڑے دریا کے پل پر سے گزر رہی تھی تو دشمن کی توپوں نے پل پر گولہ باری شروع کر دی۔ اگر پل پر گولہ اُس حالت میں لگ جاتا جب ٹرین پل پر سے گزر رہی تھی تو ٹرین کا تباہ ہونا یقینی تھا لیکن خوش قسمتی سے آخری ڈبہ اس پر سے گزرا ہی تھا کہ پل پر ایک گولہ آکر گرا اور یہ پل اُڑ گیا۔

بعض جگہ پر باغیوں اور جرمن فوجوں نے ریلوے اسٹیشنوں اور ریلوے لائن پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر سُرخ افواج انکا مقابلہ کرتی ہوئی برابر بڑھتی ہی چلی گئیں۔

آخر کار یہ فوج دریائے ڈان کے کنارے ایک مقام ترہی چرسکایا پہونچ گئی۔ اس مقام پر ایک بہت مضبوط ریلوے پُل تھا جس کو دشمنوں نے تباہ کر دیا تھا۔ لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ سب سامانِ جنگ یہیں چھوڑ دیا جائے اور دریا کو لکڑی کے تختوں کے پلوں کے ذریعہ پار کرنے کی کوشش کی جائے مگر وروشیلاف اس کے لئے طیار نہ ہوا۔ فوج کو پُل کی مرمت کرنے کا حکم دیدیا عین اُسوقت جبکہ غنیم کی فوجیں چاروں طرف سے حملہ کر رہی تھیں پُل بنانے کا کام جاری تھا۔ دشمن کو اپنی تمام کوششوں کے باوجود فوج کو تباہ کرنے میں کامیابی نہ ہوئی اور آخر کار پُل طیار ہو گیا اور سرخ افواج اس پر سے گزر کر زارزن پہونچ گئیں۔

زارزن پر بھی برابر دشمنوں کے حملے ہو رہے تھے اور ایک مختصر سی فوج شہر کی حفاظت کر رہی تھی۔ زارزن غیر معمولی طور پر اہمیت اختیار کر چکا تھا کیونکہ ایک ہی مقام تھا جس کے ذریعہ یوکرین کا غلّہ ماسکو پہونچ سکتا تھا۔ وروشیلاف کے پہونچنے کے ساتھ ہی تمام بار اُس پر ڈال دیا گیا۔ وروشیلاف نے شہر کی حفاظت کا نیا نقشہ طیار کیا اور اُس نے چند ہزار منتخب سپاہیوں کے دو ڈویژن طیار کئے، تاکہ جس مقام پر زیادہ خطرہ ہو وہاں اس فوج کو پہونچا دیا جائے چونکہ محاذ جنگ بہت بڑا تھا اس لئے وروشیلاف نے پہلی مرتبہ فوج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے فوجی لاریوں کو استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح میکانیکی فوج (Mechanised Force) کی بنیاد ڈالی گئی۔

اس وقت بالشویک حکومت کی عمر ایک سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور یہ چاروں طرف سے مصائب میں گھری ہوئی تھی اس پریشانی کے عالم میں ایک غدّار نے لینن کو گولی کا نشانہ بنایا لیکن لینن اس زبردست حملے کو بھی برداشت کر لے گیا۔

اسی حالت میں زارزن کی جنگ جاری تھی خود شہر کے اندر مینشویک پارٹی کے لوگ موجود تھے جو برابر غنیم سے سازش کر کے سُرخ افواج کو تباہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے۔ لیکن وروشیلاف کا انتظام اور تدبر ان سب پر غالب آیا شہر کی حفاظت میں

وروشیلاف نے غیر معمولی بہادری اور ہمت کا ثبوت دیا، اکثر ایسے مواقع پیش آئے کہ دشمن کے زبردست حملے کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر سُرخ افواج پیچھے ہٹنا شروع ہوئیں۔ فوج پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ کر وروشیلاف خود فوج کے آگے آگیا اور دشمنوں کی آتش باری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دشمنوں کی صفوں پر چند ساتھیوں کے ساتھ حملہ آور ہوگیا۔ پیچھے ہٹتی ہوئی فوج نے جب اپنے سپہ سالار کو اِس بے جگری سے مقابلہ کرتے دیکھا تو پلٹ کر حملہ آور ہوئی اور دشمن کو شکست دیکر پسپا کر دیا۔

اب شہر کی حفاظت کرنے والی فوج کے پاس سامانِ جنگ ختم ہونے کے قریب پہونچ گیا تھا۔ وروشیلاف مرکزی حکومت کے پاس برابر تار روانہ کر رہا تھا۔ مگر مرکزی حکومت اس قابل نہ تھی کہ وہ زارزن کچھ امداد بھیج سکتی۔ لینن بہت پریشانی کے ساتھ زارزن کی حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ ماسکو سے کوئی فوج نہیں بھیج سکتا تھا مگر اُس نے اپنے خاص رفیق کو وروشیلاف کی امداد کے لئے زارزن روانہ کر دیا۔ یہ شخص اپنی دماغی خوبیوں کی وجہ سے ایک بڑی فوج سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ جس مقام پر خطرات حد سے زیادہ گزر جاتے اور مشکلات ناامیدی میں تبدیل ہونے لگتیں وہاں لینن ہمیشہ اسی شخص کو بھیجتا۔ اس شخص کا نام تھا اسٹالین۔

اسٹالین نے زارزن پہونچتے ہی وہاں کی بگڑتی ہوئی حالت کو بہت کچھ سنبھال لیا۔ لیکن پھر بھی سپاہیوں اور سامانِ جنگ کی کمی باقی رہی۔ آخرکار وزیر جنگ ٹراٹسکی نے تھوڑی سی فوج زار کی فوج کے ایک سابق افسرِ اعلیٰ کی ماتحتی میں روانہ کی۔ اس فوج کے افسروں نے غنیم سے سازش کر لی۔ وروشیلاف کو جب اس سازش کا علم ہوا تو اُس نے فوراً اِن لوگوں کو گولی سے اُڑا دیا ٹراٹسکی اس پر آگ بگولہ ہوگیا۔ اسٹالین کو وہ اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا اس لئے اُس نے لینن کو مجبور کیا کہ وہ اسٹالین کو زارزن سے واپس بُلالے۔ لینن اگرچہ اس کے لئے طیار نہیں تھا مگر آخر میں اس نے اسٹالین اور ٹراٹسکی کی آپس کی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے واپس بلا لیا۔ اس کے بعد ٹراٹسکی نے وروشیلاف کو بھی زارزن سے ہٹا کر ماسکو بھیجدیا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وروشیلاف کے ہٹتے ہی باغی جنرل کی فوجوں نے زارزن کو فتح کر لیا۔

جنگ کے دوران میں اس سے زیادہ نازک حالت کبھی نہ ہوئی تھی۔ لینن نے اسٹالین سے یوکرین کی فوجی کمیٹی کا صدر بننے کی خواہش ظاہر کی۔ اسٹالین اسکے لئے فوراً طیار ہوگیا مگر اس شرط پر کہ ٹراٹسکی یوکرین کے جنگی معاملات میں قطعی مداخلت نہ کرے گا۔

اس کے بعد اسٹالین اور وروشیلاف یوکرین پہونچے۔ محاذِ جنگ بہت ہی وسیع تھا اور فوج کو تیزی کے ساتھ حرکت کرنے کی ضرورت تھی۔ وروشیلاف چونکہ اس فوج کو میکانکی فوج (Mechanised Force) میں تبدیل نہیں کر سکتا تھا اس لئے اُس نے ہر بٹالین میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں سوار رکھے اور اس طرح اکتوبر ۱۹۱۹ء کو انقلاب روس کی مشہور فوج یعنی پہلی سوار فوج (Cavalry) وجود میں آئی۔

وروشیلاف کو تعلیم کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ اس موقعہ پر اس نے سپاہیوں کو تعلیم دینے کا عجیب و غریب طریقہ ایجاد کیا یعنی جب فوج ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف روانہ ہوتی تو ہر سپاہی کی پشت پر چھپے ہوئے حروف اور الفاظ چپکا دئے جاتے اور اُس سپاہی کے پیچھے چلنے والا سپاہی اُن الفاظ کو یاد کرتا۔

"فرسٹ کولری آرمی" نے یکے بعد دیگرے یوکرین کے تمام اہم مقامات کو فتح کرنا شروع کر دیا اور آخرکار جنرل ورنگل کی فوجوں سے پورے یوکرین کو صاف کر دیا۔

یوکرین کی یہ جنگ ابھی پورے طور پر ختم نہیں ہوئی تھی کہ پولینڈ کی فوجوں نے یوکرین پر حملہ کر دیا۔ ورو شیلاف کو فوراً اس محاذِ جنگ پر مع اپنی کویلری آرمی کے آنا پڑا۔ ورو شیلاف، یوکرین سے یلغار کرتا ہوا جنوب کی طرف سے پولینڈ پر حملہ آور ہوا۔ دوسری طرف روسی انقلابی فوجیں لتھونیا سے گزرتی ہوئی شمال کی جانب سے وارسا (دارالسلطنۃ پولینڈ) کی طرف بڑھیں۔

پولینڈ کے جرنلوں کا خیال تھا کہ روسی فوجوں کا حملہ صرف جنوب سے ہوگا۔ اس لئے انھوں نے ورو شیلاف کی فوج کو روکنے کے لئے انتہائی طیاریاں کیں لیکن "فرسٹ کویلری آرمی" پولینڈ کی فوجوں کو شکست دیتی ہوئی برابر آگے بڑھتی چلی گئی اور پولینڈ کے اندر داخل ہوگئیں۔۔۔ اس وقت بھی ورو شیلاف اپنی عادت کے موافق ہمیشہ فوج کے آگے ہی رہتا اور سب سے پہلے دشمن پر حملہ کرنے کے لئے خود ہی آگے بڑھتا۔ سُرخ افواج ورو شیلاف کی کمان میں جس قدر تیزی سے بڑھ رہی تھیں اسکا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعہ سے ہو جائے گا:۔۔ ۲۸ جولائی کو پولینڈ کے صدر مارشل پلسڈسکی نے، برسٹ لٹاسک کے کمانڈر انچیف سے بذریعہ تار دریافت کیا کہ کیا تم دشمن کو دس دن تک برسٹ میں روک سکتے ہو۔ برسٹ لٹاسک کے کمانڈر نے جواب دیا: "دس دن کیا معنی۔ ہم دشمن کو ایک ماہ تک روک سکتے ہیں"۔ لیکن اُسی شام کو سُرخ افواج نے برسٹ لٹاسک کے قلعہ پر قبضہ کر لیا

سُرخ افواج کی اِن فتوحات سے تمام یورپ میں کھلبلی مچ گئی اور پیرس سے جنرل ویگان مع کثیر سامانِ جنگ اور ہوائی جہازوں کے پولینڈ پہونچے ۔۔ جنرل ویگان، فرانس کا نہایت مشہور اور لایق جنرل ہے۔ جنرل ویگان کا پولینڈ پہونچ جانا پولینڈ کے لئے خدائی رحمت ثابت ہوا۔ کثیر تعداد میں سامانِ جنگ کے آجانے کی وجہ سے پولینڈ کو او ر تقویت پہونچ گئی۔ دوسری طرف یہ حالت تھی کہ چھ سال کی مسلسل جنگ سے روس بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ فوجیں تھک چکی تھیں۔ جنرل ویگان نے روس کی انقلابی فوجوں کے قلب اور میمنہ کو بالکل تباہ کر دیا۔۔۔ آخر کار لینن نے جنگ کے مصائب سے روس کو بچانے کا پورا تہیہ کر لیا اور تمام دشمن ممالک سے صلح کی گفت وشنید شروع کر دی۔ مگر ابھی اندرونِ ملک کچھ باغی جنرل موجود تھے جن کو انگریزوں سے برابر مدد ملتی تھی۔ سُرخ افواج نے اِن باغیوں کو گھیر کر پوری طرح سے تباہ کر دیا۔ آخر کار جب روس کو ان مصائب سے نجات ملی تو لینن ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو اِس دُنیا سے چل بسا۔

امن قایم ہو جانے کے بعد سویٹ گورنمنٹ کی طرف سے ورو شیلاف کو مارشل کا خطاب عطا کیا گیا اور ۱۹۲۶ء میں مارشل ورو شیلاف کو روس کا وزیرِ دفاع بنایا گیا۔۔۔ وزارت کے عہدہ پر پہونچ کر ورو شیلاف نے روس کی بری اور ہوائی فوج کو جدید ترین آلاتِ حرب سے مسلح کیا۔ فوج کے ہر دستے کی تعلیم اور معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی لائبریریاں قایم کیں اور فوجی سپاہیوں کو تعلیم دینے کے لئے خاص طور سے مدرسین کو مقرر کیا گیا۔ مگر اتنے بڑے عہدہ پر فایز ہو جانے کے بعد ورو شیلاف میں نام کو بھی غرور اور تکبر نہیں پیدا ہوا۔ ڈان بیسن کے وہ مزدور جو اسکے ساتھ مِل میں کام کیا کرتے تھے، ہاسکو اُس سے ملنے جاتے ہیں۔

موجودہ جنگ کے شروع ہونے کے بعد ورو شیلاف نے وزارت کے عہدہ سے استعفا دیدیا اور خاص طور پر مشرقی سرحد کے دفاع کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جرمنی اور روس کی موجودہ جنگ شروع ہونے کے بعد ورو شیلاف وزارت جنگ کا رکن مقرر کیا گیا اور روس کی مشرقی سرحد کے شمالی حصہ کی کمان اُس کے سپرد ہے۔

صلاح الدین عثمان

نگاہِ بازگشت

(مسلسل)

۱۰- ثاقب لکھنوی جناب ثاقب لکھنوی دورِ حاضر کے اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کا مولد آگرہ ہے، مگر لکھنؤ میں مدت سے مستقل قیام ہے۔ اسی لئے آپ اپنے کو لکھنوی لکھتے ہیں۔

آپ کا مذاقِ سخن عام لکھنوی شعراء سے علٰحدہ ہے۔ فطرت کا مشاہدہ، حیاتِ انسانی کا تجزیہ، الفاظ کا رکھ رکھاؤ آپ کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے احساسِ حیات کو اپنے اور دوسروں کے لئے بہت معنی خیز بنا دیتے ہیں۔ مگر حیاتِ انسانی کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن پر قنوطیت کا رنگ غالب نہیں ہوتا۔ وہ زندگی سے گریز کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ زندگی کی اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں۔ وہ صرف اپنے نظریات اور اپنی کیفیات ہی کو بے نقاب نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے احساسات وجذبات کا بھی عمیق مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ کے حسبِ ذیل اشعار آپ کے مشاہدۂ کائنات کا پتہ دیتے ہیں:

کس نے غمکدہ دنیا کا نام رکھا ہے　　ہمیں تو کوئی یہاں دردآشنا نہ ملا

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی　　اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

مصرع کا ہر لفظ (پہلو) پر نگینہ کی طرح جڑا ہوا نظر آتا ہے اور خصوصاً دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں لفظ "سناٹا" نے ایک خاص سماں کھینچ دیا ہے۔ جناب ثاقب کی یہ خصوصیت کہ وہ خشک سے خشک موضوع کو آب و رنگِ شاعری میں سمو کر پیش کرتے ہیں اُنھیں دوسرے ہمعصر شعراء سے ممتاز بناتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ　　ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

وسعتِ معنی اور تخئیل بلند کے علاوہ اسلوبِ بیان اس قدر رنگین و دلکش ہے جو دل ونظر کو اپنی طرف جذب کئے لیتا ہے

جناب ثاقب کی نظریں زندگی کے معمولی واقعات سے بھی نتائج اخذ کرتی ہیں اور آپ ان تاثرات کو اس قدر پراثر پیرایۂ بیان میں نظم کرتے ہیں کہ وہ ذاتی چیز نہیں رہتی بلکہ شخصیت کی حدود سے بڑھکر ایک عمومی حیثیت اور ایک عالمگیر لوا ختیار کر لیتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، عدم التفات، بے وفائی اور انقلاب زمانہ کا مرقع جیسا آپ نے اِن دو اشعار میں کھینچا ہے مثال ہمیں شاید ہی کہیں نظر آئے۔ ملاحظہ ہو:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے　　جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن　　زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

جناب ثاقب کی مظاہرِ فطرت سے وابستگی آپ کو حقایق کے اُبھارنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ آپ کا ایک شعر ہے:

وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر　　جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

الفاظ و معانی کی ہم آہنگی کی ایسی مثالیں جناب ثاقب کے یہاں بہت ملتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو :-

اُمید و نا اُمیدی کا بہم ہونا وہی جانے　　کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے

کائنات کا درد جناب ثاقب کی روح کو تڑپا دیتا ہے۔ آپ اپنے پہلو میں ایک ایسا احساس دل رکھتے ہیں جو کسی طرح بھی دوسروں کی تکلیف کو دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہی جذبہ ہے جو انھیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ :

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوگا مرے دل سے　　نظر یا دل کی جھپکے تو کہہ دوں عنا دل سے

اپنی شخصیت کی اہمیت اور مذاقِ عشق کی بلندی کو ظاہر کرنا اُن کے پندارِ خودی کا نتیجہ ہے جس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ :

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو　　بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

اسی جذبہ کو ایک اور شعر میں یوں ظاہر کرتے ہیں :

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی　　میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

مندرجۂ بالا شعر آپ کی جدتِ بیان اور اظہارِ خیال پر آپ کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے۔ طرزِ نگارش اور جدتِ بیان کی ایک نہایت ہی لطیف اور نادر مثال ملاحظہ ہو :

سجدے کا کام آج نہ لیں گے جبیں سے ہم　　نقشِ قدم اُٹھائیں گے اُن کے زمیں سے ہم

اس شعر کی تشریح کر کے اس کے لطف کو خاک میں ملانا نہیں چاہتا۔ صاحبانِ ذوق خود اندازہ کر سکیں گے کہ ایک پامال مضمون کو کس قدر لطیف پیرایۂ بیان عطا کیا ہے۔

"بعض نغمے جو شاعر کے دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں ایسے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ کبھی ظاہر نہیں ہوتے اور دل کے اندر ہی رہتے ہیں"۔ مگر باوجود اس فراوانی جذبات و احساسات کے جناب ثاقب کو اظہارِ بیان پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ نازک سے نازک جذبات ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسے :

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں　　ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

جناب ثاقب کائنات کے کسی مظہر کو حقیر نہیں سمجھتے۔ اُن کی نظریں دُنیا کی حقیر سے حقیر چیز کی اہمیت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ جناب ثاقب نے اپنی شاعری میں حیات و کائنات کا ذکر کیا ہے اور زندگی کے حقیقی تجربات پر اپنے تخیل کی بنا رکھی ہے۔ وہ اپنے احساسات کو شعر کا جامہ اُسی وقت پہناتے ہیں جب کوئی واقعہ اُن کے دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ مگر اس حقیقی احساس و بلند تخیل کے لئے الفاظ کا خارجی لباس بھی ویسا ہی استعمال کرتے ہیں جو شایانِ شان ہے۔ چنانچہ آپ کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں :

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر　　خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا !

گلشن سے اُٹھ کے میرا مکاں دل میں آگیا　　اک داغ بن گیا ہے نشیمن جلا ہوا

پہلے شعر میں ایک طائر کی اسیری کی اہمیت کو جس طرح دوسرے مصرعہ میں ظاہر کیا ہے وہ جناب ثاقب کے نازک احساسات و دور رس نگاہوں کا ثبوت ہے۔

یہاں تک تو جناب ثاقب کے اس حصۂ شاعری کا تذکرہ تھا جو اُن کے مطالعۂ حیات و کائنات تک محدود ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُن کے کلام میں تغزل نہیں۔ گو وہ آپ درنگ کی شاعری سے کتنا ہی بے نیاز کیوں نہ معلوم ہوں مگر اُن کے پہلو میں ایک بیچین اور حساس دل ضرور ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اُن کے یہاں بیباک رنگِ تغزل کی مثالیں نہ ملیں گی۔ اُنکی شاعری محبوب کے ظاہری و خارجی اوصاف اور لکھنوی رنگِ تغزل سے پاک ہے۔ اُن کا رنگِ تغزل بھی متانت لئے ہوئے ہے مگر سوز و اثر سے خالی نہیں۔ باوجود اس حزم و احتیاط کے اُن کے تغزل میں ایک کیفیت اور ایک رنگینی پائی جاتی ہے اور پھر مصرعوں کی روانی۔ سلاست اور حلاوت شعر کے لطف کو دونا کر دیتی ہے۔ ہم جناب ثاقب کے رنگِ تغزل کے چند نمونے یہاں پیش کرتے ہیں جس سے آپ کے ذوقِ صحیح کا اندازہ ہو سکے گا:-

جو اہلِ دل پہ گزرتی ہے مجھ پہ بھی گزری — سُنا ہوا ہو جو قصہ اُسے سناؤں کیا،
شبِ فراق کو میں جانوں یا خدا جانے — جو تم سمجھ نہیں سکتے اُسے سناؤں کیا
کب اُس نے کی ہے پرسش غمہائے جانگسل — جب حالِ دل بیان کے قابل نہیں رہا
سراسر دفترِ عالم ہے رنگیں، — فقط میری تمھاری داستاں سے
سونے والوں کیا خبر اسے ہجر — کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا
آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں — اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہے
ویرانہ جہاں دیکھ لیا راہ سفر میں — بڑھتا ہوں اُسی سمت کہ شاید مرا گھر ہو
شبِ فراق کی روزانہ آفتیں تو یہ، — یہ امتحان تو ہوتا کبھی کبھی کے لئے
مری قید کا دلشکن ماجرا تھا — بہار آ ئی تھی آشیاں بن چکا تھا
شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا۔ خدا ہی خدا تھا
برگشتہ ہوئی دُنیا رسم رہِ اُلفت سے — اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

اُن کے دیوان میں اس قسم کے اشعار کی کمی نہیں۔

جناب آرزو کی طرح جناب ثاقب کے یہاں بھی تمثیلات کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اور ان تمثیلات و تشبیہات سے دوش بدوش سادگیِ بیان سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی — بے سوئے ہوئے خوابِ پریشاں نہیں دیکھا
پھول کو توڑ کے دیکھو اثرِ وصل و فراق — موت ہے چاہنے والوں سے جدا ہو جانا
بڑھائی جس نے تیری نیند مجھ کو تڑپا کے — وہ میری عمرِ گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

گو جناب ثاقب نے پُرانے رنگِ شاعری اور روایتی اسلوبِ بیان کو ترک نہیں کیا مگر انھوں نے اسی فرسودہ پیکر میں زندگی کا جوش اور ولولہ بھر دیا ہے۔

۱۱- جلیل مانک پوری

حضرت جلیل مانک پوری، جناب امیر مینائی کے شاگرد ہیں۔ اور اُسی پُرانے دور اور پُرانے رنگِ شاعری کی یادگار۔ آپ کا رنگِ سخن اب بھی وہی ہے جو امیر و داغ کے زمانہ کا طرۂ

امتیاز تھا۔ پچاس ساٹھ سال کی مشقِ سخن ہو چکی ہے اور آپ اپنے کلام کی رنگینی و شوخی کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ۔ نہ خیال کی بلندی۔ نہ معنی آفرینی۔ لیکن آپ کے کلام کی روانی اور سادگی نرمی اور لوچ اور لہجہ کا دھیما پن۔ یہ سب باتیں ضرور قابلِ توجہ ہیں اور کچھ دیر کے لئے انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ آپ کے کلام میں عامیانہ مضامین اور بیباک معاملہ بندی کی بھی کمی نہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

سبھی مجھے مار ڈالا مری جان ہو کر — چلے ہائے دم بھر کو مہمان ہو کر
ہاں ! مری جاں پھر اُسی انداز سے — مار ڈالا مسکرا کر ناز سے
کیونکر کہوں کہ ہوش نہ تھا۔ تھا۔ ضرور تھا — وہ بیخودی کی آڑ میں لپٹے جلیل سے
دلِ بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی — آپ پہلو میں جو بیٹھیں تو سنبھل کر بیٹھیں
آج تو دل سے نکالی جائے گی — اے تمنا تجھ کو رو لوں شامِ وصل

لکھنوی رنگِ تغزل بھی آپ کی شاعری سے جھلکتا ہے اور باوجود دہلوی اسکول کے مقلد ہونے کے ناسخ کا رنگِ شاعری بھی آپ کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

کیا کیا ملا رہا ہوں نسیمِ سحر کو میں — سونے میں کھل گئی ہے جو وہ زلفِ مشکبو
پردہ اُٹھے تو ڈال دوں اپنی نظر کو میں — اچھا نہیں کہ ہو رُخِ محبوب بے نقاب
تڑپ تڑپ کے تمنا دلِ حزیں میں رہی — رُکی رُکی جو چھری دستِ نازنیں میں رہی
خنجر سے کاٹتا ہوں شبِ انتظار کو — کرتا ہوں یاد شام سے ابروئے یار کو
سحر کو کیسے کیسے پھول چنتا ہوں میں بستر سے — ٹپکتے ہیں شبِ غم دل کے ٹکڑے دیدۂ تر سے
کیا زمانہ ایک ہی کروٹ بدل کر رہ گیا — دن جو دشمن کے پھرے میرے بھی پھرنے چاہئیں

آپ کے کلام میں سطحی مذاق کے الفاظ و محاورات بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسے:

اُنھیں خوب تو نامہ بر دیکھ لینا — مزہ لیں گے ہم دیکھ کر تیری آنکھیں
سب کا توڑ ایک لگاوٹ کی نظر ہوتی ہے — بے وفائی ہو کہ شکوہ کہ ستم کی فریاد
نیا نیا ہے ابھی شوق دلربائی کا — ذرا ذرا سی شکایت پہ روٹھ جاتے ہیں
کچھ رو گئیں تو کچھ مرے رونے پہ ہنس گئیں — گزریں جو اس طرف سے حسینوں کی ٹکڑیاں
تمھارے لئے زندگانی لٹا دی — بہاریں لٹا دیں۔ جوانی لٹا دی

مندرجۂ بالا اشعار اور خصوصاً خط کشیدہ الفاظ ذوق کو سطحیت اور عامیانہ رنگِ تغزل کی غمازی کر رہے ہیں۔
مگر ان تمام باتوں کے باوجود جناب جلیل کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اپنی روانی و سلاست شوخی و رنگینی حُسنِ بیان اور محاورات کی بناء پر نہایت دلنشین ہیں۔ اور شعر کی بیساختگی و صفائی زبان شعر کے حُسنِ صورت میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ مثلاً:

میری وحشت بھی تماشا ہو گئی — جو اِدھر گزرا کھڑا دیکھا کیا،

اس محویت پہ آپ کے قربان لے جلیلؔ | اتنا نہیں خیال کہ کس کا خیال ہے
میری توبہ بھی کوئی توبہ ہے | جب بہار آئی توڑ ڈالی ہے
مجھے تمام زمانے کی آرزو کیوں ہو | بہت ہے میرے لئے ایک آرزو تیری
نہ اشارہ ۔ نہ کنایہ ۔ نہ تبسم ۔ نہ کلام | پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں
پھر شوقِ تماشہ لئے جاتا ہے کسی سمت | پھر ذوقِ طلب مجھ کو تماشہ نہ بنا دے
آج تک دل کی آرزو ہے وہی، | پھول مرجھا گیا ہے بو ہے وہی
زمانے پر ہنسے کوئی کہ روئے | جو ہونا ہے وہ ہوتا جا رہا ہے

جناب جلیلؔ کے یہاں بعض اشعار زبان و بیان کے لحاظ سے بہت سادہ مگر معنویت اور حسنِ مفہوم کے لحاظ سے نہایت بلند ہیں ۔ آپ کا ایک شعر ہے :

آپ اور سوگ مرا کیا کہنا | دیکھئے لب پہ ہنسی آئی ہے

شعر کے طرزِ بیان ۔ اندازِ تخاطب ۔ طنزِ لطیف اور لب و لہجہ نے ملکر ایک ایسا لطف پیدا کیا ہے جس کی تشریح کرنا شعر کے حُسن کو خاک میں ملا دینا ہو اس شعر کے اندازِ بیان میں اس قدر قدرت ہے کہ ایک تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے ۔

دُنیا کی یہ تلخ حقیقت ہے کہ اگر ایک انسان نہ روئے تو دوسرے کو ہنسنے کا موقع نہ ملے ۔ ایک کی ناکامی اور رنج سے دوسرے کو مسرت ہوتی ہے ۔ اس تلخ حقیقت کو جناب جلیلؔ نے تغزل کے رنگ میں سمو کر کس انداز سے پیش کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

اے جلیلؔ آنسو بہائے تم نے کیوں | اُن کو ہنسنے کا بہانہ مل گیا

فراوانیِ شوق اور بیخودی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :

راہِ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا | منزل پہ ہم پہونچکر منزل کو ڈھونڈھتے ہیں

یہ شعر آپ کی وسعتِ نظر اور انسانی نفسیات کے مشاہدہ کی دلیل ہے ۔

اس فلسفہ کو کہ انسان متلون المزاج واقع ہوا ہے ۔ اُس کی فطرت انقلاب پسند ہے اور وہ کبھی ایک حالت سے مطمئن نہیں ہوتا اس رنگ میں بیان کرتے ہیں کہ :

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے | رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

آپ کا ایک شعر ہے :

میرے آنے کی تو بندش ہے مگر | "کیا کریں گے" میں اگر یاد آیا

مصرعہ ثانی کے "کیا کریں گے" میں جو تیور پنہاں ہیں اور محبوب کی مجبوری کی جو تصویر کشی کی ہے وہ نہایت پُر لطف ہو اس قسم کا اندازِ بیان اور اس قسم کا لب و لہجہ لئے ہوئے آپ کے یہاں بہت اشعار ملتے ہیں ۔ مگر غالباً اس سادگیِ بیان کا خیال رکھنے کی وجہ سے یا اور کسی بنا پر آپ کے یہاں بعض جگہ موزوں اور مناسب الفاظ صرف نہیں ہوئے ہیں ۔ مثلاً :

فصلِ گل آئی ۔ جنوں اُچھلا جلیلؔ | اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

جو دن اُچھلا روزمرہ اور محاورے کے خلاف ہے۔

تم نے آکر مزاج پوچھ لیا   اب طبیعت کہاں سلجھتی ہے

"سلجھتی" کی جگہ اگر "ٹھہرتی" نظم کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔

حال باقی نہ رہا کچھ ترے دیوانے میں   اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

معلوم صرف "حال" کہکر کیا مراد لیا ہے۔ اس لفظ سے مصرع اولے میں کوئی خاص مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ اگر اس کو یوں کہتے کہ: "کچھ بھی باقی نہ رہا اب ترے دیوانے میں" تو شاید اُن کا مفہوم کچھ پورا ہو سکتا تھا۔

نسبت سے کہیں مزا کسی پہ ہوتا ہے   مزہ جو اس میں ہے وہ عمر جاوداں میں نہیں

آپ نے لفظ "مزہ" اپنے کلام میں جا و بیجا اس قدر استعمال کیا ہے کہ اس کے صرف کا بھی اب کوئی مزہ نہ رہا۔

"مزہ" کو چھوڑ کر اُس کا ہم معنی لفظ "لطف" بآسانی یوں نظم ہو سکتا کہ "جو لطف اُس میں ہے وہ عمر جاوداں میں نہیں"

بہر حال آپ کے کلام میں ایک بے ساختہ پن۔ ایک روانی اور بے تکلفی ہے جو دلوں پہ اثر کرتی ہے اور آپ کے اشعار میں ایک خلوص ہے جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

۱۲- جگر مراد آبادی

حضرت جگر مراد آبادی، ملک کے غزل گو شعرا میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ آپ حضرات داغ و تسلیم دونوں کے شاگرد رہ چکے ہیں اور آپ کی شروع دور کی شاعری میں ان دونوں کی خصوصیت کلام کا صحیح امتزاج پایا جاتا ہے۔ بعد میں حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کے زیر اثر آپ کی شاعری میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور اب عرصہ سے آپ اپنا ایک علحدہ رنگِ سخن قایم کر چکے ہیں جو دورِ حاضر کے اکثر و بیشتر نوجوان شعرا کے لئے قابلِ تقلید بنا ہوا ہے آپ ملک میں اپنی شاعری اور ترنم کی وجہ سے نہایت مقبول ہو چکے ہیں۔ آپ کے پڑھنے کا والہانہ انداز آپ کے اشعار میں ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے "موسیقی شاعری کی بنیاد ہے" اور جناب جگر کے کلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ترنم ان کی شاعری کا جزو خاص ہے۔ وہ الفاظ کی نشست اور بحروں کے انتخاب میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں کہ شعر یکسر نغمہ اور "فردوس گوش" بنکر دلوں پر اثر کر جائے۔ ان کی تمام غزلوں میں غنائی عنصر نمایاں پایا جاتا ہے۔ جگر ایک فطری شاعر ہیں اور اُن کے واردات قلبی کا آئینہ ہے۔ اُن کی آواز میں سوز۔ اُن کے لہجہ میں درد۔ اُن کے الفاظ میں گداز اور اُن کے اشعار میں ایک کیفیت ہوتی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔

حضرت جگر خالص غزل گو شاعر ہیں۔ مگر اُن کا مشاہدۂ حُسن اور احساسِ عشق اس قدر عمیق ہے کہ اُن کے کلام میں سطحی جذبات کم نظر آتے ہیں۔ "جمالیاتی محرکات کم و بیش دُنیا کی ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ جلوۂ حُسن کی کشش۔ دردِ اشتیاق کی کسک۔ اور آرزو کی ہنگامہ آرائیاں انسانیت کی متاعِ مشترک ہیں" لیکن بہت کم شاعر ایسے ہیں جنھیں یہ ملکہ حاصل ہو کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کی کیفیات کی صحیح تصویر پیش کر سکیں۔ حضرت جگر نے اپنے نفس کے اندرونی تجربات و کیفیات کے علاوہ کسی دوسری چیز کو اپنی شاعری میں بہت کم دخل دیا ہے۔ اسی لئے اُن کی شاعری یکسر ہیجان و اضطراب نظر آتی ہے اور اُن کے کلام میں محاسن کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہیں۔ اُن کی شاعری میں تخیل کا عنصر کم اور جذبات کا زیادہ ہے۔ تاہم جہاں جہاں انھوں نے جذبات پر قابو پاکر اور سنبھلکر کچھ کہا ہے وہ اپنے اندر دلکشی کے علاوہ

ہم کو دعوتِ فکر بھی دیتا ہے اور اُن کی مترنم شاعری کے برخلاف وقتی اثر پیدا نہیں کرتا بلکہ دل کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ جگر کے اس قسم کے اشعار بہت دیرپا اثر رکھتے ہیں اور کبھی نہ بھولنے والی چیزوں میں شامل ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج — دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا — گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

دل کو برباد کرکے بیٹھا ہوں — کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی — وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

الٰہی ترک محبت بھی کیا محبت ہے — بھلاتے ہیں انھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

آ- کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں — جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں،

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے — رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

جنونِ محبت یہاں تک تو پہونچا، — کہ ترک محبت کیا چاہتا ہوں،

اِن اشعار میں مستی و ترنم۔ شوخی و بے ساختگی۔ رندی و سرمستی سب ہی کچھ پایا جاتا ہے اور یہ شعر وہی شخص کہہ سکتا تھا جس کے دل و دماغ عشق و محبت میں رچے ہوئے ہوں۔ وہ نئے نئے موضوع کے ذریعہ سے اپنی شخصیت کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ جیسے:

وہ میری طرف بڑھا دے گلچیں، — جن پھولوں میں رنگ ہے نہ بو ہے

ہر اک صورت۔ ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے — الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے،

میری مستی شوقِ پیہم۔ میری فطرت اضطراب — کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں،

کوئی حسیں۔ حسیں ہی ٹھہرتا نہیں جگر — باز آئے اس بلندیِ ذوقِ نظر سے ہم

غنچۂ نسرین و گل۔ انجم و خورشید و ماہ — یہ بھی مری رہگذر۔ وہ بھی مری گردِ راہ

جناب جگر کے یہاں عجز و فنا دگی نہیں پائی جاتی۔ اُنھوں نے عشق کیا ہے مگر خود داری کو لئے ہوئے۔ اگر وہ حُسن کو رنجیدہ دیکھنا نہیں چاہتے اور اُس کی توہین گوارا نہیں کرتے تو ساتھ ہی ساتھ وہ عشق کی خودی کو بھی صدمہ اور ٹھیس پہونچانا نہیں چاہتے۔ وہ حُسن کے آگے عشق کی عظمتوں کو بہت بلند کرکے دکھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں — آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں

ہو کے رہے گا ہمنوا۔ وہ بھی ترے ہی ساتھ تھا — نغمۂ شوق گائے جا حُسن کی برہمی نہ دیکھ

خطا معاف کسی اور کا تو ذکر ہی کیا — نیاز مند ترے تجھ سے بے نیاز رہے

حُسن آیا تھا خود منانے کو — سو توجہ ہی عشق نے کم کی

مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا — دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

جناب جگر کے یہاں بعض بلند اشعار بھی نظر آتے ہیں:۔ مثلاً

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے جب کوئی آسرا نہیں ہوتا
حدودِ کوچۂ محبوب ہیں وہیں سے شروع جہاں سے پڑنے لگیں، پاؤں ڈگمگائے ہوئے

جناب جگرؔ کی اس لغزشِ مستانہ میں ایک خاص پرکیف عاشقانہ حقیقت پائی جاتی ہے۔

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی

شعر کے دوسرے مصرعہ میں طنز کا بہت لطیف پہلو موجود ہے، اثر کے لحاظ سے نہایت کمل ہے۔ اسی انداز کا ایک اور شعر ہے:

ترکِ اُلفت بہت بجا ناصح لیکن اُس تک اگر یہ بات گئی

یہ شعر جناب جگرؔ کی محاکات نگاری کی اعلیٰ مثال ہے۔ محاکات کی اور عمدہ مثالیں بھی جناب جگرؔ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قدِ بالا۔ وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منھ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

جناب جگرؔ کے مذاقِ عشق کی بلندی ملاحظہ ہو:

وہ بھی ہے اک مقامِ عشق جہاں
ہر تمنا گناہ ہوتی ہے
جو خود نہ زندگی ہو نہ پیغامِ زندگی
وہ حسن قہر ہے وہ محبت عذاب ہے

ان کے یہاں بعض بعض جگہ جوشِ بیان اور ولولہ بھی موجود ہے۔ جیسے:

زمانے کے ہمدوشش و ہمراز کب تک
زمانے کو پیچھے ہٹاتا چلا جا
یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

بعض بعض جگہ جناب جگرؔ نے کائنات و حیات پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت کا پہلو لئے ہوئے گو وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں:

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں زندگی خود ہی عبارت ہے مگر ہوش نہیں

اس قسم کی مثالیں جناب جگرؔ کے کلام میں اور بھی ملتی ہیں جہاں انھوں نے سماج کی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ مگر ہمیں اس مضمون میں صرف اُن کے انتخابِ کلام ہی سے تعلق ہے اور اب تک ہر شاعر کے جتنے اشعار کا بھی اعادہ کیا ہے وہ سب اُن کے اپنے انتخاب ہی میں سے کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب بہت خوب کیا ہے اور اس انتخاب میں اُن اشعار کا پتہ نہیں جن میں اُن کی روحانیت کی بے راہ روی اور بے قاعدگی اعتدال سے تجاوز کر گئی ہے یا جن میں کچھ خامیاں ہیں۔

۱۲۔ جوشؔ ملیح آبادی جناب جوشؔ ملیح آبادی دورِ حاضر کے ایک کامیاب نظم گو شاعر ہیں۔ آپ نے ابتدا میں حضرت عزیزؔ لکھنوی مرحوم سے مشورۂ سخن کیا مگر آپ کی آزاد منشی نے اپنے اوپر اس پابندی کو بھی جائز نہ رکھا اور پھر خود اپنی طبیعت ہی کی رہنمائی میں ترقی کی۔ جوشؔ ایک انقلاب پسند مزاج لیکر دنیا میں آئے تھے اور

یہی سبب ہے کہ انھوں نے دُنیا ئے شاعری میں بھی ایک انقلاب پیدا کیا۔ آپ کی شروع دور کی شاعری کا نمونہ ہمیں آپ کے پہلے مجموعۂ کلام "روحِ ادب" سے ملتا ہے۔ اس مجموعہ میں تقلیدی شاعری تھی جس پر لکھنویت کا رنگ غالب تھا۔ مگر آپ کی انقلاب پسند طبیعت نے اِس رنگِ شاعری کو پسند نہ کیا اور آپ تقلیدی شاعری کے تار و پود کو توڑ کر نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور ان کے مجموعۂ کلام "نقش و نگار" اور "شعلہ و شبنم" شایع ہونے کے بعد ان کے قدر دانوں نے انھیں "شاعرِ انقلاب" کے نام سے یاد کرنا شروع کیا۔

زیر نظر انتخابِ کلام دیکھنے کے بعد ایک شخص بآسانی اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ جوش کی افتادِ طبیعت غزل گوئی کے منافی ہے۔ آپ کی غزلیات میں وہی شکوہِ الفاظ اور تراکیب پائی جاتی ہیں جو آپ کی نظموں کی خصوصیت ہے۔ آپ کی بعض غزلوں میں نظموں کا سا اندازِ بیان اور تسلسل موجود ہے۔ اس کے علاوہ جب ہم اِن اشعار کو دیکھتے ہیں کہ:

للہ الحمد کہ گلزار میں ہنگامِ صبوح	حکمِ آزادیِ مرغانِ گرفتار آیا
خوش ہوا اے گوشِ! کہ جبریلِ ترنم چہکا	مژدہ اے چشم! کہ پیغمبرِ انوار آیا

یا یہ اشعار کہ:

بخشش اس جسمِ پاک جوہر کو	مرگ فرسائی جلالتِ روح
چشمۂ زندگی ہو مدح سرا	ارغوانی شراب ہو ممدوح

تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا ہم کسی قصیدہ کے اشعار کو پڑھ رہے ہوں۔ علاوہ بریں آپ کی غزلیات میں "بایں ہمہ۔ رامش و رنگ۔ ہشیار باش۔ مژدہ اے چشم۔ مست باش۔ تیر از کماں رفتہ۔ مدحِ نمو" وغیرہ وغیرہ خالص فارسی الفاظ و تراکیب کی وہ زیادتی ہے جو غزل کے لب و لہجہ کے لئے بالکل نامانوس ہے۔ اس بیان سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ جناب جوش کی غزلوں میں کوئی اثر نہیں ہے یا وہ غزل نہیں کہہ سکتے بلکہ صرف دکھانا یہ مقصود ہے کہ حضرتِ جوش کی افتادِ طبیعت نظموں کے لئے نہایت موزوں ہے اور سچ یہ ہے کہ آپ موجودہ دور کے نظم گویوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن انکی غزلیں ان کی نظموں کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اور آپ بہ حیثیت ایک غزل گو کامیاب شاعر نہیں کہے جا سکتے۔

شاعرانہ مصوری کی جتنی عمدہ مثالیں ہمیں جناب جوش کے یہاں ملتی ہیں۔ ایسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نادر تشبیہات و نازک استعارات کے جیسے اعلیٰ نمونے ان نظموں میں ملتے ہیں وہ دوسرے کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ "جوش کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے" خلوص اور حق پرستی ان کی فطرتِ ثانیہ ہے اور ہم ان کی نظموں سے ان کی زندگی کے متعلق بہت کافی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کا رجحان طبع غزل کے لئے موزوں نہیں ہے مگر آپ ایک حقیقی شاعر ہیں اور آپ کی غزلیات میں بھی بعض بعض جگہ بہت پرلطف اور پُرکیف اشعار ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی	آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کر دیا
دُنیا نے ہر فسانہ حقیقت بنا دیا	ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا
مٹ چلی تھی خلشِ سجدۂ شوق	پھر ترا نقشِ قدم یاد آیا

کل اُن کے آگے شرحِ تمنا کی آرزو — اتنی بڑھی کہ نطق کو بیکار کر دیا
ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا — جب اُس نے وعدہ کیا۔ ہم نے اعتبار کیا

یہ سب اشعار رنگِ تغزل، اندازِ بیان اور اپنے اثر کے لحاظ سے نہایت پُر کیف ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے حامل۔ مائلِ ترکیب کی ایک عمدہ مثال ملاحظہ ہو:

اِک تم کہ اہلِ دل کی نظر پہ چڑھے ہوئے — اِک میں کہ ہوں خود اپنی نظر سے گرا ہوا۔

ایک حقیقت کو کس قدر سادگی سے ادا کیا ہے اور پھر زورِ بیان ملاحظہ ہو:

جو چاہنا اختیار کرنا — دُنیا پہ نہ اعتبار کرنا

باوجود تقلیدی شاعری سے منحرف ہونے کے جناب جوشؔ کے یہاں اس انتخاب میں بھی (جو انھوں نے خود کیا ہے) کہیں کہیں لکھنوی رنگِ تغزل اور نسائی لہجہ کی جھلک موجود ہے۔ جیسے:

اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار — پھر تو فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا

"اے میں سو جان سے نثار" کے فقرہ میں کس قدر نسائی لہجہ کی جھلک ہے یہ اہلِ ذوق حضرات خود اندازہ لگالیں گے۔

اب سر اُٹھا کہ میں نے شکووں سے ہاتھ اُٹھایا — مرجاؤں گا ستمگر نیچی نہ کر نگاہیں
خنجر ہے جوشؔ ہاتھ میں دامن لہو سے تر — یہ اس کے طور ہیں کہ مسیحا کہیں جسے

مندرجۂ بالا دونوں اشعار لکھنوی رنگِ تغزل کی غمازی کر رہے ہیں۔ اس قسم کے اشعار آپ کے یہاں اور بھی ملتے ہیں۔ مگر جناب جوشؔ اِس رنگِ سخن کو اب قریب قریب ترک کر چکے ہیں اور زیادہ تر آپ کا زورِ سخن اصلاحی نظموں یا نظری مناظر کی عکاسی میں صرف ہوتا ہے۔

(باقی) سید علی سجاد مہر۔ اکبر آبادی۔ بی۔ اے

محمودی رسم خط پر تبصرہ

(مسلسل)

ان تصریحات کے بعد آپ اپنی تجویز پر غور فرمایئے۔ جو مغالطہ یائے مخلوط و ہائے مخلوط میں ہے وہی "واؤ معدولہ" میں ہے، اصل فارسی تلفظ میں خ ہمیشہ ساکن ہوتی ہے اور واؤ متحرک، یہ بات چونکانے والی لیکن حق ہے۔ اس کی بحث کو بخوف طوالت یہاں ترک کرتا ہوں۔

میں نے ان تمام چیزوں پر طول کلام سے اس لئے کام لیا ہے کہ جو غلط باتیں عام طور پر رائج ہوگئی ہیں، ہر شخص کو ان پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہوتی یا کوئی بات ایسی پیدا نہیں ہوتی جس سے توجہ اُن کی طرف جذب ہو، تقلیداً مان لی جاتی ہیں، اور اُن سے کسی نہ کسی قسم کی قباحت لازم آتی ہے، ان کا ازالہ ہو جائے۔ اگر یہ باتیں سمجھ میں آجائیں تو اُردو کا خط صاف، صحیح یا مضبوط بنیادوں پر قایم اور حشو و زواید سے پاک ہو جائے۔ خط زیرِ نظر ہی میں سے متعدد حروف کم ہو جائیں گے، سلسلۂ حرکات کی تکمیل ہو سکیگی اور محذوفات پر نظر ثانی کرنے کا موجد صاحب کو موقع ملیگا۔ جن چیزوں کا میں نے بطلان کیا یہ بڑی پُرانی اور کھٹکتی ہوئی ہیں ہائے مخلوط ہی سے ابجد اور طریق تشکیل پر کتنا غلط اثر پڑا ہے۔

تخفیف حروف - اس میں میں محمود علی خاں صاحب سے ساز کرکے آپ سے جنگ کرنے پر کمربستہ ہوں۔ معاف فرمایئے یہ ایک سطحی خیال ہے کہ وہ حروف جن کو آپ چھانٹنا چاہتے ہیں فاضل ہیں اور مکررات کا حکم رکھتے ہیں اور آسانی سے ترک کئے جاسکتے ہیں۔ اگر پہلی بات مان بھی لی جائے تو دوسری کسی طرح صحیح نہیں۔ فارسی نے عربی سے اور اُردو نے فارسی سے پوری ابجد لینے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی جس کا ازالہ ضروری ہو۔ اگر دونوں نے صرف خط کی نقل کی ہوتی تو فارسی میں خاص عربی آوازوں کے حروف اور اُردو میں یہ حروف اور ایک خاص فارسی آواز کا حرف دونوں یقیناً منتقل نہ ہوتے۔ صرف مشترک آوازوں کے حروف اخذ کئے جاتے۔ لیکن جب خط کے ساتھ منجملہ ہزاروں الفاظ کے حروف زیر بحث والے الفاظ بھی کثرت سے لئے گئے تو ان کا لینا ناگزیر ہوا۔ زبان ان کی آوازیں ادا کرنے سے قاصر تھی لیکن قلم مجبور نہیں تھا۔ دونوں میں سے ایک چیز نہ لی گئی ہوتی تو کوئی دشواری نہ تھی۔ ان حروف کی آوازیں اول ہی سے ہمارے مجموعۂ اصوات میں شامل ہیں اور یہ سمجھنا سخت غلطی ہو کہ مثلاً ث اور ص کی وہی آوازیں ہیں جو س کی، لہٰذا س کو رکھکر ان کو ترک کیا جاسکتا ہے۔ ایسا ہوتا تو ان کا بجائے یکدیگر استعمال کرنا جایز ہوتا، لیکن اسی بنا پر کہ ان کی آوازیں مختلف ہیں یہ بات آج تک کبھی روا نہیں رکھی گئی اور زِنا، رزاقی مسالہ وغیرہ کی نوزائیدہ جدتیں جن پر بعض ثقات نے بھی مہر جواز لگا دی ہے، طفلانہ اغلاط سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ تعمد و اختیار کی وجہ سے ان سے زیادہ معیوب ہیں۔ لفظ سـنہ کی کتابت کے معاملے میں اسی مارچ کے نگار میں ایک

مجوب الاسم صاحب نے تجربے کے سنِ مبعوث کی کمزور رسّی کا سہارا پکڑا ہے۔ یہ ترکیب املا و انشا دونوں کے اعتبار سے لائقِ عبرت تھی نہ کہ قابلِ استناد و تقلید۔ ایک توسن بہ ترکیب فارسی، دوسرے موصوف بہ مبعوث! مبعوث احمد تھے کہ سن تھا۔ یہ مثال وہ ہو کہ جہاں قلم کو تسہیل پسند زبان کے آگے سے سرِ اطاعت اُٹھا کر سیدھا آسمان کے رُخ کر دینا چاہیئے۔ طبیعت کو طبیٔت بولتے ہیں تو کیا اس کی کتابت بھی بلا عین جائز ہوگی اور اس کو نظم میں بھی بہ اضافت یا بلا اضافت اسی طرح باندھیں گے؟ اسی طرح شروع، طلوع رجوع، صحیح کے متعلق کیا مذہب اختیار کیا جائے گا؟ جو حرف لفظ کے جوہر میں داخل ہے وہ بلا صرفی یا نحوی قاعدے کے حذف نہیں ہو سکتا۔

اگر، جیسا کہ آپ اور کثیر التعداد دوسرے اصحاب چاہتے ہیں، حروفِ زیرِ بحث کو اُردو سے خارج کر دیا جائے تو ان سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ جب آپ کے ملک میں اُردو، فارسی، عربی تینوں پہلو بہ پہلو پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں تو متعلقہ الفاظ کے دو دو رسم الخط سیکھنے پڑیں گے اور نماز بخشوانے کو جانے سے روزے بھی گلے پڑ جائیں گے۔ آپ کی دو سطروں میں آئے ہوئے الفاظ کے صرف جدید رسم الخط۔ نقس (نقص)۔ سرف (صرف)۔ سُورت (صورت)۔ خت (خط)۔ سوتی (صوتی) اُسول (اُصول)۔ ہُرُوف (حروف) سے کسی طرح کام نہ چلے گا اور موجودہ صورت کی احتیاج بدستور باقی رہے گی۔ مطلوبہ اصلاح کی صرف یہ صورتیں ہیں کہ یا تو ہندوستان کی فارسی و عربی کا رسم الخط بھی بدلا جائے، یا ان کے مطلوبۃ الاصلاح الفاظ اُردو سے چُن کر نکال دئے جائیں، یا اُردو کا خط بدل جائے۔ اتحادِ خط و اشتراکِ لغات کے ساتھ اتحادِ رسم ناگزیر ہے۔ تبدیلِ رسم سے اہلِ لغت اور آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے جو مشکلات پیدا ہوں گی اور جن کی طرف محمود علی خاں صاحب اشارہ کر چکے ہیں، ان کا تصور آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

خط زبان کا ترجمان ضرور ہے لیکن اس کا رسم اس کے تلون کا تابع نہیں۔ اس کی چال شطرنج کے پیادے کی طرح یک رُخی ہے۔ زبان اُلٹی سیدھی سب طرح چلتی ہے۔ ہر زبان میں مقامی اختلافات ہوتے ہیں، اور اگر کوئی زبان وسیع الحدود ہے تو اس میں یہ اختلافات اور بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ خط میں ان سب کی رعایت نہیں ہو سکتی، اس کی بنا ایک محدود قطعۂ ملک کی زبان پر ہوتی ہے اور اس کے بھی ایک محدود طبقے کی زبان پر۔ مخصوص حروف و الفاظ کو کوئی کسی طرح بولے، لیکن لکھنے میں سب اُسی معیار کی پابندی کرتے ہیں جو ایک دفعہ مقرر ہو چکا ہے۔ اس کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔ خود عربی میں بہتیرے الفاظ میں جیم اور قاف کی جگہ ایک اجنبی آواز گاف نے لے لی ہے لیکن اس لفظی تغیر کا کتابت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اسی طرح نہ ان اختلافات کا کوئی اثر پڑا ہے جو مختلف عربی بولنے والے ممالک میں از یکدیگر موجود ہیں۔ تو کیا یہ اتحاد عرب سے صرف اقصائے مغرب ہی کی طرف وسعت پذیر ہو سکتا ہے، مشرق کی طرف ایران و افغانستان و ہندوستان تک نہیں پھیل سکتا۔ ہم کو اس قدر تنگ نظری سے اس مسئلے پر غور نہیں کرنا چاہیئے۔ جن عربی حروف کو آپ اُردو میں دیکھنا نہیں چاہتے ان کو نکال کر بھی آپ اندرون ملک کے لئے ایک معیار قایم نہیں کر سکیں گے۔ زیادہ دقیقہ سنجی سے کام لیا جائے تو آپ کو ژ۔ خ۔ غ۔ ف کو بھی جن کو آپ رکھنا چاہتے ہیں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا اور ق وادیِ گنگا میں رہے تو رہے، پنجاب اور دکن کی ابجد سے تو آپ کو خارج کرنا پڑے گا۔ اگر آپ چاہیں کہ وہ صوتی طریق پر اُردو کو لکھیں تو آپ کو قلم، کلم، اور خلم کی تینوں صورتیں جائز کرنی پڑیں گی۔ باقی کو قیاس کیجئے! اس اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ سے زبان کا کیا حشر ہوگا اور کون کس کی بات سمجھ سکے گا؟ ہندوستان کی نسبت سے

اہل پنجاب و دکن کے لئے جو حیثیت قلم کی ہو گیا وہی حیثیت نقش، صورت، حروف کی کل اہلِ ہند کے لئے عرب کی نسبت سے نہیں ہو سکتی۔ اگر لاہور و پشاور کو حیدر آباد کے ساتھ اتحاد رسم کی ضرورت ہے تو کابل کے ساتھ بھی اس سے کم نہیں ہے۔

طریق الصوت کو جماعیت پر محدود کرنے کی بھی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ہر شخص کو آزادی ہونی چاہئے کہ الفاظ کو جس طرح وہ بولتا ہے اسی طرح لکھے، حتیٰ کہ تتلے کی نوک زبان و نوک قلم میں بھی ہم آہنگی ہو۔ غرضکہ ایک متفقہ معیار سے چارہ نہیں اور ہمارے موجودہ معیار میں گوناگوں داخلی و خارجی فوائد مضمر ہیں۔ اس کو چھوڑنے سے علاوہ ان مشکلات کے جن کا اشارہ کیا گیا متقارب زبانوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہو جائے گی اور ان میں اجنبیت بڑھ جائے گی۔ مشترکہ مواد کی وجہ سے جو سہولت ایک کو دوسرے کی زبان سیکھنے کی اسوقت ہے وہ مفقود ہو جائے گی۔ زمانہ غیر ضروری اختلافات کو مٹانے کا ہے، بڑھانے کا نہیں۔ حدود ہند کے اندر سندھی اور پشتو نسخ میں لکھی جاتی ہیں، لہٰذا سمجھنا چاہئے کہ وہ اُردو کی ہم خط ہیں۔ مشترکہ آوازوں کے حروف میں پشتو اور اُردو کے درمیان چند حروف میں تھوڑا سا فرق ہے اور سندھی اور اُردو میں بہت زیادہ۔ اس فرق کی وجہ سے تینوں میں بُعد ہو گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ضرورت ہے کہ ان کے بھی اس باہمی فرق کو مٹا دیا جائے اور فرق صرف اُنھیں چیزوں میں رہے جو ہر ایک کے ساتھ خاص ہیں۔ حرکات کے ترک نے اس بُعد کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ آدمی حرفوں کو دیکھتا ہے لیکن پڑھ نہیں سکتا، حالانکہ اگر پڑھ سکے تو سندھی کا ٹوٹا پھوٹا مطلب نکال ہی سکتا ہے۔ میں نے "ترکی بول چال" منگائی۔ الفاظ اور جملے اُردو و ترکی کے بالمقابل لکھے ہوئے ہیں لیکن حرکتیں دونوں میں ندارد۔ پڑھنے سے مجبور۔ کتاب نہ میرے کام کی نہ ترک کے۔ "تمام عرقی" معلوم کرنا ہوتی ہے؟ - ان مثالوں سے مدعا یہ ہے کہ ہم خط زبانوں میں رشتۂ اتحاد و ارتباط کے بڑھانے کی ضرورت ہے نہ کہ کم کرنے کی۔

بعض لوگ یورپ کی مثال کو مد نظر رکھ کر اردو فارسی و عربی کے رسم کے مختلف ہونے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ لیکن یورپ کی مثال قابل تقلید ہونے کے بجائے قابل اجتناب ہے۔ ان کا خط اگر ایک نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس سے دھوکا ہوتا ہے اور ایک ایک چیز کے متعدد استعمالات یاد رکھنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ ظاہری اتحاد میں وہ تفریق ہے کہ خدا کی پناہ۔ ایک زبان کا جاننے والا دوسری کو پڑھنا چاہے تو اس پر لازم ہے کہ قاعدہ از سر نو پڑھے، اور تیسری کو سیکھنا چاہے تو پھر بچہ بنے۔ انگریزی کے قیاس پر دوسری فرنگی زبانوں کے کثیر التعداد الفاظ اپنے رسم الخط میں لکھے ہوئے روزمرہ اس قدر غلط پڑھنے میں آتے ہیں کہ اصلی تلفظ سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ تو وہ انگریزی یا رومن رسم الخط کے مطابق تو لکھے جاتے اور اسکے قیاس پر صحیح پڑھ لئے جاتے۔

میں اس بات کو تکرار کہنا چاہتا ہوں کہ حروف غ۔ ح۔ ذ۔ ژ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ ابجد میں ث۔ ہ۔ ژ۔ ا۔ کی آوازوں کے لئے نہیں رکھے گئے ہیں اور یہ اُن کی جگہ نہیں لے سکتے۔ وہ اپنی اصلی آوازوں کے نمائندے ہیں اور وہ آوازیں ابتدا سے ہمارے مجموعۂ اصوات میں شامل ہیں۔ ان کی حیثیت سب کے نزدیک وہی ہے جو اہل پنجاب و دکن اور صوبجات متحدہ کے عوام کے نزدیک قؔ کی ہے۔

حروف مذکورۂ بالا پر تو خیر سب کا اتفاق ہے، لیکن آپ کو یہ چؔ اور ڑؔ سے کیوں چڑ ہوئی؟ اور ان کا کام آپ کونسے حروف سے لیں گے؟ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ خدا کرے میرے سہو کی بدگمانی غلط نہ ہو۔ ہ کی بجائے حؔ

رکھنے کی علت تو میں نے قیاس کر لی لیکن آپ کی کفایت شعاری سے وہی یورپی زبانوں والی خرابی پیدا ہوتی ہے جو نہایت تکلیف دہ ہے۔

اگر تخفیف سے آپ کا مقصد در اصل اختصار کتابت ہی ہے تو اتنی کھینچا تانی سے صرف ص اور ط کی دو صورتوں کا فایدہ ہوگا، باقی حروف کے ہمشکل ابجد میں موجود ہیں۔ اردو سے زیادہ اختصار کس خط میں مل سکتا ہے؟ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ اردو میں کل کتنے حروف ہیں کیونکہ ثقہ شمار کنندوں کی بتائی ہوئی تعداد میں تیس اور سو کے درمیان بہت سی ہیں اور ان میں "عادِ اعظم" حضرتِ انشا ہیں جنھوں نے دس کی رعایت کر کے پچانوے کو نصاب قرار دیا ہے اور میں ان میں سے کسی کے مقابل نہیں آنا چاہتا، لیکن یہ دیکھتا ہوں کہ بنیادی حروف وہ اٹھارہ ہیں جن کی کبھی تختی پر مشق کی تھی، اور اگر ں اور ہ اور ی کی دوسری صورتوں کو شامل کر لیا جائے تو اکیس۔ ترکیب میں بھی تعداد اسی کے لگ بھگ رہتی ہے۔ اس سے زیادہ اختصار اور کیا چاہیئے۔ خط رقومی میں ں، و، ہ، ی کی اتنی صورتیں ان کے مختلف استعمالات کے لحاظ سے غلط شامل کی گئی ہیں جیسا کہ اوپر کی بحثوں سے ظاہر ہے کہ بلا امتیاز استعمال دوسری صورت رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ نون غنہ کی کتابت کا موجودہ طریقہ جس کو آپ پسند کرتے ہیں یکسانی اور حسن خط دونوں کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہے۔ وسطی اور اخیر و منفصل میں دو رنگی کیوں رہے۔ نون منقوط و غیر منقوط کو پاس پاس لکھ کر حسن کا مقابلہ کیجیے۔ تیسری خرابی وضع سے انحراف ہے۔ ہر جگہ نقطہ اور الٹا جزم یہی بہترین صورت ہے۔

خط رقومی اور ان امور کی بحث جو جناب موجد کے مقالے اور آپ کے ملاحظات سے پیدا ہوتی ہیں، ختم ہو گئی۔ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ ہم موجودہ خط کو رقومی سے بہتر صورت میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اب میں وہ صورت بتاتا ہوں۔ حیدرآباد میں جو ٹائپ بنایا گیا تھا اور جس کو ناکامیاب فرض کر کے آپ نے رقومی کی حمایت کی ہے اس میں حرفوں کے ترکیبی تغیرات کو قایم رکھنے کی وجہ سے ایک ایک حرف کی متعدد صورتیں بنانی پڑیں اور تعداد حروف و مرکبات غیر معمولی طور پر زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ نمونوں کا جو کتابچہ شایع کیا گیا تھا اس میں لکھا ہے کہ نستعلیق میں ان کی کل تعداد ۵۹۴ ہے جن میں ۴۵۷ مفرد، ۱۰۲ مرکب اور ۳۵ زوائد ہیں۔ اگرچہ ۱۰۲ مرکبات صرف خوبصورتی کے لئے ہیں، ورنہ مفردات سے بخوبی بن سکتے ہیں۔ مجموعی ۵۹۴ میں کثیر الاستعمال تقریباً ۲۱۶ ہیں۔ نسخ فاؤنٹ میں کل ۳۲۶ حرف ہیں جن میں مفردات ۱۸۰، مرکبات ۱۱۳ اور زوائد ۳۳ ہیں۔ اس میں بھی مرکبات مفردات سے بہ آسانی بن سکتے ہیں۔ کثیر الاستعمال تقریباً ۱۱۲ ہیں۔

اعداد کا اتنا بڑا فرق صاف بتاتا ہے کہ نسخ میں قیمت و کلفت نسبتاً بہت کم ہے۔ بنا بریں بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ ٹائپ کے لئے اسی خط کو کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ بالفرض اگر نسخ کی قیمت و محنت بھی برداشت سے زیادہ ہے تو ان کی تخفیف کی بہترین صورت میری رائے میں مفصلۂ ذیل کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہاں آکر نسخ و نستعلیق میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ پھر بھی نسخ میں فصاحت زیادہ ہے۔

لکھنا بدیہی طور پر جدا جدا حروف کو الٹا لا میں پاس پاس چنتا ہے اور اس عمل کے لئے ان کا ملانا لازم نہیں۔ نسخ و نستعلیق کی ایجاد کے وقت اگر ٹائپ کی مشین اور ٹائپ رائٹر موجود ہوتے تو کتابوں کے لئے بہترین آلہ ہوتے اور انکے ذریعے حروف کی وہ مختصر صورتیں ترتیب دی جاتیں جو ذیل میں بشمول مکرر صورتوں کے ہر ایک کے نیچے دکھائی گئی ہیں:-

ا - ر - ط - و - ھ البتہ بلا تغیر سالم رہتے۔

ب ج د س ش ص ع ف ق ک ل م ن ہ ی ے۔ (آخری تینوں مفرد ہیں)

ب ج (صرف نستعلیق میں) ۳ (بلا نقطہ) ۴ ۶ ف ق ک ل م ز ے یہ یہ

اور یہی مختصر صورتیں فی الجملہ اصلی خط ہیں کیونکہ دائرے اور کششیں جیسا کہ اوپر لکھا گیا ختم لفظ کی علامتیں ہیں۔ لیکن اُس وقت اکیلا قلم ذریعۂ کتابت تھا (اور آج بھی غالب ذریعہ وہی ہے) اس لئے کتابوں اور ضروریات روزمرہ کا خط یکساں رہا۔ مندرجۂ بالا اصل واساسی صورتوں کو بجنسہ اور منفصل طور پر ترتیب دینے میں وقت مقابلۃً بہت زیادہ درکار ہوتا۔ اس لئے ان کا ملا دینا ناگزیر ہوا تاکہ بلا قلم اُٹھائے مسلسل و زود تر لکھا جاسکے۔ ملانے میں حروف سابق ولاحق اور حُسنِ خط دونوں کی رعایت سے ان کے اوائل و اواخر میں مقدار اور خفا و جلا اور جہت کے اعتبار سے فرق پڑگیا۔ تو ٹائپ بنانے کے لئے جو صورتیں اُس وقت اختیار کی جاتیں وہ اب کیوں نہ اختیار کرلی جائیں اور اعتبارات مذکورہ کو نظرانداز نہ کردیا جائے۔ ہر ترکیبی حرف کی چونکہ ایک ہی صورت ہوگی، ہمیں اختیار ہے کہ اگر باقی قلمی صورتوں میں کوئی زیادہ خوبصورت یا سہل ہے تو اس کو اختیار کرلیں مثلاً میری رائے میں ج ۳ ۴ ۶ ق کو یوں جـ ـ صـ عـ قـ کردیا جائے تو شاید زیادہ اچھا ہوگا، کیونکہ مجھ کو وہ اضمام کا سا اشارہ کرتی اور ناآمیز سی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں انتظار و تسلسل کی سی شان پائی جاتی ہیں (حالانکہ ج اور ۶۔ ج م۔ ی۔ ھ کے ساتھ ترکیب بھی پاتی ہیں) اور ۳، ۴، ق، ترکیب میں یہ رخ کہیں اختیار نہیں کرتے۔ اتصال تام کی پابندی نہ ضروری ہے نہ پورے طور پر ہوسکے گی۔ حروف کے آخری سرے موٹے رکھنے سے، جیسا کہ میں نے مشورۃً کہا ہے اتصال ان مقامات پر بدنما ہوگا جہاں اب سرا باریک رہتا ہے۔ مثلاً جـ بـ ـ اگر سرا باریک رکھا جائے تو اس کے برعکس صورت ہوگی۔ لیکن قلمی خط سے زیادہ سے زیادہ اتحاد قایم رکھنے اور اجنبیت کو دور رکھنے کی غرض سے جہاں تک ممکن ہو اتصال بہتر ہوگا۔ تنظیم و ترصیف یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حروف ایک سیدھ میں رہیں اور یہ بھی کہ قلمی خط کے لگ بھگ رکھے جائیں ثانی الذکر کی ترجیح ظاہر ہے۔ لیکن اس بات کا مدار سہولت عمل پر ہے۔

زیادہ وضاحت کے لئے بـ کی اس بـ صورت کی بجائے یہ اور مـ کی بجائے مـ کے ھ بہتر ہوگی۔

نیچے نثر و نظم کے کچھ نمونے اُسی کتابچے سے لیکر مذکورۂ بالا طرز پر لکھتا ہوں جو حیدر آباد سے شایع ہوا تھا۔ اور اب چونکہ صحیح تشکیل کے راستے سے خس و خاشاک صاف ہوچکے ہیں، حرکات و سکنات اپنے مجوزہ طریق پر لگاتا ہوں، اگرچہ ان نمونوں میں سب اشارات نہیں آسکتے۔ نظم میں مد و قصر کے اشارے دئے گئے ہیں جو اس کی صحت قرأت کی ضمانت ہیں۔ جمع یا ضرب کا نشان حرف کے نیچے یا اوپر اس کے حذف فی القراءت کا اشارہ ہے۔

دَکَن کے رَفِیعُ الْمَنْزِلَت وَ بَیدار مَغْز فَرمانرَوا

اَعْلیٰحَضرت سُلطانُ الْعُلُوم نَوّاب مِیر عُثمان عَلی

خَاںْ بَہَادُرْ. خَلَّدَ اَللّٰہُ مُلْکَہٗ وَ سَلْطَنَتَہٗ کی عَدِیمُ اَلنَّظِیرْ عِلْمْ پَرْوَرِی اَوْرْ بے شُمَارْ بَرَکَاتْ مِیںْ سے ایکْ بَرَکَتْ یِہْ بھِی ہَے

یہ اصل خط ہے جس میں نہ جدت ہے نہ تصرف نہ تحریف نہ زیادت۔ طریق تشکیل میں البتہ ایجاد بندہ کو دخل ہے، اس میں بھی کوئی جدید علامت سوا علامتِ حذف لفظی کے استعمال نہیں کی گئی، وہ بھی اس وجہ سے کہ اس کے لئے کوئی علامت پہلے سے موجود نہیں تھی صرف ہمزۂ وصل کے لئے وصلہ (صہ) یعنی سر صاد تھا اور باقی محذوفات کے لئے ان کا خالی ہونا اشارہ تھا۔ مجھ کو اس سے زیادہ مختصر اشارہ نہیں مل سکا۔ ناظرین دیکھیں گے کہ یہ طریقہ وضع خط کے عین مطابق اور صحت تلفظ کا پورے طور پر ضامن ہے۔ ایسی صحت کے بغیر اُردو خط اور اُردو زبان مقبول عام نہیں ہو سکتے۔ مکمل ہونے میں بھی کوئی مروجہ رسم الخط اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن مقالۂ ہٰذا میں اس کا تمام و کمال دینا ممکن نہیں۔

محمد شریف خاں شروانی - ایم - اے

حفیظ جالندھری

جب ۱۹۲۵ء میں حفیظ جالندھری کا پہلا مجموعہ "نغمہ زار" کے نام سے شایع ہوا تو اکبر الہ آبادی۔ چکبست لکھنوی اور اقبال کا کلام ملک بھر میں مشہور ہو چکا تھا اس وقت اکبر اور چکبست کے کلام اپنا نیا پن کھو چکے تھے یا کھو رہے تھے۔ اقبال کے کلام کا زور اور غلغلہ بڑھ رہا تھا اور جوش ملیح آبادی کے کلام کی دھوم بندھ رہی تھی۔ اختر شیرانی کی رومانی نظمیں دلوں میں چٹکیاں لینے لگی تھیں۔ پنجاب میں تلوک چند محروم کو جو کچھ کہنا تھا قریب قریب کہہ چکے تھے۔ اور وہ ایک خاص شہرت کے مالک ہو چکے تھے۔ ہمارے صوبہ میں جوش کو چھوڑ کر اس وقت جو جو شعرا بلند مقامات پر پہونچ چکے تھے وہ سب کے سب غزل گو تھے یعنی حسرت موہانی، فانی بدایونی، یگانہ، اصغر اور جگر۔ ان کے علاوہ جن دس بارہ دوسرے شاعروں نے شہرت حاصل کی ان سب کا نام اور کام ۱۹۳۵ء سے ادھر کی چیزیں ہیں۔

۱۹۲۵ء سے اب تک یعنی اس سولہ برس کے اندر حفیظ جالندھری نے لگاتار اپنے کلام کے مجموعے ملک کے سامنے پیش کئے۔ "نغمہ زار" "سوز و ساز" "شاہنامہ اسلام" پہلی جلد، دوسری جلد، تیسری جلد اور مختلف رسالوں میں نئی غزلیں اور نئی نظمیں۔ حفیظ کے متعلق یہ کہنا تو بہت آسان ہے، کہ وہ اکبر اور چکبست کے دور کے بعد کے شاعر ہیں۔ لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ گزشتہ پندرہ برسوں کے مشہور شعرا کے کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا بہ حیثیت مجموعی کون شعراء اُن سے متعلق ہیں یا نمایاں طور پر اُن سے متاثر ہیں۔ بات جو کچھ بھی ہو لیکن حفیظ کی بہت سی نظمیں ملک میں اس قدر مقبول ہو چکی ہیں۔ زبانوں پر اتنی چڑھی ہوئی ہیں۔ کانوں اور دلوں میں اس طرح گونج چکی ہیں کہ حفیظ کو اس دور کی شاعری سے غیر متعلق ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس دور سے اُن کا جیتا جاگتا تعلق ماننا پڑتا ہے

حفیظ کی شاعری نے جن خوبیوں کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا۔ ان میں سب سے نمایاں خوبی ان کی نظموں کا سنگیت یا ترنم تھا۔ یہ چیز اکبر، چکبست۔ اقبال اور جوش ملیح آبادی یا حفیظ سے پہلے کسی شاعر کے یہاں اس رنگ اور اس شکل میں نہیں ملتی۔ موسیقی اور شاعری، گیت اور نظم، ترانہ اور ادب کا ایسا میل پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اگرچہ حفیظ کے بعد کچھ لوگوں نے گیت اور نظم سنگیت اور شاعری کو ایک کرنا چاہا اور ایک حد تک وہ لوگ کامیاب بھی ہوئے لیکن وہ حلاوت وہ سُریلا پن دوسرے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" میں حفیظ کے اس قسم کے کارنامے کئی ہیں۔ کچھ ٹکڑے سنئے:۔

جاگ سوزِ عشق جاگ   جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ کام دیوتا   فتنہ ہائے نو جگا

بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

ایک دوسری نظم "کرشن بنسری" کا صرف ایک ٹکڑا سنئے۔

بنسری بجائے جا:۔

کانھ مُرلی والے نند کے لال بنسری بجائے جا۔ بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا سُنائے جا ۔ سُنائے جا
کانھ مُرلی والے نند کے لال بنسری بجائے جا ۔ بنسری بجائے جا

شاعر نے اِن نظموں کو موزوں کرنے میں اِن کو رچنے، نکھارنے اور سنوارنے میں ظاہر ہے کہ حالی، آزاد، اکبر، چکبست، درگا سہائے سرور، اقبال، بلکہ انیس اور نظیر اکبر آبادی تک کسی نظم گو یا غزل گو شاعر سے اثر نہیں لیا ہے۔ ایسی شاعری، گیت سے ایسی ملتی جلتی ہوئی نظمیں پنجاب میں اس لئے پیدا ہوئیں کہ پنجاب کا صوبہ پرست ہوتے ہوئے بھی اُردو زدہ نہیں تھا۔ جو صوبہ ناسخ کو پیدا کر سکتا ہے۔ (اگرچہ ناسخ آئے لاہور سے تھے) وہ صوبہ آسمان کے تارے توڑ لا سکتا ہے۔ انیس، چکبست، نظیر اکبر آبادی اور جوش ملیح آبادی کو بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اقبال۔ تلوک چند محروم اور حفیظ جالندھری کو پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ کیا ہے، اس پر آپ غور کریں۔ میں تو صرف اتنا کہہ کر چپ ہو جاؤں گا کہ ہمارے صوبہ کو یا کم سے کم لکھنؤ کو اہلِ زبان ہونے کی بسا اوقات مہنگی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اہلِ پنجاب کی مادری زبان پنجابی ہے۔ اسی سے خواہ وہ غزل میں چمک نہ سکے ہوں لیکن اُن کی نظموں سے تصنع اور تکلف کی بو نہیں آتی۔ پنجاب والے ہندوستانی زبان سے زیادہ قریب ہیں۔ ہم ہندوستانی کہلاتے ہیں اور وہ پنجابی۔ لیکن ہماری زبان میں شاعری کرنے میں وہ ہم سے زیادہ ہندوستانی ہیں۔ وہ کیا داغ تک بلکہ غالب تک کو اس معاملہ میں زیادہ ہندوستانی ماننا پڑتا ہے۔ دلوں میں چٹکیاں لینے والی بھی ہندوستانیت حفیظ جالندھری کی کئی نظموں میں نکھر آئی ہے۔ لیکن اپنے گیتوں میں اور ترانوں میں حفیظ جالندھری پنجاب اور مغربی اور مشرقی یوپی کے کئی شعراء سے متمایز اور ممتاز ہیں اس لئے کہ دوسرے شعرا نے گیت لکھنے کی بالارادہ کوشش کی وہ گیت کی اسپرٹ میں ڈوب نہیں سکے۔ وہ ہندی گیت کی سادگی میں ہندی گیت کا ٹھوس پن نہیں لا سکے اسی سے اُن کے گیت پھسپھسے۔ بے مغز۔ پھیکے ہلکے اور کمزور رہے۔ برعکس اسکے حفیظ جالندھری کے گیتوں اور ترانوں کے مصرعے اور ٹکڑے پُر مغز، بھرپور اور بامعنی ہوتے ہیں۔ رومانی۔ منظریہ اور ہر طرح کے گیتوں میں حفیظ جالندھری نے سہل ممتنع کی بے لاگ مثالیں دی ہیں۔ کوئی ایسی نظموں کے لکھنے کی کوشش کرے تو معلوم ہو۔ ہمارے صوبہ سے اسپرٹ کے لحاظ سے پنجاب کا صوبہ وہی تعلق رکھتا ہے جو انگلستان سے امریکہ رکھتا ہے۔ یا زیادہ عمر سے جوانی کو جو تعلق ہے۔ حفیظ کے الفاظ میں صرف حفیظ ہی نہیں بلکہ پورا پنجاب ہم سے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ:۔

ابھی تو میں جوان ہوں

آواز کی یہ طیاری، یہ اُبلتی ہوئی جوانی، یہ بے تکلف اور بے لاگ رچاؤ اور نکھار، یہ شوخ اور چٹیلی رنگینی، یہ دھن، یہ سُریلا پن، یہ رنگ یہ رس، یہ کسک اور یہ انگڑائیاں، ہم کو آج تک کسی اُردو شاعری میں اور کہیں نہیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہو کہ مصرعے اور اشعار کہے نہیں گئے ہیں بلکہ چھلک پڑے ہیں۔ حفیظ کی منظر نگاری خاص توجہ کی مستحق ہے۔ موسیقی اور صوری نغمیت اور چیتر کاری کا جو میل حفیظ کی منظریہ نظموں میں ہمیں ملتا ہے وہ کم سے کم مجھے تو اور کہیں نہیں ملا۔ یہ نئے اور چھلکیلے مناظر کے احساس میں یہ اُبھار، یہ کسک اور معانی رنگ خاص چیزیں ہیں۔

لیکن حفیظ نے کہیں کہیں مصلحانہ یا مفکرانہ یا واعظانہ باتیں بھی کہی ہیں۔ کچھ مسائل کی پیچیدگی نے اُن کے خیال اور اُنکی شاعری میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً " رقاصہ" نامی نظم میں وہ پہلے رقاصہ کی اداؤں سے للچائے ہیں پھر خود پیدا در رقاصہ پرستیں بھی ہیں اور نہ جانے کیا سوچ کر یہ لکھ دیا ہے کہ اسلامی حکومت کے عہدِ زرّیں میں یا تو رقاصہ نہیں تھیں۔ یا رقاصہ لی بی بالکل نہیں وہ غیر مشرقی بھی بتاتے ہیں۔ رقاصہ عورتوں میں نہیں تھیں۔ تاریخ۔ الف لیلیٰ۔ روایتیں اور واقعات سب حفیظ کے اس بیان کے خلاف ہیں۔

حفیظ کی غزلوں میں بھی یہی مچلتی ہوئی اور اُبھرتی ہوئی جوانی نظر آتی ہے۔ جس میں البیلے پن کے ساتھ وہ ملاوٹ اور معصومی ہے، وہ متوازن الھڑپن ہے، وہ جذباتی کیفیتیں ہیں وہ تیور اور مردانہ وار انداز ہیں جو ہمیں عموماً اور شعرا کے یہاں نہیں ملتے۔ چند اشعار سنئے:

اے دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی سنتا جا شرماتا جا

یہ دُکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا۔ دامن بھی پھیلاتا جا

دونوں سنگ راہِ طلب ہیں، راہنما بھی، منزل بھی
ذوقِ طلب ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے، چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دُھن میں گاتا جا

ایک دوسری غزل کے چند اشعار سنئے:-

ناکامیِ عشق یا کامیابی،
دونوں کا حاصل - خانہ خرابی

دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا،
دیوانہ ہو جا - بن جا شرابی

اُن کا بہانہ برجستہ گوئی
اپنا تبسّم حاضر جوابی

چند اور اشعار سنئے:-

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
میرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھکو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

اہلِ زباں تو ہیں بہت - کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

جہاں تک " شاہ نامۂ اسلام" کا تعلق ہے۔ مجھے اور شاید بہتوں کو حفیظ کی شاعری کے اس خاص رنگ اور رجا

انداز سے "شاہ نامۂ اسلام" بالکل بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی اُسے بے اختیار ہو کر سراہنے پر تلا ہوا ہو تو وہ اُسے جھوم جھوم کر پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر حفیظ کی دوسری شاعری کے مقابلہ میں "شاہ نامہ اسلام" کسی کو پسند نہ آئے تو وہ یہ سمجھ لے کہ ملٹن نے "فردوس گم شدہ" (Paradise lost) لکھنے کے بعد کئی ایسی چیزیں لکھیں جن میں شعریت سے زیادہ نثریت ہے۔ ایک فطری شاعر کی زندگی میں کبھی کبھی نثریت کا دور بھی آجاتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہ نامۂ اسلام لکھنے میں شاعرانہ جذبہ کی جگہ ملّی جذبہ نے لے لی ہو مجموعی حیثیت سے حفیظ کی شاعری کا کیا مرتبہ ہے۔ اس کے متعلق میں پھر یہی کہوں گا کہ ۱۹۲۵ء کا ہندوستان اور اس وقت کے نوجوانوں کی تحریک کی جیتی جاگتی رچائی اور سنواری ہوئی تصویر اپنے بس کرن عمر کے ساتھ نظر آتی ہے۔ جیسے وندھیاچل کی دیوی کی تیسرے پہر کی جھانکی یا کرشن کے گوپ لیلا کی جھانکی۔ حفیظ نے اپنی ایک نظم میں جس کا نام ہے "تین نغمے" ٹیگور اور اقبال دونوں کی شاعری سے کترا کر نکل جانے کی جو راہ نکالی تھی اُس کا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔

لیکن ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد کا ہندوستان جوانی کی اس بے فکری۔ اُس اُمنگ اور اس دلفریب انفرادیت سے یا اجتماعت کے قدیم نظریوں سے گزر گیا جس کی ترجمانی حفیظ نے کی ہے اور خوب خوب کی ہے۔ اب اُس جوانی کے فطری جذبات غور و فکر کی اس دور بلوغ سے گزر رہے ہیں۔ اجتماعیت کے وہ نئے تجربے اور وہ نئے نظرئے جن سے آج سے چھ سات برس پہلے کا ہندوستان بے خبر تھا۔ دوسری حسرتیں دوسری ناکامیاں دوسرے خواب ہندوستان پر آج چھائے ہوئے ہیں۔ اس دور کی ترجمانی اگر حفیظ جالندھری اپنی شاعری میں کریں گے تو وہ چیز "سوز و ساز"، "نغمہ زار" اور "شاہنامۂ اسلام" سے بھی ذرا مختلف ہوگی، پُرانی دُنیا مر رہی ہے۔ نئی دُنیا جنم لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور حفیظ کی شاعری کا دور اگر ختم نہیں ہوگیا تو اُسے نیا جنم لینا پڑے گا۔

نشور لاسلکی (لکھنؤ) — فراق گورکھپوری

نگار کے پچھلے پرچے

ہندوستانی صحافت ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں

(مسلسل)

بقول جان کلارک مارش مین ۱۸۵۷ء کا معرکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے پیغام اجل ثابت ہوا اور سارا الزام کمپنی کے سر تھوپ دیا گیا اگرچہ گزشتہ ستر سال میں کمپنی نے بلا مشورۂ وزارت کوئی سیاسی قدم نہیں اُٹھایا تھا اور اس تمام عرصہ میں کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس سے کہیں زیادہ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کو حکومت میں درخور حاصل رہا، لیکن ایک پبلک کی آنکھوں کے سامنے تھا اور دوسرا پس پردہ۔ پچاس برس پہلے کورٹ آف ڈائرکٹرس نے ویلور کی بغاوت کے بعد لارڈ ولیم بنٹنک کی برطرفی کے لئے جو استدلال پیش کیا تھا، اب اس بڑی بغاوت کے موقع پر وہی الزام اور وہی استدلال خود بورڈ آف ڈائرکٹرس کے خلاف پیش کئے جا رہے تھے[1]۔

دسمبر ۱۸۵۷ء میں لارڈ پامرسٹون (Palmerstone) نے کمپنی کے بورڈ کو مطلع کیا کہ عنقریب ایک بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جانے والا ہے جس کے مطابق ہندوستان بالواسطہ زیر تاج منتقل ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں کمپنی نے جان اسٹورٹ مل کو ایک درخواست مرتب کرنے کی ہدایت کی، جو پارلیمنٹ میں پیش بھی کی گئی۔ یہ درخواست انگریزی زبان میں طرز انشاء کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

بالآخر یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکۂ معظمہ کے ایک اعلان نے حکومتِ ہند کی تبدیلی پر مہر تصدیق ثبت کر دی، جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ:

> "ہندوستان کی عنان حکومت جو اب تک ملکۂ معظمہ کے معتمدین، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد تھی اب خود حضور ملکۂ معظمہ نے سنبھال لی ہے۔ تمام معاہدات، جملہ خطابات، حقوق اور رسوم ایمانداری کے ساتھ برقرار رکھے جائیں گے۔ پبلک ملازمتیں ہر شخص کے لئے کھلی ہیں اور اس سلسلہ میں رنگ و نسل کی کوئی تفریق نہ ہوگی اور حکومت اگرچہ ایک عیسائی حکومت ہے مگر مذہب کی بنا پر نہ تو کسی کو محروم کیا جائے گا اور نہ کسی کو فائدہ پہونچایا جائے گا۔"

کمپنی کے عہد کی دوعملی - (جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی نمائندگی بورڈ آف ڈائرکٹر کرتا تھا اور حکومت کی نمائندگی بورڈ آف کنٹرول) نہایت ناکام ثابت ہوئی تھی۔ اس لئے نیا قانون جو "ہندوستان کی بہتر حکومت" کے لئے بنایا گیا تھا، پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ اس قانون کا بنیادی خیال یہ تھا کہ:

> "اُن کی (ہندوستانیوں کی) ترقی میں ہماری (برطانیہ کی) قوت منحصر ہے، اُن کی آسودگی میں ہمارا تحفظ مضمر ہے اور اُن کا

1. John clark Marshman - History of India P. 521

تشکر ہمارے لئے بہترین معاوضہ ہوگا"

حکومت کی اس قابلِ ذکر تبدیلی نے انتظامی حالات بالکل بدل دئے، لیکن اخبارات کا جہاں تک تعلق ہے، اُن کے لئے بدستور وہی پابندیاں رہیں جو ۱۸۵۸ء میں تھیں۔ لارڈ کیننگ نے حکومت اور اخبار نویسوں کے تعلقات ہموار کرنے کی کوشش ضرور کی اور اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ سرکاری دفتر کے ایک حصہ میں ایک کمرہ اڈیٹروں کے لئے مخصوص کر دیا گیا، جس کو "اڈیٹروں کا کمرہ" کہتے تھے۔ اس کمرہ میں عوام کی دلچسپی کے کاغذات اڈیٹروں کو دکھلائے جاتے تھے اور عوام کی دلچسپی کی دستاویزیں بھی سرکاری گزٹ کے اخیر میں اکثر شایع کی جاتی تھیں۔

۱۸۶۰ء میں حکومت نے ایک نیا قدم اُٹھایا جس نے ہندوستانی صحافت کی راہ میں کچھ آسانیاں پیدا کیں۔ لارڈ مکالے اور اُن کے انڈین لاکمیشن (Indian Law Commisson) کے رفقاء نے ۱۸۳۷ء میں جو قانون تعزیرات ہند مرتب کیا تھا اور جو بیس سال تک مختلف کمیشنوں کا تختۂ مشق بنتا رہا، اُس میں ایک دفعہ بغاوت (دفعہ ۱۱۳) کی بھی تھی۔ ۱۸۶۰ء میں جب اس قانون پر نظرِ ثانی کی جانے لگی تو لارڈ کیننگ نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ دفعہ اُڑا دیجائے، کیونکہ اسکو صحافت کی آزادی کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے اور یقیناً یہ دفعہ اپنی بست سالہ زندگی میں ہندوستانی صحافت کی راہ میں کافی سنگِ گراں ثابت ہوئی تھی۔ یہ تجویز حکومت نے قبول کر لی اور یہ دفعہ اس موقعہ پر تعزیرات ہند سے علحدہ کر دی گئی۔

۱۸۶۱ء میں ہندوستان نے سیاسی و دستوری ارتقاء کی پہلی منزل میں قدم رکھا، یعنی انڈیا ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل میں قانون سازی کے لئے پہلی بار ہندوستانی نامزد کئے گئے۔ اب تک گورنر جنرل کی مجلس قانونساز کے ممبر سپریم کورٹ کے (Superim Court) کے دو جج بھی ہوا کرتے تھے۔ لیکن جدید قانون میں وہ اُڑا دئے گئے۔ اس کونسل کے اولین ہندوستانی ممبر راجہ پٹیالہ، راجہ ڈنکر راؤ اور راجہ بنارس تھے جن کی وفاداری غدر کے زمانہ میں ثابت ہو چکی تھی۔ اِن اصلاحات کے نفاذ کا ہندوستانی رائے عامہ پر خوشگوار اثر ہوا اور بہت سے نئے انگریزی اخبارات اُسکے ساتھ ہی پیدا ہوئے۔

یہی حال دیسی زبان "اُردو" کی صحافت کا بھی تھا۔ اُس وقت تک اُردو ہندی کا جھگڑا پیدا نہ ہوا تھا، اس لئے ہندو برادران وطن بھی اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ اُردو ہی کو بناتے تھے۔ اس دور میں ہندی اخبارات خال خال نظر آتے ہیں

اُردو اور ہندی اخبارات کی فہرست

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ
اُردو گائڈ	مالک خان بہادر مولوی کبیر الدین	کلکتہ	۱۸۵۸ء	اسحاقی	—	جونپور	۱۸۵۹ء
اودھ اخبار	مالک منشی نول کشور	لکھنؤ	۱۸۵۹ء	انجمن افروز	—	دہلی	"
صبح	زیر سرپرستی شاہ محمد صادق صاحب	مدراس	"	شمس الاخبار	عبدالستار صاحب [illegible]	مدراس	"
طلسم حیرت[1]	"	"	"	مدراس پنچ	—	"	"

[1] مصنف "اختر شہنشاہی" کے بیان کے مطابق اس کا اجراء ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ گارسان دتاسی نے اس کا ذکر ۱۸۶۸ء میں کیا ہے۔

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ
امامیہ	سید عابد علی	لکھنؤ	سنہ ۱۸۵۹ء	محب رعایا (ہندو رفاہ)	حکیم جواہر لال	اٹاوہ	سنہ ۱۸۶۱ء
یامداد[1]	—	بمبئی	"	نسیم جونپور	سید مظفر حسین	جونپور	"
منظور الاخبار	محمد منظور	سورت	سنہ ۱۸۶۰ء	وکٹوریہ گزٹ[9]	—	سہارنپور	"
خیرخواہ خلق[2]	سوہن لال، اجودھیا پرشاد	اجمیر	مئی سنہ ۱۸۶۰ء	امین الاخبار	عزیزالدین خاں	الہ آباد	"
مفید الخلایق	شیونراین[3]	آگرہ	سنہ ۱۸۶۰ء (؟)	شعلۂ طور	جمنا پرشاد	کانپور	"
اخبار طبابت	—	پشاور	سنہ ۱۸۶۱ء	خیرخواہ ہند	اجودھیا پرشاد[12]	اجمیر	"
آفتاب عالمتاب[5]	گنیش لال	آگرہ	"	مجمع البحرین[10]	اصغر حسین	لودھیانہ	"
بغاوت ہند (ماہوار)	مکند لال	"	"	جام جہاں نما	—	کلکتہ	—
اخبار حیدری	مرزا علی حسینی حیدری	"	"	روھیلکھنڈ اخبار	—	بریلی	—
اخبار حسینی	سید حسین علی[6]	"	"	کشف الاخبار	منشی امام علی خاں	بمبئی	سنہ ۱۸۶۱ء
جگت لبھ جنتک[7]	سوہن لال	اجمیر	"	خیرخواہ خلق[11]	—	آگرہ	سنہ ۱۸۶۲ء
پرجاہت (ہندی)	حکیم جواہر لال[8]	اٹاوہ	"	لوک متر (ہندی)	—	"	یکم جنوری سنہ ۱۸۶۳ء

[1] یہ شیعوں کا پہلا اخبار تھا۔ [2] یہ اخبار یوربین خیالات کا مؤید تھا۔ ایک مضمون میں اُس نے اپنے ناظرین کو مشورہ دیا تھا کہ جنھیں فرصت ہو اور تین ہزار کا صرف برداشت کرسکتے ہوں وہ انگلستان ضرور جائیں۔ [3] دونوں اڈیٹر اجمیر کالج کے تعلیمیافتہ تھے۔ بقول گارسان دتاسی "حکومت نے اِس اخبار کے مدیروں کی آزادانہ روش اچھی نظروں سے نہیں دیکھی، چونکہ بغاوت کے بعد ہندوستان میں آزادی باقی نہیں رہی اس لئے حکومت نے اِس اخبار کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا۔" خطبات گارسان دتاسی۔ خطبہ نمبر ۱

[4] مدیر، دہلی کالج کے تعلیمیافتہ تھے اور سنہ ۱۸۵۵ء سے قبل اسی کالج میں پروفیسر تھے۔ [5] اس اخبار کے بعض مضامین "ناگری رسم الخط میں ہوتے تھے۔ اڈیٹر— [6] دہلی کالج کے پروفیسر تھے۔ اور الف لیلیٰ کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ [7] یہ ہندی تھا۔ ہندی کا پہلا اخبار سنہ ۱۸۵۹ء میں بریلی سے جاری ہوا۔ اس کا نام "بریلی تت بودھنی پترکہ" تھا۔

[8] حکیم صاحب ایک انگریزی اخبار (فرینڈ آف انڈیا) بھی نکالتے تھے۔

[9] اس کا اڈیٹر ایک انگریز تھا مگر زبان بیحد شستہ ہوتی تھی۔

[10] اُردو اخبار۔ اڈیٹر نے علم الحساب اور دوسرے موضوع پر متعدد کتابیں بھی لکھیں۔

[11] یہ اخبار "نور علی نور" کی جگہ پر [illegible] شروع ہوا تھا آگے چل کر اس کے اڈیٹر (سنہ ۱۸۶۵ء میں) محمد فاخر اور محمد شاہ ہوئے۔

[12] پندرہ روزہ عیسائیوں کا تبلیغی رسالہ تھا۔

[13] یہ ماہوار رسالہ تھا۔

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ
ہندوستانی[1]	بابو دکھنا ہرنجن	—	سنہ ۱۸۶۱ء	مظہر العجائب	نجف علی	رڑکی	سنہ ۱۸۶۵ء
نجم العلوم	—	لکھنؤ	سنہ ۱۸۶۲ء	لارنس گزٹ	اسمٰعیل خاں	میرٹھ	"
نور العلم[2]	—	—	"	میرٹھ گزٹ[8]	—	"	اواخر سنہ ۱۸۶۴ء
بحر حکمت	لالہ نرسکھ رائے صاحب	لاہور	"	آگرہ لا جنرل[8]	—	آگرہ	سنہ ۱۸۶۵ء
گیان پرکاش[3]	—	آگرہ	"	پنجابی	—	لاہور	"
اخبار عالم	منشی وجاہت علی	میرٹھ	سنہ ۱۸۶۴ء	خیر خواہ ہند[9]	آر۔ سی۔ ماتھر	—	"
نجم الاخبار	—	"	"	اودھ گزٹ[10]	—	لکھنؤ	"
جامع الاخبار	رحمت اللہ	—	"	روضۃ الاخبار	—	بمبئی	"
انجمن اسلامی	آنریبل خان بہادر عبد اللطیف	کلکتہ	"	مفتاح القلوب	—	"	"
بھارت کھنڈ امرت[4]	منشی دھر	آگرہ	"	مطلع خورشید[11]	مرزا محمد شفیع	سندھ	"
دلکشا	—	فتح گڑھ	سنہ ۱۸۶۵ء	صبح صادق	عبد الرحمان شفاف	مدراس	"
احسن الاخبار	احسان احمد	بریلی	"	شاہی عمدۃ الاخبار[12]	—	"	"
آئینۂ ہند	ہرداس	"	"	قاسم الاخبار[13]	منشی محمد قاسم صاحب غم	"	"
سروپ ہراک[5]	شیونراین	آگرہ	"	سلطانی	—	مٹیابرج کلکتہ	"
تتوبودھنی پترکہ[6]	گلاب شنکر	بریلی	"	اخبار کرتان[14]	—	مدراس	"
رفاہ خلایق	کنور بہادر	شاہجہانپور	"	نجم الاخبار	—	میرٹھ	سنہ ۱۸۶۶ء

[1] "بیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا اور اپنے زمانہ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ بعد کو کانگریس کے ابتدائی زمانہ میں یہ اخبار اُس کانگریسی جماعت کا نمایندہ بنا جو اُس زمانہ میں انتہا پسند حقوق طلب جماعت تصور کی جاتی تھی۔۔۔۔ درحقیقت 'ہندوستانی' اُس زمانہ کے سب سے زیادہ بیدار سیاسی احساسات کی ایک آواز تھی"۔ (قاضی عبد الغفار۔ نگار۔ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء صفحہ ۱۳)۔ [2] اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا۔ [3] ہندوؤں کا پہلا مذہبی اخبار۔ [4] گارسان دتاسی کے بیان کے مطابق اس کے جواب میں ایک اخبار دہلی سے "مفید انام" سنہ ۱۸۶۳ء میں جاری ہوا۔ [5] مفید الخلایق کا ہندی اڈیشن۔ [6] ہندی کا ہفتہ وار اخبار تھا۔ [7] یہ منشی وجاہت علی کے اخبار 'اخبار عالم' کا ضمیمہ تھا۔ [8] یہ قانونی اخبار تھا جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا۔ [9] یہ اخبار بھی انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا۔ [10] پہلے اس کا نام اودھ گزٹ سماچار تھا مگر آگے چلکر سماچار غائب ہوگیا۔ [11] اس کا اجرا سنہ ۱۸۶۵ء سے قبل ہوا تھا اور یہ اُردو نہیں بلکہ فارسی کا اخبار تھا۔ [12] اس کا اجرا شاید سنہ ۱۸۶۲ء میں ہوا تھا۔ [13] اس اخبار کے سرورق پر یہ قطعہ درج رہتا تھا:-

قاسم الاخبار اخبار یست بے مثل و شگرف
برصحائف می زند لاف از کمال برتری

بہر سال آغاز اخبار شد تجریش بخت عیش
جام جمشید است یا آئینۂ سکندری

مصرعۂ تاریخ کے اعتبار سے سنہ اجرا سنہ ۱۲۶۹ھ ہے۔ [14] اس کے سرپرست کالی کٹ کے ایک مشہور تاجر کرتان حاجی محمد قاسم تھے۔ موصوف کے بمبئی اور حیدر آباد میں مطبع تھے اور انھی کی زیر سرپرستی بمبئی سے 'معین کرتان' اور حیدر آباد سے 'شوکت اسلام' جاری ہوئے۔ (رسالہ اُردو۔ جلد ۲۔ نمبر ۸)

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ
کانپور گزٹ	منشی نولکشور	کانپور	۱۸۶۶ء	برق خاطف	مظفر حسین	بمبئی	۱۸۶۶ء
آب حیات[1]	بنسی دھر	آگرہ	"	گنج شائگاں	پنڈت سورج بھان	لاہور	"
کارنامۂ ہند	خواجہ محمد ہاشم	گوڑگانوہ	"	علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	سر سید احمد	علیگڈھ	"
بحر حکمت[2]	منشی گوری شنکر	لاہور	"	مظہر الاخبار[4]	عبرت	مدراس	"[6]
گیان پرودینی پترکا[3]	پنڈت مکند رام کشمیری	"	"	اردو اخبار	بال گوبند	آگرہ	۱۸۶۶ء[7]
خیر خواہ پنجاب	منشی دیوان چند	سیالکوٹ	"	آئینۂ عالم	—	"	"
نیر راجستان	—	راجپوتانہ	"	مخزن القوانین	بابو پیارے لال موہن بزجی	—	"[8]
ریاض الاخبار	سید حسن صاحب	مدراس	"	اخبار سائنٹفک سوسائٹی	—	علیگڈھ	"[9]
ریاض الاخبار	—	بمبئی	"	—	—	—	—

[1] اس اخبار کے ایک کالم میں اُردو اور دوسرے میں دیوناگری رسم الخط ہوتا تھا اور اڈیٹر متعدد چھوٹی چھوٹی کتابوں کا مصنف بھی تھا، جن کی تعداد گارسان دتاسی کے بیان کے مطابق تقریباً پچاس تھی۔ [2] یہ طبی رسالہ تھا اور مہینہ میں ایک بار شایع ہوتا تھا۔ [3] اس اخبار کے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں اُردو ہوتی تھی۔ [4] گارسان دتاسی نے اِس اخبار کا ذکر اپنے ۱۸۶۶ء کے خطبہ میں کیا ہے، لیکن اس اخبار کا اجراء ۱۸۵۶ء میں ہوا تھا۔ اس کے اڈیٹر خواجہ بادشاہ صاحب عبرت تھے۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر نمبر میں اخبار کے متعلق ایک مدعیہ غزل ہوا کرتی تھی اُس کا مطلع یہ تھا:۔ " ضیائے دیدۂ بیناہے مظہر الاخبار مفیدِ مردم ہر جا ہے مظہر الاخبار " خبریں زیادہ تر انگریزی اخبارات سے اقتباس کی جاتی تھیں۔ [5] ۱۸۶۶ء میں حسب ذیل اخبارات کا بھی اجراء ہوا مگر اُن کے اڈیٹروں کے نام کا پتہ نہ چل سکا:۔ سیتا دیپک (ہندی)۔ محسن الاخبار۔ کارنامہ (لکھنؤ)۔ سوم پرکاش (ہندی ؟)۔ مجمع البحرین (حیدرآباد)۔ اخبار انجمن ہند (لکھنؤ) یہ شاید راجگان اور تعلقہ داران کی اُس انجمن کا اخبار تھا جو آج "برٹش انڈیا اسوسیشن" کے نام سے مشہور ہے۔ اخبار سہیلی (پنجاب)۔ رسالہ انجمن اشاعت مطالب (سہ ماہی)۔ اکمل الاخبار (دہلی)۔ [6] ۱۸۶۶ء میں حسب ذیل اخبارات بھی موجود تھے:۔ اخبار مفید انام (فتح گڈھ)۔ لطف الاخبار (میرٹھ؟)۔ طلسم حکمت (میرٹھ)۔ بیوپاری۔ یہ امرتسر کا اُردو تجارتی اخبار تھا جس میں تجارتی خبریں ہوتیں اور اشتہارات ہوتے برتنت بلاس (جمو۔ شاید یہ ہندی اخبار رہا ہوگا)۔ گیان دیپک (ہندی۔ سکندرہ) کوی بچن سدھار۔ (ہندی کا ادبی ماہنامہ)۔ بنارس گزٹ (بنارس)۔ دبدبہ سکندری (رام پور کا سرکاری اخبار ہے) صادق الاخبار (سہارنپور)۔ اخلاق الانوار (سہارنپور)۔ محتشم (جاوہ)۔ [7] یہ قانونی رسالہ تھا۔ اور اس کا اجراء ۱۸۶۴ء میں ہوا تھا۔ [8] یہ سر سید مرحوم کی سائنٹفک سوسائٹی کا آرگن تھا اور اس کا اجراء ۱۸۶۶ء میں ہوا تھا۔ یہ فہرست ۱۰۲ اخبارات پر مشتمل ہے جن کا اجراء ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۸۶۶ء تک یعنی دس سال میں ہوا لیکن یہ فہرست قطعاً غیر مکمل ہے کیونکہ اس عرصہ میں کم از کم ایک ہزار اخبارات کا اجراء ہوا۔ قاضی عبدالغفار کے بیان کے مطابق صرف ایک ۱۸۶۱ء ہی میں ۱۵۰ اخبارات کا اجراء ہوا۔

۱۸۶۲ء میں لارڈ کیننگ کی جگہ لارڈ ایلگن (Elgin) ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ انھوں نے اخبارات سے کوئی خاص تعرض نہیں کیا۔ لارڈ موصوف نے یہ عہدہ قبول کرتے وقت پیشین گوئی کی تھی کہ اب اُن کو سرزمین وطن دیکھنا نصیب نہ ہوگا اور یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور وائسرائے کے عہدہ کا چارج لینے کے بیسویں مہینہ دھرم شالہ کے مقام پر اُن کا انتقال ہوا۔

لارڈ ایلگن کی جگہ کچھ دنوں تک سر رابرٹ نیپر (Sir Robert Napier) نے کام کیا لیکن ۱۸۶۴ء میں اس عہدہ کے لئے سر جان لارنس کا انتخاب ہوا۔

۱۸۶۷ء میں صحافت کے لئے ایک نیا قانون بنایا گیا۔ یہ قانون Regulation of Printing Presses and Newspapers Act No XXV. تھا۔ اس قانون کا تعلق مطابع، اخبارات اور کتابوں سے تھا جن کی برطانوی ہند کے اندر طباعت و اشاعت ہوئی تھی۔ یہ قانون اس ملک میں ابتک نافذ ہے۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۱۴ء میں اس قانون میں ترمیم اور مزید اضافہ کیا گیا۔ اس قانون کی اہم دفعات کا خلاصہ یہ تھا:-

۳- ہر وہ کتاب یا اخبار جو برطانوی ہند میں طبع ہو، اُس پر ناشر اور طابع کا نام نیز شایع ہونے اور طبع ہونے کی جگہ کا بھی نام ہونا ضروری ہے۔

۴- برطانوی ہند کے اندر کوئی شخص اخبارات یا کتابوں کی طباعت کی غرض سے مطبع نہیں رکھ سکتا ہے، جب تک کہ وہ اپنے حلقہ کے مجسٹریٹ کے سامنے اُس مخصوص فارم پر دستخط نہ کرے جس میں یہ لکھا رہتا ہے کہ " میں فلاں ابن فلاں اسکا اظہار کرتا ہوں کہ میرے پاس ایک مطبع ہے جو ــــــ فلاں جگہ پر واقع ہے۔

۵- کوئی مطبوعہ رسالہ یا اخبار جس میں خبریں ہوں یا خبروں پر تبصرہ ہو، برطانوی ہند کے اندر شایع نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ ضابطہ کی حسب ذیل کارروائی عمل میں نہ آجائے۔ ہر اخبار یا رسالہ کا ناشر اور طابع مقامی مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہو کر حسب ذیل فارم پر جس کی دو کاپیاں ہوں گی، دستخط کرے:-

" میں فلاں ابن فلاں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ میں ــــــ اخبار یا رسالہ کا طابع (یا ناشر یا ناشر اور طابع) ہوں جو (جگہ کا نام) سے طبع اور شایع ہوتا ہے۔"

سزا

۱۲- اگر کوئی شخص دفعہ ۳ کی خلاف ورزی کرے تو اُس کو پانچ ہزار روپیہ تک جرمانہ کی یا دو سال تک قید محض کی سزا دیجائے یا جرمانہ اور قید دونوں کی سزا دیجائے۔

۱۳- اگر کوئی شخص دفعہ ۴ کی خلاف ورزی کرے اُس کو بھی اسی طرح کی سزا دی جائے۔

۱۴- اگر کوئی شخص، اس ایکٹ کے ماتحت، ایسا بیان شایع کرے جو غلط ہو، یا جس کے متعلق اُس کو یقین ہو یا وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹ ہے، اُس کو مجسٹریٹ پانچہزار جرمانے کی اور دو سال قید محض کی سزا دے سکتا ہے۔

اس قانون کے اجراء کے کچھ ہی عرصہ بعد قانون تعزیرات ہند میں " باغیانہ تحریروں اور تقریروں " کے لئے ایک نئی دفعہ کا اجراء کیا گیا۔ واقعہ لارڈ لارنس کے جانشین لارڈ میو (Mayo) کے عہد حکومت کا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں جب قانون

تعزیرات ہند پر نظر ثانی کی گئی تو دفعہ ۱۱۳ کو خارج کر دیا گیا تھا، لیکن ۱۸۶۹ء میں اِس دفعہ کی حکومت نے پھر ضرورت محسوس کی۔ یہ خدمت لارڈ میئو نے سر جیمس فٹز جیمس اسٹفن (Sir, james Fitzjams Stephen) کے سپرد کی جو بہت بڑے مقنن تھے اور اُن کی مرتب کی ہوئی دفعہ کو ۱۸۷۰ء میں قانون بنا دیا گیا اور کچھ دنوں بعد یہ قانون، تعزیرات ہند کا جزو بن گیا اور آج تک ہندوستان کی سیاسی و صحافتی تاریخ میں دفعہ ۱۲۴ الف کے نام سے مشہور ہے۔

اس دور کو ہم بجا طور پر ہندوستانی صحافت کے دورِ جدید کی ابتداء سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اُس زمانہ میں جن اخبارات کا اجراء ہوا، اُن میں اکثر آج تک بقید حیات ہیں مثلاً :۔ پائنیر (۱۸۶۵ء)۔ امرت بازار پتر کا (۱۸۶۸ء)۔ مدراس میل (۱۸۶۸ء)۔ اسٹیٹسمین (۱۸۷۵ء)۔ لاہور کا سول اینڈ ملٹری گزٹ (۱۸۷۶ء) اور انڈین سوشل رفارمر (۱۸۹۰ء) سبمیرین ٹیلیگراف لائن (Submarine Talegraph Line) مکمل ہوئی اور اُسی کے ساتھ ریوٹر (Reuter) کی خبر رساں ایجنسی کی شاخ ہندوستان میں بھی قایم ہوگئی۔ اس سے پہلے بھی ریوٹر کی خبریں ہندوستان آتی تھیں، لیکن صرف ایک اخبار "بمبئی ٹائمز" کے لئے، وہ بھی بذریعہ ڈاک۔ لیکن اب خبریں بذریعہ تار آنے لگیں۔ اس چیز نے ایک طرف اخباروں کی اہمیت بڑھا دی اور دوسری طرف ہندوستان کی اخباری دلچسپیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

آج ریڈیو اور ریڈیو ٹیلیگراف کے عہد میں ہم مشکل ہی سے اُس دور کے حالات کا قیاس کر سکتے ہیں۔ ۱۸۶۹ء تک بیس الفاظ کے ایک پیغام کی قیمت پانچ پونڈ ہوتی تھی۔ لیکن ۱۸۶۹ء میں یہ قیمت نصف کے قریب ہوگئی یعنی دو پونڈ سترہ شلنگ پہلی ٹیلیگراف کمپنی کے قیام کے بعد دو اور کمپنیاں قایم ہوئیں، جس کا قدرتی نتیجہ لاگ ڈاٹ تھا، اسی وجہ سے قیمت میں تخفیف ہوئی

آج جو چیز ہم کو سب سے زیادہ حیرت ناک معلوم ہوگی وہ یہ ہے کہ ۱۸۶۵ء میں اگر کوئی برقی پیغام انگلستان سے ہندوستان روانہ کیا جاتا تو وہ چھ دن آٹھ گھنٹے اور چالیس منٹ میں ہندوستان پہونچتا۔ آج اس سے کم عرصہ میں ہمارا خط انگلستان پہونچ جاتا ہے۔ ۱۸۷۳ء میں یہ وقفہ کم ہو کر اُنیس گھنٹہ بارہ منٹ رہ گیا اور پھر تین گھنٹہ نو منٹ رہ گیا۔

اس دور کی مطبعی ایجادات اور ترقیوں نے صحافت کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس زمانہ میں دیسی اخبارات کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ بنگال کے گورنر جنرل سر جارج کیمپبل (Sir, George Campbell) نے ۱۸۷۳ء میں اُن اخبارات کی تحقیقات کا حکم دیا جن کے مالک ہندوستانی تھے۔ اس تحقیقات کی رپورٹ کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت صرف بنگال میں ۳۸ ہندوستانیوں کے اخبارات تھے۔ اُن کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) پالی باری درشن (چیٹھوہار)۔ (۲) تالوک پترکا (کلکتہ)۔ (۳) گرام باشی (رانا گھاٹ)۔ (۴) مہا پاپ بلیا پی بھا (ڈھاکہ)۔ (۵) گرام دت (باریسال)۔ (۶) الابند ھوپ (کلکتہ)۔ (۷) چشم عالم (فارسی۔ پٹنہ)۔ (۸) اخبار الاخبار (اردو مظفر پور)۔ (۹) آسام مہیر (گوہاٹی۔ آسام)۔ (۱۰) بالا رنجیکا (کلکتہ)۔ (۱۱) مرشد آباد پترکا (بہرامپور)۔ (۱۲) ستیا ہب پری درشک (کلکتہ)۔ (۱۳) سہا اچار (کلکتہ)۔ (۱۴) ہتا سادھیدینی (باریسال)۔ (۱۵) گیان بھکشنی (چیٹ موہار)۔ (۱۶) بشرادت (کالی گھاٹ۔ کلکتہ)۔ (۱۷) سلاو اساچار (کلکتہ)۔ (۱۸) ہندو رنجیکا (راج شاہی)۔ (۱۹) باری سال بارتیھا (باریسال)۔ (۲۰) امرت بازار پترکا (کلکتہ)۔ (۲۱) رنگ پور دگ پرکاش (کاکی نیا۔ رنگ پور)۔ (۲۲) ایجوکیشن گزٹ (ہگلی)۔ (۲۳) جام جہاں نما (فارسی۔ کلکتہ)۔ (۲۴) بھارت سنس کارک (کلکتہ)۔ (۲۵) سپتا ہک سنگباد (کلکتہ)۔ (۲۶) بلی شہار پترکا

کلکتہ) - (۲۷) سنگابندھو (ڈھاکہ) - (۲۸) سیتاپک سماچار (کلکتہ) - (۲۹) اُردو گائیڈ (کلکتہ) - (۳۰) باھودرشن (کلکتہ) - (۳۱) گرام بارتاپرکاشک (کومرکھالی-نادیا) - (۳۲) ڈھاکہ پرکاش (ڈھاکہ) - (۳۳) شوم پرکاش (چنگری پوٹا ۲۴ پرگنہ) - (۳۴) بھارت بھرتیا (کلکتہ) - (۳۵) دوربین (اُردو ؟ - کلکتہ) - (۳۶) سماچار چندریکا (کلکتہ) - (۳۷) سنگباد روواکار (کلکتہ) - (۳۸) سنگباد پرنوچندرادایا (کلکتہ) -

مدراس کا بھی تقریباً یہی حال تھا - مدراس کے اُردو اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس لکھتے کہ "۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کا زمانہ (مدراس میں) اُردو اخبارات کے عروج کا زمانہ ہے - پرانے اخبارات نے اپنے حجم، طباعت اور اشاعت میں خاصی ترقی کی اور کئی ایک جدید اخبارات جاری ہوئے ..... اس میں شک نہیں کہ بعض اخبارات کی زندگی نہایت مختصر تھی لیکن باوجود اس کے اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر نئے اخبار کے خیر مقدم کے لئے شائقین کی ایک کثیر تعداد تھی"[1]

اسی زمانہ کے متعلق مارگریٹا بارنس کا بیان ہے کہ:

"ہندوستانی زبان کی صحافت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی تھی - اُس وقت بمبئی پریسیڈنسی میں مرہٹی، گجراتی، ہندوستانی اور فارسی اخبارات کی تعداد ۶۲ تھی - شمالی و مشرقی صوبۂ اودھ اور صوبۂ متوسط میں اُن کی تعداد ۶۰ تھی - اور مدراس میں تامل، مالیالم، تلگو اور ہندوستانی زبان کے ۱۹ ہفتہ وار اور روزنامے تھے - ان اخبارات کی اشاعت قدرتاً محدود تھی لیکن اُس میں اضافہ ہو رہا تھا - اُس وقت لوگوں کا اندازہ تھا کہ ان اخبارات کے پڑھنے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی"[2]

یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو ملکہ وکٹوریہ کے "ملکۂ ہندوستان" ہونے کا اعلان کیا گیا -

ورناکلر پریس ایکٹ گزشتہ پندرہ برسوں سے یہ دستور تھا کہ ہندوستانی اخبارات کے اہم مضامین کا ترجمہ تیار کیا جاتا اور اُس کی کاپیاں سرکاری افسروں کو اور برطانوی پریس کو روانہ کی جاتیں - ۱۸۷۵ء میں لارڈ سالسبری (Salisbury) جو اسوقت وزیر ہند تھے، وہ کچھ تو انہیں خلاصوں سے اور کچھ اُن خبروں سے جو برطانوی اخبارات میں شایع ہوتی تھیں، اس نتیجہ پر پہونچے کہ دیسی پریس باغیانہ روش اختیار کر رہا ہے اور اس کے متعلق انھوں نے گورنر جنرل کو بھی لکھا اور مشورہ دیا کہ اس کا سدباب کرنے کے لئے عملی اقدام کیا جائے - اُس وقت ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ نارتھ برک تھے - وہ حکومت کی اس تجویز سے متفق نہ ہوئے کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق اُس وقت جو قانون موجود تھا، اُس کی موجودگی میں مقدمہ چلانے کا کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا سوا اس کے کہ حکومت اور دیسی پریس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو جائیں -

۱۸۷۶ء میں لارڈ لٹن (Lytton) نے پریس کے مسئلہ پر زیادہ سوچ بچار شروع کیا اور ہندوستان

---

[1] 'مدراس کے اُردو اخبارات' - رسالہ اُردو جلد ۲۱ - نمبر ۸۲ -

[2] The Indian Press P. 276

کی صوبائی حکومتوں سے بھی اس سلسلہ میں صلاح لی۔ لارڈ لٹن کی طرح بیشتر صوبوں کے گورنر بھی شدت کے ساتھ اخبارات کے لئے ایک نئے قانون کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ بالآخر ایک مسودۂ قانون مرتب کیا گیا اور اس کی اطلاع وزیر ہند کو بذریعہ تار دی گئی، جنھوں نے فوراً اس قانون کے لئے اپنی منظوری دیدی اور ۱۴ مارچ ۱۸۷۸ء کو اس مسودۂ قانون نے "ورناکلر پریس ایکٹ[1]" کی شکل اختیار کر لی۔ یہ قانون بیس طویل دفعات پر مشتمل تھا، اور اس کے نفاذ کی وجہ یہ بتلائی گئی تھی:

"کچھ عرصہ سے اُن اخبارات میں جو مشرقی زبانوں میں شایع ہوتے ہیں، اس طرح کا مواد ہوتا ہے جس سے لوگوں میں حکومت کی طرف سے جو قانون برطانوی ہند میں قایم ہے، بے اطمینانی پیدا ہونے کا اندیشہ اور ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں فرقوں اور مختلف مذاہب کے پیروں کے درمیان نفرت پیدا ہونے کا خوف ہے۔

اور چونکہ یہ اخبارات ایسے لوگوں کی کثیر تعداد پڑھتی ہے جو جاہل اور کم سمجھ ہوتے ہیں، اور ان چیزوں سے اُن کے متاثر ہونے کا بیحد امکان ہے۔ اس لئے بقائے امن کے واسطے اور ہز مجسٹی کی رعایا کے تحفظ کی خاطر یہ ضروری معلوم ہوا کہ اگزیکٹو گورنمنٹ کو ایسے اختیارات عطا کئے جائیں جس سے وہ ایسے اخبارات کی اشاعت پر قابو حاصل کیا جا سکے۔ اور اسی غرض سے حسب ذیل قانون مرتب کیا جا رہا ہے۔"

اس ایکٹ کی اہم دفعات کا خلاصہ یہ تھا:

۳۔ کسی ضلع کا مجسٹریٹ یا پریسیڈنسی ٹاؤن کا پولیس کمشنر جس کے مقامی حدود کے اندر اخبارات چھپتے یا شایع ہوتے ہوں وہ، حکومت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد، دفعہ ۵ کے ماتحت کسی اخبار کے چھاپنے والے اور شایع کرنے والے کو متفقہ یا علٰحدہ علٰحدہ ضمانت داخل کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ اگر شایع کرنے والا اور چھاپنے والا ایک ہی شخص ہو تو دونوں حیثیتوں میں اُس سے ضمانت کی رقم کا تعین لوکل گورنمنٹ کے اختیار میں ہے۔

۵۔ جب کسی اخبار کے چھاپنے والے یا شایع کرنے والے مجسٹریٹ یا کمشنر پولیس ضمانت طلب کرے تو اُس وقت چھاپنے والا یا شایع کرنے والا مجسٹریٹ یا کمشنر کو اپنی تحریر میں یہ لکھ کر دے کہ آیندہ سے وہ کوئی ایسی بات نہ لکھے یا چھاپے، جس سے حکومت کو ناراضگی کا موقعہ ملے یا جس سے قانون کی خلاف ورزی ہو تو چھاپنے والے یا شایع کرنے والے سے ضمانت کی رقم نہ لی جائے گی

۶۔ اگر لوکل گورنمنٹ جس کے حدود میں اخبار چھپتا یا شایع ہوتا ہو، اُس کو یہ معلوم ہو کہ اخبار میں کوئی ایسی بات شایع ہوئی ہے جس سے رعایا میں حکومت کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہونے کا یا مختلف فرقوں یا مذہب کے پیرووں کے درمیان منافرت پیدا ہونے کا امکان ہے تو لوکل گورنمنٹ اس کی نوٹس سرکاری گزٹ میں شایع کرے گی۔

۷۔ اگر اس نوٹس کے بعد بھی اخبار نے اپنا رویہ نہ بدلا تو حکومت اخبار کی تمام کاپیاں، مطبع کا تمام سامان مع مشین وغیرہ اور ضمانت کی رقم ضبط کر سکتی ہے۔

۱۱۔ وہ اخبارات جو برطانوی ہند کے حدود کے باہر چھپتے اور شایع ہوتے ہیں ان میں اگر کوئی قابل اعتراض بات شایع ہو

---

[1] اس قانون کا پورا نام یوں تھا: An Act for the better control of Publication in Oriental Languages.

تو حکومت اس کی مجاز ہے کہ وہ اُس اخبار کی کل کاپیاں ضبط کرے جو اُس کے حدود کے اندر موجود ہوں۔

اِس قانون کو عام طور پر" اخبارات کو مقید کرنے" کی کوشش سے تعبیر کیا گیا۔ اس قانون کے سلسلہ میں مسٹر گلیڈ اسٹون نے جو اس بل کے مخالف تھے، دارالعوام میں ایک تحریک بھی پیش کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ" ورناکلر پریس ایکٹ" کے ماتحت اگر کسی اخبار کے خلاف کارروائی کرنے کی ضرورت پیش آئے تو پہلے اُس کو سکریٹری آف اسٹیٹ کے پاس بھیجا جائے جو اُس کو ایوان کے سامنے پیش کرے، لیکن یہ تحریک ناکام رہی۔

اِس قانون کے نفاذ کے بعد ایک" پریس کمشنر" کا تقرر عمل میں آیا جس کے دُہرے فرائض تھے۔ اول تو یہ کہ حکومت عوام سے متعلق جو اقدامات کرنے والی ہو اُس کی صحیح اطلاع وہ اخبارات کے لئے فراہم کرے اور حکومت دیسی زبان کے اخبارات کے ایڈیٹروں کے درمیان وسیط کا بھی کام دے۔ اس عہدہ پر پہلا تقرر مسٹر رابرٹ لتھ برج (Robert Leth-bridge) کا ہوا، جو آگے چل کر سر کے خطاب سے سرفراز کئے گئے۔

" پریس کمشنر" کے تقرر کو ہندوستان کے انگلو انڈین اخبارات کے اڈیٹروں نے بیحد ناپسند کیا اور اسٹیٹسمین نے تو اسکا بہت مضحکہ بھی اُڑایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے جلد ہی پریس کمشنر کے پہلے فرض سے اُس کو سبکدوش کر دیا۔

" ورناکلر پریس ایکٹ" کا ہندوستان کی رائے عامہ پر کیا اثر ہوا ؟"

ہندوستان میں یہ لارڈ لٹن کا عہدِ حکومت تھا۔ ہندوستان میں اُس کے عہد کی ابتدا ہی تلخی اور غیر ہر دلعزیزی کے ساتھ ہوئی۔ اُس کے دہلی دربار ہی نے ہندوستانیوں کو ناخوش کیا۔ یہ دربار اُس وقت منعقد ہو رہا تھا جب کہ عظیم الشان اور تاریخی قحط نے پورے ملک کو اپنا شکار بنا رکھا تھا۔ ٹیگور مرحوم نے بھی اِس موقعہ پر ایک دردانگیز نظم لکھی تھی جو بنگال میں عرصہ تک بہت زد خاص و عام رہی۔ ابھی پورا ملک قحط کی ہلاکت سے جانبر بھی نہ ہوا تھا کہ لارڈ لٹن نے ٹیکس میں اضافہ کر دیا۔ یہ باتیں کچھ کم نہ تھیں کہ ورناکلر پریس ایکٹ ہندوستانی اخبارات کے سر نازل کیا گیا۔ اس ایکٹ کے خلاف پورے ملک نے احتجاج کیا اور مدراس کا مشہور اخبار" ہندو" اسی ایکٹ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے جاری کیا گیا۔

لارڈ لٹن کی جگہ مارکوئس آف رپن (Marquess of Ripon) نے لی اور ۷ دسمبر ۱۸۸۱ء کو ورناکلر پریس ایکٹ کے خاتمہ کے لئے ایک بل پیش کیا گیا۔ مارکوئس آف رپن نے بحیثیت صدر کونسل، اس بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ" میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ میرے لئے یہ چیز ہمیشہ باعثِ افتخار رہے گی کہ یہ قانون (ورناکلر پریس ایکٹ) میرے عہدِ حکومت میں ہندوستان کی آئینی کتاب سے علٰحدہ کیا گیا"

البرٹ بل اور کانگرس کا قیام

ہندوستانی رائے عامہ کے ارتقاء کی تاریخ کے سلسلہ میں انڈین اسوسیشن (Indian Association) بھی قابلِ ذکر ہے جس کا قیام ۱۸۷۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس اسوسیشن کا نصب العین ملک کے متوسط طبقہ کے نقطۂ خیال کی نمایندگی اور اسکی ترجمانی کرنا تھا اور اس اسوسیشن نے جو پہلی تحریک شروع کی وہ یہ تھی کہ سول سروس کے امتحانات میں ہندوستانیوں کو برابری کے حقوق حاصل ہوں۔ ابھی یہ تحریک چل ہی رہی تھی کہ البرٹ بل (Albert Bill) کے فتنہ نے سر اُٹھایا۔

۱۸۸۳ء میں حکومتِ ہند کے وزیر قانون مسٹر البرٹ نے ایک مسودہ قانون مرتب کیا، اس کی رو سے ہندوستانی ججوں کی عدالت میں انگریز ملزمین کے مقدمات کی سماعت بعض حالات میں ممکن تھی۔ ہندوستان کی انگریز آبادی نے اسکے خلاف شورش شروع کی۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی انگریزوں نے ایک انجمن بھی بنائی اور پروپگنڈے کے لئے ایک لاکھ کی کثیر رقم بہت ہی قلیل عرصہ میں جمع کرلی۔ انگریزوں نے اپنے غیظ و غضب میں صرف ہندوستانیوں ہی کو صلواتیں نہیں سنائیں بلکہ لارڈ رپن وائسرائے ہند اور مسٹر سی۔ پی۔ البرٹ کی بھی کوئی گت اُٹھا نہیں رکھی۔ بالآخر اس کوشش کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی انگریزوں کے فیصلہ کے سامنے حکومت نے سرِ تسلیم خم کردیا۔

اِس واقعہ نے ہندوستانی رائے عامہ کی تشکیل میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا۔ ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقہ اور ہندوستانی اخبارات اِس وقت بیحد غضبناک تھے مگر اس سے ہو ہی کیا سکتا تھا۔ اِس ذلت کے احساس نے ایک قومی ادارہ کے قیام کا تخیل پیدا کیا۔ اس کام کو کلکتہ کی انڈین اسوسیشن نے اپنے ذمہ لیا۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر انجمن نے چندہ کے لئے ایک اپیل بھی شایع کی۔ اُنھیں دنوں مسٹر ہیوم (Hume) نے جو ایک رٹائرڈ سولین تھے، قومی انجمن کے قیام کے لئے ایک گشتی چٹھی اخبارات میں شایع کی۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ نے اِس اسکیم کو خوش آمدید کہا اور انڈین اسوشیشن نے بھی اس کی تائید کی اور ایک قومی انجمن بالآخر قایم ہوگئی —— یہ تھی انڈین نیشنل کانگرس —— یہ واقعہ ۱۸۸۵ء کا ہے۔

سرکاری راز کا قانون

۱۸۸۴ء میں لارڈ رپن کی جگہ پر لارڈ ڈفرن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے اُن کے عہدِ حکومت کی قابل ذکر چیز "سرکاری راز کا قانون (Official Secrets Act)" ہے۔

کلکتہ کے امرت بازار پتر کا نے حکومت اور ریاست بھوپال کے تعلقات کے متعلق کچھ ایسی باتوں کا پتہ چلایا جسکو حکومت صیغۂ راز میں رکھنا چاہتی تھی اور ان کو شایع کیا۔ اس چیز نے صوبہ متوسط کے اجنٹ کو چراغ پا کردیا۔ اُس نے اپنی ایک طویل چٹھی میں ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً اس اخبار پر مقدمہ چلائے، لیکن لارڈ ڈفرن نے یہ نامناسب سمجھا اور اجنٹ کو لکھا کہ جو کچھ ہوا وہ تو ہو ہی چکا اب اگر مقدمہ چلایا گیا تو واقعات کی مزید تشہیر ہوگی لیکن اجنٹ سرلیپل گرفن (Sir Lepel Griffin) اس تجویز سے متفق نہ ہوسکے اور احتجاجاً انھوں نے اپنے عہدے سے استعفا دیدیا۔

اِس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد امرت بازار پترکا نے پھر اسی حرکت کا اعادہ کیا۔ اس مرتبہ اُس نے دفتر خارجہ کی ایک اہم دستاویز جو ریاست کشمیر کے متعلق تھی شایع کردی۔ یہ قصہ لارڈ لنس ڈاؤن (Lansdowne) کے عہدِ حکومت کا ہے جو لارڈ ڈفرن کے جانشین تھے۔ اس موقعہ پر حکومت نے یہی مناسب سمجھا کہ سرکاری خفیہ کارروائیوں کے تحفظ کے لئے ایک قانون بنا دیا جائے۔ اس سے کچھ دن پہلے انگلستان میں بھی اسی مقصد کے پیشِ نظر ایک قانون بنایا گیا تھا ہندوستان کا قانون بھی انھیں اصولوں پر مرتب کیا گیا جو ۹؍اکتوبر ۱۸۸۹ء کو پاس ہوا اور ۱۷؍اکتوبر کو گورنر جنرل نے اپنی منظوری دیدی۔

اردو اور ہندی کے مقابلی دَور کے اخبارات

(سنہ ۱۸۶۸ء ــ سنہ ۱۹۰۰ء)

نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان	نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان
رتن پرکاش	—	سنہ ۱۸۶۸ء [1]	رتلام	ہندی	مفید عام	—	سنہ ۱۸۶۹ء	آگرہ	اردو
حقائق عرفان	عماد الدین	"	امرتسر	اردو	اتالیق پنجاب	محمد حسین آزاد	سنہ ۱۸۷۰ء [2]	لاہور	"
مخزن مسیحی	ریوانڈ بے، بے ورش	"	الہ آباد	"	اخبار عام	پنڈت مکند رام	سنہ ۱۸۷۱ء	"	"
برہم گیان پرکاش	کیشب چند	۱۸۶۹ء	کلکتہ	ہندی	تہذیب الاخلاق	سر سید احمد	"	علیگڈھ	"
گنجینۂ علم	گنگا پرشاد	"	مراد آباد	اردو	محب مارواڑ	—	"	مارواڑ	اردو ہندی
دھوم پرکاش	بابو جوالا پرشاد	"	آگرہ	"	ریاض نور	—	"	مراد آباد	اردو
پاپ موچن	"	"	"	ہندی	"	—	"	ملتان	"
جلوۂ طور	رائے گنیشی پرشاد	"	میرٹھ	اردو	پریاگ دت	—	"	الہ آباد	ہندی
مفید انام	شنکر سروپ	"	فتح گڑھ	"	رسالہ ڈبٹنگ سوسائٹی	—	"	میرٹھ	اردو
چشم عالم	—	یکم جنوری سنہ ۱۸۶۹ء [3]	پٹنہ	"	گورنمنٹ گزٹ	سرکاری اطلاعیں	"	لکھنؤ	"
اعلامیہ	زین العابدین شیرازی	"	حیدرآباد	"	بندو پرکاش	—	"	کانپور	ہندی

[1] گرسان دتاسی نے سنہ ۱۸۶۸ء میں حسب ذیل اخبارات کا ذکر کیا ہے: (۱) امیر الاخبار۔ مدراس۔ (۲) اخبار سر رشتہ تعلیم اودھ۔ (۳) اکمل الاخبار لکھنؤ۔ (۴) ضیاء الاخبار۔ (۵) کوکب عیسوی۔ میرٹھ۔ [2] سنہ ۱۸۶۹ء میں یہ اخبارات بھی موجود تھے:۔ (۱) اخبار الاخیار مرزاپور۔ (۲) بدیا درش (ہندی) اس کا اُردو اڈیشن نجم الاخبار کے نام سے نکلتا تھا۔ (۳) دبدبۂ سکندری۔ ریاست رام پور کا سرکاری اخبار جو ابتک جاری ہے۔ (۴) ڈھاکہ پرکاش (ہندی) ڈھاکہ۔ (۵) غالب الاخبار۔ سیتاپور۔ (۶) گنجینۂ احکام۔ یہ قانونی رسالہ تھا۔ (۷) جگت سماچار (ہندی) شاید مراد آباد سے نکلتا تھا۔ [3] گارسان دتاسی کے بیان کے مطابق اس سال ۱۸ اُردو کے نئے اخبارات اور تین ہندی کے نئے اخبارات کا اجرا ہوا اور "اہل ہند میں اب یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ اُن کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات میں پڑھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیا جائے۔ ہندوستانی اور دوسری دیسی زبان کے اخبارات اُن گوشوں میں پہونچتے ہیں جہاں انگریزی اخبارات کے توسط سے مغربی تہذیب و تمدن کے خیالات اہل ہند کو پہونچ رہے ہیں ــ بعض اخبارات ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں اُردو لکھتے ہیں" (خطبہ سنہ ۱۸۶۹ء ۔ اُردو ۔ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء) ــ ان میں سے کچھ اخبارات یہ تھے:۔ (۱) انوار الشمس۔ (۲) [illegible]۔ (۳) [illegible] (۴) [illegible] سماچار [illegible] صاحب [illegible] کی سرپرستی میں نکلتا تھا اور ایک کالم میں اُردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی تھی)۔ (۵) [illegible] (۶) سرکاری اخبار [illegible] (۷) [illegible] رسالہ لکھنؤ)۔ (۸) [illegible] جبل (۸) خورشید جہاں۔ آگرہ [illegible] (۹) [illegible] عام [illegible]

نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان	نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان
منوبہار	کرشن جی پرسورام گوڑ	سنہ ۱۸۶۱ء	بمبئی	ہندی[1]	مخزن الفوائد	مولوی مسیح الزماں	سنہ ۱۸۶۳ء	حیدرآباد	اُردو
نور الابصار	—	"	الہ آباد	اُردو	آثار المصار	—	"	لکھنؤ	"
یادگار زمانہ	محمد عبدالرزاق	"	مدراس	"	اخبار سررشتۂ تعلیم	بابو شیو رام	"	لاہور	"
کوہی نجبن سدہار	بابو ہرزی چندر	"	بنارس	ہندی[2]	اخبار طبابت	—	"	پشاور	"
اسلامیہ	مولوی محب حسین	سنہ ۱۸۶۲ء	حیدرآباد	اُردو	وکیل[5]	—	"	امرتسر	"
ماہنامہ دہلی سوسائٹی	شمس العلما مولوی ذکاء اللہ[7]	"	دہلی	"	نور الانوار[6]	—	"	کانپور	"
منشور محمدی[3]	منشی محمد قاسم صاحب	"	مدراس	"	میسور اخبار	حافظ سید محمد صاحب	"	میسور	"
اُردو گائڈ	تربلاکھوناتھ دت	"	کلکتہ	"	اخبار الاخبار	منشی محمد علی	"	لکھنؤ	"
مفید خلائق	شیو نرائن[4]	سنہ ۱۸۶۲ء	آگرہ	"	لارنس گزٹ	سید جمال الدین	"	میرٹھ	"
شمس الاخبار	رجب علی (عیسائی)	"	کلکتہ	"	پنجابی	محمد اعظم	"	لاہور	"
سعد الاخبار	منشی مراری لال	"	دہلی	"	سانڈرس گزٹ	—	"	میرٹھ	"
اسٹریچی گزٹ	منشی مہدی حسن	"	مرادآباد	"	گلشن ریاض	—	"	آگرہ	"

۱ بقول گارساں دتاسی، اس اخبار میں ہندوستانی، مرہٹی، گجراتی اور سنسکرت کے مضامین شایع ہوتے تھے۔ ۲ ہندی کے دو اور رسالوں کا اسی سنہ میں اجراء ہوا۔ ایک کا نام "سلبھ سماچار" تھا۔ اور اُس کا مقصد غریبوں کی حمایت کرنا تھا۔ اس اخبار میں ہندوستانیوں کی شکایات بھی پیش کی جاتی تھیں دوسرا رسالہ "ذخیرہ بال گوبند" تھا۔ یہ آگرہ سے نکلتا تھا۔ اس سنہ میں اُردو کے بھی حسب ذیل جرائد کا اجراء ہوا:۔ (۱) مطبع نور۔ کانپور۔ (۲) مفتاح القلوب کراچی۔ (۳) میوٹو گزٹ۔ میرٹھ۔ (۴) اُردو لا رپورٹ۔ میرٹھ۔ (۵) مخزن العلوم۔ بریلی۔ (۶) روہیلکھنڈ اخبار۔ روہیلکھنڈ۔ ۳ یہ اخبار عیسائی مشنریوں کے جواب میں نکالا گیا تھا اور اس کے مضمون نگار یوپی، بنگال اور پنجاب وغیرہ کے ممتاز علماء تھے۔ اس سنہ میں حسب ذیل جرائد کا بھی اجراء ہوا (۱) کوہ طور۔ لاہور (۲) مطلع انوار۔ اُردو، ہندی۔ لاہور۔ (۳) میو میموریل گزٹ۔ انجمن دہلی۔ (۴) پٹیالہ اخبار۔ (۵) شمشیر بہادر۔ (۶) عمدۃ الاخبار بھوپال۔ اسی نام کے دو اور اخبارات بریلی اور مدراس سے جاری ہوئے۔ (۷) حقیقی عرفان (لاہور)۔ ۴ دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور سنہ ۱۸۵۷ء سے قبل اسی کالج میں پروفیسر بھی رہے۔ انھوں نے اُردو میں کئی کتابیں ترجمہ کی تھیں۔ ۵ یہ اخبار عرصہ تک ایک خاص درجہ کا مالک رہا۔ اسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس اخبار کے صیغۂ ادارت سے مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی تعلق رہا تھا۔ ۶ اسکی خصوصیت یہ تھی کہ یہ حکومت کا مخالف تھا اور سرسید احمد کے خیالات کی بھی مخالفت پرزور انداز میں کرتا تھا۔ چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ کے اڈیٹر نے لکھا تھا کہ اسکا زیادہ مناسب نام ظلمت شعار ہے۔ ۷ اس سنہ میں حسب ذیل اخبارات بھی موجود تھے:۔ (۱) اخبار انجمن شاہجہانپور۔ (۲) اخبار الاخبار۔ مرزاپور۔ اسی نام کا ایک مدراس سے نکلتا تھا (۳) بھارت پترکا۔ ہندی۔ لکھنؤ۔ (۴) اخبار انجمن ہند۔ یہ تعلقہ داران اودھ کا اخبار تھا۔ (۵) برہم گیان پرکاش۔ یہ بمبئی کا اُردو اخبار تھا۔ (۶) دھولپور گزٹ۔ (۷) ہندی پرکاش۔ امرتسر۔ (۸) ہرش چند میگزین۔ (۹) گوالیار گزٹ۔ یہ اُردو اور مارواڑی میں نکلتا تھا۔ (۱۰) جبل پور کرانیکل۔ اُردو (۱۱) خیرخواہ اودھ لکھنؤ۔ (۱۲) خیرخواہ عالم دہلی۔ (۱۳) لوح محفوظ مرادآباد۔ (۱۴) مارواڑ گزٹ۔ اُردو اور مارواڑی۔ (۱۵) ناصر الاخبار۔ دہلی۔ (۱۶) پنجاب گزٹ لاہور۔ (۱۷) صادق الاخبار۔ بہاولپور۔ اس نام کا ایک اخبار دہلی سے بھی نکلتا تھا۔ (۱۸) سوشل سائنس کانگریس جے پور۔ (۱۹) طلسم فرقین۔ بنگلور۔ (۲۰) اُردو دہلی گزٹ۔ آگرہ

نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان	نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان
محافظ بنگلور	—	سنہ ۱۸۷۵ء	بنگلور	اُردو	معلم شفیق	مولوی محب حسن	سنہ ۱۸۸۲ء	حیدرآباد	اُردو
جریدۂ روزگار	سید مرتضیٰ شاہ	"	مدراس	"	اسلامیہ	"	"	"	"
گلدستۂ ریاض	ریاض خیرآبادی	"	گورکھپور	"	شگوفہ	سید حسن بلگرامی	سنہ ۱۸۸۳ء	"	"
قیصر الاخبار[1]	—	"	الہ آباد	"	مذاق سخن	مشتاق احمد	"	"	"
ظہور الاسلام	—	سنہ ۱۸۷۶ء	مدراس	"	گلدستۂ مشتاق	"	"	"	"
آریہ درپن	آریہ سبھا	"	—	ہندی	علوم وفنون	"	"	"	"
آریہ بھوشن	—	"	شاہجہانپور	"	اتحاد	غلام غوث	سنہ ۱۸۸۳ء	مدراس	"
آصف الاخبار	نرائن سوامی	سنہ ۱۸۷۷ء	حیدرآباد	اُردو	دبیر مدراس	سید حسن رضا	"	"	"
اودھ پنچ[2]	سید سجاد حسین	"	لکھنؤ	"	کرناٹک پنچ	محی الدین خاں تسنیم	"	"	"
مظہر العجائب[3]	مولوی ابوالمحامد سلطان محمود	سنہ ۱۸۷۹ء	مدراس	"	داستان سیاح	سید ابراہیم عفو	سنہ ۱۸۸۳ء	حیدرآباد	"
کوہ طور	—	سنہ ۱۸۸۱ء	لاہور	"	دیش اپکارک	—	"	لاہور	"
مفید عام	—	"	"	"	رفاہ عام	—	"	جھجر	"
نوطی ہند	—	"	میرٹھ	"	ہندوستانی	منشی گنگا پرشاد	"	لکھنؤ	"
شفق	سید حسن رضوی	"	حیدرآباد	"	ذخیرۂ تعلیم	مولوی عبدالعزیز	سنہ ۱۸۸۳ء	حیدرآباد	"
احسن الجرائد	حکیم محمد حسین صاحب	"	مدراس	"	رفیق نسواں	امریکی مشن	"	لکھنؤ	"

[1] شمالی ہند کا پہلا روزنامہ تھا — [2] اُردو کا پہلا مزاحیہ ہفتہ وار اخبار تھا، جو اخبار کی جملہ خصوصیات کا بھی حامل تھا۔ اثر و تسنیم کی دُھلی ہوئی لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہوتی۔ اُردو نثر نے اِس اخبار کی وساطت سے بہت سی ارتقائی منزلیں طے کیں۔ اس کا معیار بہت بلند تھا اور ملک میں وقیع نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ رتن ناتھ، سرشار، شرر، اکبر اور چکبست جیسے محسنین زبان اسکے مضمون نگار تھے۔ آزادی تحریر اس اخبار کی خصوصیت تھی۔ پردہ اور تعلیم نسواں کا دشمن تھا۔

[3] مسجد والاجاہی کے احاطہ میں مطبع مظہر العجائب سے شایع ہوتا تھا۔ سرورق پر مسجد والاجاہی کی تصویر بھی ہوتی اور اُس کے نیچے یہ شعر درج رہتا:۔

الٰہی نغمہ سنجی بخش چوں بلبل زبانم را مسخرکن سوادِ اعظم نازک خیالی را

اس اخبار کے اغراض و مقاصد یہ تھے:۔

"سوائے واقعات واقعی و مضامین علمی کے اور کوئی امر غیر واجبی و [illegible] درج اخبار نہ ہوگا، اکثر اوقات ابواب دینی بھی مرقوم ہوا کریں گے، مدح و ذم غیر واجبی سے کام نہیں، تو تو میں میں کا نام نہیں"

نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان	نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان
ہندوستان [1]	پہٹل	سنہ ۱۸۸۴ء	لندن	اردو	بھارت سدھار	—	سنہ ۱۸۸۹ء	—	اردو
بادِ صبا	ابراہیم بلیغ	سنہ ۱۸۸۵ء	مدراس	〃	مخبر صادق	شیخ ضیاء الحق	سنہ ۱۸۹۲ء	پٹیالہ	〃
دکن پنچ	غریب الدین	〃	〃	〃	الحامی	مولوی نوراللہ	سنہ ۱۸۹۴ء	مدراس	〃
گلدستہ [2]	عبداللہ خاں ضیغم	〃	حیدرآباد	〃	انتخاب لاجواب	منشی عبدالعزیز	〃	لاہور	〃
عزیز الاخبار	عزیز الدین صاحب گھٹالہ	سنہ ۱۸۸۶ء	مدراس	〃	مخبر دکن	سید عبدالقادر	سنہ ۱۸۹۵ء	مدراس	〃
زمیندار	منشی محبوب عالم	〃	گجرانوالہ	〃	شیر آصفی	حکیم محمد سعید	سنہ ۱۸۹۸ء	〃	〃
افسر الاخبار	مشتاق احمد	سنہ ۱۸۸۷ء [3]	حیدرآباد	〃	پیشوا	شیخ ضیاء الحق	سنہ ۱۸۹۹ء	لاہور	〃
اخبار النساء	مولوی سید احمد [4]	〃	دہلی	〃	کرزن گزٹ	مرزا حسرت	سنہ ۱۹۰۰ء	دہلی	〃
پیسہ اخبار	مولوی محبوب عالم	〃	لاہور	〃	شمشیر قلم	نثار علی شہرت	〃	لاہور	〃
وکیل، قومی	عبداللہ حسرتی	سنہ ۱۸۸۸ء	لکھنؤ	〃	جریدۂ روزگار	عبداللطیف	〃	مدراس	〃

عہدِ وکٹوریہ کے قابلِ ذکر انگریزی اخبارات

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ اجراء	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ اجراء
پائنیر	—	الہ آباد	سنہ ۱۸۶۵ء	ہندو	—	مدراس	سنہ ۱۸۷۸ء
ٹائمز آف انڈیا	رابرٹ نائٹ	بمبئی	سنہ ۱۸۶۱ء	انڈین سوشل رفارمر	—	بمبئی	سنہ ۱۸۹۰ء
انڈین اکنامسٹ	〃	کلکتہ	سنہ ۱۸۷[illegible]ء	اسٹینڈرڈ دہلی	—	〃	〃
اگریکلچرل گزٹ	〃	〃	〃	کیپٹل	شنارے ٹرمیرن	کلکتہ	سنہ ۱۸۸۸ء
اسٹیٹسمین	〃	〃	سنہ ۱۸۷۵ء	انڈین انجینئرنگ	پیٹ ڈول	〃	〃
سول اینڈ ملٹری گزٹ	ای، کے، ازمین	لاہور	سنہ ۱۸۷[illegible]ء	ہندوستان ریویو	سچانند سنہا	〃	سنہ ۱۸۸۹ء
ٹریبون	سیتلاکانت چیٹرجی	〃	سنہ ۱۸۸[illegible]ء	—	—	—	—

محمد عتیق صدیقی

[1] اس کے مالک اودھ کے مشہور تعلقہ دار راجہ رام پال سنگھ آنجہانی تھے۔ [2] حیدرآباد سے ایک اور گلدستہ "جوہر سخن" کے نام سے شایع ہونا شروع ہوا تھا۔ [3] اس سال حیدرآباد سے چار گلدستے اور شایع ہونا شروع ہوئے۔ (۱) گلزار سخن، جس کے مالک مولوی نورالدین صاحب تھے۔ (۲) دوسرا گلدستہ "گل و بلبل" تھا۔ (۳) تیسرا "خیالِ محبوب" اور (۴) چوتھا "دکن پنچ" تھا۔ [4] یہ وہی سید احمد صاحب ہیں جنھوں نے "فرہنگِ آصفیہ" مرتب کی ہے۔ یہ شاید ہندوستان کا پہلا زنانہ پرچہ تھا۔

اخبارات کی فہرست مرتب کرنے کے سلسلہ میں حسب ذیل کتابوں اور رسالوں سے مدد لی گئی ہے:۔ (۱) خطبات گارسان دتاسی۔ (۲) The Indian Press۔ (۳) رسالۂ اردو۔ (۴) رسالۂ نگار۔ (۵) رسالۂ ہندوستانی۔ (۶) اختر شاہی۔ (۷) اخبار نویسوں کے حالات

مکتوبات نیاز

جناب بندہ - سوال کسی کی بے نیازی یا نیاز مندی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا کہ میری "خوئے تسلیم" کس حد تک اُن کے لئے گوارا ہو سکتی ہے - کیونکہ جہاں سر جھکانا بھی "سرکشی" میں داخل ہو وہاں جان دینے کی بھی صورت کوئی اور ہونا چاہئے - وفا اور عاشقی کیسی ؟

اُدھر یہ طعن کہ ——— گل ہمہ گوش ست و صوت بلبل نارسا ست !

یہاں یہ حال کہ

نسبتی یک جرم را صد عذر گفت
گرچہ تقصیرے کہ می باید نداشت

اب آپ ہی فرمائیے اس صورت میں سوائے خاموشی کے کیا چارہ ہے - بہر حال میں تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ سوائے شرمندگی کے اور کوئی نتیجہ نہیں - شرمندگی، اپنے آپ سے۔ اُن سے اور ساری دنیا سے!

نیاز نوازا - کرمنامہ پہونچا، شکریہ کا محل نہیں، لیکن رسماً عرض ہے، آپ کی تمام داستانِ الم میں سے مجھے صرف اتنا یاد رہگیا ہے کہ "میں جو اچھا ہوا بُرا نہ ہوا"

پھر اب جو ان نشتروں سے کام لیا جا رہا ہے تو کیا آپ کو یقین ہے کہ دل پھر خون دینے لگے گا - خوشی مجھے بھی ہوگی اگر ایسا ہوا۔ لیکن یہ خوشی اب میسر آئے ایسے نصیب کہاں !

دنیا سے "دامن کشاں" گزر جانا اتنا مشکل نہیں جتنا کانٹوں میں اُلجھا کر دامن کو صحیح و سلامت لے آنا — لیکن یہ تجربہ بار بار نہیں کیا جاتا !

میں آپ کو بھول تو نہیں سکتا۔ لیکن یاد رکھنے کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ——— خوش رہئے !

مکرمی - تسلیم - یہ دور مشین کا دور ہے، کل پرزوں کا دور ہے، ہر چیز میکانکی (mechanical) اور ہر بات غیر طبعی ! اُردو کا ایک محاورہ ہے "چلتا پُرزہ" ۔ جو غالباً زیادہ پُرانا محاورہ نہیں ہے اور مشینوں ہی کو دیکھ کر اختیار کیا گیا ہے ——— سو، جب تک آپ یہ "چیز" نہیں، کامیابی دشوار ہے ——— اس میں وضعداری، اخلاق، اور عہد و پیماں کو مطلق دخل نہیں - ہوا کا رخ دیکھنا، اور اپنا کام نکال لینا تو اِ کسی طریقے سے ہو

یہ ہے اس لفظ کا صحیح مصداق — یہ سچ ہے کہ دُنیا اب آپ کے رہنے کی جگہ نہیں رہی، لیکن شکوہ و شکایت بھی بیکار ہے - اُس کا آئین بدلنا نہیں، آپ کو اپنی وضع چھوڑنا نہیں - سوال صرف جیتے رہنے کا ہے، سو وہ بھی اب کتنے دن کے لئے - اللہ اللہ کیجئے اور ایک جگہ اپنے آپ کو سمیٹ کر بیٹھ جایئے :

غنچہ شو دامنِ آرام بہ چنگ است اینجا !

مذہب، غریبوں اور بیکسوں کا سہارا اسی معنی میں ہے :

A poor man's Consolation

صدیقی، لکھے جایئے اور پھاڑتے جایئے، یہاں تک کہ آپ لکھنا چھوڑ بیٹھیں یا یہ سلسلہ "خرق و حرق" ختم ہو جائے ! فسانہ نگاری کا وہ دور جب صرف کاغذ کے پھولوں کو پیش کیا جاتا تھا، گزر گیا، کسی مورت کو سنوار کر مصنوعی حرکت و جنبش سے کام لینا، اب مقبول نہیں - دنیا اب صرف حقیقت و واقعیت کی تلاش میں ہے، خواہ اس کا بیان کتنا ہی گھنونا کیوں نہ ہو — میں نے بھی عرصہ تک خیال کی دُنیا پر حکومت کی اور آپ نے بھی — لیکن اب جگہ اُن لوگوں کے لئے چھوڑ دینا ہے، جو عمل، فعل اور کردار کا علم لیکر نمودار ہوئے ہیں - بہت دن تماشا کیا، اب چند دن تماشائی بنکر دیکھئے کیا ہوتا ہے - اس میں شک نہیں کہ محبت کی تہذیب و متانت ختم ہو رہی ہے، اور بدمستی بلکہ سیہ مستی نے اس کی جرّاحی شروع کر دی ہے، لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے - انسان اسی طرح آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جائے گا، یہاں تک عورت، مرد، محبت و عداوت سب کی تشکیل بالکل نئے انداز پر ہوگی، وہی انداز جو جنت سے باہر آتے وقت آدم و حوّا کا تھا !

جب دماغ و خیال کی نزاکتیں ختم ہوتی ہیں تو اعصاب میں قوت پیدا ہو جاتی ہے - ہمارے اعصاب کمزور تھے اور خیال قوی، اب اعصاب قوی ہیں اور خیال کمزور — پہلے بھی اعصاب ہی کی حکومت تھی اور اب پھر ہونے والی ہے — ذہن و دماغ کا دور یقیناً پھر آئے گا، لیکن ابھی نہیں - جنگ کے بعد آفتاب کو کم از کم دو سو سال تک تو اس ویرانہ پر طلوع ہونے دیجئے !

مکرمی - شاعری میں اس انقلاب کا مطالعہ بہت غور سے کر رہا ہوں، اور ایک حد تک آپ سے متفق ہوں، لیکن یہ بتایئے کہ ہندوستان کی ۴۰ کروڑ آبادی اور اسی نسبت سے اس کے ہزاروں شاعروں کا کیا علاج !

اگر یہ آبادی معہ اپنے تمام شاعروں کے ایک تہائی ہو جائے تو ملک اور لٹریچر دونوں غلامی سے آزاد ہو جائیں یقیناً یہ زمانہ چنگ و رباب لیکر شبستانوں کی رونق بڑھانے کا نہیں اور نہ غزلیں گا گا کر رقص و مستی کا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شاعر جو ہاتھ میں پھاوڑا اور کدال لیکر نکلا ہے، وہی کب ان سے کام لیتا ہے - خس خانوں میں بیٹھ کر یا صرف مشاعروں میں واہ واہ حاصل کرنے کے لئے، سرمایہ دار کی بُرائی اور مزدور کی حمایت میں نظم لکھ دینا، انقلابی شاعری نہیں

جب تک خود شاعر کی پیشانی سے پسینہ اور آنکھ سے لہو نہ ٹپکے " انقلابی شاعری" کا دعوے کرنا ——
اب کیا کہوں، کیا ہے!

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں ؟

آرٹ کے لحاظ سے یقیناً شاعری نے بہت ترقی کرلی ہے لیکن جب احساس " حقیقت و صداقت" عام ہو جائیگا تو الفاظ کی یہ شاعری ختم ہو کر کبیر و نظیر کی شاعری کا دور پھر آئے گا، اور غالباً زیادہ گہرے رنگ کا!

حضرت - خط ملا - آپ اُن کی طبیعت سے واقف نہیں۔ اِدھر سے جتنا زیادہ اصرار ہوگا، اُتنا ہی اُدھر سے انکار بڑھے گا اُس شخص میں فرشتہ و شیطان دونوں کا اجتماع ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان میں سے کون کس وقت بروئے کار ہے!

کیسا پیارا انسان، لیکن کتنا خطرناک! آپ کو کیا خبر کہ اپنی اس فطرت سے خود اپنے آپ کو اس نے کتنا نقصان پہونچایا ہے، دوسروں کا کیا ذکر!

بہرحال آپ مطمئن رہئے، میں موقعہ و محل دیکھ کر اس ذکر کو چھیڑوں گا، لیکن کسی خوشگوار نتیجہ کی توقع آپ قایم نہ کیجئے۔ اگر مان گئے تو خیر، ورنہ پھر کار برآری کی کوئی اور صورت سوچئے۔

ایک ہفتہ کے اندر ہی میں آپ کو اطلاع دوں گا کہ صورتِ حال کیا ہے۔

مکرمی - آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں

کوئی نہیں تیرا تو مری جان، خدا ہے

اس میں شک نہیں کہ جب زمانہ " بر سرِ جنگ" ہوتا ہے تو " نادِ علی" وغیرہ سے کام نہیں چلتا۔ "مُوے پر سو دُرّے" دنیا کا قدیم ہنجار ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہاں کمزور کو جینے کا حق نہیں شکوہ و شکایت کا منھ نہیں —— رہا ہاتھ پاؤں مارنا، سو اس کی سکت ہوتی، تو کمزور ہی کیوں ہوتے ——
مرزا مظہر جانجاناں کا ایک شعر ہے:

نے فرصتِ اشکے نہ مرا رخصتِ آہے
دارم بہ رُخِ یار غریبانہ نگاہے

عشق و عاشقی سے قطع نظر، یوں بھی یہ شعر ہمارے آپ کے حال کی نہایت اچھی تصویر ہے۔ اس کا ایک علاج بیدل نے بتایا ہے، اور وہ یہ کہ:

از ہمہ بیگانہ برآ

لیکن بیدل تمام عمر مجبور رہے، وہ ایسا کہہ سکتے تھے، ہم آپ کس طرح یہ دعوی کرسکتے ہیں، بہرحال میں غور کروں گا کہ آپ کی مشکلات دور ہونے کی کیا صورت ہے —آپ کے خط نے مجھے بہت بےچین کر دیا ہے ——

طرح نہ ہو تو چند دن کے لئے میرے پاس چلے آئیے ۔ ممکن ہے دو آپس ملکر کچھ کام کر جائیں!

تسلیم — جب سے آپ کا خط ملا ہے، یہی سوچ رہا ہوں کہ میں اتنا بیوقوف کیوں ہوں ؟ یعنی باوجود اس یقین کے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کبھی نہ کریں گے، کیوں آپ پر بھروسہ کرنے کو جی چاہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے ایک ہی شخص ہیں اور اُس سے زیادہ جھوٹا دنیا میں کوئی نہیں، جو یہ کہے کہ وہ آپ سے زیادہ سچا ہے!

خوشی ہو یا رنج، ناگہاں، دونوں بُرے، لیکن جس حد تک آپ کا تعلق ہے، مجھے یہ دونوں گوارا ہیں، کیونکہ خوشی کی آپ سے توقع نہیں اور رنج کا ہر وقت اندیشہ ہے ۔ بہرحال، بغیر اس خیال کے کہ آپ نے کیا فرمایا، میں شکریہ بھی ادا کرتا ہوں اور اُس وقت کا بھی منتظر ہوں، جب آپ یہ لکھیں گے کہ ٹھیک اسی وقت جب آپ کو چلنا چاہئے تھا، بیمار پڑگئے ۔ خدا آپ کو تندرست رکھے!

حضرت — نوید کا شکریہ، لیکن افسوس ہے کہ میں اس خوشی میں شریک نہ ہو سکوں گا، تاہم میری دُعائیں اور تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں، خدا کرے آپ اس تقریب سے خاطر خواہ فارغ ہو جائیں ۔ جب آپ واپس آئیے گا اس وقت اطمینان سے بیٹھ کے ساری داستان سنوں گا ۔ خدا حافظ!

آپ کیا پوچھتے ہیں ۔ فانی کے مرنے کا کتنا صدمہ ہے ۔ آخیری مرتبہ یہیں لکھنؤ میں چند مہینے پہلے ملاقات ہوئی تھی ۔ میں ایک تقریب سے بھوپال جا رہا تھا اور وہ بھوپال کے مشاعرہ سے فارغ ہو کر یہاں آئے تھے، غم کی گھڑیاں ہنس کر گزار دینے والے، ایسے اب کہاں ؟ ۔ ڈیڑھ سال قبل جب حیدرآباد میں اُن سے ملا تھا، تو غریب بہت پریشان تھے ۔ بیوی کی موت اور معاش کی فکروں نے ان کو بہت سوگوار بنا دیا تھا لیکن خوش دلی کا وہی عالم تھا ۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ خود ان کا انتخاب کیا ہوا کلام شایع ہو جائے تو اچھا ہے اور میں نے وعدہ بھی کر لیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں یہ خواہش پوری نہ کر سکا، جس کا مجھے ہمیشہ صدمہ رہے گا ۔

اب میں اس ذمہ داری کو اور زیادہ محسوس کر رہا ہوں اور بہت جلد اس کی اشاعت کی فکر کروں گا ۔ اُن کے صاحبزادے کہاں ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ انتخاب چھپوا کر تمام جلدیں اُن کے پاس بھیجدوں ۔

باب الاستفسار

شرحِ کلامِ مومن

(جناب سید سجاد علی میرزا۔ سہارن پور)

مئی کے نگار میں میرے پیش کئے ہوئے اشعار مومن پر آپ نے اظہار خیال کیا تھا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب میں اسی سلسلہ کے آگے کے اشعار اور پیش کرتا ہوں۔ براہ کرم ان پر بھی اظہار خیال فرمائیے۔

(۱) آوازِ گنبد اُس سے شکایت عدو کی تھی — ناچار چپ ہیں صورتِ دیوار کی طرح

پہلا مصرعہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

(۲) دل میں ہوائے بتکدہ ظاہر میں کیا حصول — رہنا حرم میں مومنِ مکار کی طرح

پہلا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے اور دوسرے مصرعہ سے اس کا کیا تعلق ہے۔

(۳) جا سکتے تو نہیں، جاتے ہیں اُس کو میں جو ناصح — چھٹ جائیں گے قصہ سے کیا تو نے اگر بند

اس کا بھی پہلا مصرعہ مبہم ہے۔ "جا سکتے نہیں" اور پھر "جاتے ہیں" یہ کیا بات ہوئی؟

(۴) تا شکوۂ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں — کیوں سرگزشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد

کوہکن کی یاد اور "شکوۂ غیر" سے کیا تعلق۔

(۵) ہے کفر و بدعت ایک نہیں تارِ سبحہ سے — زنار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

یہ شعر تو بالکل چیستاں معلوم ہوتا ہے۔

(۶) نوید اے دل کہ رشکِ غیر سے چھوٹے اسے ہم نے — ستم کا کر دیا خوگر جفا و جور سہہ سہہ کر

رشکِ غیر سے چھوٹنے کا کیا سبب؟

(۷) تو یہ کہاں کدورت باطن سے ہوش تھے — غش ہو گیا میں رنگِ مئے ناب دیکھ کر

کدورت باطن کس کی؟

(۸) مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو — کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

یہ شعر بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔

(۹) چشمِ گلشن پہ قدم رکھتا ہوا کون آئے گا — عطرِ فتنہ میں گلِ نرگس بساتی ہے بہار
چشمِ گلشن سے کیا مراد ہے ۔

(۱۰) بیمروت ناتواں بیں ہنس دے روتا دیکھ کر — دل دیا ہیں نے اسے کیا جانئے کیا دیکھ کر
"ناتواں بیں" سے کیا مراد ہے ۔

(۱۱) تاش کا ہمدم کفن لانا کر بس میں مر گیا — جلونوں سے جلوۂ خورشید سیما دیکھ کر
تاش کا کفن کیوں اور تاش کیا ؟

(۱۲) زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے — قربان جاؤں تیرے مجھے نیمجاں نہ چھوڑ

(۱۳) دلگرمیِ فریب پہ کبھی میں نثار ہوں — پروانہ کیا مجال کرے امتحانِ شمع

(۱۴) روشن ہے اہلِ بزم پہ شکوہ نسیم کا — اس سہکتی زباں پہ دیکھو بیانِ شمع

(۱۵) ہے تارِ گریہ تارِ نفس اہلِ سوز کو — یعنی روانِ شمع ہے اشک روانِ شمع

(۱۶) محفل میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف — دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

(۱۷) اس نے دکھا دکھا کے مجھے چھیڑ دیکھنا — گل پھینکے عندلیبِ گرفتار کی طرف

(۱۸) ہے کیا قبول سجدہ شہیدانِ عشق کا — ہوں غوث سر جھکاتے ہی تلوار کی طرف

(۱۹) ہم ہیں اور نزع شبِ ہجر میں جاں ہونے تک — صبر آتا ہے کوئی تاب دتواں ہونے تک

(۲۰) شام سے تا صبح مضطر، صبح سے تا شام ہم — ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم

(۲۱) دل میں ناصح آئے کیا اپنا خیال، — جا سکے کب یار کے مسکن میں ہم

(۲۲) بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے — شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

(۲۳) دیکھا ادھر کو تو نے کہ بس دم نکل گیا — اترے نظر سے اپنی نگہبانیوں میں ہم

(۲۴) مت کیجو دیر آنے میں کیا جانئے کیا ہے — کھینچا ہے جذبِ شوق نے یوسف کو چاہ میں

(۲۵) ظالم وہ بیوفا ہے عدو میں کے رشک سے — اتنا کچھ آ گیا ہے خلل اپنے نباہ میں

(نگار) (۱) عدو کی شکایت اس سے (یعنی محبوب سے) آوازِ گنبد ہو گئی، یعنی آوازِ بازگشت بلکر ہم ہی تک واپس آئی اس لئے ہم مجبوراً دیوار کی طرح خاموش ہو گئے یعنی نہ دشمن کی شکایت کریں گے، نہ الٹ کر اس کو سنیں گے ۔

(۲) بیشک شعر میں تعقید ہے ۔ اس کی نثر کیجئے تو آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا ۔ دل میں ہوائے بتکدہ (اور) ظاہر میں مومن مکار کی طرح حرم میں رہنا (اس سے) کیا حصول !

(۳) "جا سکتے نہیں" یعنی پہونچ نہیں سکتے ۔ مطلب یہ کہ اس کی گلی میں جاتے تو ہیں لیکن اس تک پہونچ نہیں سکتے ۔
اس لئے اگر ہم کو مقید کر دیا گیا تو اس بیکار دوادوش سے بچ جائیں گے ۔

(۴) محبوب عاشق سے پوچھتا ہے کہ تمھیں کوہکن کی سرگزشت بھی یاد ہے یا نہیں اور مدعا اس سے یہ ہے کہ کوہکن کے مقابلہ

ہیں، خسرو کی کامیابی کو یاد کروں اور اس طرح غیر کا شکوہ کرنا چھوڑ دوں۔

(۵) نہیں، بہ معنی نہیں تو یا ورنہ استعمال ہوا ہے۔ تسبیح کا استعمال بدعت ہے اور زنار کا استعمال کفر، لیکن مومن کے نزدیک دراصل دونوں ایک ہیں کیونکہ تارِ سبحہ کو بھی دیکھ کر زنار برہمن کی یاد آتی ہے۔

(۶) ہم نے ظلم سہہ سہہ کر یار کو جفا کا اتنا خوگر عادی بنا دیا ہے کہ وہ اب غیر پر بھی جفا کرے گا اور ظاہر ہے کہ غیر اس کی برداشت نہ کر سکے گا محبت ترک کر بیٹھے گا۔ اس صورت میں ہمیں رشکِ غیر سے نجات مل جائے گی۔

(۷) کدورتِ باطن سے مراد شراب کی تلچھٹ یا اس کا برا نتیجہ۔

(۸) پہلے مصرعہ میں موسیٰ اور جلوۂ طور کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اہلِ دین میں یہ تاب نہیں کہ جلوہ کا تقاضہ کر سکیں کیونکہ اس کا نتیجہ موسیٰ کو جو کچھ ملا ظاہر ہے۔ اس لئے دین کے یہ آداب دیکھ کر میں کافر ہو گیا، کیونکہ بتوں کی پرستش میں اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔

(۹) "چشمِ گلشن" سے مراد "گلِ نرگس" ہے۔

(۱۰) "ناتواں بیں" "دو حواس" کو کہتے ہیں۔

(۱۱) تاش ایک قسم کا باریک کپڑا، جس میں ایک تار ریشم کا ہوتا ہے اور ایک تار بادلہ کا۔ "چاندنی سے جلوۂ خورشید سیا" کو گویا تاش سے تشبیہ دی ہے۔

(۱۲) یہ شعر مومن کے فکر شاعرانہ کی نہایت پاکیزہ مثال ہے۔ کہتا ہے کہ تم نے اگر دشمن کو صرف زخمی کر کے چھوڑ دیا تو مجھے رشک تو ضرور آئے گا لیکن نہ اتنا کہ مر جاؤں، اس لئے مجھے نیم جاں چھوڑ کر نہ جاؤ اور عدو کو ہلاک ہی کر دو تاکہ میں بھی اس رشک سے جان دے دوں۔

(۱۳) میں بناوٹی گرمجوشی و اختلاط پر بھی قربان ہوں اور جس طرح پروانہ شمع کے خلوص و صداقت کا امتحان نہیں لے سکتا اسی طرح مجھے بھی یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ محبوب کی گرمجوشی سچی ہے یا جھوٹی۔

(۱۴) شمع کی بہکتی زبان سے مراد اس کی لو کا اضطراب ہے جو ہوا سے پیدا ہو جاتا ہے۔

(۱۵) "روانِ شمع" یعنی "جانِ شمع"۔ مطلب یہ کہ شمع کا گریہ ہی شمع کی جان ہے۔

(۱۶) وہ اغیار کو دیکھ کر مجھے دیکھتا ہے تاکہ رشک کی وجہ سے اس کو نہ دیکھ سکوں۔

(۱۷) وہ دکھا دکھا کر عندلیب گرفتار کی طرف پھول پھینک رہا ہے، گویا چھیڑ رہا ہے کہ دیکھو بلبل کتنی کامیاب ہے کہ اس کا محبوب (پھول) اس کے پاس ہے اور تو اس نعمت سے محروم ہے!

(۱۸) "غوث" صوفیہ کے یہاں خاص مرتبہ کے لوگ ہیں، جن کے اعضاء عبادت کے وقت جدا جدا ہو جاتے ہیں مطلب یہ کہ تلوار کی طرف سر جھکاتے ہی میرے اعضاء خود بخود جدا ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں شہیدانِ عشق کے سجدے کے قبول یا عدمِ قبول کی بحث ہی کیا!

(۱۹) پہلا مصرعہ آپ یوں پڑھیں :— "ہم ہیں اور نزع، شبِ ہجر میں جاں ہونے تک"

جاں ہونے تک یعنی جان دینے تک۔

(۲۰) پہلے مصرعہ میں لفظ تم نے آپ کو اُلجھن میں ڈالا ہو گا۔ تم یعنی غم۔

(۲۱) اپنا دل، یار کا مسکن ہے اور یار کے مسکن تک اپنا گزر نہیں اس لئے اپنا خیال دل میں کیا آسکتا ہے۔

(۲۲) دشمن نے محبوب سے کہا کہ مومن تمہاری شکایت کرتا پھرتا ہے اور اس پر محبوب آمادۂ قتل ہو گیا، اس واقعہ پر مومن کہتا ہے کہ مدعی کا کہنا بالکل غلط ہے اور ہم اس کے ثبوت میں ضرور شہادت طلب کرتے، لیکن ہم خود جان سے بیزار ہیں اس لئے اس جھگڑے سے کیا فایدہ۔

(۲۳) ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ کسی طرح تیری نگاہ سے بچے رہیں، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، تو نے اِدھر دیکھا ہی تھا کہ دم نکل گیا۔ اس طرح خود ہم اپنی نگاہ سے اُتر گئے کیونکہ ہم نے اپنی نگہبانی کی فکر کی تھی جس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

(۲۴) اس شعر میں بھی فکر شاعرانہ ہے اور بہت پُر لطف۔ مومن محبوب سے کہتا ہے کہ دیکھو زلیخا کے جذب شوق نے یوسف کو چاہ میں گرا دیا تھا، اس لئے آنے میں دیر نہ کرو ورنہ معلوم نہیں میرا جذب شوق تمھیں کس مصیبت میں مبتلا کر دے۔

(۲۵) عدو اتنا بیوفا ہے کہ اس کے رشک سے میری نباہ میں بھی خلل پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر میں تجھ سے نباہ کرتا معلوم نہیں ہوتا تو اس کا سبب بھی دشمن ہی ہے۔

کیفِ سرمدی

شکستِ دعوتِ تجدیدِ آرزو ہے مجھے　　خمارِ رخصتِ پیمانہ و سبو ہے مجھے

خزاں ہے میرے لئے نغمۂ نویدِ بہار　　دریدہ پیرہنی مثلِ غنچہ بو ہے مجھے

عزیز جام نہ پیمانہ و سبو ہے مجھے　　شرابِ ناب کے نشہ کی آرزو ہے مجھے

ہوں آنکھ ہی کی طرح اپنی آنکھ سے اوجھل　　میں بزم میں ہوں مگر اپنی جستجو ہے مجھے

عزیز جان سے بھی گرچہ آبرو ہے مجھے　　عزیز تر مگر اس سے بھی ایک تو ہے مجھے

وفورِ بیخودیِٔ شوق میں نہیں معلوم　　تلاش اپنی ہے یا تیری جستجو ہے مجھے

نہ میکدہ کی نہ محفل کی آرزو ہے مجھے　　کہ بزمِ عیش میری اپنی ہاؤ ہو ہے مجھے

نوائے دل نہیں اک کیفِ سرمدی ہے امیںؔ

مرا یہ ساز ہی پیمانہ و سبو ہے مجھے

امینؔ حزیں سیالکوٹی

حمد

مومن کے صحیفوں میں کافر کے اداروں میں
یک لخت دلِ سادہ اوراق نہیں ملتا

جس طاق کے سینے پر روشن ہو چراغِ دل
ادیان کے حجرے میں وہ طاق نہیں ملتا

خورشیدِ بشریت سے چمکے تو کہاں چمکے
اس پرتوِ رحمت کو آفاق نہیں ملتا

انداز کی شوخی میں، عشووں کے تبسم میں
وہ خندۂ مجروحِ عشاق نہیں ملتا

انساں کی فطرت کو جلووں کی تمنا ہے
جلوا کوئی انساں کا مشتاق نہیں ملتا

پیشانیِ دوراں پر لکھتے ہیں تجارت سے
جو نقد وفا کردے بیباق نہیں ملتا

کونین کی ہلچل میں انساں کی یتیمی کو
خلاق تو ملتے ہیں رزاق نہیں ملتا

ہندی مکتب

قوم ہے ایک قصرِ عالیشان
شیخِ مکتب ہے قوم کا معمار

حق سے وہ روشناس کرتا ہے
اُس سے روشن ہے سینۂ اسرار

وہ جگاتا ہے خفتہ روحوں کو
اُس سے ملت کی قسمتیں بیدار

اُس کے قدموں پہ ہے جبینِ رسوم
اُس کی مٹھی میں نبضِ لیل و نہار

اُس کے ماتھے پہ کج کلاہِ حیات
اُمتوں کا وہ قافلہ سالار

اُس کے لب سے طلوع ہوتا ہے
آفتابِ حدیثِ صد اعصار

آہ لیکن مرے وطن میں شہابؔ
ہر ادارہ ہے شیطنت کا حصار

ہر صحیفہ ہے مردہ و مدقوق
ہر عقیدہ ہے خستہ و بیمار

میکدے، مسجدیں، صنم خانے
سب تپِ دق کا ہیں ازل سے شکار

ہر نفس میں پڑی ہے اک زنجیر
ہر نظر میں کھلا ہے اک بازار

دل ہو کس طرح مطلعِ الہام
شیخِ مکتب شکم سے ہے لاچار

صحنِ مکتب نہ کیوں رہے تاریک
پیشِ خورشید جب کھنچے دیوار

حرفِ الہام اس جگہ گویا
شیطنت کی خدا سے ہے تکرار

شہاب ملیح آبادی

انتخاب کلام میر

کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

تھی حسب عاشقی کی بدایت ہی میر پر
کیا جانئے کہ حال نہایت کو کیسا ہوا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات؟
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

کسو وقت پاتے نہیں گھر اُسے
بہت میر نے آپ کو گم کیا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا۔ یا دن کو جوں توں شام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دئے
بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تاب کس کو جو حالِ میر سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

حالِ دل میر کا رو رو کے سب اے ماہ سُنا
شب کو القصہ عجب قصۂ جانکاہ سُنا

کوئی ان طوروں سے گزرے ہے ترے غم میں مری
گاہ تو نے نہ سُنا حال مرا گاہ سُنا

دیکھا جو میں نے یار تو وہ میر ہی نہیں
تیرے غمِ فراق میں رنجور ہو گیا

گلبرگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعلِ ناب سا

رکھ ہاتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے؟
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

شہرِ دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں
آخر اُجاڑ دینا اُس کا قرار پایا

پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اُس جواں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرا تو دیکھو میر کا

کیا طرح ہے، آشنا گاہے - گہے نا آشنا
یا تو بیگانے ہی رہیئے، ہو جیئے یا آشنا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اُداس کیا

نامرادی کی رسم میر سے ہے
طور یہ اُس جوان سے نکلا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

اک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

دل کی آبادی کی اس حد ہے کہ خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ،
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں
ماتم زدہ میر اگر نہ ہوگا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

نالۂ میر نہیں رات سے سنتے ہم لوگ
کیا ترے کوچہ سے اے شوخ وہ رنجور گیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

خراب مجھ کو کیا اضطرابِ دل نے میر
کہ ٹک بھی اس کنے اُس بن رہا نہیں جاتا

گلی میں اُس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا

مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اُسے
پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا!
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اُس بن
جی جو اُچٹا تو کسو طرح لگایا نہ گیا

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعوی حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

دور تجھ سے میر نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ
کل جو میں دیکھا اُسے مطلق نہ پہچانا گیا

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا

یک نگہ سے بیش کچھ نقصاں نہ آیا اُس کے تئیں
اور میں بیچارہ تو اے مہرباں مارا گیا

کب نیاز عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

قیمت فی کاپی ۸ر

آیندہ جنوری سنہ ۴۲ء کے متعلق صفحہ ۸ کا اشتہار ملاحظہ فرمائیے

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۴۰	فہرست مضامین نومبر سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۵

ایڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۶	نومبر ۱۹۴۱ء	شمارہ ۵

ملاحظات

جنگ اور ہندوستان

لڑائی کی وہ آگ جس کے شعلے یوروپ کے مغربی سواحل تک پہونچ کر دو بار انگلستان کے سامنے ٹھنڈے سے پڑ گئے تھے، ۲۲ر جولائی سے مشرقی یوروپ کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس کی رفتار تیز ہو یا نہ ہو، لیکن خطرناک ضرور ہے اور ہر دن ہمارے اندیشوں میں ایک نیا اضافہ لیکر طلوع ہوتا ہے

جرمنی کو اسوقت تک روس کے محاذ پر جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ عارضی ہو یا مستقل، لیکن ہے بہر حال کامیابی اور ہم صرف اپنی تمناؤں یا دعاؤں کے اعتماد پر اس کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے

یقیناً جرمنی کو اس کی توقع کے خلاف، اس محاذ پر بہت زیادہ وقت صرف کرنا پڑا، بڑی زبردست قربانیاں پیش کرنا پڑیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ روس جس پامردی کے ساتھ نازیوں کے اس سیلاب آتش و آہن کا مقابلہ کر رہا ہے وہ تاریخ کا بالکل پہلا واقعہ ہے، لیکن ان باتوں سے تسکین ڈھونڈھنا یا دوسروں کے اضطراب میں کمی پیدا کرنے کی کوشش کرنا بالکل لایعنی بات ہے

مظلوم کی اخلاقی قوتیں کبھی ایک ظالم کی کھچی ہوئی تلوار کے سامنے ڈھال نہیں بن سکیں اور قدرت کا یہ کوئی مسلمہ اصول نہیں ہے کہ وہ سرکش کو اس کی سرکشی کی سزا ضرور دے ــــ قوموں کا بننا بگڑنا آجتک صرف قوت و ضعف پر منحصر رہا ہے ــــ قوت و ضعف اخلاق کا نہیں، بلکہ وحشت و بربریت کا، مادی ذرائع کا ــــ اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ جرمن قوم نے آج اپنی اسی قوت کا سکہ بٹھا رکھا ہے

ہو سکتا ہے کہ عاد و ثمود کی قوموں کو تباہ کر دینے والا خدا، کسی وقت نازی قوم کو بھی فنا کر دے، لیکن اگر کبھی ایسا ہوا، تو یہ اس طرح نہ ہوگا کہ زلزلہ آیا اور جرمنی کا تختہ اُلٹ گیا، یا جرمن افراد کی صورتیں مسخ ہو کر وہ انسان سے جانور بن گئے، بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہوگی کہ کوئی دوسری قوم اُس سے زیادہ مضبوط عزم و ارادہ، اس سے زیادہ خوفناک قوت اور اُس سے زیادہ ہلاکت بار آلات لیکر اُٹھی اور دُنیا کا وہ نقشہ جسے جرمن تلوار نے قایم کیا تھا، اس کو دوسری قوم کی تیز تر تلوار نے مٹا کر رکھدیا۔ یہ ہے قدرت کا قانون اور یہی ہے فطرت کی سنت جاریہ ——— محض دُعاؤں سے اس وقت تک نہ کوئی ملک فتح ہوا، نہ مغلوب ہونے سے بچا رہا۔ اس لئے اگر "نازیت" واقعی کوئی فتنہ ہے ——— اور اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ——— تو ہم کو صرف اس توقع پر مطمئن نہ ہونا چاہئے کہ روس کی زبردست مدافعت، کاکیشیا کا کوہستان اور ماسکو کی برفباریاں، اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے کافی ہیں، یا یہ کہ برطانیہ و امریکہ کی جمہوریتیں اس کو فنا کرکے رکھدیں گی، بلکہ اپنی اجتماعی وحدت پر بھروسہ کرکے اس کے مقابلہ کی طیاریاں کرنا چاہئے۔ اسوقت سوال نہ برطانیہ کا ہے، نہ امریکہ کا، نہ مغربی جمہوریت کا نہ روسی اشتراکیت کا۔ بلکہ صرف اس غور و تامل کا کہ اگر یہ آگ بڑھتے بڑھتے ہندوستان تک پہونچی تو کیا ہم صرف آلۂ کار کی حیثیت سے اپنے وطن کی مدافعت کریں گے؟ ——— اگر ہماری ہمتوں کا تقاضہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تو شاید "برطانیہ" بھی زیادہ خوش نہیں ہو سکتا اور اگر قومیت و وطنیت کا مطالبہ کچھ اور ہے، تو ہم کو اپنے اندر "اجتماعی وحدت" کی روح پیدا کرکے مقابلہ کرنا چاہئے اور اس روح کے پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر وقت شاید ہی کبھی مل سکے!

جنگ کا موجودہ رُخ

روس میں لڑائی کے تین محاذ اب بھی بدستور قایم ہیں اور سوائے اس کے کہ فوجی نقطۂ نظر سے ان کی ہندسی شکلیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، ابھی تک کوئی نمایاں تغیر ان میں پیدا نہیں ہوا

جرمنی برابر آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا ہے اور باوجود برفباری شروع ہونے کے، لڑائی کی گرمی اسی طرح قایم ہے — لینن گراڈ کے محاذ پر بیشک جرمن زور گھٹ گیا ہے لیکن نہ اتنا کہ روس اس سے کوئی فایدہ اُٹھا سکے

ماسکو کی طرف بھی جرمن فوجوں کا دباؤ کچھ کم ہو گیا ہے، لیکن نہ اس قدر کہ ماسکو خطرہ سے دور ہو گیا ہو، اسی کے ساتھ جب ہم کریمیا کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو صورت اور زیادہ بھیانک نظر آتی ہے۔ اوڈیسہ کا سقوط ہی اپنی جگہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا کہ کیف، پولٹاوا اور خارکوف بھی ہاتھ سے نکل گئے اور اس طرح اوکرائن کا زرخیز علاقہ بالکل جرمن قبضہ میں چلا گیا۔

خیال تھا کہ اوکرائن کے بعد جرمن فوجوں کا سارا دباؤ ماسکو کی طرف بڑھ جائے گا، لیکن انھوں نے اس کے بعد ہی کریمیا کی طرف اقدام شروع کر دیا اور وہاں بھی اپنے پاؤں جمالئے۔ چنانچہ اس وقت بحر ازوف کے اکثر ساحلی مقامات روس کے قبضہ سے نکل چکے ہیں صرف ایک روسٹوف باقی ہے، لیکن وہاں بھی صورت حال بہت نازک ہے

یہ بات اب بالکل واضح ہو گئی ہے کہ یا تو جرمنی اب براہ قاف باکو کے پٹرولی چشموں اور ایران کی طرف بڑھنا چاہتا ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو ایران اور روس کے درمیان اپنی فوجوں کی آہنی دیوار قایم کر دے گا تاکہ ایران کی طرف سے برطانیہ و امریکہ کی مدد، ایران کو نہ پہونچ سکے

روسی حکومت ماسکو سے منتقل ہو کر سمارا آ گئی ہے اور ماسکو کے تین طرف ۴۰ ۔ ۵۰ میل کے اندر سخت لڑائی ہو رہی ہے

مشرق کی طرف سے ماسکو بالکل کھلا ہوا تھا، لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ جرمن فوجوں کا رُخ اس طرف بھی ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو ماسکو چاروں طرف سے گھر جائے گا

اس میں شک نہیں کہ یہاں برفباری شروع ہو گئی ہے اور بارش نے بھی جرمن فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا ہے لیکن اس سے روسیوں کو زیادہ فایدہ نہیں پہونچ سکتا، کیونکہ رسد رسانی کے ذرایع روز بروز مسدود ہوتے جاتے ہیں اور اگر جرمن فوجیں بغیر آگے بڑھے ہوئے صرف محاصرہ ہی پر قناعت کریں تو بھی ماسکو کے لئے جانبر ہونا مشکل ہے

لینن گراڈ کی طرف کہا جاتا ہے کہ روسی فوجوں نے کہیں کہیں جارحانہ قدم اُٹھایا ہے، لیکن یہ حالات موجودہ جبکہ ماسکو اور لینن گراڈ کی سڑک پر دشمن کا قبضہ ہے اور کالی نن بھی خطرہ میں ہے، روسی توقعات مشکل ہی سے پوری ہو سکتی ہیں

اس میں شک نہیں کہ لینن گراڈ کے محاصرہ کو بہت دن ہو چکے ہیں، لیکن روسی پلہ ابتک یہاں کمزور ہے اور سردیاں شروع ہو جانے کے بعد بھی کوئی توقع اس لئے قایم نہیں کی جا سکتی کہ یہاں زیادہ تر فن لینڈ کی فوجوں سے کام لیا جا رہا ہے جو برفستانی لڑائیوں کے انداز سے پوری طرح واقف ہیں۔ لینن گراڈ کی طرف جرمنی کی پالیسی شروع سے یہ رہی ہے کہ فن لینڈ کی دلچسپیاں اس طرف سے کم نہ ہونے پائیں اور ہو سکتا ہے کہ لینن گراڈ کے مسئلہ میں اس نے اسی لئے ڈھیل ڈال رکھی ہو

الغرض روس کی حالت بہت نازک ہوتی جا رہی ہے اور جرمنی کے اقدامات زیادہ ہوتے جا رہے ہیں، لیکن ان نامواقق حالات کے باوجود ایک چیز ایسی ہے جو روس کی آخری کامیابی کی طرف سے ہمیں بالکل مایوس نہیں ہونے دیتی، اور وہ یہ کہ یہاں کی فوج اور آبادی نے آخری سانس تک مقابلہ کا عزم کر لیا ہے اور قوموں کی قسمتیں پلٹنے میں ہمیشہ عزم و ارادہ ہی کو زیادہ دخل رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانیہ اور امریکہ نے بھی اپنی جگہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ روس کو مدد پہونچانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ مدد کوئی معمولی مدد نہ ہو گی، لیکن اس سلسلہ میں اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جنگ کا اثر روس کی اشتراکی حکومت پر کیا ہو گا

اشتراکیت کا مستقبل

ہٹلر کا پروپاگنڈا یہ ہے کہ یہ جنگ روس کے خلاف نہیں بلکہ وہاں کی اشتراکی حکومت کے خلاف لڑی جا رہی ہے اور چونکہ اشتراکیت سے سارا یورپ گھبرایا ہوا ہے اس لئے اس جہاد میں جرمنی کے ساتھ اور بھی متعدد حکومتوں کی ہمدردیاں شامل ہو گئیں

چونکہ امریکہ اور انگلستان میں بھی بڑی جماعت اشتراکیت کے خلاف ہے، اس لئے ہٹلر سمجھتا تھا کہ ان دونوں ملکوں کو بھی روس کا ساتھ دینے کی ہمت نہ ہو گی، لیکن چونکہ یہ جنگ جمہوریت و نازیت کی جنگ ہو گئی ہے اس لئے برطانیہ نے نازیت کو فنا کرنے کے لئے روس کی مدد کرنے کا اعلان کر دیا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اشتراکیت کے خلاف برطانیہ کی پالیسی بدستور وہی رہے گی۔ یہی روش بالکل امریکہ کی بھی ہے۔ اس لئے روس اس جنگ میں کامیاب ہو یا ناکام، دونوں صورتوں میں روس کی موجودہ اشتراکی حکومت کو ختم ہو جانا ہے

اگر جرمنی کو کامیابی حاصل ہوتی ہے، تو ظاہر ہے کہ روس میں جو نئی حکومت قایم ہو گی وہ ہٹلر کی پسند کی ہوئی ہو گی اور اس میں اشتراکیت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جائے گی، لیکن اگر ہٹلر ہار گیا، تو بھی اشتراکیت کا خاتمہ ہی سمجھئے

اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ روسی اور اشتراکی ان دونوں کا فرق معلوم کرلیں — روسی آبادی اتنے بڑے حصۂ زمین پر پھیلی ہوئی ہے جو بحر اٹلانٹک کے رقبہ کا چوگنا ہے اور ظاہر ہے کہ ایشیا و یوروپ کے اس وسیع قطعۂ زمین پر جو حکومت قایم ہوگی وہ ایک وسیع سلطنت کی حیثیت رکھے گی اور وہاں کے نظام حکومت کا اثر یقیناً بڑا دور رس ہوگا، اسی لئے روس کی سیاسی تاریخ میں یہاں کی آبادی اور اس کے جذبات کو بڑا دخل رہا ہے

اگر صدیوں تک زار کی جابرانہ حکومت قایم رہی تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ روسی آبادی میں آزادی کا جذبہ نہ پایا جاتا تھا بلکہ صرف یہ کہ وہاں کی روایتی زندگی کی آرزوئیں بہت ہموار چیز ہے۔ روسی امرا نے جذبۂ حریت کو اُبھرنے نہ دیا اور اسی لئے جب تک اس روایتی زندگی پر کاری ضرب نہیں لگائی گئی، وہاں انقلاب نہ ہو سکا

روس کی تاریخ انقلاب اور اشتراکیت کا مستقبل سمجھنے کے لئے تین باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے — ایک روس والوں کی مذہبیت، دوسرے تاتاریوں کا حملہ اور تیسرے پیٹر اعظم کی اصلاحات

روس نے دسویں صدی کے اخیر میں عیسوی مذہب اختیار کیا لیکن چونکہ یہ چیز انھیں کلیسائے روم سے نہ ملی تھی اس لئے وہ انضباط جو وہاں تھا اور جو رومن قانون اور یوروپین کلچر کی بدولت ان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد تاتاریوں کے حملے نے ان کے عادات و خصایل کو بہت متاثر کیا اور کامل ڈھائی سو سال تک تاتاری جوا ان کی گردن میں پڑا رہا، لیکن جب یہ تاتاریوں کی غلامی سے آزاد ہوئے تو بھی اس انداز سے کہ انھیں پہلے شخصی حکومت کے سامنے جھکنا پڑا

پیٹر اعظم سب سے پہلا فرمانروا تھا جس نے روس کو یوروپین حکومتوں کی برادری میں شامل کیا لیکن اس اصلاح نے روسی قوم کو دو حصوں میں منقسم کر دیا اور جدید و قدیم خیالات کی دو جماعتیں وہاں قایم ہوگئیں - جب ۱۹۱۷ء میں وہاں انقلاب رونما ہوا تو یہی کشاکش جاری تھی، لیکن بعض انتہا پسند افراد نے جو حکومتوں کی تاریخ اور انقلابات کا مطالعہ کر چکے تھے، ان دونوں جماعتوں کے اختلافات کو دور کر کے آزادی کا جدید ترین نظام حکومت قایم کرنا چاہا اور لینن جو انقلابی تحریک کی چالوں سے واقف تھا کامیاب ہوگیا

اس نے مرکزی حکومت پر اقتدار حاصل کرکے مخالفین کو قتل کرنا شروع کیا اور اشتراکی نظام قایم کر دیا۔ ہر چند لینن نے یہ سب کچھ ذاتی اقتدار کے لئے نہ کیا تھا بلکہ تمام قوم کی فلاح کا سوال اس کے سامنے تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ لینن کی حکومت بھی ایک قسم کی آمرانہ حکومت تھی

لینن کے بعد اسٹالین اُبھرا اور اس کے زمانہ میں اشتراکیت کے اُصول میں بہت کچھ تبدیلی پیدا ہوگئی - پھر اب کہ ایک طرف جرمنی سے اُسے جنگ کرنا پڑ رہی ہے اور دوسری طرف برطانیہ و امریکہ کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہے، جن میں ہر فریق اشتراکیت کا مخالف ہے، اشتراکیت کا مستقبل زیادہ تاریک ہوگیا ہے اور روس کو چاہے فتح حاصل ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں اشتراکیت تقریباً ختم ہو جائے گی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہٹلر نے تو ساری دُنیا سے اپیل کی ہے کہ وہ اشتراکیت کے خلاف جہاد کر رہا ہے اس لئے سب کو اس کی مدد کرنا چاہئے، لیکن اسٹالین نے دُنیا کی اشتراکیت پسند جماعتوں سے مدد کی کوئی اپیل نہیں کی، حالانکہ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسٹالین جانتا ہے اگر اس نے اس جنگ کا مقصد اشتراکیت کی حمایت

قرار دیا تو برطانیہ اور امریکہ کبھی اس کی مدد نہ کریں گے

آپ نے اس دوران میں روسی مقررین کی زبان سے مذہبی آزادی کا ذکر بھی سُنا ہوگا اور آپ نے مسٹر روزولٹ کی وہ تقریریں بھی سُنی ہوں گی جن میں اس نے روسی حکومت کو ملک کے اندر مذہبی آزادی دینے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ سب علامتیں ہیں اس بات کی کہ روس کے اشتراکی اُصول میں تغیر پیدا ہو جانا ضروری ہے

مارکس کے اُصول اشتراکیت میں دو باتیں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، ایک یہ کہ ذاتی ملکیت ختم کرکے آبادی کی فرقہ وارانہ تقسیم مٹادی جائے اور دوسرے یہ کہ خدا اور اس کے وجود کے اعتقاد کو ذہن انسانی سے محو کر دیا جائے کیونکہ اب ذہن انسانی ترقی کرکے حدودِ مذہب سے دور نکل گیا ہے ــــ پھر برطانیہ اور امریکہ کی عیسوی حکومتیں کسی وقت اس بات پر تو راضی ہو سکتی ہیں کہ سرمایہ داری کو ختم کرکے وہ اشتراکیت سے قریب تر ہو جائیں، لیکن مذہب کے باب میں وہ اُصول اشتراکیت کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتیں، چنانچہ چرچل اور روزولٹ دونوں نے صاف صاف کہدیا ہے کہ وہ روس کی مدد صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ مقصود ہٹلر کو شکست دینا ہے ورنہ جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے وہ روس کے شدید مخالف ہیں۔ گویا روس کو برطانیہ وامریکہ کی یہ مدد "حُبِّ علی" نہیں بلکہ "بغضِ معاویہ" کی صورت رکھتی ہے

پھر اسٹالین اتنا بیوقوف نہیں کہ وہ روس کے موجودہ موقف سے آگاہ نہ ہو، وہ جانتا ہے اور اچھی طرح جانتا ہو کہ تنہا جرمنی سے مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت نہیں اور امریکہ و برطانیہ کی مدد حاصل کرنے کے عوض میں اُسے اشتراکیت کی قربانی ضرور کرنا پڑے گی

اگر آج لڑائی کے زمانہ میں برطانیہ وامریکہ، روس کے شریک ہیں تو اُصولاً صلح کے وقت بھی ان کی شرکت کو تسلیم کیا جائے گا اور جرمنی کی شکست کے بعد انھیں شرایط کو فوقیت حاصل ہوگی جو امریکہ و برطانیہ کی طرف سے پیش کی جائیں گی اور ظاہر ہے کہ یہ شرایط کبھی اشتراکیت کے موافق نہیں ہو سکتیں

کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بدلنا ضروری ہے، لیکن وہ نظام کیا ہوگا، اس کا صحیح علم کسی کو نہیں، تاہم اس کی ایک نمایاں ترین خصوصیت کا علم ضرور ہے اور وہ یہ کہ اشتراکیت کم ازکم پچاس سال کے لئے پیچھے ڈھکیل دی جائے گی اور سرمایہ داری ایک نئی صورت اختیار کرکے سامنے آئے گی، جسے ہم نہ جمہوریت کہہ سکیں گے نہ آمریت!

زمانہ نام ہے سلسلۂ انقلابات کا اور کائنات کی ہر شئے میں ہر وقت تغیر ہو رہا ہے، لیکن بعض تغیرات ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم محسوس نہیں کرتے اور بعض ایسے ہوتے ہیں، جن کے نتائج سے بےخبر رہتے ہیں۔ اس جنگ کے بعد جو انقلاب ہونے والا ہے، اس کی نوعیت چاہے کچھ ہو، لیکن ہم اسے محسوس کرنے پر بھی مجبور ہوں گے اور اسکے نتائج سے متاثر ہونا بھی ہمارے لئے ناگزیر ہوگا ــــ پھر بعض قومیں ایسی ہوں گی، جو اس سے فایدہ اُٹھا کر حیات جدید کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں گی اور بعض وہ جنکی غلامی کی زنجیریں اور زیادہ جکڑ جائیں گی یعنی ایک کا تاثر اسے گڑھے سے نکال کر اوپر لے آئے گا اور دوسرے کا تاثر اسکے جمود کو زیادہ سخت و سنگین بنادے گا ــــ ہندوستان کا کیا حشر ہوگا، اس کا صحیح علم تو کسی کو نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اسوقت تک ہمارے لیڈروں کی عقلیں سدھر گئیں یا ہم اپنے لیڈروں کی طرف سے بے نیاز ہو کر خود سوچنے اور سمجھنے کی طرف مایل ہو گئے، تو ہو سکتا ہو کہ ہندوستان کی تاریخ کا بھی کوئی نیا ورق اُلٹا جائے اور یہ ورق شاید مکروہ نہ ہو۔

ماسکو کا محاذ

۳۰ر اکتوبر کو ماسکو کے محاذ کی جو حالت تھی وہ آپ کو پہلو کے نقشے سے معلوم ہو سکے گی۔

ماسکو کے چاروں طرف سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے جو ملک کے مختلف سمت کو جاتی ہیں اور انھیں سڑکوں پر اسوقت لڑائی ہو رہی ہے۔

شمال کی طرف جرمن فوجیں کالی نن تک پہونچ گئی تھیں جو ماسکو سے ۲۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ لیکن اب وہ ماسکو سے صرف ۲۰ میل دور ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی قوی امکان ہے کہ وہ دریائے والگا کے داہنے ساحل سے ہوتی ہوئی الگزنڈروف تک پہونچ جائیں گی اور مشرق کی طرف سے ماسکو کو گھیر لیں گی

جنوب کی طرف کالوجا اور ریازان کی طرف سے جرمن فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں اور اگر یہ فوجیں الگزنڈروف تک پہونچنے والی فوجوں سے مل گئیں تو ماسکو کا مشرقی سمت بالکل غیر محفوظ ہو جائے گا

شمالی مغرب کے گوشہ میں لوبلامسک تک اور مغرب میں موجوسک اور مالوجارسلاوٹز تک جرمن فوجیں پہونچ گئی ہیں تازہ خبروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ جرمن ڈویزن سرپوخوف اور کولومنا کی طرف بڑھ رہی ہیں اور اگر اس میں جرمنوں کو کامیابی ہو گئی تو جنوب کی طرف سے ماسکو پر سخت حملہ ہو گا

مشرق کی طرف جو فوجیں کالوجا، اوریل اور تولا کی طرف آگے بڑھ رہی ہیں وہ غالباً ریازان کی فوجوں سے مل جائیں گی اس طرح ماسکو آہستہ آہستہ سخت محاصرہ میں آتا جا رہا ہے

لیکن روسی جرمن فوجوں کو نہایت جرأت کے ساتھ آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اور کیا نئی صورت پیدا ہو گی
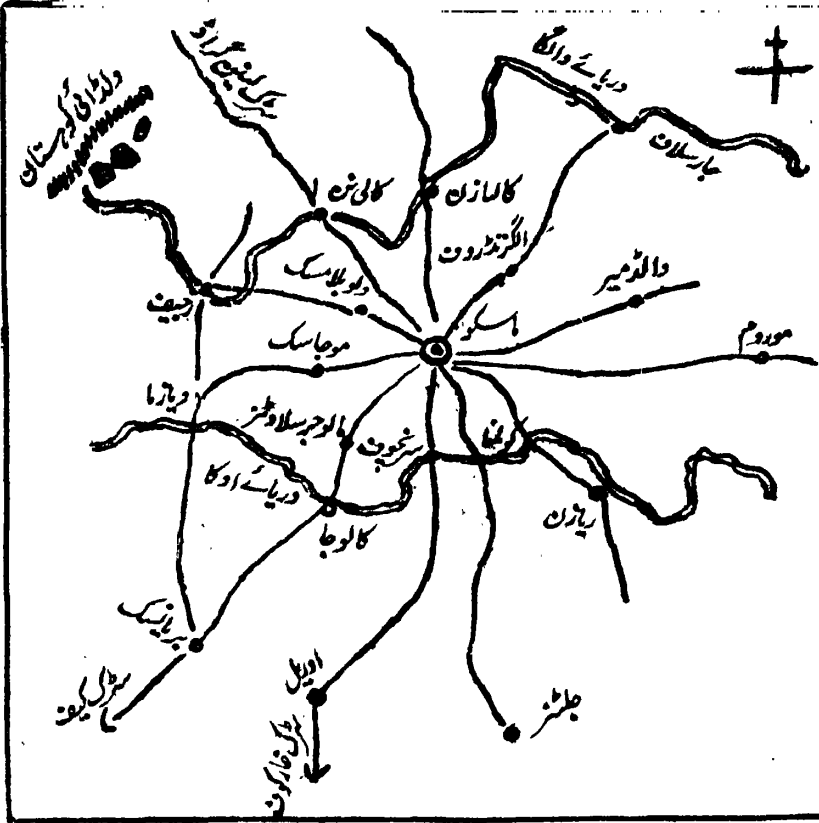
آیندہ جنوری کے "نگار" کی اہمیت

کا اندازہ آپ یوں نہیں کر سکتے۔ پہلے آپ جنوری ۱۹۴۱ء کے "نگار" کو سامنے رکھئے کہ وہ بجائے خود کتنی اہم چیز ہے اور پھر اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھئے کہ تمام اُن اساتذۂ غزل کے کلام پر جن کا ذکر آپ جنوری ۱۹۴۱ء کے نگار میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، مُلک کے بہترین نقادوں کی تفصیلی رائے ایک جگہ آپ کو معلوم ہو سکے تو یہ دونوں باتیں ملکر کتنی عظیم الشان ادبی خدمت قرار پائے گی

جنوری ۱۹۴۲ء کے "نگار" میں انھیں تمام شاعروں کے متعلق ملک کے چار مسلم الثبوت نقادوں کی نہایت بسیط و مفصل رائے آپ کے سامنے پیش کی جائے گی اور آخری مضمون اڈیٹر نگار کا ہوگا، جس میں تمام انتقادی مقالات کو سامنے رکھ کر بتایا جائے گا کہ اس میزان میں ان شاعروں کی قدر و قیمت کیا قرار پائی

اگر آپ کے پاس جنوری ۱۹۴۱ء کا "نگار" موجود ہے، تو جنوری ۱۹۴۲ء کا نگار حاصل کرنا آپ کے لئے ضروری ہے، کیونکہ یہ دونوں ملکر ایک مکمل چیز بنتے ہیں اور اگر جنوری ۱۹۴۱ء کا "نگار" آپ کے پاس نہیں ہے، تو جلد طلب فرمالیجئے، کیونکہ ممکن ہے پھر آپ کو نہ مل سکے

اگر آپ کی خریداری سالِ حال میں جنوری کے بعد کسی مہینے سے شروع ہوئی ہے تو اپنی خریداری جنوری ۱۹۴۱ء سے شروع کیجئے اور دفتر کو اطلاع دیجئے تاکہ جنوری اور اس کے بعد کے پرچے آپ کو بھیجدئے جائیں، اس صورت میں جنوری ۱۹۴۱ء کا پرچہ آپ کو یونہی ملجائے گا۔ لیکن اگر آپ یہ مناسب نہیں سمجھتے تو صرف جنوری ۱۹۴۱ء کا پرچہ طلب فرمالیجئے۔ لیکن اس صورت میں اس کی قیمت آپ کو علاوہ محصول دو روپیہ ادا کرنا پڑے گی

بہرحال آیندہ جنوری ۱۹۴۲ء کا "نگار" نہایت اہم چیز ہے اور اگر آپ اس سے پورا لطف اُٹھانا چاہتے ہیں تو جنوری ۱۹۴۱ء کا "نگار" بھی آپ کے پاس ہونا ضروری ہے تاکہ ان دونوں کو آپ ایک جلد میں مجلد کرا سکیں۔

منیجر نگار

ہندوستانی صحافت بیسویں صدی میں

(مسلسل)

پہلا دور

ہندوستانی رائے عامہ کے ارتقا کی تاریخ میں بیسویں صدی کا آغاز بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ملکی اور غیر ملکی صحافت کے درمیان خط امتیاز قایم کیا۔ ہندوستان کے انگریزی اخبارات کے یورپین اڈیٹروں نے اس وقت تک حکومت کے ان اقدامات کے خلاف آواز بلند کی تھی، جو غیر دانشمندانہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز نے صورت حال بدل دی اور ملک کے "انگلو انڈین اخبارات" نے حکومت کی تائید شروع کی۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ پر ایڈورڈ ہفتم بادشاہ ہوئے، ہندوستان میں یہ لارڈ کرزن کا دورِ حکومت تھا۔ سنہ ۱۹۰۳ء کے اخیر میں حکومت نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ سرکاری معاملات کی رازداری کے لئے جو قانون ۱۸۸۹ء میں پاس ہوا تھا، اس میں حکومت نے ترمیم کی جس سے حکومت کے اختیارات بے حد وسیع ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کی زد میں آنے والے اخبار کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس ترمیم کے خلاف اخبارات نے بہت شور و غل مچایا۔ (اس سلسلہ میں گوپال کرشن گوکھلے کی خدمات بہت زیادہ قابل قدر تھیں) لیکن ہندوستان کے غیر ملکی اخبارات نے اس موقعہ پر حکومت کی تائید کی۔

۱۹۰۵ء میں ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے رائے عامہ کی بیداری میں بڑا حصہ لیا۔ لارڈ کرزن نے سنہ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو ہندو و مسلم حلقوں میں تقسیم کیا۔ اس کا واحد مقصد بنگالیوں کی روز افزوں طاقت کو روکنا تھا۔ اسٹیٹسمین جو ہندوستان میں برطانوی خیال کا نمائندہ تھا، اس نے اپنے ایک افتتاحیہ میں تقسیم بنگالہ کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں لکھا کہ:

"مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو آگے بڑھانے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ملک میں ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی بڑھتی ہوئی قوت کا ہم بہ آسانی سد باب کر سکیں[1]"

بنگالیوں نے اس تقسیم کے خلاف زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے۔ اس وقت کلکتہ میں ہندوستانی خیال کی نمائندگی

---

[1] The "Statesman", Qouted by K. S. Shelvankar in "The Problems of India"

"بنگالی" کر رہا تھا (جس کے اڈیٹر سر بیندر ناتھ بنرجی تھے) اور مدراس میں "ہندو" بھی پیش پیش تھا۔ لیکن انگریزی خیالات کی ترجمانی کرنے والے بہت سے اخبارات تھے چنانچہ اس سلسلہ میں کلکتہ کا اسٹیٹسمین۔ لاہور کا سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ الہ آباد کا پائنیر (جو اب لکھنؤ سے نکلتا ہے) اور بمبئی کا ٹائمز آف انڈیا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ابھی اس تقسیم کے خلاف ملک کے طول و عرض میں شورش برپا ہی تھی کہ لارڈ کرزن نے چلتے چلتے ایک اور حرکت کی یعنی کلکتہ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقعہ پر انھوں نے اپنی تقریر میں جی کھول کر مشرقیوں کو عموماً اور ہندوستانیوں کو خصوصاً خوب خوب سلواتیں سنائیں۔ اس تقریر نے سارے ملک میں غیظ و غضب کی لہر دوڑا دی۔

لارڈ کرزن کا یہ اقدام یقیناً غیر دانشمندانہ تھا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ:

"لارڈ کرزن کے ہفت سالہ دورِ حکومت نے ہندوستانیوں میں اس بات کا احساس پیدا کر دیا کہ حکومت کو ہندوستانی رائے عامہ کی طرف متوجہ کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ کوئی مضبوط قدم اُٹھایا جائے"[۱]

اس احساس نے بہت جلد "سودیشی تحریک" کی شکل اختیار کی۔ دوسری طرف ہندوستانی معتدلین اصلاحات کے لئے شور مچا رہے تھے۔ ان سب پر بالا وہ بےچینی تھی جو ملک کے کاشتکاروں میں پیدا ہو رہی تھی۔ پنجاب میں اُس کا سب سے زیادہ زور تھا، وہاں اس تحریک کے لیڈر لالہ لاجپت رائے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں حکومت نے اُن کو جلاوطن کر دیا۔ ہندوستان کے اخباروں نے اس کے خلاف بہت احتجاج کیا۔

ان حالات نے ملک میں اخبار بینی کا شوق پیدا کیا جو روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ اس دور میں ہندوستان نے جو نئے اخبار نویس پیدا کئے اُن میں سے سب ایک ایک کر کے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ اُن میں قابلِ ذکر سر چنتامنی۔ جی۔ اے نٹسن (G. A. Natesan)۔ مہادیو گوونڈ رانڈے اور تلک وغیرہ تھے۔

۱۹۰۹ء میں ہندوستان کو "منٹو مورلے اصلاحات" (Minto-Morley Reforms) عطا ہوئے۔ اِن اصلاحات کے نفاذ سے پہلے ہی حکومت کئی بار اِس کا اظہار کر چکی تھی کہ ہندوستان کے لئے اصلاحات زیرِ غور ہیں۔ ہندوستان کے تمام سیاسی حلقے عموماً اور اعتدال پسند لوگ خصوصاً ان اصلاحات کے متعلق بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے، لیکن جب ان کا اعلان ہوا تو ہر شخص کو مایوسی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔

اِن اصلاحات کی سب سے بڑی خصوصیت جداگانہ انتخاب تھا۔ ممبران کونسل کی تعداد میں اضافہ ہوا، منتخب شدہ ممبر بھی بڑھا دئے گئے، نیز ممبروں کو "مفادِ عامہ" کے متعلق تجاویز پیش کرنے، بجٹ پر بحث کرنے اور سوالات کرنے کا بھی حق دیا گیا۔

ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ اِن اصلاحات سے ملک کا کوئی طبقہ خوش نہ تھا۔ لیکن معتدلین اُن کو قبول کرنے کے لئے طیار ہو گئے تھے۔ اس لئے اب ہندوستانی رائے عامہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور اس چیز نے اخبارات کے لئے ایک گونہ دشواری پیدا کر دی۔

۱۔ Margarita Barns, "The Indian Press" P. 322.

تقسیم بنگالہ کے بعد سے بنگال کی سیاست تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور اس سلسلہ میں دہشت انگیزی بھی ترقی کر رہی تھی۔ ۱۹۰۹ء کے اوائل میں "امپیریل پریس کانفرنس" (Imperial Press Conference) لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی سر سرندرناتھ بنرجی، اڈیٹر بنگالی نے کی۔ اس موقعہ پر کانفرنس کے ایک ممبر نے سرندرناتھ بنرجی سے اپنی تقریر کے دوران میں سوال کیا کہ:-

"کیا دہشت انگیزی کی تحریک کی تمام ذمہ داری اُن ہندوستانی اخبارات پر عاید نہیں ہوتی، جن کو اپنے قلم پر قابو نہیں ہے؟ اس الزام کی تردید کرتے ہوئے سر سرندرناتھ بنرجی نے بتلایا کہ دہشت انگیزی مشرق کی نہیں بلکہ مغرب کی پیداوار ہے۔

اس زمانہ میں حکومت، ملک کے بڑھتے ہوئے سیاسی رجحانات اور اخبارات کے تلخ اندازِ بیان کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں اخبارات پر قابو حاصل کرنے کے لئے ایک نیا قانون (The Indian Press Act) بنایا گیا۔ ہندوستانی ممبروں میں کچھ لوگ اس کے خلاف تھے۔ خصوصاً مسٹر سنہا (جو آگے چل کر لارڈ سنہا بنے) اس کے بہت خلاف تھے مگر عین وقت پر مخالفین بھی اس کے موید ہو گئے۔ کونسل کے پہلے ہی جلسہ کے موقعہ پر ۲۴ر جنوری ۱۹۱۰ء کو کسی شخص نے دن دہاڑے کلکتہ ہائی کورٹ کے اندر پولیس کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اس حادثہ نے پوری صورتِ حال بدل دی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر یہ واقعہ نہ پیش آیا ہوتا تو مسٹر سنہا اس بل کے سلسلہ میں ممبری سے مستعفی ہو جاتے بہرحال یہ بل قانون بن ہی گیا۔ اس قانون میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ اخباروں اور چھاپہ خانوں سے رقم ضمانت جمع کرائی جائے اور پھر تادیباً اسے ضبط کر لیا جائے۔

لارڈ منٹو کی جگہ لارڈ ہارڈنگ، ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ جارج پنجم بادشاہ ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں اُن کی تاجپوشی کا دربار دہلی میں منعقد ہوا۔ اس دربار میں بنگال کی تقسیم کی تنسیخ کا اعلان کیا گیا۔ نیز بنگال کو پریسیڈنسی صوبہ بنانے اور ہندوستان کے دارالسلطنت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان کیا گیا۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ کے اعلان نے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا کی کیونکہ حکومت نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ تقسیم بنگال کا مقصد دراصل ہندوستان میں ایک اسلامی صوبہ کا قیام تھا۔ حکومت کے اس اعلان نے مسلمانوں میں بے چینی پیدا کر دی تھی لیکن سر آغا خاں اور مسلم لیگ کے دوسرے سربرآوردہ حضرات نے مسلم جماعت کی اس بے چینی کو ختم کر دیا۔

جہاں تک سیاسی مسلک کا تعلق تھا، کامریڈ "اربابِ علیگڈھ کا خوشہ چیں" تھا جن کو اُس زمانہ کے تعلیم یافتہ مسلمان مذہب اور سیاست میں اپنا قطعی رہنما سمجھتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے الہلال جاری ہوا جو اپنے سیاسی، علمی و دینی مباحث کے اعتبار سے یورپ اور امریکہ کے بلند پایہ رسائل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کے اندر سیاسی و مذہبی انقلاب پیدا کرنے میں بڑی مدد کی۔

بیسویں صدی میں ہندوستانی صحافت کا پہلا دور ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ اس دور میں دو قابلِ ذکر اخبار جاری ہوئے جو ابتک زندہ ہیں۔ ایک الہ آباد کا لیڈر اور دوسرا بمبئی کا "بمبئی کرانیکل"۔ لیڈر کو ۱۹۰۹ء

میں پنڈت مدن موہن مالوی نے جاری کیا اور مسٹر چنتامنی آنجہانی نے چار چاند لگا دئے۔ اس اخبار کے ہمدردوں میں ہم کو ڈنشا واچا اور فیروز شاہ مہتا وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ معتدلین کا اخبار تھا اور آج بھی اعتدال پسند نقطۂ خیال کی نمایندگی کرتا ہے۔

بمبئی کرانیکل کا اس دور کے اختتام سے کوئی ڈیڑھ سال قبل یعنی ۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو بمبئی سے اجرا ہوا۔ اس اخبار کے اڈیٹر مشہور غیر ملکی محب ہندوستان (Benjamin Guy Horniman) تھے آپ اس سے قبل انگلستان کے مانچسٹر گارڈین اور اسٹیٹسمین کلکتہ کے مدیر رہ چکے تھے۔ تقسیم بنگالہ کے خلاف بنگالیوں نے جو تحریک شروع کی تھی مسٹر ہارنی مین نے اُس تحریک کے ساتھ صرف ہمدردی ہی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ عملی طور پر اُس میں حصہ بھی لیا تھا۔ بمبئی کرانیکل بھی لیڈر کی طرح معتدلین کی نمایندگی کے لئے نکالا گیا تھا مگر وہ آگے چل کر انتہا پسند ہوگیا اور آجتک کانگریس کے نقطۂ خیال کی نمایندگی کر رہا ہے۔ ہارنی مین کے بعد بمبئی کرانیکل کے اڈیٹر مشہور نومسلم اہل قلم مسٹر پکتھال مرحوم ہوئے اور اُن کے بعد اس کے اڈیٹر مسٹر سید عبداللہ بریلوی ہوئے جو اب تک یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور جن کو ملک کے اخبار نویسوں میں بہت عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

پچھلی جنگ عظیم اور اُس کے بعد

۴ اگست ۱۹۱۴ء کو جنگ کا آغاز ہوا اور بقول مارگریٹا بارنس :-

"اُس کے ساتھ ہی ہندوستان میں شدید کشمکش کا دور شروع ہوا یہ دور خود حکومت کے لئے بھی کچھ کم پریشان کن نہ تھا۔۔۔۔۔ اِس وقت ہندوستان سے ایک ایسی لڑائی کے لئے مدد مانگی جا رہی تھی جو "خود اختیاری" (Self-determination) کے لئے لڑی جا رہی تھی اور یہ ایک ایسا مقصد تھا جسکے حصول کے لئے خود ہندوستان کئی پشتوں سے جد و جہد کر رہا تھا"[1]

آغاز جنگ کے ساتھ ہی حکومت نے ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ ضروری سمجھا۔ اسوقت ہندوستانی اور انگلو انڈین اخبارات کے زاویۂ نگاہ میں قطبین کا فرق ہے۔

اس دور کے وہ واقعات جو صحافت پر اثر انداز ہوئے یا جن کا صحافت سے تعلق ہے اختصار کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں :-

اِس زمانہ میں بہت سے ہندوستانی اخبارات کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ اکثر اخبارات کے اڈیٹر اور بہت سے لیڈر نظر بند کر دئے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں ملک کے دو مشہور محب وطن سر فیروز شاہ مہتا اور گوکھلے کا انتقال ہوا۔

۱۹۱۶ء میں لارڈ چیمسفورڈ ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں دبے لفظوں

[1] Margrita Barns, "The Indian Press" P. 136

میں یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے اندر اصلاحات کے نفاذ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس اظہار خیال نے ہندوستانی رائے عامہ کو بیحد مایوس کیا۔ اسی سنہ میں مسز اینی بیسنٹ نے مدراس کے مشہور اخبار "مدراس اسٹینڈرڈ" کو خرید کر "نیو انڈیا" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اُن کے اخبار کی ضمانت ضبط کی گئی اور دس ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں مسز اینی بیسنٹ نے پریوی کونسل میں اپیل کی جو کامیاب رہی اور حکومت مدراس کو اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا۔

اسی سنہ میں وائسرائے کی خدمت میں اخبار نویسوں کا ایک وفد حاضر ہوا۔ اس وفد نے اپیل کی کہ حکومت ۱۹۱۰ء کے قانون مطابع کو منسوخ کر دے۔ لیکن وائسرائے نے اس کے جواب میں اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

۱۹۱۸ء میں ایک پبلسٹی بیورو شملہ میں قایم کیا گیا۔ اس کا مقصد اخبارات اور حکومت کے درمیان خوشگوار تعلقات قایم کرنا تھا۔ اور اسی سنہ میں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے آرگن "سرونٹ آف انڈیا" کا پونہ سے اجراء ہوا اور اسی سنہ کے آخری زمانہ میں لڑائی کا بھی خاتمہ ہوا

۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ پاس ہوا۔ اس ایکٹ کی شانِ نزول یہ تھی کہ ۱۹۱۷ء میں حکومت نے ایک کمیٹی مسٹر رولٹ کی صدارت میں مقرر کی۔ اس کمیٹی کا کام دہشت انگیزی کی تحریک کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کرنا اور اُسکے انسداد کی تدابیر تجویز کرنا تھا۔ حکومت نے اس کمیٹی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جلد ہی بل کی شکل میں مرتب کر کے قانونی درجہ دیدیا۔ اس قانون کے مطابق جج بلا جوری کے سیاسی مقدمات کی سماعت کر سکتے تھے اور پھر اُنکے فیصلوں کی اپیل بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ نیز وہ لوگ جن کو سیاسی وجوہ کی بنا پر مشکوک سمجھا جائے، اُن سے ضمانتیں اور مچلکے طلب کئے جا سکتے تھے اور اُن کو غیر معین وقت کے لئے نظر بند کیا جا سکتا تھا۔

اسی سلسلہ میں جلیان والا باغ کا حادثہ پیش آیا۔ مدراس کے "ہندو" اور بمبئی کرانیکل کی ضمانتیں ضبط کی گئیں۔ بمبئی کرانیکل کے اڈیٹر مسٹر ہارنی مین کو جلا وطن کیا گیا اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ اخبار کا افتتاحیہ سنسر کرانے کے بعد چھاپا جائے۔ چند روز تک تو اس پر عمل ہوتا رہا مگر اس سلسلہ میں ایسی دشواریاں پیدا ہوئیں کہ ادارے نے یہ طے کیا کہ افتتاحیہ کی جگہ خالی چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہے۔

۱۹۱۹ء کے اوائل میں شمالی ہند سے ایک نئے روزنامہ کا اجرار ہوا۔ یہ موتی لال نہرو کا اخبار "انڈیپنڈنٹ" (Independent) تھا، جو الہ آباد سے نکلتا تھا۔ اس اخبار کے اجراء کے اسباب جواہر لال نہرو یہ بیان کرتے ہیں:۔

> "پنجاب کے واقعات اور اُن کی تحقیقات کا والد پر بیحد گہرا اثر ہوا۔ اب وہ اپنی پُرانی اعتدال پسندی سے بہت دور ہٹ چکے تھے۔ الہ آباد کے مشہور اخبار لیڈر سے غیر مطمئن ہو کر انھوں نے ۱۹۱۹ء کے اوائل میں اپنا ایک اخبار انڈیپنڈنٹ کے نام سے نکالنا شروع کر دیا۔"[1]

اس اخبار کی مدتِ حیات زیادہ نہ تھی چنانچہ ۱۹۲۲ء میں وہ بند ہو گیا۔

[1] Jawaherlal Nehru, "An Autobiography p. 44.

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو تلک اس دنیا سے گزر گئے۔ اسی دن گاندھی جی نے اپنی تحریک ستیہ گرہ کا آغاز کیا۔ یہ تحریک کانگریس اور خلافت کی مشترکہ تحریک تھی۔ اسی زمانہ میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی رپورٹ نے قانونی شکل اختیار کی۔ ملک کا انتہا پسند طبقہ اس اسکیم سے قطعاً مطمئن نہ تھا اور معتدلین بھی کچھ زیادہ خوش نہ تھے، اس موقعہ پر انگلو انڈین اخبارات نے حکومت اور اصلاحات کی حمایت کی۔ ملکی اخبارات جو اعتدال پسند تھے وہ حکومت کی حمایت اور معتدلین کی وکالت پُرزور انداز میں کر رہے تھے۔ لیکن قوم پرور اخبارات انتہا پسندوں کے ہمنوا تھے۔

ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس کی سیاسی اُفتادِ طبع انتہا پسندوں کے ساتھ لگا نہ کھاتی تھی لیکن وہ حکومت کے ساتھ بھی اُن قوانین کی موجودگی میں تعاون کرنے کے لئے طیار نہ تھا جو اُسوقت موجود تھے۔ اسی طبقہ کو اپنا ہمدرد بنانے کے لئے حکومت نے مروجہ قوانین کی تحقیقات کے لئے کئی کمیٹیاں مقرر کیں۔ اسی سلسلہ میں ایک کمیٹی صحافت کے قوانین کی جانچ پڑتال کے لئے بھی قایم ہوئی۔ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ صحافت اور مطابع کے لئے تین قانون موجود تھے ایک ۱۸۶۷ء کا۔ دوسرا ۱۹۰۸ء کا اور تیسرا ۱۹۱۰ء کا۔ کمیٹی اس نتیجہ پر پہونچی کہ ان قوانین میں آخری دو قانونوں کو منسوخ کر دیا جائے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اِن قوانین کا ہندوستانی اور انگلو انڈین اخبارات کے لئے یکساں استعمال نہیں کیا گیا۔

حکومت نے جو کمیٹیاں مقرر کی تھیں ان کی سفارش کی روشنی میں مرکزی اسمبلی نے ۱۹۲۲ء میں تقریباً دو درجن قوانین منسوخ کر دئے۔ ان میں پریس کے متعلق بھی وہ دونوں قوانین شامل تھے جن کی کمیٹی نے سفارش کی تھی۔

۱۹۲۲ء میں کانگریس کے اندر ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا جو داخلۂ کونسل کا حامی تھا۔ اس جماعت کے لیڈر مسٹر سی، آر، داس اور موتی لال نہرو تھے۔ مسٹر داس، گیا کانگریس کے صدر تھے، جب کانگرس کے اجلاس میں یہ تجویز انھوں نے پیش کی تو بہت بڑی اکثریت نے اس کی مخالفت کی اور یہ تحریک مسترد ہوگئی۔ مسٹر داس نے کانگرس کی صدارت سے استعفیٰ دیا اور اُسی دن "سواراج پارٹی" کی بنا ڈالی۔ جلد ہی اُن کو اپنی کوششوں میں کامیابی ہوئی اور کانگرس کو بھی اُنکے مطالبے کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس جماعت نے اپنے نقطۂ خیال کی نمایندگی کے سلسلہ میں اخبار کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی، چنانچہ "ہندوستان ٹائمز" نے جلد ہی اس کمی کو پورا کر دیا۔ آج بھی یہ اخبار کانگرس کے داہنے بازو کے نقطۂ خیال کا نمایندہ ہے۔

ہندوستانی رائے عامہ کے ارتقاء نے جلد ہی لوگوں کو ہندوستانی خبر رساں ایجنسی کی ضرورت کی طرف بھی متوجہ کیا ملک میں اسوشیٹیڈ پریس موجود تھا مگر اُس کا بڑی حد تک حکومت سے تعلق تھا، اس لئے قوم پرور طبقہ کو اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اس شکل پر قابو حاصل کرنے کے لئے ۱۹۲۷ء میں فری پریس (Free Press) کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے روح رواں مسٹر جیکر، ڈاکٹر بیسنٹ جی، ڈی برلا اور مسٹر وال چند ہیرا چند وغیرہ تھے۔ اس خبر رساں اجنسی نے بہت جلد ترقی کی اور اُسی سرعت کے ساتھ زوال پذیر بھی ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کے علاوہ اور دوسرے ملکوں کی خبریں بھی اُس نے فراہم کرنا شروع کر دی تھیں اور اس سلسلہ میں اُس کا ایک دفتر لندن میں قایم تھا۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں اُس کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۹۳۳ء میں ایک دوسری خبر رساں اجنسی یونائیٹڈ پرس کے نام سے بنگال میں قایم ہوئی۔ یہ خالصاً کانگرس کے خیال کی نمایندگی کرتی ہے۔ ابتدا میں تو اُس کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی مگر کانگرس وزارتوں کے عہد میں اُسنے کچھ ترقی کی ہے۔

لارڈ ارون کا دورِ حکومت بڑا ہی ہنگامہ خیز تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی نے ۱۹۳۰ء میں نمک سازی کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے (Ordinance) کا نفاذ شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر پریس بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ پریس آرڈیننس (Indian Press Ordinance 1930) کے نام سے ایک قانون نافذ ہوا۔ اس قانون میں ان تمام قوانین کا نچوڑ موجود تھا جو منسوخ ہوئے تھے اور اِس سلسلہ میں بہت سے ہندوستانی اخبارات سے ضمانتیں طلب کی گئیں۔

موجودہ جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی حکومت نے ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ ضروری سمجھا۔ اور اُسکے ساتھ ہی پریس کی آزادی بڑی حد تک قطعاً ختم ہوگئی۔ ابتدا میں تو حکومت اور اخبارات کے تعلقات بیحد خراب ہوگئے تھے لیکن بعد میں " آل انڈیا نیوز پیپرس اسوسیشن (All India News papers Association) قایم ہوئی۔ اور دہلی میں تمام ملک کے اڈیٹروں کی ایک کانفرنس قایم ہوئی۔ حکومت نے اُس کے بعد اخبارات کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی بنائی اور اس کی شاخیں صوبوں کی حکومتوں نے بھی قایم کیں اور یہ طے پایا کہ حکومت کسی اخبار کے خلاف بلا اس مشاورتی کمیٹی سے مشورہ کئے ہوئے کوئی قدم نہ اُٹھائے۔

ذیل میں اُن قابلِ ذکر اخبارات کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو اسوقت موجود ہیں:

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت	نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
نیشنل ہیرالڈ	انگریزی	لکھنؤ	روزنامہ	ڈیلی ہیرالڈ	"	لاہور	روزنامہ
پانیر	"	"	"	سنڈے ٹائمز	"	"	ہفتہ وار
لیڈر	"	الہ آباد	"	نیو ٹائمز	"	"	"
اسٹار	"	"	سہ روزہ	ایسٹرن ٹائمز	"	"	"
ہندوستان ٹائمز	"	دہلی	روزنامہ	منڈے مارننگ	"	"	"
نیشنل کال	"	"	"	ڈیلی گزٹ	"	کراچی	روزنامہ
اسٹیٹسمین	"	"	"	کراچی ڈیلی	"	"	"
یونائیٹڈ انڈیا اینڈ اسٹیٹس	"	"	سہ روزہ	سندھ آبزرور	"	"	"
کامرس اینڈ انڈسٹری	"	"	ہفتہ وار	خیبر میل	"	پشاور	ہفتہ وار
سول اینڈ ملٹری گزٹ	"	لاہور	روزنامہ	بمبئی کرانیکل	"	بمبئی	روزنامہ ہفتہ وار
ٹریبیون	"	"	"	ٹائمز آف انڈیا	"	"	روزنامہ

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
اسٹار	انگریزی	بمبئی	روزنامہ
اوننگ نیوز آف انڈیا	"	"	"
بمبئی سنٹی نل	"	"	"
کامرس	"	"	"
فائینانشل نیوز	"	"	"
السٹرئیڈ ویکلی آف انڈیا	"	"	"
انڈین سوشل رفارمر	"	"	"
ویکلی نیوز آف انڈیا	"	"	"
ڈیلی نیوز	"	ناگپور	روزنامہ
ہتواڈا	"	"	سہ روزہ
انڈیپنڈنٹ	"	"	ہفتہ وار
ہندو	"	مدراس	روزنامہ
انڈین ایکسپرس	"	"	"
مدراس میل	"	"	"
جسٹس	"	"	ہفتہ وار
ڈیلی پوسٹ	"	بنگلور	روزنامہ
اسٹیٹسمین	"	کلکتہ	"
اسٹار آف انڈیا	"	"	"
ہندوستان اسٹینڈرڈ	"	"	"
اڈوانس	"	"	"
امرت بازار پترکا	"	"	"
کیپٹل	"	"	ہفتہ وار
انڈین اکنامسٹ	"	"	"
اورینٹ	"	"	"
سلہٹ کرانیکل	"	سلہٹ	"
ٹائمز آف آسام	"	"	"

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
انڈین نیشن	انگریزی	پٹنہ	روزنامہ
سرچ لائٹ	"	"	"
نیو اڑیسہ	"	کٹک	"
آبزرور	"	"	ہفتہ وار
حقیقت	اُردو	لکھنؤ	روزنامہ
ہمدم	"	"	"
حق	"	"	"
ہندوستان	"	"	ہفتہ وار
مدینہ	"	بجنور	سہ روزہ
تیج	"	دہلی	روزنامہ و ہفتہ وار
وحدت	"	"	"
سوراج	"	"	"
وطن	"	"	"
ریاست	"	"	ہفتہ وار
منادی	"	"	"
دین دُنیا	"	"	"
الامان	"	"	سہ روزہ
الجمعیت	"	"	"
انقلاب	"	لاہور	روزنامہ
احسان	"	"	"
زمیندار	"	"	"
ملاپ	"	"	"
پرتاپ	"	"	"
ہندو	"	"	"
زمزم	"	"	"
کرم ویر	"	"	ہفتہ وار

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
شکارپور گزٹ	سندھی	شکارپور سندھ	ہفتہ وار
فرنٹیر ایڈووکیٹ	اُردو	پشاور	روزنامہ
اصلاح سرحد	//	//	ہفتہ وار
مجاہد	//	//	//
ترجمان سرحد	//	//	//
وجیہ پربھات	//	//	روزنامہ
سرحد	//	//	//
اجمل	//	بمبئی	//
خلافت	//	//	//
قوم	//	بنگلور	ہفتہ وار
ہند جدید	//	کلکتہ	روزنامہ و ہفتہ وار
عصر جدید	//	//	//
مسلم	//	پٹنہ	سہ روزہ
اتحاد	//	//	//
نقیب	//	//	ہفتہ وار
جیون	//	//	//
البرہان	//	ناگپور	//
الفاروق	//	//	//
نظام	//	سندھ	//
آج	ہندی	بنارس	روزنامہ
پرتاب	//	کانپور	//
بھارت	//	//	//
نواجیوتی	//	اجمیر	ہفتہ وار
راجستان	//	//	//
سنگھرش	//	لکھنؤ	//
لوکومانیہ	//	کلکتہ	روزنامہ
وشوامتر	ہندی	کلکتہ	روزنامہ
نواشکتی	//	پٹنہ	روزنامہ و ہفتہ وار
جنتا	//	//	روزنامہ
یوگی	//	//	ہفتہ وار
کرم ویر	//	صوبہ متوسط	//
سواراجیہ	//	//	//
ہندوستان	//	دہلی	روزنامہ
ویر ارجن	//	//	//
ہندو	//	//	ہفتہ وار
الواحد	سندھی	سندھ	روزنامہ
ہندو	//	//	//
ہندو سماج	//	//	ہفتہ وار
قربانی	//	//	//
دھرم ویر	انگلوسندھی	//	//
سندھ سدھار	//	//	//
ستارہ ہند	//	//	//
سندھ زمیندار	//	//	سہ روزہ
پارسی سنسار لوک سیوت	انگلوگجراتی	//	//
اکالی پترکا	گورمکھی	پنجاب	ہفتہ وار
فتح	//	//	//
خالصہ سیوک	//	//	//
موجی	//	//	//
فرنٹیر ایڈووکیٹ	پشتو	پشاور	روزنامہ و ہفتہ وار
سرحد	//	//	ہفتہ وار
آشا	آڑیا	آڑیسہ	روزنامہ
دیش کتھن	//	//	//

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت	نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
سماج	اڑیا	اڑیسہ	روزنامہ و ہفتہ وار	یودایا	مرہٹی	صوبہ متوسط	ہفتہ وار
شکتی	〃	〃	ہفتہ وار	کیسری	〃	بمبئی	سہ روزہ
لوک ماتا	〃	〃	〃	ناواکال	〃	〃	〃
آنندا وکتان	تامل	مدراس	〃	لوکا شکتی	〃	〃	روزنامہ
دار السلام	〃	〃	سہ روزہ	لوکومانیہ	〃	〃	روزنامہ و ہفتہ وار
جدید دلچسپ	〃	〃	ہفتہ وار	دینین پرکاش	〃	〃	روزنامہ
کودی ارانسو	〃	〃	〃	بھول جیب	〃	〃	ہفتہ وار
کما ان	〃	〃	〃	شری وینکٹیشور	〃	〃	〃
جے بھارتی	〃	〃	روزنامہ	تارن بھارت	〃	〃	〃
دھنیا مانی	〃	〃	〃	ویودہ ورتھا	〃	〃	〃
تامل مان	〃	〃	〃	تری کال	〃	〃	〃
وڈوتھالی	〃	〃	〃	پرکاش	〃	〃	〃
اندھرا پترکا	تلگو	〃	روزنامہ و ہفتہ وار	ممبئی کامگار	〃	〃	〃
جنوانی	〃	〃	〃	جنتا	〃	〃	〃
اندھرارتنا	〃	〃	سہ روزہ	دھائن دھاری	〃	〃	〃
کسٹانا پترکا	〃	〃	ہفتہ وار	اوہان	〃	〃	〃
پرجا بندھو	〃	〃	〃	سانج ورتمان	〃	〃	〃
پرجا متر	〃	〃	〃	بمبئی سماچار	گجراتی	〃	روزنامہ و ہفتہ وار
تری لنگا	〃	〃	〃	دیش متر	〃	〃	〃
وھینی	〃	〃	〃	گجرات سماچار	〃	〃	〃
زمین رعیت	〃	〃	〃	گجرات	〃	〃	〃
کانتی ریوہ	کرانی	〃	سہ روزہ	ہندوستان پرجا متر	〃	〃	〃
پربھات	〃	〃	ہفتہ وار	انصاف	〃	〃	〃
سوتنترہ	〃	〃	〃	جنم بھومی	〃	〃	〃
ماتر بھومی	ملیالم	〃	〃	لوک مات	〃	〃	〃
مہاراشٹرا	مرہٹی	صوبہ متوسط	〃	پرتاب	〃	〃	ہفتہ وار

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت	نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
پرجامترکساری	گجراتی	بمبئی	ہفتہ وار	کیساری	بنگالی	بمبئی	روزنامہ ہفتہ وار
نیوپرکاش	″	″	″	پنچانیہ	″	″	″ ″
مسلم گجراتی	″	″	″	دیش	″	″	″
مزدور سندیش	″	″	″	حنفی	″	″	″
قوم سیوک	″	″	″	محمدی	″	″	″
گجراتی	″	″	″	نواشکتی	″	″	″
گجرات متر	انگلوگجراتی	″	روزنامہ	سنجیوانی	″	″	″
گجرات درپن	″	″	″	سوادش	″	کلکتہ	ہفتہ وار
گجرات پنچ	″	″	″	نیجاہت	″	″	″
جام جمشید	″	″	″	سنگا ٹھور	″	بہار	″
قیصر ہند	″	″	″	جناشکتی	″	آسام	″
انند بازار پترکا	بنگالی	″	روزنامہ ہفتہ وار	جگابھیری	″	″	″
آزاد	″	″	″ ″	جگاشکتی	″	″	″
بندے ماترم	″	″	″ ″	باتوری	آسامی	″	روزنامہ
بنگ باسی	″	″	″ ″	آسامیہ	″	″	ہفتہ وار
باسومتی	″	″	″ ″	وبکا آسوم	″	″	″
تہوادی	″	″	″ ″	پرتیبا	انگلوآسامی	″	″
اسماعیلی	انگلوگجراتی	″	روزنامہ	—	—	—	—

محمد عتیق صدیقی

نگاہِ بازگشت

(مسلسل)

۱۴- حسرت موہانی حضرت حسرت موہانی ملک کے مشہور شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ حضرت تسلیم کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ آپ کا رنگِ سخن ہمیں داغ و جلال و امیر کا زمانۂ شاعری یاد دلاتا ہے۔ آپ کی شاعری میں تقلید کے عنصر کی فراوانی اور پامال و فرسودہ مضامین کی بہتات ہے۔ آپ کے کلام کی بنیاد بجائے جذبات کے زیادہ تر تخئیل پر ہے۔ اور آپ کے اشعار لکھنوی رنگِ شاعری کا نمونہ۔ آپ کے کلام میں حقیقی جذبات اور وجدانی حسیات کی کمی اور اشعار میں زیادہ تر محبوب کے خارجی اوصاف کی تعریف ہے آپ کے کلام میں فکر و خیال کی بلندی و تنوع کم اور روایتی تغزل کے مضامین کی کثرت ہے۔ اس کے علاوہ اشعار میں نہ سوز و گداز ہے اور نہ اثر آفرینی۔ اُنکے یہاں زندگی پر نہ کوئی تنقیدی نظر ہے اور نہ حیات و کائنات کا مشاہدہ و مطالعہ۔ ان کی شاعری نہ نفسیات انسانی کا تجزیہ ہے اور نہ حقیقی جذبات و احساسات کا پرتو۔ بلکہ اِن کی شاعری میں روایتی شاعری کی بنا پر وہی محبوب کی عشوہ طرازیاں اور ستمکاریاں ہیں اور وہی لکھنوی رنگِ تغزل کی داستانِ پارینہ جن کو الفاظ کا ایک نیا لباس دیکر پیش کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:۔

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا

اس سلیقے سے کیا ذبح کہ دامن اُن کا — خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا

لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذت آزارِ عشق — اُس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

مائلِ شوق مجھے پاکے وہ بولے ہنسکر — دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو

فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ — پہلے کس ناز سے رو رو کے سنوارے گیسو

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اُس پیرہن میں تھی

کبھی چُرا کے جو روزن سے بھی تجھے دیکھوں — تو چور کی جو سزا ہو وہی سزا میری

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے — مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے

اِن تمام اشعار کو دیکھنے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ اِن اشعار میں جذبات کی پاکیزگی ہے نہ بلندی۔ نہ معنی آفرینی ہے نہ علوئے تخئیل۔ اسی لحاظ سے الفاظ میں بھی متانت کم اور عمومیت زیادہ ہے۔ ظاہری کلام کی نفاست خود جذبات و تخئیل کی پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے۔ شاعر کے انفا

میں اثر اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر کتاب میں پڑھی ہوئی یا سُنی سُنائی باتوں کے بجائے اپنی زندگی کی حقیقی واردات کا اظہار کرے۔ اگر اُس میں خلوص نہیں ہے تو وہ محاوروں کا کیسا ہی برمحل استعمال کیوں نہ کرے اُس کی آواز کھوکھلی مصنوعی اور بے اثر رہے گی۔ اور پھر اس قسم کے اشعار سُنتے سُنتے تو اب طبیعت بھی بھر گئی ہے اور ان میں اب کوئی دلکشی باقی نہیں ہے۔

ہمیں جنابِ حسرت کے یہاں توانئ تشبیہات کی مثالیں تو نہیں البتہ خارجی شاعری کے نمونے زیادہ ملتے ہیں اور اگرچہ باقی و داخلی شاعری کے کہیں کہیں اشعار پائے بھی جاتے ہیں تو اُن میں سے بہت سے اشعار پاکیزگی و متانت سے گرے ہوئے ہیں اور سطحی خیالات و جذبات کا نمونہ ہیں۔ جیسے:۔

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

تصور میں وہ شوخ تھا ہم سے باہم
عجب لذت بیخودی تھی فراہم

دعوت میں تری میں بھی ہوں معلوم ہے لیکن
کیا غیر کی خاطر سے ہے کیا میرے لئے ہے

نہیں کھلتی مری نسبت تری اے حیلہ جو مرضی
کہ ہے اقرارِ دلجوئی نہ انکارِ ستمگاری

پر سر نازدہ از راہِ کرم پہونچا تھا
شب عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا

ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا
تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

(لفظِ کام کی معنویت یہاں ذرا دادطلب ہے)

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے

دِل کچھ اس ڈھب سے لئے اسنے کہ بسوگمی
حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

ان سب اشعار میں اور خصوصاً آخر کے دو شعروں میں جنابِ حسرت نے اپنے محبوب کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جو معیار مقرر کیا ہے وہ اہلِ ذوق حضرات کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جنابِ حسرت ایک مشاق شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی کہنہ مشقگی کی بدولت کہیں کہیں معاملہ بندی کے اچھے اشعار نکال لئے ہیں، اور جو فنی اعتبار سے بے عیب بھی ہیں لیکن ان کی تخلیق جمال کی کوشش میں کسی قسم کی بلندی اور عظمت نہیں پائی جاتی۔ ان کی شاعری زندگی سے بہت دور ہے اور اس لئے مصنوعی ہے اور یہ فرسودگیِ بیان اس دورِ جدید میں نہ لائقِ ستائش ہے نہ قابلِ توجہ۔ اور اگر میں یہاں یہ کہوں تو شاید نامناسب نہ ہوگا کہ:۔

طرح نو افگن کہ ماجدت پسند اُفتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز فردا ساختی

لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ جنابِ حسرت کے یہاں تغزل کی عمدہ مثالیں نہیں ملتیں۔ آپ کے یہاں تغزل کا صحیح رنگ موجود ہے مگر کم۔ اور وہ بھی سب روایتی و تقلیدی عناصر کی بنیادوں پر۔ چنانچہ آپ کے اچھے اشعار کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریِ دل
التفات اُنکی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

اک برقِ تپاں ہے کہ تکلم ہے تمہارا
اِک سحر ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمہارا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ کیا

آئی جو اُن کی یاد مرا دِل ٹھہر گیا
دعوئے غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حُسن،
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

اِک رنگِ التفات بھی اس بے رُخی میں تھا
اِک سادگی بھی اس نگہِ سحرفن میں تھی

گو ان اشعار کے بعض مضامین فرسودہ ہیں مگر جناب حسرت کی مشاقی اور اُن کے اندازِ بیان نے ان میں ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان اشعار کا طرزِ ادا اور ندرتِ بیان یقیناً قابلِ ستایش ہے۔

یہ اور اسی قسم کے اشعار حضرتِ حسرت کی مشاقی کا ثبوت ہیں اور ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ کے بعض بعض اشعار میں فارسیت، کا بے محل استعمال شعر کو بے کیف کر دیتا ہے۔ جیسے:

وہ قامتِ بلند نہیں در قبائے ناز
اک سرو ناز ہے جو بنا ہو برائے ناز

اک طرفہ ماجرا ہے درِ کوئے میفروشاں
سرگرم بادہ نوشی انبوہِ خرقہ پوشاں

'در قبائے ناز' اور 'در کوئے میفروشاں' میں یہ لفظِ 'در' لباسِ شعر میں ایک پیوند کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت غیر مانوس معلوم ہوتا ہے۔

جناب حسرت نے بعض جگہ نامناسب تصرفات سے کام لیا ہے مثلاً یہ شعر:-

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں
دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں

یہ لفظِ "یاریاں" بھی صحیح مذاقِ شعری کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

جناب حسرت کے یہاں بعض اشعار میں مناسب الفاظ کو چھوڑ کر ضرورتِ شعری یا کسی اور وجہ سے اُنکی جگہ دوسرے نامناسب اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال شعر کے لطف کو زائل کر دیتا ہے۔ جیسے "آسودگی" کے بجائے غزل کے لئے ایک غیر مانوس اور ثقیل لفظ "فراغت" بکثرت استعمال کیا ہے اور اس مختصر سے انتخاب میں ہمیں یہ لفظ تین جگہ نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

سب سے منھ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

عہدِ یک عمر فراغت سے بھی خوشتر گزرا
وہ جو یک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

سب کی خاطر کا ہے خیال تمھیں
کچھ ہمارا بھی انتظام کرو

اِس لفظ "انتظام" کا استعمال یہاں کہاں تک موزوں ہے وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اِس قسم کی مثالیں

جناب حسرت کے کلام میں اور بھی اکثر و بیشتر پائی جاتی ہیں۔[1]

۱۵۔ حفیظ جالندھری

جناب حفیظ جالندھری، پنجاب کے مشہور نظم گو شاعر ہیں مگر آپ کا انتخاب کلام، دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ غزل بھی خوب کہتے ہیں۔ آپ کا فطری رجحان غزل ہی کی طرف ہے۔ آپ کی غزلوں میں وہ لوچ، شیرینی اور سُریلاپن موجود ہے جو تغزل کے لئے مخصوص ہے۔ آپ کی زندگی بھی عسرت اور فلاکت میں بسر ہوئی ہے اور آپ کو اپنے دورانِ حیات میں مختلف قسم کے مصائب سے دو چار ہونا پڑا۔ مگر آپ نے اپنے اشعار میں زمانے کی شکایت نہیں کی اور اگر انھوں نے کہیں شکوے کے لئے اپنے لب کھولے بھی ہیں تو احسان کی طرح آگ نہیں برسائی ہے بلکہ اُس میں بھی غزل کا مانوس انداز اور لب و لہجہ کا دھیماپن موجود ہے۔ جیسے:۔

دوستوں کی بے وفائی پر حفیظ   صبر کرنا بھی مجھے آ جائے گا

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار   آہ بھر لیتا ہوں میں فریاد کر لیتا ہوں میں

آپ کے اشعار میں سوز و گداز اور درد و اثر کے ساتھ ساتھ تخیئل بلند اور ندرتِ مضامین کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ معمولی سی بات کو اس اسلوب کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ شعر میں ایک قسم کی جدت محسوس ہونے لگتی ہے۔ جیسے:

اُٹھا رکھا ہے میں نے آپ کا دیدار محشر پر   مرا منھ تک رہے ہیں میری ہمت دیکھنے والے

صرف شعر کے طرزِ ادا اور لہجہ نے شعر میں کس قدر قوت پیدا کر دی ہے۔

اسلوب بیان کی چند اور عمدہ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

وہ اور ہمارے پاس خدا سازبات تھی   ہم مدتوں خدا کی قسم بد گماں رہے

ہمت بلند تھی مگر اُفتاد دیکھنا   چپ چاپ آج محوِ دُعا ہو گیا ہوں میں

مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو   کہ جینے کے لئے مجبور ہوں میں

ابھی باقی ہے میعادِ مصیبت   ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

آخری شعر طرزِ ادا اور اندازِ بیان کے علاوہ سوز و گداز کا مرقع ہے اور نہایت پر اثر۔ جینے کی تمنا صرف اسلئے کہ ابھی کچھ اور مصیبتیں نازل ہونے والی ہیں اور اُن کو سہنا ہے نہ صرف شاعر کے سوز و گداز اور حسرت کی انتہائی منزل کی طرف اشارہ کر رہا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ شاعر کی علوئے ہمت اور ضبط و تحمل کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ ایک صریح طنز کی مثال ملاحظہ ہو:۔

تمام زادِ سفر راستے میں لٹ جاتا   خدا نے فضل کیا کوئی رہنما نہ ملا

لفظ "رہنما" رکھکر جو طنز پیدا کیا ہے وہ نہایت پُر لطف ہے۔ بعض بعض شعر آپ کے بہت سادہ مگر نہایت پُر کیف

---

[1] مقالہ نگار نے حسرت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بغیر کسی حذف و اضافہ کے بجنسہٖ شایع کر دیا ہے، کیونکہ حسرت کی شاعری کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور اس "سب" کے جواب میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ "سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست۔" حسرت کے تغزل سے لطف اُٹھانے کے لئے جس ذوق کی ضرورت ہے وہ یقیناً اتنا عام نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہئے۔ میر کے یہاں بھی بعض حضرات کو سوائے تخریب اخلاق کے اور کچھ نظر نہیں آتا ——— (نیاز)

ہیں ۔ جیسے:

ہم ہی ہیں تھی نہ کوئی بات یاد تم کو آ سکے — تم نے ہمیں بھلا دیا۔ ہم نہ تمھیں بھلا سکے

بھلائی نہیں جا سکیں گی وہ باتیں — تمھیں یاد آئیں گے ہم یاد رکھنا

تم نے دُنیا ہی بدل ڈالی مری — اب تو رہنے دو یہ دُنیا داریاں

حشر کے دن میری چپ کا ماجرا — کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

پھر مردہ آرزوؤں میں اک روح پھونک دی — گزرا پھر اس طرف سے کوئی دیکھتا ہوا

جوشِ بیان اور معنی آفرینی کی مثالیں ملاحظہ ہوں ۔ فرماتے ہیں :-

تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں — کہ شاید وہیں ہو ترقی کا زینہ

ناآشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست — کم بخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی — دو نوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

ندرتِ فکر اور تخئیل بلند کے نمونے بھی آپ کی شاعری میں پائے جاتے ہیں :-

بلندی پر اُٹھائیں تھیں نگاہیں — یہی تھی اولیں اُفتاد میری

حُسن بھی اب تو ٹھہرتا نہیں معیارِ نظر — آدمی شانِ خدا ہے تو خدا کیا ہوگا

مگر آپ کے کلام میں ابھی پختگی کی شان پیدا نہیں ہوئی ہے اور کہیں کہیں خامیاں بھی ہیں ۔ جیسے آپ کا ایک شعر ہے :-

او مبتلائے زیست ٹھہر خودکشی نہ کر — تیرا علاج زہر نہیں ہے شراب ہے

صرف "مبتلائے زیست" کی ترکیب سے کسی مفہوم کا تعین نہیں کیا جا سکتا ۔ ہاں "مبتلائے غمِ زیست یا مبتلائے آلامِ زیست" وغیرہ کوئی ترکیب ہوتی تو کوئی مفہوم پیدا ہو سکتا تھا[۱]

تھے حق شناس اور انا لحق نہ کہہ سکے — اہلِ زباں تھے ہم بھی مگر بے زباں رہے

"ہم بھی زبان رکھتے تھے" کے مفہوم میں جناب حفیظ نے "اہلِ زبان" کا ٹکڑا صرف کیا ہے جو میرے خیال میں فصیح نہیں اور "اہلِ زبان" کہنے سے سامع کا ذہن اصل مفہوم کی طرف منتقل ہونے کے بجائے "اہلِ زبان" کے اصطلاحی معنی کی طرف منتقل ہوتا ہے ۔ اگر دوسرے مصرعہ کو یوں نظم کرتے تو مفہوم بہت زیادہ واضح ہو جاتا اور "اہلِ زبان" کا ٹکڑا بھی نکل جاتا کہ "گو تھی زباں منہ میں مگر بے زباں رہے"

فرش سے مطمئن نہیں ۔ پست ہے ناپسند ہے — عرش بہت بلند ہے ۔ ذوقِ نظر کو کیا کروں

"پست ہے ناپسند ہے" نے شعر کے مفہوم کو بہت مبہم کر دیا ہے ۔ اگر پہلے مصرعہ کا مفہوم یوں قرار دیا جائے کہ فرش سے مطمئن نہیں اس لئے کہ پست ہے ۔ تو "ناپسند ہے" کا ٹکڑا بیکار رہوا جاتا ہے کہ "مطمئن نہیں" پہلے ہی صرف ہو چکا ہے ۔ اور اگر دونوں ٹکڑوں کو الگ کر کے پڑھا جائے کہ فرش سے مطمئن نہیں ۔ اور پست ناپسند ہے (حالانکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں) تو پھر بھی پست کے بعد کا "ہے" زائد ہوا جاتا ہے ۔ خدا معلوم فرش سے مطمئن نہیں کہنے کے بعد "پست ہے ناپسند ہے" سے کیا مفہوم پیدا کیا ہے ۔ ؟

---

[۱] اعتراض غلط ہے ، شاعر نے "مبتلائے زیست" کہہ کر یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ "زیست" بجائے خود ایک غم ہے ۔ جو شعر کا حسن ہے ، وہی آپ کے نزدیک قبح ہے ! نیاز

۱۶۔ دلؔ۔ شاہجہاں پوری

حضرت دلؔ شاہجہاں پوری جناب امیر مینائی مرحوم کے شاگرد ہیں اور اسوقت ملک کے مشاق شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کا مذاق پاکیزہ اور طبیعت متین ہے۔ آپ کا رنگِ سخن اُس شوخی و رندانہ بانکپن سے معرّا ہے جو داغی اسکول کے لئے مخصوص ہے، لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ اُن کا کلام یکسر بے کیف و بے لطف ہے۔ جناب دلؔ کے کلام میں وہی دلکشی و رعنائی پائی جاتی ہے جو ایک صحیح رنگِ تغزل میں ہونا چاہئے۔ آپ کے کلام میں جذبات کی وہ فراوانی نہیں ہے جو موجودہ دور میں ہمیں حضرتِ جگر کے یہاں نظر آتی ہے مگر پھر بھی غنائے تغزل کی مثالیں آپ کے یہاں موجود ہیں جو پرکیف بھی ہیں اور پر اثر بھی۔ آپ کی شاعری یکسر بین و مرثیہ بھی نہیں ہر چند کہ سوز و گداز سے آپ کا کلام خالی نہیں ہے۔ آپ ایک حقیقی شاعر ہیں اور اپنے جذبات و تاثرات کو نہایت مناسب و موزوں الفاظ میں ادا کرنا جانتے ہیں۔ گو تقلید کا عنصر بھی ہمیں کہیں کہیں آپ کے یہاں نظر آجاتا ہے جیسے:

بڑھے جوشِ جنوں میں دستِ وحشت جسقدر چاہے — قیامت کی ہے گنجائش مرے چاکِ گریباں میں
دیکھئے کب ختم ہو شوقِ نظر کا امتحاں — بڑھ گیا نازِ تجلی مجھ کو حیراں دیکھکر

عاشق کی چاک گریبانی اور حیرانی اب اتنی پُرانی چیز ہو چکی ہے کہ اس میں اب کوئی دلکشی باقی نہیں رہی۔ مگر اس قسم کی مثالیں ہمیں جناب دلؔ کے کلام میں بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر وہ اپنی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اُن کے اندازِ بیان اور طرزِ ادا میں بھی ایک خاص قسم کی ندرت ہوتی ہے جس سے بعض اوقات پامال مضمون بھی نیا ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

ایک نہایت فرسودہ مضمون ہے کہ نظارۂ جمال اکثر و بیشتر باعثِ بیخودی و مدہوشی ہوتا ہے مگر جناب دلؔ کی جدت پسند طبیعت اس مضمون کو کس قدر نئے انداز سے نظم کرتی ہے کہ:

محوِ جمالِ بیخود و مخمور ہو گئے — یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

ایک اور عام مضمون کو کہ عاشق جب تک محبوب سامنے نہ ہو، کیا کیا سوچتا ہے اور اُس سے شکایت کے لئے کیا کیا اندازِ بیان تلاش کرتا ہے۔ مگر اس کا سامنا ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یوں بیان کرتے ہیں:۔

دفعتہً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد — ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں — مرکت ... [illegible]

پہلے مصرعہ کی بیساختگی اور خلوص کی شدت قابلِ داد ہے۔

اپنے دردِ دل کی کیفیات کو تقریباً ہر شاعر نے پُر زور الفاظ میں بیان کیا ہے مگر جنابِ دلؔ کا اندازِ بیان دیکھئے کہ کس قدر سادگی سے اپنی حالت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

آغازِ تمنا سے انجامِ محبت تک — گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سُنا ہوگا

کس قدر پر اثر ترجمانی کی ہے۔ اس شعر میں خدا معلوم کیوں میں خود اس تصرف کا مرتکب ہوں اور اس کو اسی طرح پڑھتا ہوں کہ:

آغازِ محبت سے انجامِ محبت تک — گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سُنا ہوگا

جنابِ دلؔ کے کلام میں تعبیرِ شاعرانہ کی مثالیں اکثر پائی جاتی ہیں۔ ایک جگہ دامن جھٹکنے کے انداز کو یوں

بیان کرتے ہیں کہ:

سرِ طور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

یاد ہے۔ ہاں! یاد ہے طرز نگاہِ مست یار ایک نازک پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوا

آپ کے بعض اشعار میں مومن کے طرزِ ادا کا لطف آتا ہے۔ جیسے:

نگاہِ مست سے اور مُڑ کے دیکھنے والے تجھے تو ہے مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں

سادگی بیان اور محاکاتی رنگ کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:۔

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

جناب دلؔ کے یہاں صحیح رنگ تغزل کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ اسی دھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

نگاہِ شوق رہی ہم زبانِ دل لیکن کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے

اس اضطراب پہ قربان اک جہان سکوں کوئی سنبھال رہا ہے تڑپ رہا ہوں میں

کیا کہئے اب آلِ محبت کی سرگزشت یا د اُس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

غماز کہوں یہ سوئے ادب۔ سفاک کہوں یہ ناممکن نشائے نظر جو کچھ بھی ہو انداز تو معصومانہ ہے

اے اہلِ نظر میں کیا سمجھوں آگاہ نہیں مستقبل سے انجامِ محبت کیا ہوگا۔ آغاز ہی اِک افسانہ ہے

جناب دلؔ کے کلام میں سوز و گداز اور اثر آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ جیسے:۔

منظر اداس۔ شمع سحر پیکرِ خموش اُٹھا ہے کوئی گرمیِ محفل لئے ہوئے

اُدھر گھبرا کے غمخواروں کی مایوسانہ سرگوشی اِدھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بےخبر ہونا

مایوسِ ازل ہوں یہ مانا۔ ناکام تمنا رہنے دے جاتے ہو کہاں رُخ پھیر کے تم۔ مجھکو تو ابھی کچھ کہنا ہے

اے جوشِ الم۔ کب تک گریہ۔ دل آج تو ڈوبا جاتا ہے موجیں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں۔ طوفاں ہے کہ اُمڈا آتا ہے

بہار جام بکف جھومتی ہوئی آئی شکستِ عہد نہ کرتے تو اور کیا کرتے

کھیلتی تھی یوں چمن میں شوخیِ موجِ نسیم بے تکلف ہر کلی کو مسکرانا ہی پڑا

بعض بعض جگہ آپ کے کلام میں جوش و خروش کا عنصر بھی ملتا ہے۔ مثلاً:۔

اسی سے کیجئے رفتار کا کچھ اندازہ نظامِ دہر بدلتا ہوا اُٹھا ہوں میں

شعر کے تیور اور لہجہ کا تیکھاپن قابلِ ملاحظہ ہے۔

غرض جناب دلؔ کے کلام میں تخئیل بلند۔ ندرتِ بیان اور تعبیرِ شاعرانہ کی مثالیں بہت پائی جاتی ہیں۔ آپ بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے نہایت مناسب و موزوں الفاظ صرف

کرتے ہیں۔ معاملاتِ حسن و عشق کے بیان میں بہت حزم و احتیاط سے کام لیتے اور عامیانہ یا عریاں اندازِ بیان اختیار نہیں کرتے۔ اِس شدید حزم و احتیاط ہی کا شاید یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے یہاں جوش و ولولہ کی کمی ہے۔ بہرحال جہاں تک محسوسات و ادائے بیان کا تعلق ہے۔ آپ ایک نہایت کامیاب شاعر کہے جا سکتے ہیں۔

۱۷۔ روشؔ صدیقی حضرت روشؔ صدیقی ایک نوعمر نظم گو شاعر ہیں۔ مگر آپ کی شاعری کی ابتدا غزلوں سے ہوئی اور جس کا انتخاب اس وقت زیرِ نظر ہے۔ اس انتخاب کے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا فطری میلان نظم ہی کی طرف ہے۔ آپ اپنی غزلوں میں مختلف قسم کی تراکیب فارسی اور نظم کی رنگینیوں کو راہ دیتے ہیں۔ جیسے یہ شعر:۔

وہ آنکھ اُٹھے تو برس جائے کیف میخانہ وہ لب کھلیں تو بکھر جائیں نغمہ ہائے ارم

کسی نظم کا شعر معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ وہ فارسی تراکیب جو آپ کے یہاں استعمال ہوتی ہیں اُن میں سے چند نمونے ملاحظہ ہوں بعید جلوہ ہائے رنگ و بو۔ رازِ تشنہ کامیِ شوق۔ جنبشِ دامانِ تصور۔ شمعِ احساسِ جدائی۔ گریۂ نیم شبی۔ رفتۂ سوزِ ناتمام۔ فغانِ روحِ بیتابی۔ انجمنِ نیم شبی وغیرہ وغیرہ۔

بعض بعض اشعار میں اس قدر استعارات سے کام لیا گیا ہے کہ شعر میں تکلف پیدا ہوگیا ہے اور یہ بھی نتیجہ ہے آپ کے میلانِ نظم گوئی کا۔ جیسے:۔

شمعِ احساسِ جُدائی کو بجھا یا نہ گیا کبھی اے جنبشِ دامانِ تصور تجھ سے

صرف اتنا کہنا تھا کہ اے تصورِ محبوب! تجھ سے بھی احساسِ جدائی کو کم نہ کیا گیا۔ اُس کو ایسا اندازِ بیان عطا کیا ہے کہ شعر میں تصنع اور آورد کی جھلک محسوس ہونے لگتی ہے اور بے ساختگی و آمد زائل ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی تراکیب صرف نظم میں بھلی معلوم ہوتی ہیں ۔۔۔ آپ کا ایک شعر ہے:۔

مری ناشادمانی انتہائے شادمانی ہے کسی کا لطف پنہاں آنسوؤں میں مسکراتا ہے

"لطف" ایک کیفیت کا نام ہے۔ اُس کا ہنسنا یا رونا معلوم۔ لطف کا آنسوؤں میں مسکرانا بہت مبہم سی بات ہے

ترا مذاق ہی اے کاش جا و داں ہوتا ترے مذاق نے کیا کیا دکھائے ہیں عالم

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی صرف لفظ "مذاق" کہکر نہ معلوم کس چیز کا مذاق مراد لیا ہے۔ مذاق کے ساتھ اگر کوئی اور لفظ ترکیب دیکر استعمال کرتے جیسے مذاقِ عشق۔ مذاقِ درد۔ یا مذاقِ ستم تو شعر میں کسی مفہوم کا تعین ہو سکتا تھا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود روشؔ کی غزلوں میں طرزِ ادا کی جدت اور ایک شگفتگی پائی جاتی ہے۔ عشق کی عظمت اور شانِ استغنا کو کس قدر حسن کے ساتھ ظاہر کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو:۔

جو راہ اہلِ خرد کے لئے ہے نامحدود جنونِ عشق میں وہ چند گام ہوتی ہے

ازل سے حُسن ہے آمادۂ کرم لیکن ہنوز عشق کے لب پر کوئی سوال نہیں

محبت کی لطافتوں کو اشعارِ ذیل میں بہت لطف سے بیان کیا گیا ہے:

خموشی سے بھی بارِ ترجمانی اُٹھ نہیں سکتا بہت غمناک رودادِ محبت ہوتی جاتی ہے

تذکرہ رہتا ہے دل سے سحر و شام اُن کا	لب پہ آجائے نہ بھولے سے کہیں نام اُن کا
ہونے ہی کو ہے اسے دل تکمیل محبّت کی	احساسِ محبت بھی مٹتا نظر آتا ہے
شب بھر نشاط گریۂ اُلفت نہ پوچھئے	آنکھوں پہ اُن کا دامنِ تر دیکھتے رہے
سکونِ دل جو جو ملا بھی تو آہ گیا ہوگا	سکونِ دل تو مرے درد کا مآل نہیں
بظاہر تو کوئی وجہ مسرت بھی نہیں ہوتی	یہ کیوں اکثر بہت شاداں دلِ ناشاد ہوتا ہے

سادگیِ بیان اور طرزِ ادا کی بعض پاکیزہ مثالیں ملاحظہ ہوں :

جس میں ہو یاد بھی تری شامل	ہائے اُس بیخودی کو کیا کہئے
کھینچ کر لائے جو ترے در تک	ایسی دیوانگی کو کیا کہئے
اُن پہ قربان ہستیِ کونین	اِک مری زندگی کو کیا کہئے

جناب روشؔ صدیقی ایک خوشگو شاعر ہیں مگر آپ کی غزلوں میں پختگی نہیں پائی جاتی۔ نظم آپ کا موضوعِ شاعری ہے اور آپ نظم ہی زیادہ اچھی کہہ سکتے ہیں۔

۱۸- پنڈت امرناتھ ساحر

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی ایک کہن سال اور کہنہ مشق غزل گو شاعر ہیں۔ آپ کا انتخابِ کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا میلان زیادہ تر تصوف کی طرف ہے۔ آپ کے کلام میں بجائے حُسنِ مجازی کے حُسنِ حقیقی کی برق پاشیاں نظر آتی ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

دیدار شش جہت ہے کوئی دیدہ ور تو ہو	جلوہ کہاں نہیں کوئی اہلِ نظر تو ہو
جس کی باطن پہ نظر ہے اُسے آتا ہے نظر	قلب کے آئینہ میں حُسن کا تاباں ہونا

آپ عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا ایک زینہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں :

جلوۂ حق نظر آتا ہے صنم میں ساحر	ہے مرے کعبہ کی تعمیر صنم خانوں سے

آپ کی شاعری میں نہ جوش و ولولہ ہے اور نہ اثر آفرینی۔ بلکہ اشعار کی بنیاد تخیلات پر رکھی گئی ہے۔ رنگِ تغزل آپ کے یہاں بہت ہلکا ہے، مگر کہیں کہیں بلند خیالی کی اچھی مثالیں آپ کے کلام میں نظر آجاتی ہیں مثلاً :-

گویا زبانِ حال تھی - ساحر خموش تھا	یہ سعیِ ضبط تھا - وہ تقاضائے ہوش تھا
ہے مقتضائے حُسن کہ دیکھے نہ دیکھ کر	ہے اقتضائے عشق کہ بارِ دگر تو دیکھ
بے تمنائی نے برہم رنگِ محفل کر دیا	دل کی بزم آرائیاں تھیں آرزو سے دل کے ساتھ
کیفِ مستانِ ازل کفر سے آزاد نہیں	بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

آپ نے کہیں کہیں کیفیات کی بہت عمدہ مصوری کی ہے۔ مثلاً

ہم ہیں اور بیخودی و بیخبری	اب نہ رندی نہ پارسائی ہے

۱۹- سیماب اکبرآبادی

جناب سیماب اکبرآبادی نہایت پُرگو اور مشاق شاعر ہیں۔ آپ نے حضرت داغ دہلوی سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ اور اسی لئے آپ کے کلام میں ایسے نمونے

ملتے ہیں جو دورِ قدیم کی شاعری کی یادگار ہیں۔ جیسے:

قاتل کا نام لکھدیا کیوں میری قبر پر لیتے ہیں راہگیر بھی بوسے مزار کے
مٹا دو۔ خاک کر دو۔ پھونک دو۔ کر دو فنا لیکن ہمارا جذبۂ فطری کہیں برباد ہوتا ہے
وہ اُنکا جانا دامن جھٹک کر۔ وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر وہ اُن کا آنا وہ شادمانی۔ ہائے محبت ہائے جوانی

کہیں کہیں اشعار میں لکھنوی اسکول کی مخصوص یاسیّت و مرثیت کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

ہم اپنی موت پر دیکھیں کسی کا آنکھ تر کرنا ہمیں بھی انتظارِ بزمِ ماتم کی خبر کرنا
کسی مردِ وفا کا کوچ ہے پھر اپنے مسکن سے اُداسی مانگنے آئی ہے دُنیا میرے مدفن سے
ہم کو تو جاگنا ہے ترے انتظار میں آئی ہو جس کو نیند وہ سوئے مزار میں
کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے
دینا مجھے فریبِ نویدِ حیات تم جب لوگ جا رہے ہوں جنازا لئے ہوئے
آ۔ اور آخری نگہِ یاس دیکھ جا شاید پھر اس کے بعد عیادت روا نہ ہو

جناب سیماب اکبر آبادی نے ہر چند کہ جدتِ بیان اور طرزِ ادا سے اپنی شاعری کو ایک نیا آب و رنگ دیکر پیش کیا ہے مگر اُن کے یہاں فرسودہ مضامین اور سُنی سُنائی باتیں بھی نظر آجاتی ہیں اور اُن کا دامنِ شاعری بھی تقلید کے عنصر سے داغدار ہے۔ ملاحظہ ہو:

صحنِ گلشن میں بنے پھرتے ہیں دامانِ بہار چند ٹکڑے جو مرے چاکِ گریباں میں نہیں
نظر آتا نہیں وحشت میں کہیں دستِ جنوں اور کھینچے لئے جاتا ہے گریباں کوئی
لگی دل کی بھڑک اُٹھی یہ داغِ کہنۂ دل سے کوئی پروانوں کو آواز دے اُن کی محفل سے
طورا ے خاکسترِ سوزِ دلِ موسےٰ بتا جو دئے تھے برق ایمن نے وہ جلوے کیا کئے
شام فرقت انتہائے گردشِ ایام ہے جتنی صبحیں ہو چکی ہیں۔ آج سب کی شام ہے
یوسف کی طرح عشق میں خودداریاں کہاں ورنہ مذاقِ حُسن زلیخا سے کم نہیں
جنوں کی نذر سالانہ کا ساماں دیکھ لیتا ہوں بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہوں

مگر ان تمام باتوں کے باوجود جناب سیماب اکبر آبادی کی شاعری اپنے اندر ایک اثر رکھتی ہے۔ آپ کے اشعار کا طرزِ بیان۔ زبان میں نئی تراش خراش۔ اور تراکیب میں جدت۔ یہ سب آپ کے کلام میں زور و اثر پیدا کر دیتے ہیں بعض بعض معمولی باتوں کو اپنے طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان سے اس قدر پُرلطف بنا دیتے ہیں کہ شعر کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک عام روایت ہے کہ برقِ ایمن نے طور کو خاکستر کر دیا اور جنابِ موسےٰ پر آنچ نہ آئی اور صرف بیہوش ہو کر رہ گئے، اس کو جناب سیماب نے کس قدر نئے انداز سے بیان کیا ہے:

بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر شاید ہنسی بھی آ گئی اُن کو جلال میں

ایک شعر اور ملاحظہ ہو:۔

دِل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں ۔۔۔ اِک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

سادگی وطرزِ ادا کے علاوہ ہر لفظ کانٹے کی تلی چیز معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کو کہ ایک انسان اگر غمزدہ ہو تو اُسکو ہر چیز بُری معلوم ہوتی ہے اور اگر وہ خوش ہو تو اُسے ہر شے اچھی۔ کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے :۔

نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی ۔ نہ کنول کے پھول سے تازگی ۔۔۔ فقط ایک دِل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے

انسانیت کے متعلق جناب سیماب اکبر آبادی کا تخیل بہت بلند ہے ۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :

ہے کوئی اور شے انسانیت میرے تخیل میں ۔۔۔ خیالوں میں کبھی تصویرِ انساں دیکھ لیتا ہوں

ابھی تک محشرِ انسانیت میں ۔۔۔ تلاشِ آدمیت ہو رہی ہے

حسب ذیل اشعار میں سادگیِ بیان ۔ جلوئے تخئیل اور اسلوب بیان قابل ملاحظہ ہیں :۔

میں جیا بھی دُنیا میں اور جان بھی دیدی ۔۔۔ یہ نہ کھل سکا لیکن آپ کی خوشی کیا تھی

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ جو سُنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اس طرح مجھے ستا رہے ہو ۔۔۔ جیسے میرا خدا نہیں ہے

دُنیا سے اِک افسانہ کہنے کو تھے پھر سوچا ۔۔۔ دُنیا ہے خود افسانہ۔ افسانے سے کیا کہئے

کیا آگئی نیندِ اہلِ محفل ؟ ۔۔۔ کہنی تھی ہمیں بھی اک کہانی

بھاری قدم ۔ نظر متحیر ۔ نفس دراز ۔۔۔ کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آگئے

مری حیرت پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں ۔۔۔ جنھیں یہ بھی نہیں معلوم نظریں ہیں کہاں میری

مگر جناب سیماب کی شاعری میں سوز و گداز کم ہے اور غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ نے تخئیل سے زیادہ کام لیا ہے مثلاً آپ کا ایک شعر ہے :

طور، اے خاکسترِ سوزِ دلِ موسےٰ بتا ۔۔۔ جو دئے تھے برقِ ایمن نے وہ جلوے کیا کئے

اس شعر میں نہ کوئی جذبہ ہے نہ معنی آفرینی ۔ چند الفاظ کے اُلٹ پھیر سے شعر بالکل ایک چیستان بنکر رہگیا ہے۔

کہیں کہیں آپ کے کلام میں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ آپ کا ایک شعر ہے :۔

شورِ ہستی ابھی ذرا ٹھیرے ۔۔۔ سُن رہا ہوں ضمیر کی آواز

"شورِ ہستی" بالکل ایک مہمل سی بات ہے اور اِس ٹکڑے سے ہم کسی مفہوم کا تعین نہیں کرسکتے۔ ہستی کے شور سے جناب سیماب صاحب کی کیا مراد ہے۔ یہ شعر سے بھی واضح نہیں ہوتا۔

دِل جلا۔ پھر خود جلے۔ پھر ساری دُنیا جل اُٹھی ۔۔۔ سوز لائے تھے بمقدارِ پروانہ ہم

"سوزِ پروانہ" تو سنا تھا مگر "سوزِ پروانہ" بہت عجیب بات ہے۔

یہ فضا ۔ یہ ابر ۔ یہ ٹھنڈی ہوا ۔ یہ سبزہ زار ۔۔۔ آج تو جنگل کا جنگل قابلِ تصویر ہے

"جنگل قابلِ تصویر ہے" غلط ہے اور محاورے کے خلاف ۔

شوقِ دیدار کا کیوں اُن سے اعادہ نہ کریں ۔۔۔ لاؤ وہ کام کریں ہم جسے موسےٰ نہ کریں

اس شعر کے مصرعۂ ثانی میں "جسے موسے نے نہ کیا" کے بجائے "جسے موسے نہ کریں" نظم کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۲۰- فانی بدایونی

حضرت فانی بدایونی ہندوستان کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں اور اپنے کلام کے سوز و گداز کی وجہ سے مشہور ہیں۔ فانی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُن کے یہاں میر کا سا سوز اور غالب کا سا تصوف و فلسفۂ حیات ہے۔ لیکن میر اور فانی کے سوز و گداز میں بیّن فرق ہے۔ میر کی طرح فانی کی زندگی بھی سوگوارانہ بسر ہوئی ہے مگر ان کے یہاں شکوۂ غم کے بجائے ضبطِ غم نظر آتا ہے۔ ان کی آواز میں درد ضرور ہے مگر وہ یاسیت نہیں جو لکھنوی اسکول کے لئے مخصوص تھی۔ ان کی شاعری میں سوز و گداز ضرور ہے مگر قنوطیت نہیں۔ ہمیں اُن کے اشعار سے اُن کی زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ نظر آتا ہے اور اُن کا کلام ایک حد تک اُن کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی زندگی کا صحیح نقشہ اپنے اِن اشعار کے ذریعہ سے کھینچتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

یہ زندگی کی ہے رودادِ مختصر فانی وجودِ درد مسلم۔ علاج نا معلوم

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

انھوں نے حیاتِ انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اُن کے تاثراتِ غم نے اُن کے تجربات زندگی اور مشاہدۂ عالم کو وسیع سے وسیع تر بنا دیا ہے۔ ہجوم آلام و مصائب نے اُن کی زندگی کو ایک معمہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

آپ غالب کی طرح قیدِ حیات و بندِ غم کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں:

زندگی یادِ دوست ہے۔ یعنی زندگی ہے۔ تو غم میں گزرے گی

طول رودادِ غم معاذ اللہ عمر گزری ہے مختصر کرتے

فانی کے احساسِ غم میں میر کی سی محرومی، سپردگی و فنادگی نہیں پائی جاتی، وہ احساسِ غم ہی کو مایۂ حیات سمجھتے ہیں۔ وہ غم کو بہ خندہ پیشانی برداشت کرتے ہیں اور اسی ضبط و تحمل کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ وہ غم کی لطافتوں سے اس قدر محظوظ و مسرور ہیں کہ دوسروں کو بھی بارِ غم اُٹھانے کی تلقین کرتے ہیں۔ جیسے:

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

اُن کے لئے جفائے دوست بھی وفائے دوست ہے اور اُن کا یہ مذاقِ تلخ پسندی اُن کے لئے باعثِ سکون ہے

طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے جفا کم کر۔ جفا اب روح پرور ہوتی جاتی ہے

وہ اس قدر مانوسِ غم ہو چکے ہیں کہ وہ اپنے دردِ دل کا علاج بھی اسی غم کو تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنے دردِ غم میں ایک کیفیتِ پنہاں پاتے ہیں، جس میں وہ اپنی ہستی کو گم کر دینا چاہتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ:

ہاں! ناخنِ غم کمی نہ کرنا ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

وہ دردِ غم ہی کو سرمایۂ زیست سمجھتے ہیں اور اپنے دردِ دل کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ۔ وہ انسان کی اس فطرت سے بھی واقف ہیں کہ ہر شخص مسرور ہونا چاہتا ہے اور عیش و عشرت کا خواہشمند ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ

اپنے تجربۂ حیات اور مشاہدۂ عالم کی بنا پر دلِ غمزدہ کو اِن سامانِ راحت پر ترجیح دیتے ہیں - چنانچہ آپ فرماتے ہیں

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی ہے قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

اور اس کیفیت غم کی برتری کو کس حُسن و خوبی سے ادا کرتے ہیں - ملاحظہ ہو:

غم بھی گزشتنی ہے - خوشی بھی گزشتنی کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

وہ انھیں احساساتِ غم کی لطافتوں میں گم ہو کر اور اپنے درد دل کی کیفیات میں بیخود ہو کر درد و غم کی شدت کو کم کرتے ہیں اور یہی بیخودی و سرشاریِ غم ہے جو انھیں سب سے بے نیاز ہونے کی ترغیب دیتی ہے - وہ اپنے احساسِ غم کے آگے سب کچھ بھُلا دینا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ اُن کی ہستی کی اہمیت میں کوئی فرق نہ آئے - اسی کو حسب ذیل شعر میں بیان کرتے ہیں:

یوں سب کو بھُلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے دُنیا ہی میں رہنا ہے تو دُنیا سے گزر جا

ہمیں جناب فانی کے کلام میں حیات و کائنات کے مطالعہ کے علاوہ تغزل کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں جو اُن کے شدید احساسات اور نازک جذبات کا پتہ دیتی ہیں اور پھر یہی لطافتِ غم اُن کے اشعار میں سوز و اثر پیدا کر دیتی ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

رفتۂ نظر ہو جا - سب سے بے خبر ہو جا کھُل گیا ہے راز اپنا کھُل نہ جائے راز اُنکا

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھولدیتا تھا کوئی آج تیرا نام لیکر کوئی غافل ہو گیا

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا ہیں بہ عنوانِ دگر یاد آیا

بہلا نہ دل نہ تیرگیِ شامِ غم گئی یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

تسکین عجیب چاہتا ہوں، دشمن کا نصیب چاہتا ہوں

درپیش ہے پھر مسئلۂ طاقتِ دیدار پھر کچھ نگہِ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

کچھ نظر کہہ گئی زباں نہ کھُلی، بات اُن سے ہوئی مگر نہ ہوئی

یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی

آج تسکین دردِ دل فانی وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی

اِن اشعار میں لطافتِ غم اور کیفیاتِ بیخودی و سرشاری کی حدیں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں - ان کے اشعار میں کہیں کہیں تعبیر شاعرانہ کی عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں - جیسے:

اِک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

کس قدر لطیف اور نازک پیرایۂ بیان ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے - ایک اور استعارۂ بعید اور شاعرانہ نازک خیالی کی اعلیٰ مثال جو حضرتِ فانی کے احساسات لطیف کا پتہ دیتی ہے ملاحظہ ہو:-

کرم کیا تو باندازۂ تبسم برق وہ کچھ خیال میں آئے ہی تھے کہ آکے چلے

آپ نے اپنے مشاہدۂ کائنات کو بعض بعض جگہ نہایت پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے اور اسکے ساتھ ساتھ

الفاظ کا تناسب شعر میں جان ڈال دیتا ہے۔ جیسے:

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم — آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا
بہار لائی ہے پیغامِ انقلابِ بہار — سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو
بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی — منھ پھیر لیا ہم نے تو دُنیا نہ رہے گی

جناب فانیؔ کہیں کہیں اضداد کو نہایت پر اثر طریقے سے یکجا کرتے ہیں اور بعض مرتبہ چھوٹے چھوٹے جملوں کی تکرار نہایت لطف پیدا کر دیتی ہے۔ مگر اس طرح کہ کوئی بناوٹ اور تصنع شامل نہیں ہوتا اور کلام آورد کے عیب سے پاک ہوتا ہے ـــ بلکہ ہر شعر ایک غیر ارادی جذبہ کی اعلیٰ مثال اور معنویت کا دفتر معلوم ہوتا ہے گویا کہ دریائے تاثر و لطافت موجیں لے رہا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

اُس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ — کیا کروگے جو اگر یاد آیا ،،
مدعا ہے کہ مدعا نہ کہوں — پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے
دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہوگئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہوگئے
پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا — جب ذکرِ بہار آیا۔ سمجھے کہ بہار آئی
کل تک جو تم سے کہہ نہ سکا حالِ اضطراب — ملتی ہے آج اس کی خبر اضطراب سے

ان تمام اشعار کی لطافت و معنویت اہلِ ذوق حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے جناب فانیؔ کے یہاں اس قسم کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ آپ کے اشعار خواہ وہ دلی جذبات و احساسات کا پرتو ہوں خواہ مشاہدۂ کائنات کا نتیجہ، سوز و اثر سے خالی نہیں۔ آپ کی آواز دل سے نکلتی ہے اور دل میں اثر کر جاتی ہے اور یہی اثر آفرینی و سوز و گداز آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں

(باقی) — سید علی سجاد قہر اکبرآبادی۔ بی۔ اے

پردہ

میں خیال کر رہا تھا کہ "میں نے راجے کو پہلے کبھی دیکھا تو ہے نہیں پھر ایسا کیوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں بہت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں ایک اجنبی ہوں لیکن ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے وہ برسوں سے میرے ساتھ رہتی ہے!"

ایک دن بنگلے کے باہر میں انتظار کرتے کرتے تھک چلا تھا، ایک شخص دو چار منزل طے کرنے کے بعد بھی ممکن ہے کہ اُس کو تکان نہ ہو، لیکن بنگلہ کے باہر انتظار کرنا ایک آدمی کو تھکا ہی دیتا ہے، اسکی طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ وہ چاروں طرف دیکھتا ہے کہ اس کو ایسی چیزیں دکھائی دیں جن سے اس کا دل بہلے لیکن جب کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی تو وہ آخر تھک جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت میری تھی جب میں پہلی بار اس بنگلہ پر آیا۔ گھنٹی بجا دی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد چپراسی آیا اور "ابھی بیٹھیے" کہکر چلا گیا۔ پھر دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ بنگلہ کے باہر کوئی نہیں آیا۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کہ میں یہاں گھنٹوں سے انتظار کر رہا ہوں۔ سڑک پر موٹر گزرنے۔ دو چار آدمیوں کے گزرتے گزرتے بات کرنے اور پرندوں کی آواز کے سوا کسی قسم کی آواز کان میں نہیں آ رہی تھی۔ میں بنگلہ کے شیشوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شیشے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے نظر کے سامنے پتھر رکھدئے ہوں کیونکہ ان کے پیچھے کوئی نظر نہ آ رہا تھا پردے بھی لٹکے ہوئے تھے مگر وہ ہل نہ رہے تھے ایسی خموشی میں آدمی کا خیال نہ معلوم کہاں کہاں جاتا ہے اور میں نہ معلوم کیا کیا سوچ رہا تھا جو اس وقت مجھے بالکل یاد نہیں۔ میں یہ ضرور خیال کر رہا تھا کہ جب یکایک میرے سامنے وہ آوے گی تو میں اسکے ساتھ کس طرح سے پیش آؤں گا۔ میں اجنبی ہوں وہ مجھے جانتی نہیں ...... اور اس کے بعد میرا خیال منتشر ہو گیا۔ پردہ کے پیچھے دو پاؤں دکھائی دئے جو فوراً ہی غائب بھی ہو گئے! پھر چک اُٹھی اور چپراسی نے کہا "آئیے"، میں بنگلہ میں داخل ہوا تھا، خود کو غیر سمجھ کر، مگر پھر غیریت کا سوال دور ہو گیا۔ پہلے ہی دن اُس کا مسکرانا، ایسا معلوم ہوا جیسے اسنے کسی جانے پہچانے آدمی کو دیکھا ہو! کتابوں میں سے کچھ باتیں اس نے پوچھیں اور اس طرح جیسے وہ مجھ سے برسوں سے پڑھ رہی ہو اور میں نے اس کو جواب دیا، اور اس طرح گویا میں عرصہ سے اسے پڑھا رہا ہوں۔

"ہم اپنی طاقتیں کمانے اور خرچ کرنے میں کھو دیتے ہیں"۔ میں ورڈسورتھ کی نظم کا مطلب سمجھا رہا تھا کہ بیچ ہی میں اس نے اعتراض کیا "سب تھوڑے ہی ایسے ہوتے ہیں" میں نے کہا "ہاں سب ایسے نہیں ہوتے" اور مجھے ہنسی آ گئی خیال کیا کہ کہدوں کہ "آپ کے لئے ہی تھوڑے کہا گیا ہے!" "انگلینڈ ہی میں ایسے لوگ ہوتے ہوں گے!" اس نے طنز سے کہا اور میں نے بھی کہدیا "ہاں ہندوستانی ایسے نہیں ہوتے۔ یہ بہت اونچے لوگ ہیں!"

دو چار روز بھی نہیں گزرے تھے کہ باتوں باتوں میں وہ میرے اوپر بھی طنز کرنے لگی۔ ایک اجنبی کے ساتھ ایسی

باتیں کرنے میں اُسے پس وپیش ہونا چاہئے تھا۔ مگر راجے کے جو منھ میں آتا کہدیتی۔ ایک روز سبق میں چین کی تاریخ کے کسی واقعہ کا ذکر آیا جس کو میں بھول گیا تھا۔ میں نے راجے سے پوچھا کہ "یہ کیا تھا" مگر جواب دینے کے بجائے اس نے فوراً کہدیا "آپ نے بھی تو تاریخ پڑھی ہے!" اور مسکرادی۔ لیکن جب میں نے اس کے جواب میں کہدیا کہ "آپ نے بھی تو اپنا سبق پڑھا ہے" تو اس نے اپنا سر جھکالیا۔ بجلی کی روشنی میں وہ اپنی نگاہ نیچی کئے ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے کسی سنگ مرمر کی مورتی نے اپنی پلکیں جھکالی ہوں! - جب اس کا سر نیچے جھک جاتا تو اس کے ایک دو بال سرک کر اس کے ماتھے کے سامنے آجاتے جن کو وہاں سے ہٹانے کی وہ کوشش بھی نہ کرتی اور بجلی کی روشنی میں لال بندی ایسی معلوم ہوتی جیسے کسی نے سنگ مرمر میں مونگا جڑ دیا ہو۔ جب اس طنز کا اثر غائب ہونے لگتا تو اس کی آنکھیں اُٹھتیں اور کسی شریر سوال سے پھر چمکنے لگتیں! اس وقت اس کی آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے دو تارے چمک رہے ہوں! کبھی وہ پُرنور تارے میری طرف دیکھا کرتے - - - - - - - - - جب میری نگاہ کتاب کی طرف ہوتی اور جب میری نگاہ اُٹھتی تو وہ تارے دو چار جھپکی لے کر بجھ جاتے اور ان کے اوپر پلکوں کا پردہ پڑ جاتا!!

کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ یہی دس پندرہ روز کا۔ اور اسی عرصہ میں وہ مجھ سے بہت ہی قریب ہوگئی۔ روز شام کو میں پڑھانے کے لئے جاتا اور پڑھا کر واپس جاتا۔ جیسے ہم اپنے اپنے راستوں پر بے خبر چلے جایا کرتے ہیں اسی طرح چاہے خیال کہیں کا ہو روزانہ شام کو میں بنگلہ پر پہونچ جاتا، جس طرح روزانہ سورج کا نکلنا اور روزانہ غروب ہونا قدرتی بات ہے اسی طرح مجھے بھی ایسا معلوم ہونے لگا کہ بنگلے پر جانا اور وہاں سے واپس آنا قدرتی چیز ہے -

ہم روزانہ ایسے ہی بیٹھے رہتے! ہم کو یہ خیال شاید کبھی نہ ہوا کہ کب تک ہم اسی طرح زندگی گزارتے رہیں گے اور کیا ہمارے درمیان کوئی پردہ حایل نہ ہوگا -

ایک دن وہ چُپ چاپ آکر بیٹھ گئی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا مگر وہ روز کی طرح مسکرائی نہیں! اُس دن اس کی شکل کچھ پھیکی سی لگ رہی تھی! نہ معلوم کیوں! اسے کیا کوئی رنج تھا؟ اس کا چہرہ میں نے کبھی اُترا ہوا نہیں دیکھا تھا میں نے چہرہ غور سے دیکھا تو ماتھے کی بندی مٹی ہوئی تھی - بندی کے بجائے صرف پھیکا سا ایک لال نشان تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ چمک جاتا تھا مگر آج یہ بات نہ تھی - سوال کرتے وقت اس کی آنکھیں بجلی کی طرح کوند جاتی تھیں۔ مگر آج آنکھوں میں یہ بجلی نہیں تھی!!

مجھے اس کی وجہ نہ معلوم ہوتی اگر اس کے باپ نے آکر اس کی شادی کی خبر سنائی ہوتی! مگر مجھے وجہ ٹھیک نہ معلوم ہوئی۔ شادی کی خبر میں رنج کی کیا بات؟ - چُپ ہونے کی کیا وجہ؟ شادی کی خبر ہے تو اسے خوش ہونا چاہئے تھا لیکن میں اپنے کو مطمئن نہ کرسکا -

میں نے اس کو پڑھانا شروع کیا مگر شوق سے نہیں!! - آج وہ سوال نہ کررہی تھی، نہ بات بات پر مسکرارہی تھی وقت سے پہلے ہی سبق ختم ہوگیا۔ دل میں آیا کہ فضول کیوں بیٹھوں - چلا جاؤں! مگر اُٹھ بھی نہ سکا۔ میں نے راجے سے کہا: "اور کچھ پوچھئے"

راجے صفحہ پر صفحہ پلٹنے لگی۔ مگر اس کو اظہار مطلب کے لئے کوئی فقرہ نہ مل رہا تھا۔ میں شک کرنے لگا کہ وہ صفحوں کو

بغیر پڑھے ہی اُلٹے جا رہی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ سطروں کے بیچ میں اپنی نگاہ جمائے ہے اور اس کا دل کہیں اور ہے۔ کمرہ کی خموشی اسوقت مجھے کتنی خوفناک معلوم ہو رہی تھی! میں بھی دوسری کتاب کے ورق اُلٹنے لگا۔ کسی نہ کسی طرح سے خموشی کو توڑنے کے لئے میں نے کہا:۔ "آپ کتاب پڑھ لیا کریں ورنہ اس سے کیا فایدہ کہ ہم آپ دونوں ورق اُلٹتے رہیں!" وہ اس بات پر ہنس ہی دی۔ اس نے ورق اُلٹنے بند کردئے اور یہ کہتے ہوئے کہ "آج کچھ نہیں پوچھنا ہے!" اس نے کتاب بھی بند کردی۔

اب اس کے ماتھے پر کبھی بندی لگی ہوتی کبھی مٹی ہوتی۔ کبھی اس کا چہرہ چمکتا ہوتا کبھی پھیکا۔ کبھی وہ مسکراتی رہتی کبھی چُپ ہوکر بیٹھ جاتی!!۔ اب وہ ایک طرح کی پہیلی بنتی جا رہی تھی۔ کبھی میں اپنے آپ کو اس کے قریب اتنا ہی پاتا جتنا پہلے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ میں دور ہوتا جا رہا ہوں۔ کبھی وہ مجھ سے بہت دور ہٹتی نظر آتی اور کبھی وہ ایسی باتیں کرتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ میرے دل چھونے کی کوشش کر رہی ہے!۔ چنانچہ ایک دن راجے نے مجھ سے پوچھا "آپ کو کونسی کہانی پسند آتی ہے!!" اس سوال کا جواب دیتے وقت میں عجیب کشمکش میں پھنس گیا۔ کیا اس نے یہ سوال میرے دل کے جذبات جاننے کے لئے پوچھا تھا — اور جب میں نے اس کو ہنستے ہوئے پایا تو میں بالکل کھو گیا، اور بالکل نہ سمجھ سکا کہ کیا جواب دوں؟۔

راجے کی شادی کو آٹھ روز رہ گئے تھے اور اُس کے رشتہ دار اس کو لیکر اپنے شہر جا رہے تھے۔ آج آخری مرتبہ پڑھانا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ راجے بالکل بات نہ کرے گی اور اس کا چہرہ اُداس ہوگا، لیکن میں نے کوئی خاص تبدیلی اس میں نہیں پائی، وہ باتیں بھی ویسی ہی کر رہی تھی۔ شیکسپیر کی ایک نظم کے متعلق وہ سوال کرنے لگی کہ "شیکسپیر یاد ہی کیوں کرتا تھا جب اس کو تکلیف ہوتی تھی!" میں اس کا کیا جواب دیتا کہ یاد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں۔ وہ بولی "کیا فایدہ"۔ میں نے کہا "کچھ نہیں — شاید آپ کسی کو یاد نہیں کرتیں!" وہ بولی "نہیں"

وقت ختم ہوگیا تھا مگر میں نے کہا:۔ "اب تو آپ بہت دنوں کے بعد پڑھیں گی جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لیجئے۔ اس نے کہا "جب ہی پوچھوں گی"۔ میں نے کہا:۔ "جب تک آپ سب بھول جاویں گی"۔ مگر اس نے کہا:۔ "پھر یاد کرلیں گے"

رات کی اندھیری مجھے سڑک پر چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھی، آسمان پر بادل تھے، چاند تارے سب بادلوں میں چھپ گئے تھے۔ آج زیادہ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور میں کوٹ میں سکڑتا ہوا کالی کالی سڑکوں پر سے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ روزانہ وہ راستہ خیالوں میں کٹ جاتا تھا اور یہ بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ ایسا لمبا راستہ کیسے کٹ گیا مگر آج راستہ کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔ قدم بھاری پڑنے لگے تھے۔ اندھیری بوجھل معلوم ہو رہی تھی راستہ میں نہ جانے کیوں سب مجھے پچھلی باتوں کا خیال آ رہا تھا۔ اپنی زندگی کے ورق کیوں اُلٹ رہا تھا اور ان ورقوں کو دیکھ کر کیوں دل پر بھاری پن چھایا جا رہا تھا۔

میں یہ خیالات لیکر بستر پر لیٹ گیا۔ سونے کے لئے آنکھ بند کیں مگر خیالات دماغ میں چکر لگانے لگے۔ سوچ رہا تھا کہ میری زندگی بھی عجیب ہے! جس چیز کو پانے کی کوشش کرتا ہوں وہ ہاتھ سے پھسل جاتی ہے۔ انسان کی زندگی ہزاروں خواہشوں سے بھری ہے اور جن کی وہ خواہش کرتا ہے وہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں!!۔ ارمانوں کا

نتیجہ یہی ہوتا ہے !! میں بھی انسان ہوں - میرے دل میں بھی ارمان ہیں اور میرے ارمانوں کا بھی یہی نتیجہ ہوا -

راجے آج اجنبی معلوم ہو رہی تھی - میں خود کو اجنبی خیال کر رہا تھا میں اپنے دل میں یہ خیال کر کے پچھتا رہا تھا کہ میں نے خود کو اتنا قریب کیوں خیال کیا - اپنے آپ کو دھوکا کیوں دیا - جس روز راجے کی شادی کی خبر سُنی تھی اسی روز سے میں اجنبی سا ہو گیا تھا - لیکن اگر وہ مجھے اجنبی خیال کرتی تھی تو وہ میرے جذبات جاننے کی کیوں کوشش کرنے لگی تھی - میں اس وقت عجیب کشمکش و پیچ میں پھنسا ہوا تھا - مجھے خیال آیا کہ شاید شادی ہمارے دونوں کے بیچ میں کوئی پردہ نہ ڈالے گی - یادیں مٹائی نہیں جاتی چاہے راجے کتنی ہی بار کہدے کہ وہ کسی کو یاد نہیں کرتی !! انھیں خیالوں میں اُلجھا ہوا سو گیا -

میں ایک روز پھر بنگلے پر گیا - راجے واپس آگئی تھی - آج پھر میں بنگلہ کے باہر انتظار کر رہا تھا - پھر میں بنگلے کے باہر دیر سے بیٹھا ہوا تھا اور میں نے اپنے آپ کو اُس حالت میں پایا جو اول روز پائی جاتی تھی - مجھے اندر بلایا گیا مگر اندر جا کر راجے کو نہ دیکھا - اس کے باپ نے ضرور بے تکلفانہ بات کی مگر میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا - میری نگاہ پردوں پر جمی ہیں، تھی اور خیال کر رہا تھا کہ شاید پردہ کے پیچھے سے کوئی آنے والا ہے مگر پردے ہلے تک نہیں - ہاں، پردہ کے پیچھے دو پاؤں ضرور دکھائی دئے میں نے ان کو پہچان لیا - پردہ ہل کر رہ گیا - وہ دونوں پاؤں پھر واپس چلے گئے -

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے راجے اور میرے درمیان ایک دیوار چُن دی گئی ہو !

شنکر سروپ بھٹناگر (ام - اے)

نگار کے پچھلے پرچے

۱۹۲۶ء : جنوری عہ ر - ۱۹۲۷ء : اگست ۸ر - ۱۹۲۸ء : مئی ۸ر - ۱۹۳۱ء : جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ، ستمبر عہ ر فی پرچہ - اکتوبر ۱۲ ر نومبر، دسمبر ۸ ر فی پرچہ - ۱۹۳۲ء : جنوری ۱۶ ر فی پرچہ - فروری ۱۲ ر فی پرچہ - مارچ عہ ر فی پرچہ - ۱۹۳۳ء : فروری عہ ر فی پرچہ - ۱۹۳۴ء : فروری تا دسمبر عہ ر فی پرچہ - ۱۹۳۶ء : دسمبر عہ ر فی پرچہ - ۱۹۳۷ء : فروری عہ ر فی پرچہ، مارچ تا اگست ۱۲ ر فی پرچہ، اکتوبر عہ ر فی پرچہ - ۱۹۳۸ء : فروری ۶ ر فی پرچہ، اپریل عہ ر فی پرچہ مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - ۱۹۳۹ء : فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ - اکتوبر، نومبر ۱۲ ر فی پرچہ، اگست تا دسمبر عہ ر فی پرچہ - ۱۹۴۰ء : فروری تا مئی ۶ ر فی پرچہ - جون ۱۲ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۶ ر فی پرچہ -

مینجر نگار لکھنؤ

مطبوعات طاق بستاں

(بہترین انتقادی لٹریچر)

خواب کی دُنیا : اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے - اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے - قیمت علاوہ محصول عہ ر

الہامات شاد : شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن اگر آپ ان کے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے - قیمت ۸ ر

اقبال کی شاعری : یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا - قیمت ۱۰ ر علاوہ محصول -

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

غلط فہمی

غلط فہمی کا نام رکھنے میں غلطی کی رعایت رکھنا سخت ناشکری تھی، کیونکہ غلط فہمی بہت سی مصیبتوں سے نجات کی ایک نہایت جائز صورت ہے اور یقیناً نوعِ انسان کی اس سے زیادہ توہین اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی نجات غلطی سے ہو۔ اگر کل سے غلط فہمی کا نظام توڑ دیا جائے تو خدا ہی جانتا ہے برسوں تک کتنے سر ٹوٹنے سے بچ رہیں گے۔

جب کوئی صاحب آپ سے خوب اچھی طرح لڑ لیتے ہیں تو آپ یا وہ کوئی پہلو نکال کر کہتے ہیں "تو یہ بات تھی۔ مجھے غلط فہمی ہوئی"، اور اس کے بعد وہ آپ کے نیچے سے نکل جانے اور آپ ان کے پنجے سے نکل آنے پر ہنستے ہیں اور پریشان لباس کو درست کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

لیکن غلط فہمی اس قدر سطحی یا ناقابل اعتنا چیز نہیں ہے اور ہر چند عموماً یہ عذر پیش کرنے والے اتنے معصوم نہیں ہوتے جتنا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں پھر بھی حیاتِ انسانی کا یہ ایک دردناک واقعہ ہے کہ غیر ارادی غلط فہمیاں اس وقت تک معدوم نہیں کی جا سکی ہیں۔

میر کو شکایت تھی کہ اسے "کسو نے یاں کم سمجھا ہے"، لیکن سوال یہ ہے کہ کسی کو بھی کسی نے سمجھا ہے؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ دو فریق شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کے مفہوم کے متعلق ہم خیال ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ممالک کی حکومتوں اور باشندوں کے درمیان ایک دائمی اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں بلاشبہ ملک کی بہبود کے خواہاں ہوتے ہیں۔ عوام اور ان کے رہنما آپس میں اعتماد، خلوص، کمزور حافظہ، اور فریب کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ علوم و فنون اور فلسفہ سب کا یہی حال ہے۔ ادیب و شاعر، مصنف و نقاد، اُستاد و شاگرد کے درمیان ایک کبھی نہ پُر ہونے والا خلا رحائل دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں پر پیش کرتے، معنی پہناتے اور سمجھتے ہیں۔ اسی کا نام آزادی، ایجاد، تحقیقات اور لیاقت ہے۔۔۔ کم و بیش یہی بات "اسٹوارٹ شیز" نے لکھی ہے:- "کیا آپ جانتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا وہ خود پورے طور پر سمجھتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ کتنی مرتبہ ذہن ملتے ہیں کتنی مرتبہ وہ بالکل بھٹک جاتے ہیں۔ دُنیا کی کتنی مصیبتیں اس بھٹک جانے پر مبنی ہیں۔ ہر مباحثہ اور گفتگو میں یہ ہوتا ہے کہ ہم دوسرے کی بات نہیں سمجھتے۔ ہماری اپنی باتوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید ہمارے لئے بہتر بھی یہی ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔

مگر ایسا کیوں ہوتا ہے یہ سمجھنے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں پہلا اور صاف سبب تو یہی ہے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ کہتے نہیں اور دوسرا یہ کہ کہہ نہیں سکتے۔ پہلے سبب پر آگڈن اور رچارڈ بہت لطیف روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ "کسی جملے کا مطلب وہ ہوتا ہے جو کہنے والا چاہتا ہے کہ سامعین سمجھیں"۔ یہاں مطلب کی تعریف میں اس

امر کی گنجایش رکھی گئی ہے کہ کبھی کبھی کہنے والا اپنے دلی مفہوم کو قصداً چھپانا چاہتا ہے اور جب تک اس کے الفاظ سے پیدا ہونے والا مطلب اس کے حقیقی مفہوم سے مختلف نہ ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔ تشبیہ و استعارے ہوشیار بولنے والوں کے ہاتھ میں یہی کام دیتے ہیں۔ صنائع و بدائع عموماً اسی لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ ظرافت کا غیر سنجیدہ پہلو بھی اکثر یہی ہوتا ہے منطق و قانون اسی مقصد سے بازار میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان صورتوں میں حقیقی معنی غیر لفظی ہوتے ہیں اور ایک ہوشیار آدمی ہی انھیں پا سکتا ہے ۔۔۔ کہہ نہ سکنے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً ایک وہ ہے جو معنی فی بطن الشاعر کہکر مسترد کر دی جاتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی چیز جو ہمیں سننے اور سمجھنے سے باز رکھتی ہے زبان ہے۔ اس میں تعجب نہ ہونا چاہئے۔ ہر چیز خود ہی اپنی آسانی اور خود ہی اپنی مشکل ہے۔ اس طرح کی بوالعجبیوں سے شاید آپ تنگ آچکے ہوں لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ اس ایک جملہ کو ادا کر لیجئے جو ممکن ہے بہت سے ایسے جملوں کا مرثیہ بن سکے۔

ہماری زبان بعض مطالب کو ادا کرنے سے یکسر قاصر ہے اور بعض کو ان کی حقیقت سے قدرے جداگانہ طریقہ پر ادا کرنے کیلئے مجبور۔ اس سے نجات نہیں ملسکتی تا وقتیکہ موجودہ زبانوں کو جنکی بنیاد زیادہ تر عہد وحشت میں اسوقت کی ضروریات کے مطابق پڑی تھی مبسوط اصلاحات کے ذریعہ ریاضی سے زیادہ قریب نہ کر دیا جائے۔ یہ زبانیں عموماً اس قدر مبہم، متلون اور غیر مستقل ہیں کہ ان سے کوئی واضح، مقررہ معنی استنباط کرنا ہر شخص کا کام نہیں رہا ہے۔ ہماری غلطی صرف اتنی ہے کہ ہم نے ہر قسم کے جھگڑے مول لئے لیکن زبان سے کبھی نہ بولے۔ یہ سوال ہی کبھی پیدا نہ ہوا کہ ہمارا ترجمان بھی ہم کو دھوکا دے سکتا ہے ہم مطمئن رہے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے جو سمجھے وہ سمجھے جو نہ سمجھے وہ اپنے جہل کے حوالے۔ درانحالیکہ موقع اس قدر حسن ظن سے کام لینے کا نہ تھا۔ دو آنکھوں کو ایک ہی ڈھال بجا طور پر سبز و سُرخ دکھائی دے سکتی ہے۔ قصور ایک کا نہیں۔ قصور دوسرے کا بھی نہیں۔ قصور اس ڈھال کا ہے جو کسی طرف سبز کسی طرف سُرخ رنگ دکھاتی ہے اسکو بھی جانے دیجئے اور دیکھئے ہم کس کس طرح الفاظ پر لڑتے ہیں۔ ایک شخص اُٹھتا ہے اور بتاتا ہے کہ وقت پیدایش فلاں لفظ کے معنی یہ تھے اور آج بھی وہی ہونے چاہئیں (خواہ اس کے لئے تمام دُنیا کے دوسرے الفاظ و معاملات کے معنی بدلنے پڑیں)۔ دوسرا اعلان کرتا ہے کہ اُسوقت جو کچھ بھی رہا ہو، اب اسوقت ہم جو معنی مراد لیتے ہیں وہی درست ہیں تیسرا حکم لگاتا ہے کہ یہ جھگڑا فضول ہے۔ عقلاً یا وہ کیا معنی ہونے چاہئیں تب کام چلے گا۔ پھر صحیح کیا ہے؟ ۔۔۔ تہذیب مصیبت بالائے مصیبت ہو جاتی ہے جس طرح مہذب کیمیاوی کھانے ہماری صحت کو خراب کر دیتے ہیں اسی طرح تہذیب کے تکلفات ہمیں اور بہت سے دوسرے میدانوں میں زک پہونچاتے ہیں ۔ مبالغے اور استعارے دُنیا کے آدھے غلط مبحث کے ذمہ دار ہیں۔ یہ چٹخارے کی طرح زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور بجائے اپنا مفہوم ادا کرنے کے لوگ بولنے کے لئے بولنے لگتے ہیں۔ زبان میں بہت سے ڈھلے ڈھلائے مرکبات اور چلتے فقرے ہوتے ہیں جو ہمارے واقعی مطلب کو بگاڑتے ہیں لیکن ان سب کو برتنا ہوتا ہے۔ درحقیقت ہمیں بہت کچھ کہنے کی صورت بنانے کے لئے کہنا پڑتا ہے۔ یوں زبان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ہم زبان کی دلچسپیوں کے لئے استعمال ہونے لگتے ہیں۔ اس کی مثال اس دہقانی کی سی ہے جو اپنے جوتوں کو زحمت سے بچانے کے لئے خود پیادہ چلتا ہے۔ بیشک احساس حُسن ہر کام میں سلیقہ کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ استعمال حد درجہ بد ذوقی کی دلیل ہے۔ یہ طریقہ شاعری اور ادبی دلچسپیوں کے لئے بیحد موزون ہے لیکن زبان کا تعلق دُنیا کے بہت سے کاروبار سے بھی ہے اور وہاں ہمیں ایک صاف، بااُصول اور نسبتاً یک معنی زبان کی ضرورت

پڑتی ہے۔ آج کوئی زبان بھی اس معیار پر پوری نہیں اُترتی لیکن ہر زبان کو تھوڑا بہت کھینچ کر اس سطح پر لانا ہوتا ہے۔ اس بات کو آپنے
بھی محسوس کیا ہوگا کہ ہماری بہت سی گفتگو کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو اسکے الفاظ سے مترشح ہوتا ہو۔ بلکہ الفاظ ایک تمثیلی اور باعتبار
نیت زیادہ خوبصورت تصور ہوتے ہیں ہمارے مطالب کی۔ یہ بات ٹھیک ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ مشکل بھی ہے کہ ہمارے پاس کوئی
مقررہ پیمانہ ایسا نہیں جس کی مدد سے ہم الفاظ کی ظاہری حیثیت سے ان کے حقیقی مفہوم تک پہونچ جائیں یہی بات خوبصورت تمثیلی
بیان اور عام استعاروں کے خلاف نہایت مضبوط دلیل بن جاتی ہے —— میں جب کسی شخص کو بہت سے مجوزہ الفاظ میں سے
مناسب ترین لغت انتخاب کرنے میں مشغول دیکھتا ہوں تو مجھے بڑا رشک ہوتا ہے۔ مجھے تو بہت سے اُمور کے اظہار کے لئے کوئی لفظ ہی
نہیں ملتا۔ تمام دوسری باتوں کو چھوڑئیے اپنی نفسی کیفیتوں کے بیان کرنے کے واسطے ہی جو ہم سے سب سے زیادہ قریب ہیں ہمارے
پاس کتنے الفاظ موجود ہیں۔ قاموس کی ضخامت کا بھرم امتحان کے کمرے میں نہیں اطباء کے مطب اور علماء کی محفل میں کھلتا ہے

کئی مرتبہ ہم چیزوں سے بحث کرتے کرتے انکے ناموں سے بحث کرنے لگتے ہیں اور جو باتیں صرف ناموں کے متعلق صحیح ہیں انھیں
اشیاء پر منطبق کرنے لگتے ہیں۔ گرامر میں بالخصوص اشیاء اور انکے مراتب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ مجرد کیفیتوں اور اسمائے جمع کے
سلسلہ میں جنس کی اور دوسری بے شمار مشکلیں پیش آتی رہتی ہیں، بہت سے الفاظ کے ساتھ وہمی افسانے وابستہ ہوگئے ہیں۔ جن کی
بنا پر ان کا استعمال خطرناک بن گیا ہے۔ بالخصوص اس سبب سے کہ انکے استعمال کے نتائج یکسر غیر لسانی ہوتے ہیں مثلاً ہندو اور
مسلمان۔ بعض ایسے الفاظ ذہنی بیماریاں پیدا کرنے کا سبب ہوتے ہیں جیسے مرد اور عورت۔ غرضکہ الفاظ کی قوت اور ان کے مظالم کا
ایک طویل سلسلہ ہے جو انسان کے دوسرے گناہوں کی طرح اسکے پیچھے لگا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ سمجھنا کوئی میکانکی فعل نہیں ہے۔ بلکہ ایک معینہ شعوری کیفیت کا نام ہے اور اس شعوری کیفیت کے بیدار ہونے کے لئے محرک کے موجود ہونے کے علاوہ
معمول میں مناسب انفعالی کیفیت کا موجود ہونا بھی لازمی ہے۔ یہ چیز اس قدر ضروری ہے کہ نمک خریدنے کے علاوہ ایسے کاموں میں تو خیر عادت کا دخل ہوجاتا
ہے اور کوئی کام بغیر ہمہ تن شوق بنے ہوئے نہیں ہوسکتا اور بہت سی باتیں صرف اس لئے ہمیں تکلیف دیا کرتی ہیں کہ ہم انکو محض سُن لیتے ہیں اور ادراک و
احساس کی وہ مقدار جو انھیں جذب کرنے اور سمجھنے کے لئے ضروری ہے موجود نہیں ہوتی۔ مزید برآں ہم تو ان الفاظ کی طرف سے بھی چوکتے نہیں رہتے جو ہم خود
استعمال کرتے ہیں۔ لاک کے لفظوں میں لوگ بغیر الفاظ کے مقررہ معنوں کی فکر میں پڑے ہوئے انھیں اسی طرح استعمال کرنے لگتے ہیں جس طرح دوسروں کو
استعمال کرتے دیکھتے ہیں، اس طرح ان کا جہل چھپا رہتا ہے اور آسانی کے علاوہ یہ فایدہ بھی ہوتا ہے کیونکہ ایسے موقعوں پر وہ شاذ و نادر حق پر ہوتے ہیں لہذا
انھیں یہ یقین دلانا بھی ناممکن ہوتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اس لئے کہ ان آدمیوں کو انکے جہل سے باہر گھسیٹ لانا ایسا ہی ہے جیسے ایک خانہ بدوش کو اسکے
گھر سے نکال دینا جسکے کوئی گھر ہی نہیں ہوتا —— میں نے ان سطروں میں مسئلہ کے علمی و تحقیقی پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ نہ شاید ایسا کرنا زیادہ صحت یا
سہولت کے ساتھ ممکن ہے۔ اس مسئلہ پر زیادہ مشہور لکھنے والوں کی حیثیت بھی زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ اکثر تفصیلات میں ان سے اختلاف رکھنا ممکن ہے۔
لیکن اس اصولی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوسکتا کہ ہمیں اپنے جذبات و احساسات کو عقل کی روشنی میں اس طرح مرتب کرنا چاہئے جس سے غلط فہمی کا
امکان زیادہ سے زیادہ دور ہوسکے۔ زبان بھی ہماری زندگی کا ایک پہلو ہے جسے اس عہد نو میں جب ہر چیز گویا غسل صحت کرکے باہر نکل رہی ہے یونہی نہ
چھوڑ دینا چاہئے۔ زبان کے معاملہ میں بھی تمام دوسرے مسایل کی طرح اصلاح و امتحان کی ضرورت ہے۔ شاید دوسروں سے کچھ زیادہ ہی کیونکہ
بہت سے مسایل کا سمجھنا زبان کے پوری طرح سلجھے ہوئے ہونے پر موقوف ہے۔

نظیر حیدر

اکبر الہ آبادی

سترہ سال کا اک نوجوان لڑکا، دُبلا پتلا، قد ذرا دبتا ہوا، رنگ کچھ کھلتا ہوا، مسیں بھیگی ہوئی، پیشانی کی رگیں اُبھری ہوئی، اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے اور یہ شعر گنگناتا جا رہا ہے:

چشم عاشق سے گریں لختِ دلِ بیتاب واشک　　آپ یوں دیکھیں تماشا جانکر سیماب واشک

معلوم نہیں یہ زمین خود اس نے پیدا کی تھی یا شاہ نصیر و ظفر کے کلام کو دیکھ کر اس کے ذہن میں آئی تھی، وہ بہت خوش تھا کہ ایسی مشکل زمین میں اس نے ایک شعر کہا اور لختِ دل کو سیماب کہکر اپنی بے چینی کا اظہار کس خوبی سے کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے میز سے کاغذ اُٹھایا اور پنسل سے اس پر دوسرا شعر لکھا:

اپنے دامن پر گرا کر کیوں اسے کرتے خراب　　جانتے یکساں اگر ہم گوہر نایاب و اشک

اب اس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی گوہر نایاب اس کے ہاتھ آگیا۔ اس نوجوان کا نام اکبر حسین ہے اور یہ اشعار اس کی فکر کا اولین ثمر ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس نوجوان کا اس وقت شاعری میں کوئی اُستاد تھا یا نہیں اور یہ اشعار اس کو دکھائے گئے یا نہیں، لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے شاگرد کو جھڑکتا کہ یہ کیا مہمل گوئی ہے، تاہم دل ہی دل میں وہ اس امر کا بھی اعتراف کرتا کہ لڑکا ہونہار ہے، ذہین ہے، معنی آفرینی کی خاص اہلیت رکھتا ہے اور اگر اس کی رہنمائی کی گئی تو اچھا شاعر بن جائے گا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں کہ یہ رہنمائی اس نوجوان کو میسر آئی یا نہیں اور فکر سخن جاری رہی یا نہیں لیکن چار سال بعد جبکہ اس کی عمر ۲۱ سال کی ہے، پہلے پہل ایک مشاعرہ میں شریک ہوتا ہے اور ایک طویل غزل خاص والہانہ انداز سے سُناتا ہے۔ جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

دکھلاتے ہیں بُت جلوۂ مستانہ کسی کا　　یاں کعبۂ مقصود ہے بتخانہ کسی کا

نالاں ہے اگر وہ تو یہ ہے چاک گریباں،　　بُلبُل کی طرح گُل بھی ہے دیوانہ کسی کا

تاثیر جو کی صحبتِ عارض نے دمِ خواب　　خجلت وہ آئینہ ہوا شانہ کسی کا

پہونچی جو نگہ عالمِ مستی میں فلک پر　　ہم سمجھے مہ نو کو بھی پیمانہ کسی کا

تاثیرِ محبت سے جو ہو جاتے ہیں بے چین　　رو دیتے ہیں اب سُن کے وہ افسانہ کسی کا

ہم جان سے بیزار رہا کرتے ہیں اکبر
جب سے دلِ بیتاب ہے دیوانہ کسی کا

آپ نے دیکھا کہ اس چار سال کے اندر کتنا فرق ہوگیا۔ ہر چند اُس زمانہ کی غزل گوئی کا پامال انداز اس میں موجود ہے۔

یعنی وہی عمومی تشبیہیں، وہی گل و بلبل اور وہی کعبہ و بتخانہ جو غزل کے عناصر ضروری تھے، یہاں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن "سیماب و اشک" والی بے معنی وقت پسندی کا کہیں پتہ نہیں اور آخری دو شعر تو اُن جذبات کا بھی پتہ دیتے ہیں، جنھیں آسانی سے ہم صحیح تغزل میں شامل کر سکتے ہیں۔ زمانہ گزرتا گیا، اکبر شعر کہتے رہے، مشاعروں میں شریک ہوتے رہے، لیکن ماحول کے اثر سے مغلوب، رواج سے متاثر اور زلف و سنبل کے جال میں بدستور گرفتار۔ تاہم وہ فطری صلاحیت جس کو آگے چل کر بالکل دوسری راہ اختیار کرنا تھی، کبھی کبھی مُنھ سے کچھ اور بھی کہلوا لیتی تھی اور وہ "کچھ اور" اس رنگ کا ہوتا تھا

ابھی سے خون رُلاتی ہے مجھ کو فکرِ مآل، 　　چمن میں بعد ترے اے بہار کیا ہوگا
گو بہت کچھ رنج یارانِ وطن سے تھا ہمیں 　　آنکھ میں آنسو مگر وقتِ سفر آ ہی گیا
بعد مدت کے نظر آئی جو صورت یار کی 　　سو طرح دل کو سنبھالا غش مگر آ ہی گیا

اکبر کے اس ابتدائی دور میں سوائے غزل کے ہمیں اور کچھ نہیں ملتا اور غزل بھی اسی رنگ کی جس میں زیادہ تر قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی سے کام لیا جاتا ہے۔ اکبر نے اس دورِ شاعری میں اساتذہ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر ایک ایک زمین میں چار چار غزلیں کہیں اور خوب خوب زور آزمائی کی، یہاں تک کہ شاید خود تھکن محسوس کرنے لگے اور جب اس رنگ کو چھوڑا تو ان میں اس قسم کے اشعار کہنے کی صلاحیت پیدا ہو چلی تھی:

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں 　　کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

اکبر کا یہ دورِ شاعری دس بارہ سال رہا اور جب ان کی عمر ۳۰ سال کی ہوئی تو یہ رنگ بہت کچھ بدلا ہوا تھا۔ اب ان کے یہاں زیادہ زور لفظوں پر نہ تھا بلکہ واقعیت پر تھا اور اُن کے غزل کا داخلی رنگ بھی بہت کچھ نکھر گیا تھا۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:

کہوں کس سے قصۂ دردِ غم کوئی ہمنشیں ہے نہ یار ہے 　　جو انیس ہے تری یاد ہے جو شفیق ہے دلِ زار ہے
یہ نوید اوروں کو جا سنا ہم اسیرِ دام ہیں اے صبا 　　ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر ہمیں کیا جو فصلِ بہار ہے
تو ہزار کرتا لگاوٹیں، میں کبھی نہ آتا فریب میں 　　مجھے پہلے اسکی خبر نہ تھی ترا دو ہی دن کا یہ پیار ہے
وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے تو یہ اور آفتیں ڈھا گئے 　　کہ حواس و ہوش و خرد تو اب نہ شکیب و صبر و قرار ہے
مجھے رحم آتا ہے دیکھ کر ترا حال، اکبر نوحہ گر 　　تجھے وہ بھی چاہے خدا کرے کہ تو جس کا عاشقِ زار ہے

آپ نے دیکھا، اکبر کے دوسرے دور کی غزلگوئی پہلے دور سے کتنی مختلف نظر آتی ہے، پہلے سوز و گداز مفقود تھا اور اب اسکی چاشنی ان کے اکثر اشعار میں پائی جانے لگی، پہلے وہ صرف سطح پر رہکر بال کی کھال نکالا کرتے تھے اور اب دل کی گہرائیوں تک بھی ان کا ذہن پہونچنے لگا، پہلے اُن کے کلام میں تکلف و تصنع تھا اور اب اس میں بیساختہ پن ہے پہلے وہ صرف لفظوں سے کھیلا کرتے تھے اور اب وہ معنویت کی طرف مایل ہو چلے ہیں۔ پہلے اُن کی غزلوں میں اوچھا پن تھا لیکن اب ان میں وزن پیدا ہو چلا ہے ——— پہلے ان کی شاعری روایتی قسم کی تھی لیکن اب وہ خود دلی جذبات کو نظم کرنے لگے تھے۔ ہر چند اکبر کے دوسرے دور کی غزل گوئی میں بھی ہمیں اس رنگ کے اشعار کافی نظر آتے ہیں:

اسی کے سایہ میں ہوتی ہے میرے دل کی بسر 　　خدا دراز کرے عمر زلفِ پیچاں کی
جماتی ہے لبِ نازک پہ ان کے رنگ اپنا 　　یہ شوخیاں تو ذرا دیکھو سُرخیِ پاں کی

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا بدرقہ وہ ان اشعار سے بھی کر دیتے ہیں:

غم نہیں اس کا جو شہرت ہو گئی ہو گئی اب تو محبت ہو گئی
اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز مل گئے صاحب سلامت ہو گئی

یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر وکیل ہو کر دُنیا کا عملی مطالعہ شروع کر چکے تھے اور دوسری طرف اودھ پنچ کی طنزیہ ظرافت نے ملک میں شوخی و شوخ نگاری کا عام ذوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اکبر جن کی قسمت میں ملک کا بہترین طنز نگار نقاد ہونا مقسوم ہو چکا تھا، اس رنگ سے بہت متاثر ہوئے اور غزل گوئی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مثنوی، قطعات اور رباعیات لکھنا بھی شروع کر دیں، لیکن ان کا رنگ بالکل علحدہ تھا اور ایسا ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ اب یہ اودھ پنچ کے مستقل نامہ نگاروں میں شامل ہو گئے تھے اور اس طرح انکے انتقادی ذوق کو اُبھر کا پورا موقعہ ملگیا تھا اسوقت ملک میں انگریزی تعلیم کا چرچا تھا، مغربی تہذیب تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی، عادات و اخلاق میں آزادی پیدا ہو چلی تھی، قدیم معاشرت پر جدید معاشرت چھائی جا رہی تھی، اور سرسید نے کالج قائم کرکے ملک میں دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں ایک وہ جو انگریزی تعلیم اور سرسید کے حامی تھی اور دوسری وہ جو اسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی تھی، اودھ پنچ اس دوسری جماعت کا آرگن تھا، اکبر اسی آرگن کے نامہ نگار تھے اس لئے وہ اسی جماعت کے فرد تھے چنانچہ ۱۸۷۷ء میں انھوں نے جو ایک منظوم خط اودھ پنچ کو لکھا وہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اگر وہ بجائے غزل کے شروع ہی سے مثنوی کی طرف توجہ کرتے تو بہت زیادہ کامیاب ہوتے۔ بیانیہ شاعری کا چونکہ میدان وسیع ہوتا ہے اور انتقادی ذوق رکھنے والے شاعروں کو اس میں پھولنے پھلنے کا زیادہ موقعہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے اکبر نے جب کبھی مثنوی کے رنگ میں لکھا بہت زیادہ کامیاب ہوئے اور اس سلسلہ میں ان کی وہ نظم جو (سودی) Mr. Mu... S کی مشہور نظم آبشار لوڈور کے انداز پر لکھی گئی ہے اور جنگ نامہ روم و روس جو غیر مطبوعہ ہے اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ ان میں مثنوی نگاری کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی تھی۔

افسوس ہے کہ ان کے کلیات کی ترتیب میں تاریخوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا اس لئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ غزلوں علاوہ قطعات وغیرہ کی صورت میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے کس نظم کو پہلے رکھنا چاہئے اور کسے بعد، لیکن چونکہ وہ ۱۸۸۰ء میں منصف ہو گئے تھے اس لئے ۱۸۶۶ء سے لیکر ۱۸۸۰ء تک کا زمانہ وکالت جسمیں اودھ پنچ کے ساتھ نامہ نگارانہ تعلق کے بھی ۶ سال شامل ہیں، .... ان کی نظم نگاری کا پہلا دور تھا۔

اس زمانہ کی نظموں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ نسبتاً زیادہ طویل ہیں اور ان کو کسی نہ کسی فارسی شعر پر تضمین کی صورت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ہیں وہ سب انتقادی رنگ کی جن میں مذہب، معاشرت، اخلاق، تعلیم، پردہ وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، لیکن باوجود اس میلان کے غزلگوئی کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا اور اس میں زیادہ پاکیزگی اور گہرائی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو:

ہم کیوں یہ مبتلائے بیتابیٔ نظر ہیں تسکین دل کی یارب وہ صورتیں کدھر ہیں
دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق وہ کیا ہے اک جھلک ہے، ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

پیدا کئے فلک نے نادیدنی مناظر — نیچی ہیں اُن کی نظریں جو صاحبِ نظر ہیں
مخانۂ جہاں میں وقعت ہی کیا ہماری — اک ناشنیدہ اُف ہیں اک آہ بے اثر ہیں
اکبر کے شعر سُنکر کہتے ہیں اہلِ باطن — اب بھی خدا کے بندے کچھ صاحبِ اثر ہیں

آپ نے دیکھا کہ اس میں اک خاص فلسفیانہ انداز ہے، ایک خاص معلمانہ کیفیت ہے جو مخاطب کو فطرت کے گہرے مطالعہ کی طرف مایل کرتی ہے۔ ان کے تیسرے دور میں ان کی یہ معنی آفرینی برابر بڑھتی ہی رہی اور اُن کی غزل میں ایک خاص وزن پیدا ہوگیا۔ ملاحظہ ہو تین شعر کی ایک غزل :

یہ جتنے ذرے جہانِ فانی کے اتنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں — خدا کی ہستی کے سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بیخبر ہیں
تغیر آشنا کم تعین، تعین ایسا کہ اپنی ہی دُھن — کمال ایسا کہ سب ہیں حیرت، جمال ایسا کہ سب نظر ہیں
حواس کچھ نیک کام کرلیں کہ جیب و دامن کو اپنے بھرلیں — مرے معانی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ مختصر ہیں

ان اشعار کو پڑھئے اور ابتداء کے اُن دو اشعار کو پڑھئے جن میں "سیماب واشک" کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر غور کیجئے کہ اکبر کے رنگِ تغزل میں آخر آخر کتنا تغیر پیدا ہوگیا تھا۔

اکبر اپنی جس حیثیت سے ملک میں مشہور ہیں، وہ ایک طنز نگار نقاد (Satiric Critic) کی حیثیت سے ہے جس میں اُن کی ظرافت (Humour) نے جان ڈالدی ہے۔ اکبر کو ادبی دنیا میں ایک سوشل نقاد کی حیثیت سے جتنی شہرت حاصل ہوئی اس کی مثال مشرق کے لٹریچر میں کوئی نہیں ملتی۔ اکبر نے اپنے زمانہ کے ادبی، معاشرتی اور سیاسی رجحانات پر جو تنقید کی ہے وہ بالکل انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا نصب العین مشرق کو مغرب کے تقلیدی اثرات سے بچانا ہے، وہ نئی تہذیب و تعلیم کے مخالف نہیں ہیں، لیکن اس سے مشرق کی اخلاقی روایات کو جو صدمہ پہونچتا ہے اس کی مخالفت ضرور کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ملک کے نوجوان تقلیدِ مغرب میں اپنی قومی خصوصیات اور مذہبی احساسات کو ترک کردیں اور انھیں خیالات کو انھیں مختلف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ صاف صاف اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کیا خبر نہیں اسے ڈالیو تمھیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں؟

عورتوں کی تعلیم کے متعلق بھی ان کا فلسفہ یہی تھا کہ اگر مغربی تعلیم انھیں مشرق کی گھریلو زندگی سے ناآشنا کردیتی ہے تو کسی کام کی نہیں اسی لئے وہ پردہ کے بھی حامی تھے اور لڑکیوں کی بیجا آزادی کو پسند نہ کرتے تھے، اس موضوع پر انھوں نے بڑی دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ گھر اور شوہر کی طرف سے عورت کی بے اعتنائی انھوں نے ایک شعر میں کس خوبی سے ظاہر کی ہے :

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اسی قسم کا ایک اور طنز ملاحظہ ہو۔ بنارس سے علیگڈھ کالج کے اولڈ بوائز نے ایک رسالہ اولڈ بوائے کے نام سے نکالا تھا

اُس پر اکبر فرماتے ہیں :

نکلا یہ آب و تاب بنارس سے اولڈ بوائے — اللہ اس کو گولڈ بھی دے اور پرل بھی

خواہش ہے اب یہ بعض محبانِ قوم کی — نکلے کسی طرف سے یونہی اولڈ گرل بھی

پردہ کی حمایت میں انھیں بہت کچھ لکھا ہے اور بعض جگہ اس سلسلہ میں ان کی طنز نگاری بہت سخت ہوگئی ہے مثلاً :

پردے کی وجہ سے یہ اجازت ہے چار کی — پردہ نہ ہو تو ایک کی بھی احتیاج کیا

پردہ اُٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں — حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلمان تو ہیں

عورتوں کی آزادانہ تعلیم اور بے پردگی کا ذمہ دار وہ مرد کو قرار دیتے ہیں اور نہایت لطیف انداز میں اسکا اظہار کرتے ہیں:

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب اُس کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

بے پردگی کا جو نتیجہ ان کی نگاہ میں تھا اسے ایک شعر میں یوں ظاہر کیا ہے :

کیا گزری جو اک پردے کے عدو، رورو کے پولس سے کہتے تھے — عزت بھی گئی دولت بھی گئی، بی بی بھی گئی زیور بھی گیا

اکبر قومی کانفرنس کی ہنگامہ آرائیوں سے بھی زیادہ خوش نہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ مرض کا حقیقی علاج نہیں ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

مجرب ایسا ملا نسخہ قوم بازی کا — کہ قدر اُٹھ گئی دنیا سے عشق بازی کی

قوم کے لیڈروں اور ریفارمروں پر بھی انھوں نے خوب خوب طنز کئے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو :

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

وہ اصلاح قومی کے باب میں سب سے پہلے اقتصادی اصلاح چاہتے تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے باب میں وہ اسی چیز کی کمی پاتے تھے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

انگریز خوش ہے مالک ایروپلین ہے — ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے

بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام — بسکٹ کا صرف چور ہے لمنڈ کا چھین ہے

تہذیب جدید کی کورانہ تقلید سے مسلمانوں کو جو فایدہ پہونچا اُس کو اس انداز میں ظاہر کرتے ہیں :

رہ گیا دل ہی میں شوقِ سایۂ الطاف خاص — مجھ کو آنے کی اجازت دی نہیں بڑروم میں

کھانے کے کمرے سے رخصت کر دیا بعد از ڈنر — تھیں فقط چھریاں ہی اور کانٹے مرے مقسوم میں

اکبر بہت مذہبی آدمی تھے اور جدید تعلیم سے جو بیدینی پھیل رہی تھی اس پر بہت دل کڑھایا کرتے تھے بعض اشعار اس خیال کے ملاحظہ ہوں :

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا — دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

لا مذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم — ہرگز گزر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ

مذہب ہے گم ترقی یورپ کے سامنے — معذور خاکسار بھی ہے اور جناب بھی

اکبر کا بڑا کمال بات میں بات پیدا کرنا تھا اور اسی کے لئے ان کا مزاح و طنز زیادہ تر قافیوں کی تلاش پر منحصر ہے۔ ان کے ایک دوست بیماری کے بعد لاہور کسی جلسہ میں شرکت کے لئے جانے لگے انھوں نے کہا کہ ابھی قوت

نہیں ہے آپ کیوں جاتے ہیں، لیکن وہ نہیں مانے۔ اکبر اس خاص واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوت وہ اس کو سمجھتے ہیں لاحول ولا قوۃ

ایک اور شعر نہایت لطیف کنایہ لئے ہوئے ملاحظہ ہو:

شیخ تثلیث کی تردید تو کچھ کرتے نہیں گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

لفظ تثلیث کے ساتھ ہی، سورۂ والتین کی طرف منتقل ہونا اکبر کی شوخ ذہانت کا زبردست ثبوت ہے۔ قافیہ کی تلاش کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:

یا الٰہی ٹیٹشن کے صدقے چاء، دودھ اور کھانڈ ے یا الٰہی ٹیٹشن کے بدلے تو چلا جا مانڈ ے

فضلِ خدا سے عزت پائی آج ہوئے سی۔ اس۔ آئی شیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی بولے ہوئے ہیں یہ عیسائی

پنجاب کے ایک وکیل الف دین صاحب نے کوئی مذہبی کتاب لکھی تھی اس پر اکبر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

الف دین نے خوب لکھی کتاب کہ بے دین نے پائی راہِ صواب

اردو میں اکبر ہی پہلا اور شاید آخری شاعر تھا جس نے نظم میں لطیفوں اور چٹکلوں کو پیش کیا اور سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس سلسلہ میں وہ اپنے اصل مقصد کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ مغرب کی بیجا تقلید کا اثر دو شعروں میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

مغربی وضع کی عام مقبولیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھل گیا

بوٹ ڈاسن نے بنایا، میں نے اک مضمون لکھا ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

اکبر کا مطالعۂ فطرت بھی بڑا زبردست تھا اور اگر وہ خالص منظریہ شاعری کرتے تو بھی بہت کامیاب ہوتے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو جو محاکات و جزئیات نگاری کی بہترین مثال ہے:

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

بھولی، خوش رنگ۔ چست، نازک، پیاری پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پھرتی ہے کہ برقِ طبیعت کا اُبھار تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قایم وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قایم

گو تابع جوشِ برق پروازی ہیں دونوں کے خطوطِ طیر متوازی ہیں

کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے اللہ، اللہ، کیا ہنرمندی ہے

ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں

کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں

اس سمت اگر خیالِ انساں بڑھ جائے دامانِ نظر پہ رنگِ عرفاں چڑھ جائے

باقی

مکتوباتِ نیاز

عتاب نامہ کا شکریہ ! ——— شکریہ اس لئے کہ "حُسنِ اتفاق" سے

جو تیری خوشی تھی وہ ہی مرا مدعا ہوا

ورنہ ظاہر ہے کہ گالی سے کون خوش ہوسکتا ہے !

غلطی ہو تو خیر، معذرت میں کوئی حرج نہیں، لیکن دانستہ گناہ کرنا اور پھر عذر کرنا ! کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ "وقارِ معصیت" بھی آخر کوئی چیز ہے یا نہیں ؟

بیشک میں نے جواب نہیں دیا، قصداً نہیں دیا اور صرف اس لئے نہیں دیا کہ آپ خفا ہوں اور یہ اب میں اس لئے کہ رہا ہوں کہ آپ کو اور زیادہ غصہ آئے ! ——— فرمائیے، اب آپ کیا کہتے ہیں ؟

ہوش میں آئیے۔ دُنیا خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئی اور آپ ابھی تک ——— ——— "روئے محمود و خاک پائے ایاز" ——— والے زمانہ کا خواب دیکھ رہے ہیں !

ایک صدی قبل کی بات ہے کہ دلی کے ایک شاعر نے کہا تھا:

عشق و مزدوری عشرتگہِ خسرو کیا خوب !

لیکن یہ بات نشہ کی ترنگ ہو کر رہگئی ——— اب اس دورِ اقتصاد میں جبکہ ایک ایک ذرہ کی قیمت متعین ہوچکی ہے، آپ کی "مہر تابیاں" کسی کا حق نہیں چھین سکتیں۔ شبنم اور پرتوِ خور، اب بھی دونوں پائے جاتے ہیں، لیکن "فنا کی تعلیم" کا علمی نام اب "جذب و انجذاب" ہے، یعنی دونوں ایک دوسرے کے محتاج !

حضرت اس دورِ اشتراکیت میں نکاح بھی خطرہ میں ہے، "تعلق خاطر" کا کیا ذکر ؟ ——— اپنے پر اعتماد نہ ہو تو دوسروں کا آزمانا اب بیکار ہے !

مکرمی - کیا عرض کروں کہ میں نے زندگی کو کیا سمجھا ہے۔ ایک کہتا ہے :

زندگی، زندہ دلی کا ہے نام

دوسرا کہتا ہے :

باز می جویم دلِ افسردہ را

لانحالہ حقیقت کا تعلق شاید "ہنسنے اور رونے" کے علاوہ کسی اور چیز سے ہے۔ مگر وہ "اور چیز" کیا ؟

مذہب اس کے جواب میں کہتا ہے : " العاقبۃ للمتقین " ! علم ، گلیلو ، کولمبس اور اڈیسن کو پیش کرتا ہے - یعنی ایک کہتا ہے " اب سو رہو ، اُٹھنا تو دیکھنا " دوسرا کہتا ہے : " جتنا جاگنا ہو جاگ لو ، پھر تو ہمیشہ سوناہی ہے " ـــ بالکل نقد اور اُدھار کا فرق ہے -

میں نے تو حضت ، یہ داؤں لگایا نہیں - آپ کو اگر یہ " [illegible] " اچھا معلوم ہوتا ہے تو بسم اللہ !

قبلۂ محترم - کس قدر شرمسار ہوں کہ گرامی نامہ کا جواب اتنی تاخیر سے جا رہا ہے ، خیال تھا کہ خود حاضر ہو کر عرض کروں گا ، لیکن افسوس ہے کہ بعض اُلجھنوں کی وجہ سے قدمبوس نہ ہو سکا -

آپ نے جس شک و شبہ کے لہجہ میں مکرمت نامہ لکھا ہے ، اُس سے مجھے تکلیف ہوئی - آپ کو شاید اب تک یقین نہیں کہ آپ کا ہر لفظ میرے لئے ایک فرمان ہے ، اور ارشادِ گرامی کی تعمیل کرنا میرا ایمان !

آپ اُن سے کہدیجئے کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں ، ہو چکا اور آج ہی کل میں انھیں اس کی اطلاع بھی براہ راست مل جائے گی -

یہ بھی کوئی ایسی بات تھی کہ آپ کو اُن سے وعدہ کر لینے میں تامل ہوتا !

حضت ، آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ سے خفا ہوں ، اور جب میں خفا ہوتا ہوں تو خطرناک ہو جاتا ہوں ـــ پھر کچھ آپ نے سوچا ہے کہ اس خطرہ کا مقابلہ کیونکر کریں گے ؟ یہ معاملہ " آہن بہ آہن " کا نہیں ہے کہ آپ اپنی برہمی سے اس کا توڑ کر سکیں ، بلکہ دق کی اس حرارت کا سا ہے جو آخر میں جان ہی لیکر چھوڑتی ہے -

اب بھی خیریت ہے - کہنا مان جایئے اور اپنا پروگرام ملتوی کر کے ، ۲۷ر نومبر تک یہاں پہونچ جایئے فرض ، اخلاق ، مذہب ، سیاست - میں کچھ نہیں جانتا ـــ اصل چیز میری مرضی ہے اور اسی کی پابندی آپ کو کرنا ہوگی - سُنا آپ نے ؟

اگر آپ کو اس طرح کوئی نقصان بھی پہونچ جائے تو مضایقہ نہیں ، " کشتۂ دشمن " سے " کشتۂ دوست " ہونا بہر نوع بہتر ہے -

---

اگر تم اس باب میں کوئی فتویٰ حاصل کرنا چاہتے ہو ، تو مولویوں سے پوچھو ، رہی میری ذاتی رائے سو وہ تم کو معلوم ہی ہے -

میں جانتا ہوں یہ لوگ کیا کہیں گے - ایک کی رائے ہوگی کہ تصویر کھنچوانا بہر صورت ممنوع ہے (اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کی صورت واقعی اس قابل نہیں کہ تصویر لی جائے) ، دوسرا کہے گا کہ نیم رُخی (Profile) تصویر میں کوئی حرج نہیں ، کیونکہ اس طرح نقش میں تجسیم کا رنگ پیدا نہیں ہوتا (لیکن

یہ قول اس کا ہوگا جو اس آرٹ سے بالکل ناواقف ہے ورنہ ظاہر ہے کہ "تجسیم" کی کیفیت نیم رخی تصویر ہی سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے) تیسرا کہے گا کہ نصف دھڑ (Bust) کی تصویر جائز ہے، کیونکہ اس طرح پورا جسم سامنے نہیں آتا (اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کے نزدیک خطرہ صرف نیچے کے دھڑ میں ہے اور دل و دماغ بیکار چیزیں ہیں)

الغرض تمام دوسرے مسایل کی طرح اس میں بھی کوئی متفقہ فتویٰ آپ کو نہ مل سکے گا، اس لئے میری رائے میں آپ خود اپنی عقل سے کام لیجئے، ہر حکم کا کوئی نہ کوئی سبب ہوا کرتا ہے۔ اسلام چونکہ بُت پرستی کا مخالف ہے، اس لئے اس نے کسی ایسے فعل کی اجازت نہیں دی جس میں ہلکا سا امکان بھی بُت پرستی کی طرف مایل ہوجانے کا پایا جائے۔ اور اسی لئے اس نے مجسمہ سازی کی اجازت نہیں دی، تصویر کشی کا رواج اُس وقت عام نہ تھا کہ اس پر غور کیا جاتا۔ بعد کو جب تصویر کا رواج ہوا تو اس پر غور کرنا پڑا اور جواز و عدم جواز کی مختلف صورتیں پیدا کی گئیں۔ حالانکہ دراصل، یہ زمانہ اس قسم کی بحثوں کا ہئی نہیں یعنی اب مجسمہ سازی کے لئے بھی علت حُرمت باقی نہیں رہی، تصویر کا کیا ذکر ہے۔

جس حد تک اہلِ علم کا تعلق ہے بُت پرستی کا دور بالکل ختم ہوچکا ہے (ہندو مسلمان دونوں کے لئے) رہے جاہل، سو ان کے لئے مجسمہ، تصویر، پیپل، مزار، سب یکساں ہیں۔ تم کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں ایک جماعت صوفیہ کی ایسی بھی ہے جو اپنے پیرِ طریقت کی تصویر سامنے رکھ کر اس کے سامنے سجدہ کرتی ہے اور انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ تصویر کیسی ہے۔ پھر ان کے لئے تو تصویر مطلقاً حرام ہونا چاہئے، لیکن صرف اپنے پیر کی!

اس کے برخلاف اہلِ فن کی جماعت کو لو، جو تصویر کیا اچھے خاصے بُت بناتی ہے، لیکن اس کا مقصود صرف فن کی تکمیل ہوتا ہے، تو کیا، ان کے لئے مجسمہ سازی حرام قرار دیجائے گی؟

یہ انتہائی کج فہمی ہے کہ کسی قانون یا شریعت کے کسی حکم کو دائمی چیز سمجھا جائے۔ قانون، وقت، ضرورت اور مصلحت، کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک چیز کے بدل جانے پر قانون میں بھی تغیر و تبدل ضروری ہوجاتا ہے۔

جس وقت اسلام نے مجسمہ سازی کی مخالفت کی، یہ وہ زمانہ تھا، جب عرب میں بُت پرستی کا رواج، فنی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے، بکثرت پایا جاتا تھا اور اس رواج نے اُن کے قواءِ ذہنیہ کو مضمحل کر رکھا تھا، خیال تھا کہ اگر بُت سازی سے باز نہ رکھا گیا تو اس مذموم عادت کا استیصال نہ ہوسکے گا لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس وقت بھی کوئی مسلمان ایسا ہے جو محض مجسمہ سازی یا تصویر کشی کی وجہ سے بُت پرستی اختیار کرسکتا ہے؟

پھر جب اس کا امکان نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ حکم اسوقت بھی قابلِ عمل قرار پائے اور اس کو کالعدم نہ سمجھا جائے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خدشہ تمھارے دل میں پیدا ہی کیوں ہوا۔ کوئی اچھی شکل و صورت والا انسان اگر تصویر کھنچوائے تو اسے خیال کرنا چاہئے کہ کہیں لوگ اسے پوجنے نہ لگیں، تھیں کیا ڈر ہے!

بندہ نواز، خط پہونچا، دلجوئی کا شکریہ، لیکن

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر چند ان سب کی شکایت آپ سے تو نہیں ہو سکتی، لیکن ظلم کرنے والوں کی قوم ساری دنیا میں ایک ہی ہے اس لئے آپ سے خطاب کرنا گویا سب سے خطاب کرنا ہے!

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ "عذر گناہ بعد از گناہ" اور "کسی زود پشیماں کا پشیماں ہونا" دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا، زمین اس کا نقش لئے ہوئے لاکھوں میل کا چکر لگا چکی، اس کو واپس لینا کسی کے امکان میں نہیں، اب آپ جو کچھ کر رہے ہیں، یہ بھی فضا میں اسی طرح گم ہو جائے گا، پھر یہ فکر

کہ گر نہ ہو، تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو

بالکل بیکار ہے۔ مجھ پر نہ آپ کی تلخی کا کوئی اثر ہوا، نہ اس "عذب البیانی" کا۔ ساحل پر کھڑا ہوں اور تھپیڑے کھا رہا ہوں۔ موج ہلکی ہو تو کیا، بھاری ہو تو کیا!

خوش رہئے، کہ آپ نے کم از کم یہ تو سمجھنے کا موقعہ دیا کہ:

نہ لا دے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

میں اچھا ہوں اور کل شام تک جو کچھ مجھ پر گزری ہے اس سے بالکل خالی الذہن!

مراسلات

آگرہ - کوچۂ حکیماں ۸ ر اکتوبر ۱۹۴۱ء

مکرمی - اکتوبر کے نگار میں آپ کی شرح مومن دیکھی - دو ایک جگہ مجھے آپ سے اختلاف ہے - جی چاہا کہ آپ سے بھی کہہ دوں - طویل مضمون کی قدر نہیں ہے - کارڈ ہی پر لکھے دیتا ہوں -

شعر نمبر ۷ میں کدورت باطن سے مراد شراب کی تلچھٹ یا اس کا بُرا نتیجہ لینا، آپ سے تعجب ہے - اس کی شرح کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ کچھ مطلب نہیں نکلتا - آپ نے غور نہیں کیا - کدورت باطن سے کدورت باطن ہی مراد ہے - کہتے ہیں کہ میں دل کی کدورت، آلودگی، معصیت کو دھونے کے لئے شراب پینا چاہتا تھا، لیکن وہ جو سامنے آئی تو اس کا رنگ ہی دیکھکر بیخود ہو گیا اور مقصد اصلی یعنی صفات باطن کا ہوش ہی نہ رہا - ضمناً یہ بات بھی لکھی کہ مے ناب کے رنگ میں یہ تاثیر ہے تو وہ خود کیا کچھ نہ ہوگی -

شعر نمبر ۱۰ کے پہلے مصرعہ میں لفظ ہَم سے کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوتی - نہ اس کے معنی غم کے ہیں - یہ بھی آپ کو عجیب سوجھی مومن خاں کے دماغ میں یہ کجی ضرور رہتی کہ ہَم (بمعنی غم) جیسا نامانوس لفظ ایسے غیر فصیح موقع پر رکھدیتے، لیکن یہاں نہیں رکھا، خواہ مخواہ ان کی کج دماغی کیوں ثابت کی جائے - آپ کو شاید یہ خیال آیا کہ مصرعۂ اولیٰ کے دونوں ٹکڑے برابر کے ہیں اسلئے ہَم کو غم سمجھا - لیکن اس حالت میں یہ مساوات خوبصورت نہ رہتی - ایک جگہ مضطر صفت ہے، دوسری جگہ ہَم، اسم - اس سے تو یوں کہتے: "شام سے تا صبح غم ہے، صبح سے تا شام ہم" توازن پیدا ہو جاتا - دوسرے، آپ نے غالباً دونوں مصرعوں میں ہم کی تکرار کو خلاف فصاحت سمجھا ہوگا، اس لئے پہلے (ہم) کے اور معنی لئے - لیکن میرے نزدیک دونوں جگہ (ہم) کا آنا غیر فصیح نہیں ہے - نثر کر دیکھئے - دونوں مصرعے دو پورے جملے ہیں - مومن خاں کا مفہوم یہ ہے کہ ہم شام سے تا صبح اور صبح سے تا شام مضطر رہتے ہیں - اے گردشِ ایام اس کا کیا سبب کہ تیرے اثر سے شام بدل کر صبح ہو جاتی ہے، صبح بدل کر شام ہو جاتی ہے لیکن ہم میں تغیر نہیں ہوتا، ایک ہی عالم میں رہتے ہیں -

والسلام

احقر حامد حسن قادری

(نگار) میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس طرف توجہ فرمائی - لیکن ساتویں شعر کا جو مفہوم آپ نے بیان کیا ہے، اس سے مجھے اختلاف ہے - آپ فرماتے ہیں کہ مومن دل کی کدورت دھونے کے لئے شراب پینا چاہتا تھا، لیکن وہ شراب کا رنگ ہی دیکھکر بیخود ہو گیا اور مقصد اصلی یعنی صفائی باطن کا ہوش نہ رہا --- لیکن آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اس صورت میں اسے یہ کہنا چاہئے تھا :- توبہ، کہاں صفائیِ باطن کے ہوش تھے

دوسری بات یہ کہ رنگ مئے ناب دیکھ کر غش ہونے کے معنے یہ نہیں ہو سکتے کہ اس نے شراب پی ہی نہیں اور وہ صرف رنگ دیکھ کر بے ہوش ہوگیا کیونکہ اس صورت میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ مومن کدورت باطن دور کرنے کے لئے شراب پینا چاہتا تھا لیکن نہ پی سکا اور بدستور "خراب باطن" بنا رہا۔

غش ہو جانے کے معنے یہاں بے اختیار ہو جانے کے ہیں۔ یعنی وہ شراب کا رنگ دیکھ کر اتنا بے اختیار ہوگیا کہ بلا پس و پیش پی گیا اور یہ خیال نہ رہا کہ یہ "کدورت باطن" پیدا کرنے والی چیز ہے۔ لفظ توبہ کا استعمال بھی اسی مفہوم کا موید ہے۔

بیسویں شعر کا مفہوم بتاتے ہوئے آپ نے نثر کرکے دیکھنے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نثر نہیں کی۔ ہم کے معنے اگر وہی لئے جائیں جو آپ بتاتے ہیں تو آپ ہم کو کہاں لے جائیں گے اور نثر کرنے میں کتنے محذوفات ماننا پڑیں گے اور کتنی اُلٹ پلٹ کرنا پڑے گی آپ کے بیان کردہ مفہوم کے مطابق نثر یوں ہوگی: "ہم شام سے تا صبح (اور) صبح سے تا شام مضطر (رہتے ہیں)" اور اس صورت میں تعقید ظاہر ہے۔

ہم کو اگر غم کے معنے میں لیا جائے تو سوائے اس عیب کے کہ ایک فقرہ میں مضطر (صفت) ہے اور دوسری جگہ ہم (اسم)، نہ نثر کرنے میں محذوفات کے پُر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ تعقید کا عیب پیدا ہوتا ہے۔

آیندہ جنوری ۴۲ء میں

حضرات ذیل کے انتقادی مقالے درج ہوں گے

۱۔ پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب ــــ پٹنہ یونیورسٹی

۲۔ پروفیسر آل احمد سرور ــــ مسلم یونیورسٹی

۳۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر ــــ پرنسپل سری نگر کالج

۴۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری ــــ سنٹ اینڈروز کالج گورکھپور

۵۔ نیاز فتحپوری ــــ اڈیٹر نگار

منیجر

لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ فنون کے لحاظ سے تقسیم کی گئی ہے - ابھی تک کوئی صحیح اندازہ اس کا نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کتنے اجزاء پر مشتمل ہوگی اور اس کی یہ بے پایانی صرف اسی لئے ہے کہ ترتیب میں حروف تہجی کا لحاظ نہیں رکھا گیا -

جس حد تک ظاہری حُسن کا تعلق ہے، یہ کتاب طباعت و کتابت اور نقوش و تصاویر کے لحاظ سے لیتھوگرافی کی دُنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتی، لیکن معنوی حُسن کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا -

جزیرۂ سخنوران تصنیف ہے جناب غلام عباس سب اڈیٹر آواز کی، یہ کتاب بظاہر ایک فسانہ معلوم ہوتی ہے لیکن در اصل ایک طنزیہ انتقاد ہے ہمارے اُن شعراء پر جنھوں نے شعر کا مفہوم صرف ضلع جگت سمجھ رکھا ہے اس کتاب کا بنیادی خیال بقول مصنف ایک فرانسیسی اہل قلم "آندرے موردا" کی کسی تصنیف سے لیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ غلام عباس صاحب نہایت قابلیت وحُسن کے ساتھ اس کو صرف کیا ہے -- کتاب دیکھنے کے قابل ہے ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے -- قیمت عہ ر- ملنے کا پتہ: کتاب خانہ ہزار داستان - ۴۲ بازار لیلین - نئی دہلی -

زہریلی مکھی اور دوسرے افسانے تیسرا مجموعہ ہے جناب محمود مورخ بی-اے کے افسانوں کا - ان کے ایک مجموعہ پر ستمبر کے نگار میں تبصرہ شایع ہو چکا ہے - جناب مورخ مشہور جرنلسٹ ہیں اور باوجود انتہائی ناکامیوں کے انھوں نے صحافت کا پیچھا نہیں چھوڑا - یہ فسانے ملک کے مشہور رسایل میں شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں - قیمت عہ ر ملنے کا پتہ: گلفروش پبلشنگ ہاؤس دہلی -

حدیث ناتمام جناب پنڈت دیس راج شرما آبر سیمابی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے - ان کے کلام میں وہی آرٹ نمایاں ہے جو اُن کے اُستاد حضرت سیماب اکبرآبادی کے کلام میں پایا جاتا ہے اور کافی دلکش ہے - قیمت ۱۲/ر - ملنے کا پتہ: دفتر شاعر آگرہ

میرے نغمے جناب سلام مچھلی شہری کی بعض نظموں کا مجموعہ ہے - سلام صاحب اپنے آپ کو ترقی پسند شاعروں میں کہتے ہیں، گو ابھی تک مجھے یہی نہیں معلوم کہ ترقی پسند شاعر کس چیز کا نام ہے، سلام صاحب ذہین نوجوان ہیں اور سخن گوئی کی اچھی اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ "ادب برائے حیات" کے نظریہ کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ فن کی پابندیاں بھی انھیں ناگوار ہیں - افسوس ہے کہ ہمارے بہت سے ذہین نوجوان صرف اس لئے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں کہ ان کی گمرہی پر انھیں ٹوکا نہیں جاتا -

یہ مجموعہ اُردو سوسائٹی - دفتر اضطراب بنارس سے مل سکتا ہے -

جواہرات حفیظ جونپوری ادبستان بنارس نے حفیظ جونپوری کے سوا سو شعروں کا انتخاب اس نام سے شایع کیا ہے - جناب حفیظ مشہور خوشگو شاعر ہیں اور ضرورت تھی کہ ان کا پورا دیوان شایع کر کے ملک کے سامنے پیش کیا جاتا -

یہ انتخاب ۳/ر میں مل سکتا ہے -

بحری طاقت گورنمنٹ یو-پی کے محکمۂ اطلاعات نے یہ کتاب بہت برمحل شایع کی ہے - اس میں بحری طاقت کے مسئلہ پر تمام وہ معلومات جمع کر دی گئی ہیں جن کا جاننا جنگ کے زمانہ میں بہت ضروری ہے - یہ کتاب پندرہ

ابواب میں منقسم ہے اور بحری قوت سے متعلق کوئی ضروری مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا ذکر اس میں نہ کیا گیا ہو۔ تصاویر و نقوش کے اضافہ سے کتاب کی افادیت اور زیادہ ہوگئی ہے۔ طباعت و کتابت بھی بہت نفیس ہے

یہ کتاب محکمۂ اطلاعات یوپی گورنمنٹ سے لکھنؤ کے پتہ پر غالباً مفت ملسکتی ہے۔

شمیم کے سو شعر جناب سید مظفر حسین صاحب شمیم کے سو شعروں کا مجموعہ ہے جسے سید جمیل الدین صاحب نے مرتب کیا ہے۔

شروع میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا تعارف ہے جو جناب شمیم کے کلام میں سچائی کا عنصر بہت زیادہ پاتے ہیں منتخب اشعار کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شمیم کا ذوق تغزل واقعی پاکیزہ ہے اور تاثر کی کسک سے ان کا کلام خالی نہیں۔

یہ مجموعہ عہر میں اجمل پریس بمبئی سے ملسکتا ہے۔

سوز و گداز مجموعہ ہے جناب حافظ محمد ولایت اللہ صاحب ناگپوری کے منظومات و غزلیات کا۔ آپ بی۔اے (علیگ) ہیں، خان بہادر ہیں سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں اور سی۔پی کے پنشن یافتہ ڈپٹی کمشنر۔ ظاہر ہے کہ ایسے باکار آدمی کو شاعری کے بیکار مشغلہ کے لئے فرصت کب مل سکتی تھی، پھر بھی آپ کے فطری ذوق نظم نگاری نے یہ مجموعہ مرتب کرا ہی دیا۔ اس میں قومی، اخلاقی، سیاسی، سنجیدہ وغیر سنجیدہ سبھی قسم کی نظمیں پائی جاتی ہیں۔

کتابت و طباعت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: محمد الطاف اللہ۔ چھاؤنی ناگپور

زندہ چین مجموعہ ہے چند چینی کہانیوں کا جنھیں جناب تمنائی نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ جس طرح جدید چین، قدیم چین سے بالکل مختلف ہے، اسی طرح وہاں کی جدید کہانیاں بھی قدیم داستانوں سے بالکل علحدہ ہیں۔

چین کا موجودہ دور اک انقلابی دور ہے جس نے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ وہاں کے ادب کو بھی بہت متاثر کیا ہے اور یہ کہانیاں اسی جدید ادبی تخلیق کی پیداوار ہیں۔ کہانیوں کا اسلوب بہت کچھ روسی کہانیوں سے ملتا جلتا ہے، لیکن پس منظر بالکل دوسرا ہے۔ اس مجموعہ میں سات مشہور افسانہ نگاروں کی کہانیاں درج ہیں، جنمیں دو چینی خاتونوں کا نام بھی نظر آتا ہے۔

جناب تمنائی کی یہ خدمت اردو ادب میں نہایت مفید و برمحل اضافہ ہے جس کی ہم کو قدر کرنا چاہئے۔ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔ قیمت عہر ——— "نیا سنسار کتاب گھر بانکی پور" کے پتہ سے خط و کتابت کی جائے۔

ہماری زبان یہ پمفلٹ بھی نیا سنسار کتاب گھر نے شایع کیا ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق صاحب نے بتایا ہے کہ اردو زبان کیا ہے اور اس میں ہمزمانہ کا ساتھ دینے کی کتنی اہلیت پائی جاتی ہے مولوی صاحب موصوف کی عمر ہی چونکہ اردو کی خدمت میں صرف ہوئی ہے، اس لئے انھوں نے اس مقالہ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ماہرانہ حیثیت سے لکھا ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔ اس کی قیمت ۸ر ہے۔

وقت کی باتیں

عورت اور روس

جب حکومت زار کے زمانہ میں (۱۸۹۷ء) مردم شماری ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہر دو عورتوں میں ایک عورت خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ باقی نصف میں سے کچھ کھیتی باڑی کا کام کرتی تھیں اور کچھ کارخانوں، ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں میں۔ اس کے بعد جب سویٹ حکومت کا دور آیا تو ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۸ء تک دس سال کے زمانہ میں ۹۰ لاکھ عورتیں مفید کاموں میں لگ گئیں اور تیسری پنج سالہ اسکیم میں یہ تعداد دو کروڑ تک پہونچنے والی ہے اور عورتوں کی خدمات بھی بہت زیادہ اہم ہوتی جارہی ہیں ـــــ ۱۹۳۶ء میں ۴۰ فی صدی مزدوری پیشہ عورتیں بڑے بڑے تجارتی کارخانوں میں کام کرتی تھیں اور ۱۵ فی صدی دوکانوں میں۔ ۲۰ فی صدی ڈاکٹری اور تعلیمی پیشہ میں مصروف تھیں، ۲۳ فی صد صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں اور صرف دو فی صدی ایسی تھیں جو گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔

سویٹ حکومت میں بڑے بڑے صنعتی ادارے پائے جاتے ہیں اور ان سب میں عورتیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں، چنانچہ لینن گراڈ کے مشہور جوتا بنانے والے کارخانے (اسکروخود) کے ملازمین میں دو تہائی حصّہ عورتوں کا ہے۔

اس خیال سے کہ عورتیں وہاں آزادی و اطمینان کے ساتھ پبلک لائف اور صنعت و حرفت میں حصّہ لیکر ملک کی مدد کریں۔ حکومت نے بہت سے تربیت گاہیں اور تعلیمی ادارے قایم کردئے ہیں، جہاں مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ کر کام پر چلی جاتی ہیں۔

پانچ سال پہلے ان تربیت گاہوں میں ۲۸ لاکھ بچے پرورش پاتے تھے اور اب اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ تعداد تقریباً ۵۰ لاکھ تک پہونچ جائے گی، کیونکہ تیسری پنج سالہ اسکیم کی روسے ان تربیت گاہوں کی تعداد بہت بڑھادی گئی ہے

جب فصلوں کے کٹنے کا وقت آتا ہے تو ہر سال زراعتی ادارے اپنی تربیت گاہیں علحدہ قایم کردیتے ہیں جہاں تقریباً ۶۰ لاکھ بچے پرورش پاتے رہتے ہیں اور ان کی مائیں اطمینان سے کھیتی باڑی کے کام میں لگی رہتی ہیں۔

مزدور عورتوں کے لئے آسانی پیدا کرنے کی غرض سے وہاں پکا پکایا کھانا فراہم کرنے والی دوکانیں کثرت سے کھولی گئی ہیں، چنانچہ ۱۹۳۹ء تک روس کے بڑے بڑے شہروں میں ۵۰ ہزار دوکانیں ایسی قایم ہوچکی تھیں، جن میں سالانہ ۱۳ کرور ۵۰ لاکھ روبل کا کاروبار ہوتا تھا۔ مردوں کی طرح روس کی عورت بھی سات گھنٹے روزانہ کام کرتی ہے، اور مردوں کے برابر اسے اُجرت ملتی ہے۔ وہاں اس بات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ہر عورت اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے اتنا ہی کام کرے جو اس کی صحت کو خراب کرنے والا نہ ہو، وہاں قانوناً اس کی ممانعت ہے کہ عورتوں کو ایسے کاموں میں لگایا جائے جو ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالنے والے ہیں۔ جن عورتوں کے بچّے ۶ مہینے سے کم ہوتے ہیں، ان سے رات کو کام نہیں لیا جاتا۔

روس میں سب سے زیادہ انقلاب زراعتی طبقہ کی عورت میں ہوا ہے۔ وہاں پہلے بھی لاکھوں عورتیں اسی پیشہ میں مصروف نظر آتی تھیں لیکن ان کی حالت بقول گورکی ایک مظلوم و پامال غلاموں کی سی تھی۔ وہ صبح سے شام تک کام کرتی تھیں اور انھیں یہ خبر نہ ہوتی تھی کہ اس محنت کا صلہ کیا ملا، لیکن آج روس کی زراعت پیشہ عورت کی حالت بالکل دوسری ہے۔

۱۹۳۶ء کے اعداد شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت عورتوں کے زراعتی اداروں میں ایک تہائی سے زیادہ کام عورتیں کرتی تھیں۔ اس سے قبل زار کے زمانہ میں سوائے کھرپی اور ہنسیا کے عورت کے ہاتھ میں کچھ نہ ہوتا تھا، لیکن آج وہ بڑی بڑی

زراعتی مشینوں کو خود چلا رہی ہے اور مرد کا آدھا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا ہے ۔

صنعت و حرفت وغیرہ میں بھی وہاں کی عورت نے نمایاں ترقی کی ہے ۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ روس کو چھوڑ کر اسوقت تمام دنیا میں دس ہزار عورتوں سے زیادہ انجینیری کا کام نہیں کرتیں، لیکن روس میں ایسی عورتیں دو لاکھ پائی جاتی ہیں جو انجینیری اور مشینری کے کاموں میں مصروف ہیں ۔ دیگر علوم و فنون میں یہ حال ہے کہ زار کے زمانہ میں وہاں صرف ۲۰۰۰ عورتیں ڈاکٹری کا پیشہ کرتی تھیں، لیکن اب یہ تعداد ایک لاکھ تک پہونچ گئی ہے ۔

ورزش اور کھیل کود میں بھی وہ برابر مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں، چنانچہ اس وقت ۵ لاکھ عورتیں وہاں لیبر اینڈ ڈیفنس (Labour and Defence) کی ممبر ہیں اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار عورتیں وہ ہیں جو قدر اندازی کا ورد شلاں بیچ اپنے بازو پر لگائے پھرتی ہیں ۔

موجودہ ایران

"روس اور برطانیہ کی فوجوں نے ایران میں داخل ہو کر اس ملک کو آجکل موضوع سخن بنا دیا ہے ۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس کی تاریخ پر اک نگاہ ڈال لی جائے"

صرف ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب سرزمین ایشیا کے اس حصہ نے جو فارس کے نام سے مشہور تھا، اپنا نام بدلکر ایران رکھا لیکن وہاں کے باشندوں کے نزدیک آرین آبادی کا مسکن ہونے کی وجہ سے یہ پہلے بھی ایران ہی تھا ۔

۱۸۰۰ سال مسیح سے پہلے جب وسط ایشیا سے آرین جماعت آگے بڑھی تو وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ۔ ایک حصہ مشرق کی طرف بڑھکر ہندوستان آ گیا اور دوسرا حصہ مغرب و جنوب مغرب کی طرف کوہستانوں کی طرف چلا گیا ۔ یہ حصہ دو زبردست قوموں پر مشتمل تھا، میدی اور پارسی ۔ ۶۰۰ء قبل مسیح میں میدیوں نے ایک بڑی سلطنت دجلہ کی مشرق میں قایم کر لی جو خلیج فارس سے بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی ۔

ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ یہ ایرانی سلطنت میدی قوم کے ایک فرد (Deioces) نے قایم کی تھی اور مسیح سے ایک ہزار سال قبل بھی ان کا ایک مذہب تھا، لیکن بعد کو زردشت کے پیرو ہو گئے ۔ دارا کے عہد میں اس سلطنت کو بڑا عروج حاصل تھا، مگر سکندر کے حملہ کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا ۔ جب اسلام نے ظہور کیا تو یہ ملک مسلمان ہو گیا، کیونکہ عربوں نے چند سال کے اندر اس کو بالکل مغلوب کر لیا اور اس طرح ایران کی زردشتی فضا اسلامی فضا میں تبدیل ہو گئی ۔

اٹھارھویں صدی کے اخیر میں قاچاری حکومت سے اس سلطنت کا زوال شروع ہوا ۔ اسوقت طہران مستقل طور پر پایۂ تخت قرار دیا گیا اور ناصر الدین قاچار نے ہرات پر بھی قبضہ کرنا چاہا، لیکن انگلستان نے ۱۸۵۸ء میں خلیج فارس سے اپنی فوجیں اتار کر بوشہر پر قبضہ کر لیا اور ناصر الدین کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی ۔ اس کے بعد ایران کے باب میں برطانیہ اور روس کے درمیان رشک و رقابت شروع ہوئی، ان میں سے ہر ایک اپنا اثر جمانا چاہتا تھا ۔

۱۸۹۶ء میں ناصر الدین قاچار قتل کیا گیا اور اس کے بیٹے مظفر الدین نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی، لیکن ملک کی انتظامی حالت اس قدر خراب تھی کہ مجبوراً ۱۹۰۶ء میں اس نے پارلیمنٹری حکومت قایم کر دی ۔ ۱۹۰۷ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے محمد علی شاہ نے پھر آئین حکومت کو بدلنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہوا اور اسے اپنے ہفت سالہ بیٹے احمد شاہ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہونا پڑا، جس نے ۱۹۰۹ء ۔ ۱۹۲۵ء تک حکومت کی ۔

مظفر الدین کے زمانہ میں روس کا اثر یہاں بہت قایم ہوگیا تھا لیکن اسی زمانہ میں (سنہ۴ء - سنہ۵ء) روس کو جاپان کے مقابلہ میں سخت شکست اُٹھانا پڑی اور اس طرح اس نے ایران کے باب میں برطانیہ سے مصالحت کرلی۔

اس معاہدہ کی روسے (جو سنہ۷ء میں ہوا تھا) دونوں کے حلقہ ہائے اثر متعین ہوگئے۔ یعنی شمالی ایران، روس کے زیر اثر رہا اور شرقی جنوبی حصہ میں خلیج فارس کے ساحلوں پر انگلستان کا اثر تسلیم کرلیا گیا۔

پچھلی لڑائی میں روس نے جرمنی اور ترکی کے خلاف جنگ کرکے ایران پر بھی قبضہ کرلیا تھا، لیکن انقلاب ہوجانے کی وجہ سے روسی فوجیں یہاں سے چلی گئیں اور اس طرح ۱۹۱۸ء تک سارے ایران پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا۔ مگر اس کے دوسرے ہی سال یہاں انقلاب رونما ہوا اور برطانیہ کو یہ ملک چھوڑنا پڑا۔

اس وقت ملک کی حالت بہت نازک تھی اور ہر طرف انارکزم پھیلی ہوئی تھی کہ دفعتاً ایک شخص رضا خاں نمودار ہوا جو فوج کے معمولی عہدہ سے ترقی کرکے سنہ۲۵ء میں یہاں کا فرمانروا ہوگیا۔

ایران رقبہ میں فرانس سے تگنا ہے۔ اور تین ہزار فٹ سے لیکر ۱۶ ہزار فٹ تک بلند پہاڑوں کا سلسلہ ملک کے شمال اور مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ میدانی علاقہ بھی نصف ریگستان ہے اور باقی نصف بھی اکثر بے آب وگیاہ ہے۔ عرب کی طرح یہاں کا حال بھی یہی ہے کہ خانہ بدوش جماعتیں چراگاہ کی فکر میں ادھر اُدھر پھرتی رہتی ہیں اور جہاں سبزہ نظر آیا وہاں قیام کرلیتی ہیں۔

یہاں کی آبادی ڈیڑھ کرور سے زیادہ نہیں ہے جو سب کی سب آرین ہے اور زیادہ تر گاؤں میں رہتی ہے۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے، لیکن عیسائی اور زردشتی بھی یہاں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

یہاں کی معدنی پیداوار میں پٹرول خاص چیز ہے، اس لحاظ سے ایران دنیا کے پانچویں نمبر پر ہے اور ہزاروں ایرانی اس سلسلہ میں روزگار سے لگے ہوئے ہیں، یہاں کے پٹرولی چشمے ایک برطانوی کمپنی کے قبضہ میں ہیں جسکو شاہ ایران کی طرف سے خاص رعایتیں حاصل تھیں۔

ترکی کی طرح یہاں کی معاشرت میں بڑا انقلاب پیدا ہوگیا ہے اور افرنجیت کا زور بڑھتا جارہا ہے۔ پہلے یہاں عورتوں کو تعلیم سے بالکل محروم رکھا جاتا تھا، اور پردہ کی سخت پابندی تھی۔ لیکن اب پردہ بالکل اٹھ گیا ہے اور ان کو ممبر پارلیمنٹ بننے کا حق بھی دیدیا گیا ہے۔

رضا شاہ نے ایران کو مہذب بنانے اور ترقی دینے میں بڑی کوشش کی اور اس میں شک نہیں کہ پٹرولی چشموں نے اس کے مستقبل کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ یہاں ۱۵۰ میل لمبی پایپ لائن بنی ہوئی ہے جس کے ذریعہ سے پٹرول خلیج فارس تک پہونچتا ہے۔ یہاں کی پٹرولی پیداوار کا اوسط ۸۰ لاکھ ٹن سالانہ ہے جس میں ۲۰ ہزار ایرانی کام سے لگے ہوئے ہیں

جرمنی کے بادشاہوں کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ وہ اپنے اثرات ایران تک وسیع کردیں، چنانچہ قونیہ سے خلیج فارس تک ریلوے بنانے کی اجازت ایک جرمن کمپنی کو مل ہی گئی تھی، لیکن پچھلے سال یہ اسکیم درہم برہم ہوگئی۔

ہٹلر کے عروج کے وقت سے نازیوں کی آمدورفت یہاں اور عراق میں کثرت سے شروع ہوگئی تھی اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایران کو مرکز بنا کر برطانیہ کے خلاف عراق اور ہندوستان میں کارروائی کریں، لیکن روس اور برطانیہ کی فوجوں نے یہاں پہونچکر ہٹلر کی اس امید کو خاک میں ملا دیا۔

انتخاب کلام میر

(مسلسل)

نہ پوچھ اپنی مجلس میں ہے میر بھی یاں ــــ جو ہوگا تو جیسے گنہگار ہو گا،
اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا ــــ لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن ــــ جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
دور بیٹھا غبارِ میر اس سے ــــ عشق بن یہ ادب نہیں آتا
کیا ہے جو اُٹھ گیا ہے پر بستۂ وفا ہے ــــ قیدِ حیات میں ہے تو میر آ رہے گا
اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر ــــ پھر ملیں گے اگر خدا لایا
کہے ہیں میر کو مارا گیا شب اُس کے کوچے میں ــــ کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اُٹھ گیا ہوگا
ہے حال جائے گریہ جانِ پُر آرزو کا ــــ روئے نہ ہم کبھو ٹک دامن پکڑ کسو کا
شاید کہ مند گئی ہے قمری کی چشمِ گریاں ــــ کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کے جو کا
کل شبِ ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا ــــ شام سے تا صبحدم بالیں پہ سر یکجا نہ تھا
پیغامِ غمِ جگر کا گلزار تک نہ پہونچا ــــ نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہونچا
دل نہ پہونچا گوشۂ داماں تلک ــــ قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا
کس کو میرے حال سے تھی آگہی ــــ نالۂ شب سب کو خبر کر گیا،،
مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں ــــ میر بھی شام اپنی سحر کر گیا
پوچھا جو میں نے دردِ محبت سے میر کو ــــ رکھ ہاتھ اُن نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا
فصلِ خزاں تلک تو میں اتنا نہ تھا خراب گرد ــــ مجھ کو جنوں ہوگیا موسمِ گل میں کیا بلا
میں تو کہا تھا تیرے تئیں آ اُو سمجھ نہ ظلم کر ــــ آخر کار بیوفا جی ہی گیا نہ میر کا
گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر ــــ اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا
جو اس شور سے میر روتا رہے گا ــــ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو ــــ تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا
خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن ــــ رہے ہے خوف مجھے اُس کی بے نیازی کا
اُن نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر ــــ ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

کس کی مسجد، کیسے بتخانے کہاں کے شیخ وشاب — ایک گردش میں تری چشم سیہ کے سب خراب
وحشت ہے بہت میر کو مل آئیے چل کر — کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات
سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت — تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت
پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ — غالباً زیر زمیں میر ہے آرام بہت
تھا جی میں اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میر — پر کچھ کہا گیا نہ غم دل حیا سے آج
جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے — آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھکر
جی میں تھا اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میر — پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھکر
شکوۂ آبلہ ابھی سے میر — ہے پیارے ہنوز دلی دور
شرم و حیا کہاں تک ہیں میر کوئی دن کے — اب تو ملا کرو تم ٹک بے حجاب ہو کر
مرہ کہیں بھی میر جا سرگشتہ پھرنا تا کجا — ظالم کسو کا سن کہا، کوئی گھڑی آرام کر
افسانے ما و من کے سنیں میر کب تلک — چل اب کہ سو ویں منہ پہ دوپٹے کو تان کر
باقی یہ داستان ہے اور کل کی رات ہے — گر جان میری میر نہ آپہونچے لب تلک
رنگ پریدہ، قاصد، باد سحر کبوتر — کس کس کے ہم حوالے مکتوب کر چکے ہیں
کیا تجھکو بھی جنوں تھا کہ جامے میں تیرے میر — سب کچھ بچا ہے ایک گریبان ہی نہیں
تلوار غرق خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں — دیکھیں تو تیری کب تک یہ بد شرابیاں ہیں
جا ہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اوپر — دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں
بیٹھے تھے میر یار کے دیدا کو سو ہم — اپنا یہ حال کر کے اُٹھے اک نگاہ میں
چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر — ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں
جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں — بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں
پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میر اب — دور پہونچی ہیں مری رسوائیاں
ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں — تم تو کرو ہو صاحبی بندہ میں کچھ رہا نہیں
نالے کیا نہ کر سنا نالہ مرے پہ عندلیب — بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں — کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں
دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں — وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں
بیقراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے — کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں
صدائے آہ جیسے تیر، جی کے پار ہوتی ہے — کسو بیدرد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکاں کو
کیا سیر اس خرابے کا بہت اب چلکے سو رہئے — کسو دیوار کے سایہ میں منہ پر لیکے داماں کو
دوستی ایک سے بھی تجھ کو نہیں — اور سب سے عناد ہے تم کو

(باقی)

مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کے جہازات

شاہی سمندری بیڑہ، شاہی ہندوستانی بیڑہ اور شاہی ہوائی فوج کی حفاظت میں سال گزشتہ کا حج بخیریت تمام ہوگیا تھا اور اب **مغل لائن** فخر کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ حکومت ہند کی رضامندی اور مشورہ سے حاجیوں کے لئے جہازات کی روانگی کا انتظام ہوگیا ہے۔

چونکہ اسوقت لڑائی جاری ہے اس لئے اسوقت جہازوں کے نام اور اُن کی روانگی کی صحیح صحیح تاریخیں نہیں بتائی جاسکتیں لیکن حج کو جانے والوں کو چاہیئے کہ وہ ذیل کی تاریخوں میں مندرجۂ ذیل بندرگاہوں پر پہونچ جائیں اور اسکا انتظام بھی کرلیں کہ انھیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا جو پانچ روز سے زیادہ نہیں ہوگا۔

بمبئی :- پہلا جہاز ۱۰ ر نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا — **کراچی** :- پہلا جہاز ۱۱ ر نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا
دوسرا جہاز ۱۷ ر نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا — دوسرا جہاز ۱۸ ر نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا

کلکتہ سے صرف ایک جہاز ۱۶ ر نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا

شرح کرایہ حسب ذیل ہے :-

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ	کلکتہ سے جدہ (آمد و رفت)
فرسٹ کلاس (مع کھانے کے)	۲۴۴ روپیہ	۲۱۶ روپیہ	۲۹۵ روپیہ
تختۂ جہاز کا (تھرڈ کلاس)	۲۰۳ روپیہ	۱۹۶ روپیہ	۲۳۵ روپیے ۸ آنے

اس کے علاوہ ہر مسافر کو روانگی کے وقت بندرگاہ پر جہاز تک پہونچانے اور جدہ میں جہاز سے اُتارنے کے لئے مزید (سے ر) دینا ہونگے

مزید تفصیلات پتۂ ذیل سے دریافت کیجئے :-

ٹرنر موریسن کمپنی لمیٹڈ نمبر ۱۶ بینک اسٹریٹ۔ بمبئی

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۳۴ء

(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھ کر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۵۶ — معہ تصویر غالب (رنگین) قیمت دو روپیہ (عـ/) علاوہ محصول

جنوری ۳۵ء

(اردو شاعری نمبر) اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام یہ مجموعہ اردو شاعری پر اتنی معلومات رکھتا ہے کہ اس کے بعد پھر کسی تذکرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی متعدد مضامین اڈیٹر نگار کے قلم کے ہیں۔ صفحات ۲۳۶ – اس میں اڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے قیمت چار روپیہ (للعہ/) علاوہ محصول

جنوری ۳۶ء

(ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پہ تبصرہ اور انتخاب کلام، اردو میں ہندی شاعری پر اس سے زیادہ بہتر انتخاب اور معلومات کا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ صفحات ۱۲۸ – قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۳۷ء

ڈراما اصحاب کہف خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشا پردازی کا نمونہ ہیں۔ صفحات ۱۴۴ قیمت عہ/ علاوہ محصول

جنوری ۳۸ء

تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس وقت نظر اور کاوش و تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲ قیمت دو روپیہ (عـ/) علاوہ محصول

جنوری ۳۹ء

(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:– حیات مصحفی۔ اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۴۳ قیمت ایک روپیہ (عـ/) علاوہ محصول

جنوری ۴۰ء

(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:– نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ایک روپیہ [illegible] علاوہ محصول

جنوری ۴۱ء

یہ نمبر دنیا سے تذکرہ میں بالکل نئی چیز ہے یعنی اس میں عہد کے تمام مشہور غزل گو شعراء [illegible] [illegible] گئے ہیں اور [illegible] انتخاب کیا ہے [illegible] [illegible] قیمت [illegible]

ATION L MUSLIM UN
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI
قیمت فی کاپی

صفحہ نمبر ۸ کے تین اعلانات بہت اہم ہیں
انھیں ضرور ملاحظہ فرمائیے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۴۰	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۴۱ء	شمارہ ۶

ملاحظات

(۲۹ر نومبر ۱۹۴۱ء)

جنگ کا ہولناک مستقبل جس وقت تک جرمنی نے روس پر حملہ نہ کیا تھا جنگ کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ بحر روم یا بحر اسود سے گزر کر ایشیا اور ہندوستان تک اس خطرہ کے بڑھنے کا اندیشہ پیدا ہوتا یا یہ کہ یورپ ہی میں اس خطرہ کی عمر زیادہ قرار دیجاتی کیونکہ جرمنی، فرانس اور اکثر بلقانی ریاستوں پر اقتدار حاصل کر لینے کے بعد بھی انگلستان پر کوئی کامیاب حملہ نہ کر سکا تھا اور اٹلی و جرمنی کی متحدہ کوششوں کے باوجود بحر روم کی عنان سیادت بدستور برطانیہ کے ہاتھ میں پائی جاتی تھی اور ان حالات میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا کہ یا تو جرمنی پھر انگلستان پر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا یا وہ وقت کو اسی طرح ٹالتا رہے گا یہاں تک کہ کوئی نہ کوئی صورت باہمی مفاہمت کی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جب اس نے روس پر حملہ کیا تو لڑائی کی نوعیت بدلی، ہوا کا رُخ بدلا، قیاس آرائیاں بدلیں، اور ہم میں سے اکثر نے یہ خیال قایم کیا کہ ہٹلر سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی روس کو ختم کر دے گا اور اس کے بعد جاڑوں کا زمانہ طیاریوں میں صرف کرنے کے بعد وہ پھر انگلستان پر حملہ کرے گا۔ یہ ۲۲ر جون کی بات ہے اور اس زمانۂ انتظار کو ہٹلر کے قول کے مطابق ستمبر کے پہلے ہفتے میں ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن ستمبر کیا نومبر بھی ختم ہو گیا اور فیصلۂ جنگ کے لحاظ سے ہٹلر اب بھی اسی مقام پر ہے جہاں سے اس نے یہ خونخوارانہ اقدام شروع کیا تھا۔

یقیناً یوکرائن کا علاقہ روس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے، کریمیا پر بھی اس کا تسلط قایم ہو چکا ہے، ماسکو اور لینن گراڈ بھی خطرہ میں ہیں، لیکن روس کی شکست کا خواب ہنوز تعبیر طلب ہے اور ہٹلر کے سامنے اب صرف ماسکو یا لینن گراڈ نہیں بلکہ اسٹالین کی ہمت اور روسی آبادی کے عزم و ارادہ پر فتح پانے کا سوال ہے، کیونکہ سارا مغربی روس ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھی روسی حکومت کا ⅔ حصہ بدستور اس کے پاس باقی رہ جاتا ہے اور اگر روسی آبادی اسی طرح دشمن کا مقابلہ کرتی رہی تو ہٹلر شاید برسوں فرد حساب میں نفع و نقصان کے توازن کو برابر نہ کر سکے گا۔

ہٹلر اس میں شک نہیں بڑا با اقبال شخص ہے، لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ روس پر حملہ کرنے کے ساتھ ہی اس کے سعد ستاروں نے رجعت قہقری شروع کر دی اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سخت "گرہ" اس کی زندگی میں کب تک باقی رہے گی۔

ہٹلر کی تاریخ عروج میں شروع سے لیکر فتح یونان تک (سوائے حملۂ انگلستان کے) کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ اس کو اپنے بنائے ہوئے پروگرام کی طرف سے مایوسی ہوئی ہو، چنانچہ اس نے جس وقت روس پر حملہ کیا تو اسے یقین تھا کہ دس ہفتے اس مہم کے سر کرنے کے لئے کافی ہیں، لیکن یہ دس ہفتے پانچ مہینے میں بھی ختم نہیں ہوئے اور ہو سکتا ہے کہ ان کا شمار سالوں سے کیا جائے۔

ہٹلر نے جب روس پر حملہ کیا تو اسے دو باتوں کا یقین تھا، ایک یہ کہ روسی افواج جرمن افواج کا مقابلہ زیادہ عرصہ تک نہیں کر سکیں گی اور دوسرے یہ کہ روس کی رعایا چونکہ بالشویک حکومت سے بیزار ہے، اس لئے وہاں انقلابی بے چینی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہ نکلیں۔ یعنی روسی فوجوں نے بھی نہایت پامردی سے مقابلہ کیا اور ملک کی آبادی نے بھی پورے اتحاد کے ساتھ اپنی حکومت کی مدد کی — لیکن ہٹلر کا یہ داؤں ایسا نہ تھا کہ واپس لیا جا سکتا۔ اس نے اپنی

دونوں غلطیوں کو محسوس کیا، لیکن اب اس کے لئے واپسی کی بھی کوئی صورت نہیں ہے، اس لئے موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ اگر ماسکو، لینن گراڈ بلکہ سارے مغربی روس پر جرمن قبضہ ہو بھی جائے تو یہ جنگ ختم نہیں ہوتی اور یہی وہ اندیشہ تھا جسکی بنا پر حال ہی میں روس کے خلاف یوروپ کی متعدد حکومتوں کے نمایندوں سے ہٹلر نے مشورہ کرکے روس کے خلاف اپنے محاذ کو زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

جرمنی کے علاوہ محوری دایرہ میں قابل ذکر حکومتیں صرف دو ہیں، ایک جاپان اور دوسرے اٹلی اور اس وقت یہ دونوں خود اپنی اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ اٹلی کو افریقہ اور بحر روم میں جو ناکامیاں ہوئی ہیں انھوں نے اطالوی ساکھ کو بالکل ختم کر دیا ہے اور اس کی صورت بالکل اس شخص کی سی ہے جو دو آگوں کے درمیان پھنس کر یہ فیصلہ کرنے سے عاری ہے کہ کس آگ کی آغوش میں اپنے آپ کو سونپ دے۔ یعنی اگر وہ جرمنی کا ساتھ دیتا ہے تو اٹلی کا جرمن کی غلامی میں چلا جانا یقینی ہے اور اس کا ساتھ نہیں دیتا تو دوسری طرف برطانیہ و امریکہ اس کی حکومت کو ختم کئے دیتے ہیں۔

لیبیا میں جو تازہ برطانوی حملہ شروع ہوا ہے، وہ اسی بات کی پیش قدمی ہے اور اس وقت تک جو کامیابیاں برطانوی افواج کو وہاں حاصل ہوئی ہیں وہ نہ صرف اٹلی کے افریقی مقبوضات کو ہمیشہ کے لئے اس سے چھین لینے والی ثابت ہوں گی بلکہ روس کی طرف سے جرمن فوجوں کے دباؤ کو بھی ختم کر دیں گی۔

رہ گیا جاپان، سو امریکہ سے جو گفتگو اس کی ہو رہی ہے اور جس نے مایوس کن صورت اختیار کر لی ہے، ایسی معمولی بات نہیں کہ وہ محوری ادارہ میں شریک ہونے کے بعد جرمنی کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکے۔

یقیناً ہٹلر کو اس سے سخت شکایت ہونا چاہئے کہ اسوقت تک اس نے سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ نہیں کیا، لیکن جاپان دیکھ رہا تھا کہ خود ہٹلر کی کامیابی روس میں کس حد تک کارآمد ثابت ہوتی ہے اور چونکہ اس کی یہ اُلجھن ابھی تک دور نہیں ہوئی اس لئے وہ برابر روس کے خلاف قدم اُٹھانے کو ٹال رہا ہے۔

دوسری مصیبت جاپان کے لئے اسی دوران میں یہ پیش آگئی کہ امریکہ اور برطانیہ نے اس کے سرمایہ کو ضبط کرکے اس کے تجارتی و اقتصادی توازن کو بالکل درہم برہم کر دیا اور شرائط ایسی سخت پیش کیں اور اگر وہ انھیں مان لے تو پھر اس کی حالت اب سے ایک صدی پہلے کی سی ہو جاتی ہے —— الغرض جنگ جتنی زیادہ طویل ہوتی جاتی ہے، نازی کامیابیوں کا امکان بہت ضعیف ہوتا جاتا ہے اور امریکہ و برطانیہ کی تدابیر زیادہ ٹھوس اور زیادہ مستحکم صورتیں اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

جاپان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بحر پاسفک کا نہیں بلکہ خود بحر جاپان کا ہے، جہاں ولاڈی واسٹک کی روسی بندرگاہ جو دنیا کی بہت بڑی قلعہ بند بندرگاہوں میں سے ہے اس سے اس قدر قریب ہے کہ منٹوں کے اندر وہاں سے ٹوکیو پر بم برسائے جا سکتے ہیں

فرانسیسی انڈوچائنا پر بینک اس کی فوجوں کا بڑا اجتماع پایا جاتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ اگر لڑائی چھڑ گئی تو وہ سب سے پہلے برما کی سڑک پر حملہ کرکے ہندوستان پر بھی ہوائی تاخت کرے گا، لیکن ایک طرف سنگاپور میں برطانوی طیاریاں، دوسری طرف جزائر فلی پائن میں امریکی طیاریاں اتنی زبردست ہیں کہ جاپان کی بحری اور ہوائی طاقت مشکل ہی سے ان دونوں کا مقابلہ کر سکتی ہے —— بہرحال صورتِ حال بہت نازک ہو اور جنگ کا مستقبل روز بروز زیادہ تاریک ہوتا جاتا ہو، جس سے یقیناً ہندوستان کو بھی متاثر ہونا ہو اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تاثر یہاں کی آبادی پر کس طرح اثر انداز ہو اور ہم کو ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کرنا پڑے۔

جنگ کے حقیقی اسباب

(علمی نقطۂ نظر سے)

دنیا کے تمام واقعات و حوادث جو ہماری نگاہوں سے گزرتے ہیں، ان کا کوئی نہ کوئی فطری سبب ضرور ہوتا ہے جو ہمیں کبھی نظر نہیں آتا اور جب نظر آتا ہے تو ہم اس پر اسباب کا سلسلہ قائم کر لیتے ہیں، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ درجۂ حرارت کم ہونے کے بعد جب بیرومیٹر ہمیں فضا کی کثافت کی خبر دیتا ہے تو بارش ہوتی ہے، اسی طرح جب کرۂ زمین گردش کرتے کرتے آفتاب سے انتہائی بعد پر پہونچتی ہے تو حرارت آفتاب کم حاصل کرنے کی وجہ سے ہوا ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور پانی کی بھاپ مینھ کی صورت میں برسنے لگتی ہے، اس لئے ہم بارش کا سبب ان چیزوں کو قرار دیتے ہیں۔

عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ موجودہ جنگ کا تخم معاہدۂ ورسائی نے بویا تھا، اسی لئے ہٹلر نے اپنی قوم کا غیظ و غضب بھڑکانے کے لئے ہمیشہ معاہدۂ ورسائی کا ذکر کیا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاہدۂ ورسائی نتیجہ تھا پچھلی جنگ کا اور پچھلی جنگ بھی جرمنی ہی نے چھیڑی تھی، اس لئے ہٹلر کو "معاہدۂ ورسائی" کی شکایت کیوں ہے!

لیکن اگر ہم تسلیم کر لیں کہ موجودہ جنگ کا سبب واقعی معاہدۂ ورسائی تھا، تو پچھلی جنگ کا سبب کیا تھا جس کا نتیجہ معاہدۂ ورسائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آپ اس کا سبب اُس لڑائی کو قرار دیں گے جب ۱۸۷۰ء میں بسمارک نے فرانس کو فتح کر کے ورسائی ہی میں فاتحانہ شرائط فرانس سے تسلیم کرائی تھیں، پھر اگر کوئی اس ۱۸۷۰ء کی لڑائی کا سبب دریافت کرے گا، تو آپ اس سے قبل کس کس لڑائی کا ذکر کریں گے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ شاید قابیل و ہابیل تک پہونچ جائیگا اور جب بھی لڑائی کا کوئی معقول سبب نہ دریافت ہو سکے گا۔

اگر آپ عہدِ قدیم سے لیکر اس وقت تک لڑائیوں کی تاریخ اور ان کے اسباب و نتائج پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہر لڑائی اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی جدید اجتماعی یا سیاسی نظام ضرور لائی۔ جب بنی اسرائیل کی لڑائیاں کنعانیوں سے ہوئیں تو نظام بطریقی کی صورت قایم ہوئی، لیکن بعد کو جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی اجتماعی زندگی بغیر مشاورتی نظام کے نہیں سنبھل سکتی تو انھوں نے اس نظام کو اختیار کر لیا۔

یوروپ میں اقطاعی نظام (فیوڈل سسٹم) کا رواج بھی انھیں لڑائیوں کا نتیجہ تھا جو بادشاہوں کے درمیان حصول اقتدار و سیادت کے لئے لڑی گئیں، کیونکہ بادشاہوں کو فوج کے سپاہی صرف امرا کی وساطت سے مل سکتے تھے اور ان امراء کو فراہمی فوج اور اس کے مصارف کے لئے جاگیریں ملا کرتی تھیں۔ لیکن جب رفتہ رفتہ اہل صنعت و حرفہ اور تاجروں کا طبقہ وجود میں آیا تو جاگیردار امراء کے یہاں مزارعین کی کمی ہوئی اور وہ اپنی املاک بیچنے پر مجبور ہوئے یہاں تک کہ

اراضی ٹکڑے ہو ہو کر بہت سے لوگوں میں تقسیم ہوگئی اور اقطاعی نظام ختم ہوکر، شخصی حکومت قایم ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ ڈماکریسی کی بنیاد پڑی۔ لیکن یہ تمام انقلابات بغیر لڑائیوں کے نہیں ہوئے، اور ان لڑائیوں کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ "اجتماعیت" نے پُرانے نظام کو توڑ کر دوسرا نظام قایم کرنا چاہا۔

احساس "اجتماعیت" یا سوسائٹی کا نظام ہمیشہ ماحول اور افراد کے ذہنی ارتقاء کا تابع رہا ہے، یعنی جوں جوں انسان نے ذہنی ترقیاں کیں، اس کا تمدن بھی بڑھا، اس کی ضروریات بھی وسیع ہوئیں، خواہشیں بھی اس میں نئی نئی پیدا ہونے لگیں اور جب اس نے دیکھا کہ یہ تمام باتیں کسی نظام سے پوری نہیں ہوتیں تو اس میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ پھر چونکہ کسی قوم کے تمام افراد کی ذہنیت ایک ہی وقت میں ایک ہی طرح تغیر پذیر نہیں ہوتی، اس لئے جب کبھی یہ صورتیں ظاہر ہوئیں تو ہمیشہ دو گروہ پیدا ہوگئے، ایک وہ جو قدیم نظام ہی کو برنبائے روایات صحیح و درست سمجھتا تھا اور دوسرا وہ جو اس سے مطمئن نہ تھا اور اس طرح آپس میں خونریزیاں ہوئیں۔ پھر اگر جدید خیال کا گروہ کامیاب ہوگیا تو اس نے پُرانے نظام کو بدل دیا ورنہ وہی بدستور قایم رہا۔

مثلاً آپ ڈماکریسی ہی کو لیجئے، کہ اس نے شخصی حکومت کے خلاف کتنے طویل عرصہ تک جہاد جاری رکھا، اس کا سبب صرف یہ تھا کہ شخصی حکومت کے طرفدار زیادہ قوی تھے اور وہ ڈماکریسی کو اُبھرنے نہ دیتے تھے، لیکن جہاں جہاں ڈماکریٹک خیال والوں کو اُبھرنے کا موقعہ ملا انھوں نے پُرانے نظام کو بدل دیا، چنانچہ یورپ میں لڑائی ہوئی تو جنوبی افریقہ کے مستعمرات متحد ہوگئیں اور شمالی امریکہ نے جنگ کی تو وہ انگریزی تسلط سے آزاد ہوگیا۔

اب آئیے اس حقیقت کو سامنے رکھکر موجودہ جنگ کے واقعی اسباب پر غور کریں اور دیکھیں کہ یہ خونریزیاں کیوں اور کس نئے نظام کے لئے ہو رہی ہیں، ہر لڑائی کا فطری سبب ضروریات زندگی پورا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گویا جنگ فی الحقیقت روٹی کی لڑائی ہے یا دُنیا میں زندہ و باقی رہنے کے لئے آپا دھاپی! ۔ اس لئے جنگ کا سب سے پہلا سبب اقتصادی ہوا کرتا ہے۔ ہٹلر کہتا ہے "ہم اپنی نوآبادیاں چاہتے ہیں تاکہ ہم زندہ رہیں"۔ مسولینی کہتا ہے "ہماری زمین ہم پر تنگ ہوگئی ہے، اسلئے ہمیں زندہ رہنے کے لئے اور زمینوں کی ضرورت ہے"۔ یقیناً اس دعوے نے انھیں حکومت کی کُرسی تک تو پہونچا دیا ہے لیکن قوم کو اس سے کوئی فایدہ نہیں پہونچا، اور وہ زندگی کے لئے بدستور سخت جدوجہد میں مصروف ہے۔

ہٹلر نے اپنے خطبوں میں ہمیشہ یہی کہا کہ "معاہدۂ ورسائی نے جرمنی سے اس کی نوآبادیاں چھین کر بیروزگاری بڑھا دی ہے، اس لئے میں ان کو واپس لے کر رہوں گا،" اس آواز کا اثر جرمن مزدوروں پر بھی ہوا، کیونکہ وہ اپنی اقتصادی دشواریوں کا علاج یہی سمجھتے تھے اور وہاں کے سرمایہ داروں پر بھی کیونکہ اس طرح ان کو دولت کمانے کے ذرایع ہاتھ آتے تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جرمنی واقعی مفلس ہوگیا تھا، کیا اطالیہ در اصل فاقے کر رہا تھا اور کیا فی الحقیقت ان ملکوں کے مزدوروں کے لئے رزق ختم ہوگیا تھا؟ اگر کوئی شخص اس کا جواب اثبات میں دیگا، تو ہم اس سے پوچھیں گے کہ:- لڑائی کا یہ بے شمار بیش بہا سامان کہاں سے آیا۔ چار ہزار ٹینک جن میں سے ہر ایک متحرک قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے، ۲۰ لاکھ دیوپیکر توپیں، کروروں بم، ۱۸۰ آبدوز کشتیاں، ۴۰ ہزار طیارے، ۲۰ کرور جدید ترین آلات حرب سے آراستہ فوج اور پھر اسی کے ساتھ سپاہیوں کے لئے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور تفریح و دلچسپی کا تمام سامان جس کی قیمت کا کوئی

اندازہ نہیں ہو سکتا، کیونکر فراہم ہو سکا! کیا ساری وہ دولت جو ان طیاریوں میں صرف ہوئی ہے، پچھلی لڑائی سے اِس وقت تک تمام جرمن آبادی کو با فراغت زندگی بسر کرنے کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھی، اور کیا اتنی بے اندازہ دولت موجود ہونے کے باوجود جرمن قوم کو فقر و فاقہ کی شکایت تھی ؟

حقیقت یہ ہے کہ نازی حکومت کے دور میں مزدوروں اور صناعوں پر جو کچھ صرف کیا گیا ہے اس سے مقصود بیروزگاری دور کرنا یا جرمن قوم کو فقر و فاقہ کی مصیبت سے آزاد کرانا نہ تھا، بلکہ اصل سبب وہی تھا جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے، یعنی یوروپ کے موجودہ سیاسی و اجتماعی نظام کو ختم کر کے دوسرا نظام قایم کرنا، کیونکہ موجودہ نظام اس وقت کی بڑھی ہوئی صنعتوں اور عظیم الشان تجارتی اداروں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا!

یہ ماننا پڑے گا کہ موجودہ اجتماعی نظام نے نہ صرف بیروزگاری اور مسلسل اقتصادی دشواریاں پیدا کیں، بلکہ انکے امن و سکون کو بھی سخت صدمہ پہونچایا؟ اس لئے دنیا کا اضطراب ایک ایسے نقطہ پر پہونچگیا تھا کہ انقلاب ضروری تھا اور اس لئے کہا جاتا ہے کہ نازیت، ہٹلر کی پیدا کی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ خود ہٹلر کو نازیت نے پیدا کیا ہے، اور ہر وہ شخص جو ان نفسیاتی لمحوں سے فایدہ اُٹھاکر باہر نکل آتا ہٹلر بن سکتا تھا!

لیکن وہ اجتماعی اضطراب جس نے دُنیا میں ہٹلر کو پیدا کیا، کیوں نمودار ہوا، اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری اور طبقۂ عمال میں عرصہ سے ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کے لئے جنگ جاری ہے، سرمایہ دار چاہتا ہے کہ وہ مشینوں کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ صنعتی پیداوار فراہم کرے، لیکن مشینیں جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہیں، طبقۂ عمال میں اتنی ہی بیروزگاری بڑھتی جا رہی ہے، کیونکہ جس کام میں ایک ہزار مزدور دن بھر لگے رہتے تھے، اُسے مشین صرف دس مزدوروں کی مدد سے ایک گھنٹہ میں پورا کر لیتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہڑتالوں کی صورت میں ظاہر ہوا، اور سرمایہ داروں کی توقعات کو بھی صدمہ پہونچنے لگا۔ یہاں تک کہ آپس کی یہ کشاکش لاینحل مسئلہ ہو گیا۔ ضرورت تھی کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جو سرمایہ و عمل دونوں کو مطمئن کر سکے اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو نو آبادیاں بڑھائی جائیں یا دوسرے ملک فتح کئے جائیں اور ان صورتوں پر عمل کرنا بغیر لڑائی کے ممکن نہیں ―― لڑائی ایک طرف ملک کی اکثر آبادی کو کام میں لگا دیتی ہے اور دوسری طرف سرمایہ داروں کو موقعہ دیتی ہے کہ وہ اسلحہ و دیگر سامان حرب کی طیاری میں اپنا سرمایہ لگاکر فایدہ اُٹھائیں اور اس طرح دونوں فریق مطمئن ہو کر ایک دوسرے کی مخالفت سے باز آجاتے ہیں۔ چنانچہ ہٹلر نے اسی تدبیر سے کام لیکر ملک کو مسلح کرنا شروع کیا تاکہ طبقۂ عمال اور سرمایہ دار دونوں مصروف رہیں اور جب وہ مسلح کر چکا تو اس کا لازمی نتیجہ جنگ تھا، کیونکہ بصورت دیگر ان طیاریوں کے کوئی معنی نہ تھے، یہ تو ہوا اقتصادی نظام کا نقص جس نے لڑائی کے بھڑکانے میں مدد دی لیکن اسی کے ساتھ دوسری چیز جس نے دُنیا کو لڑائی سے قریب تر کر دیا، سیاسی عدم توازن بھی تھا جو معاہدۂ ورسائی کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ اس عدم توازن نے "قومیت" کے جذبہ کو عام کر دیا اور "بین الاقوامیت" کو ختم! ―― یوروپ کے ہر حصہ میں یہ جذبہ عام ہو گیا کہ قومیت کے لحاظ سے ملکوں کی حد بندی ہونا چاہئے اور ہر ملک اپنی اپنی جگہ "تنازع للبقا" میں مصروف ہو گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست خارجہ میں گتھیاں پڑنے لگیں، اقتصادی دشواریاں دور کرنے کے ذرایع تنگ ہو گئے، اور ہر ملک اس کوشش میں مصروف ہو گیا، کہ جس جس حصۂ زمین میں اس کی قوم کے لوگ

پائے جاتے ہیں وہ اسی کی حکومت و سیادت میں آجائیں، الغرض ہر طرف آپا دھاپی شروع ہوگئی اور بین الاقوامیت کا رشتہ جس نے تمام ملکوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا تھا، ڈھیلا پڑ گیا۔

الغرض یہ جنگ، پرانے اور نئے نظام کی جنگ ہے، اس لئے اصول سے گزر کر شخصیتوں سے بحث کرنا حقیقی اسباب کی طرف سے آنکھ بند کر لینا ہے۔ لیکن یہ نیا نظام کیا ہے؟

لڑائی سے بہت پہلے ہی طبقۂ عمال اور طبقۂ متوسط (بورژوا) چیخ رہے تھے، کہ اقتصادی نظام میں سرمایہ داروں کا پلّہ بھاری نہ رہنا چاہئے، لیکن ایسی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی کہ سرمایہ داروں کے سرمایہ سے جو دولت حاصل ہوتی ہے اسے اطمینان بخش طریقہ پر تقسیم کی جا سکے، آخر کار بعض حکومتوں نے اس طرف توجہ کی اور انھیں میں سے ایک جرمن بھی تھا اس نے تمام صنعتی اداروں پر حکومت کا تسلط قایم کرایا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اقتصادی عدم توازن کو امن پسندانہ طریقہ سے دور کرتا، اس نے ملک کے تمام صنعت، حرفت و تجارت پر قبضہ کرکے ساری آبادی کو مسلح بنانا شروع کیا اور اس طرح اس نے سرمایہ و عمل کی جنگ کا رخ ایک اور جنگ کی طرف پھیر دیا۔ جب انگلستان نے دیکھا کہ جرمنی اور اٹلی کی عسکری طیاریاں صرف مذاق نہیں ہیں تو اس نے بھی پارلیمنٹ کی موافقت سے ملک کے مصنوعات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سرمایہ داروں کا پلّہ وہاں بھی ہلکا ہوگیا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ جرمنی، اٹلی اور برطانیہ یہی تینوں حکومتیں تھیں جو اشتراکی نظام کی مخالف تھیں اور اب جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ اس طرف مائل ہوتی جا رہی ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ قوم ایک کلی حیثیت رکھتی جس کے اجزاء قوم کے افراد ہیں، اور جب قوم خطرہ میں ہو تو اس کے تمام افراد کا فرض ہے کہ وہ اشتراکِ عمل میں برابر کا حصہ لیں۔

اگر جنگ کے بعد بھی حکومتوں کا یہی خیال قایم رہا تو اس لڑائی کو رحمتِ ایزدی سمجھنا چاہئے، کیونکہ دنیا میں بقاء امن و سکون کی صرف یہی صورت ہے کہ فرق مراتب کو دور کرکے دولت و عمل کی تقسیم ضرورت و اہلیت کے لحاظ سے کی جائے۔

سیاسی حیثیت سے نظام جدید جو کچھ چاہتا ہے، وہ بھی توجہ طلب ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام حکومتیں ایک "وحدت" سے وابستہ ہوجائیں، یعنی وہ سب ملکر ایک "وفاقی حکومت" قایم کریں، جیسا کہ امریکہ، سوئٹزرلینڈ کناڈا اور جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہیں۔

موجودہ جنگ میں جب فرانس کو شکست ہوئی تو برطانیہ نے اس کے سامنے وفاق ہی کی صورت پیش کرکے خواہش ظاہر کی تھی کہ دونوں ملک ایک حکومت اور ایک میزانیہ کے تحت کام کریں، لیکن فرانس نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ اگر فرانس مان لیتا، تو شاید جنگ کا موجودہ نقشہ بدل جاتا اور "وفاقی وحدت" کی یہ بڑی زبردست بنیاد ہوتی۔

بہرحال اس جنگ کے بعد دنیا کا سیاسی و اقتصادی نظام بالکل بدل جانا ہے اور اگر یہ نظام واقعی مفید ثابت ہوا تو امید کی جاتی ہے کہ ایک عرصۂ دراز کے لئے دنیا میں امن قایم ہوجائے گا، ورنہ یہ سلسلہ بند نہیں ہوگا، اور کرۂ زمین پر آگ و خون کا کھیل برابر اسی طرح کھیلا جاتا رہے گا۔

المقتطف

بالکل آخری اطلاع

اگر آپ نے اس اشاعت کے بعد نگار کی خریداری جاری نہ رکھی تو آپ کے لئے یہ بالکل آخری اطلاع ہے کہ:
آئندہ جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار کسی نہ کسی وقت آپ ضرور طلب فرمائیں گے اور پھر آپ کو یہ کسی قیمت پر نہ مل سکے گا۔
دوسری بات آپ کے سوچنے کے قابل یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس جنوری سنہ ۴۱ء کا نگار موجود ہے تو اس کی تکمیل، اسی وقت ہوسکتی ہے جب آپ جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار بھی حاصل کریں۔
جنوری سنہ ۴۱ء کے نگار میں آپ نے اس وقت کے مشہور غزلگو شعراء کا انتخاب کلام تو ملاحظہ فرمالیا، لیکن نقادانِ فن کی نگاہ میں وہ کلام کیا حیثیت رکھتا ہے اس کا حال آپ کو صرف جنوری سنہ ۴۲ء کے نگار سے معلوم ہوسکتا ہے۔
جن حضرات نے اس میں حصہ لیا ہے اُن کے نام یہ ہیں:-
پروفیسر کلیم الدین احمد —— پٹنہ یونیورسٹی —— پروفیسر آل احمد سرور —— مسلم یونیورسٹی
ڈاکٹر تاثیر —— پرنسپل سری نگر کالج —— پروفیسر مجنوں گورکھپوری —— سینٹ اینڈروز کالج گورکھپور ——
نیاز فتحپوری —— اڈیٹر نگار —— اس سے انکار ممکن نہیں کہ جنوری سنہ ۴۱ء اور جنوری سنہ ۴۲ء کے نگار کے پرچے دونوں ملکر شعر و ادب اور نقد و تبصرہ کی دنیا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور زمانہ مستقبل میں نقادانِ فن نگار کے انھیں دو پرچوں کی بنیاد پر اپنے تذکرے مرتب کریں گے اس لئے اگر وہ چیز جس پر "ادب مستقبل" کی تعمیر ہونے والی ہے آج ہی آپ کو ملجائے تو کیا آپ اسے حاصل نہ کریں گے۔ یاد رکھئے کہ نگار کے پچھلے بعض بعض خاص نمبر اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتے مومن نمبر، ظفر نمبر کے لئے روزانہ خطوط آتے ہیں لیکن وہ اب نایاب ہیں۔ اُردو شاعری نمبر کی قیمت بھی اب بجائے دو روپیہ کے چھ روپیہ کردی گئی ہے۔ اس لئے یاد رکھیئے کہ اگر آپ نے اس وقت جنوری سنہ ۴۱ء کا نگار حاصل نہ کیا تو پھر آپ کو یہ کسی قیمت پر نہ مل سکے گا۔ اس لئے قبل اس کے کہ آپ آئندہ خریداری کے متعلق ہاں یا نہیں کا فیصلہ کریں، یہ سمجھ لیجئے کہ نگار کے مسئلہ میں "نہیں" کا فیصلہ ہمیشہ سو فی صدی غلط ہوا کرتا ہے۔

منیجر نگار

ایک اور ضروری اعلان

دیکھا جاتا ہے کہ جنوری کا پرچہ روانہ ہونے کے بعد بعض حضرات کا منی آرڈر وصول ہوتا ہے اور اس طرح دفتر کو محصول ڈاک کا نقصان ہوتا ہے اسلئے جنوری کے وی۔پی بجائے ۱۲ جنوری کے ۷ جنوری سے روانہ کئے جائیں گے اور اس طرح ہم آپکے منی آرڈر کا انتظار ۶ تک کرسکیں گے

رعایتی چندہ بالکل ختم

کاغذ کی گرانی نے مصارف اتنے بڑھا دئے ہیں کہ ہم پانچ روپیہ سالانہ میں بھی پرچہ مشکل سے فراہم کرسکتے ہیں چہ جائیکہ اس سے کم میں، اس لئے جن لائبریریوں یا طلبہ کو نگار رعایتی قیمت میں دیا جاتا تھا، جنوری آئندہ سے انھیں بھی پورا چندہ ادا کرنا ہوگا

منیجر نگار لکھنؤ

ہندوستان کے صنعتی مزدور

صنعتی مزدوروں کا ذکر کرنے سے پیشتر، ہندوستان کی صنعتی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈال لینا ضروری ہے۔
ہندوستانی صنعت کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ ہندوستانی مصنوعات تین ہزار سال قبل مسیح بابل کے بازاروں میں فروخت ہوا کرتی تھیں اور دو ہزار سال قبل مسیح ہندوستان کی ململ مصری ممیوں کو لپیٹنے کے لئے استعمال کی جاتی تھی سلطنت روما کے دورِ عروج میں بھی ہندوستان کا کپڑا کثرت کے ساتھ وہاں کے بازاروں میں فروخت ہوتا تھا۔ اہلِ روما کو اکثر شکایت تھی کہ "روم کی کثیر دولت ہر سال ہندوستانی مصنوعات کی بدولت روم سے ہندوستان منتقل ہو رہی ہے۔ اور ڈھاکہ کی ململ یونان میں "گنگیٹکا" کے نام سے مشہور تھی"[۱]۔ مسٹر ہچنسن کا بیان ہے کہ اب سے پانچ صدی پہلے تک ہندوستانی مال، بحرِ احمر سے ہو کر گزرتا تھا اور اسکندریہ اس کا سب سے بڑا بازار تھا، جہاں دونوں ملکوں (ہندوستان و یورپ) کے تاجر مسالا، ریشم اور جواہرات کا سودا کیا کرتے تھے"[۲]
تاریخ ہند کا وہ دور جو برطانوی تسلط کے بعد ختم ہوا، اگرچہ دودھ اور شہد کی ندیوں کا دور نہ تھا، پھر بھی ہندوستان کی حالت مقابلۃً اور ملکوں سے بہتر تھی۔ بنگال کی صرف ایک ادنیٰ تجارتی منڈی قاسم بازار سے تقریباً سوا تین کروڑ روپیہ کی قیمت کا ریشمی کپڑا ہر سال ممالک غیر کو جاتا تھا۔ ہمارے ملک کے مشہور اور مستند مورخ رادھا کمند مکرجی نے اپنی کتاب "ہندوستان کی تاریخ جہاز رانی" میں ہم کو بتلایا ہے کہ ہمارے جہاز ران خلیج بنگال کی راہ سے چین و جاپان اور خلیج فارس کے راستہ سے عرب و ایران و یورپ اپنا سامان تجارت لے جایا کرتے تھے" ابتدائی دور میں خود ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستانی کپڑے یورپ کے بازاروں میں لے جا کر فروخت کیا کرتی تھی۔ ہچنسن لکھتا ہے کہ:

> "سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں، جب کہ برطانوی اقتدار ہندوستان میں قائم ہو رہا تھا، انگریزی سرمایہ داری کا اصول یہ تھا کہ ہندوستانی سامان یورپ کے بازاروں میں لا کر فروخت کیا جائے نہ کہ یہ کہ انگریزی مال ہندوستان لایا جائے۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے جو کرگھا اور چرخے سے طیار کئے جاتے تھے وہ یورپ کے کپڑوں سے بدرجہا بہتر ہوتے تھے۔ اس لئے اس وقت تو ولایتی کپڑا ہندوستان لے جانا ایسا ہی ہوتا جیسے آج کوئلہ نیو کاسل (New Castle) لیجایا جائے"[۳]

---

۱ Industrial Commission Report (Malvia's note of Dissent) P. 295
۲ Lester Hutchinson, "The Empire of the Nobobs." P. 12.
۳ Ibid P. 112

ہندوستان کی جدید صنعت کی تاریخ بہ اعتبار عمر یورپ کی صنعت کی تاریخ سے بہت چھوٹی ہے۔ اس کی زندگی اُنیسویں صدی کے آخری زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۸۰ء میں پورے ملک میں تقریباً ۵۸ کارخانے تھے جن میں تقریباً ۴۰ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں مسٹر آر، کے، داس کے بیان کے مطابق مزدوروں کی تعداد صرف جوٹ (Factories) کے کارخانوں میں ۵۹۲۲۲ ہوگئی[1]۔ کچھ دنوں کے بعد کارخانوں کی تعداد بڑھ کر ۲۶۴ اور مزدوروں کی تعداد ۲۶ ہزار ہوگئی۔

ہندوستانی صنعت کی ترقی کا پہلا دور ۱۸۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ اِس دور میں ترقی کی رفتار سُست رہی۔ "لیکن یہ زمانہ کارخانہ داروں کے لئے بیحد سازگار رہا۔ زرعی مزدوری بیحد کم تھی، ضروریاتِ زندگی کی چیزیں نسبتاً ارزاں تھیں اور کارخانہ دار جتنے مزدور چاہتے اُن کو اردگرد کے دیہاتوں میں من مانی مزدوری پر مل جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کو بھی مشین کا ایک جزو سمجھا جاتا، بچّوں کی محنت سے ناجائز فایدہ اُٹھایا جاتا اور کام کے مقابلہ میں انسانیت کے پہلو کو نظر انداز کیا جاتا"[2]

ذیل کے اعداد وشمار سے پہلے دور کی صنعتی ترقی کی رفتار کا تفصیلی اندازہ ہوگا:

سنہ	کارخانے	مزدور مرد	مزدور عورتیں	مزدور بچے	کل جمع
۱۸۸۰	۵۸	۰	۰	۰	۴۰۰۰۰
۱۸۹۴	۸۱۵	۲۷۵۸۰۶	۵۳۱۲۷	۲۰۸۷۷	۳۴۹۸۱۰
۱۸۹۸	۱۰۹۸	۳۳۴۵۹۴	۶۰۶۰۳	۲۷۵۳۲	۴۲۲۷۲۹
۱۹۰۲	۱۵۳۳	۴۲۴۳۷۵	۸۵۸۸۲	۳۱۳۷۷	۵۴۱۶۳۴
۱۹۰۶	۱۸۸۵	۵۴۶۶۹۳	۱۰۲۲۹۶	۴۱۲۲۳	۶۹۰۷۱۲
۱۹۱۰	۲۳۵۹	۶۲۴۹۴۵	۱۱۵۵۴۰	۵۲۰۲۶	۷۹۲۵۱۱
۱۹۱۴	۲۹۳۶	۷۴۹۷۷۳	۱۴۴۱۵۷	۶۰۶۴۳	۹۵۰۹۷۳

اس دور کی صنعتی ترقی میں بہت سے اسباب مُعاون ہوئے۔ سب سے پہلے تو ملک کے اکثر قوم پرست لیڈروں نے (جن میں دادا بھائی نوروزجی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے) صنعتی ترقی کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنی شروع کی۔ اُن کا خیال تھا کہ ملک میں جو کال پڑ رہے ہیں، اُن کی اصل وجہ صنعتی پستی ہے۔ یہ خیال شاید سب سے پہلے اُس کمیشن نے ظاہر کیا تھا جو کال کے اسباب کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ پھر اس خیال کی تائید ۱۹۰۱ء کے

[1] R. K. Dass, "Factory Labour in India" P. 15
[2] The Indian Year Book 1931. P. 514.

کمیشن نے بھی کی۔ لیکن اس سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ معاون ثابت ہوئی وہ سودیشی کی تحریک تھی جو تقسیم بنگالہ کے بعد پورے ملک میں شروع ہو گئی تھی۔ فضل بھائی کریم نے ۱۹۰۹ء میں اپنی صدارتی تقریر میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ "سودیشی کی تحریک مل کے مالکوں کے لئے شگون نیک ہے اور اُن کو اس سے پورا پورا فایدہ ہوگا"

جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کی لڑائی نے ہندوستانی صنعت کو کافی ترقی دی۔ چنانچہ ٹاٹا کمپنی کی تمام تر ترقی گزشتہ جنگ عظیم ہی کی رہینِ منت ہے۔ آج اُس کا شمار دُنیا کے آٹھ بڑے کارخانوں میں ہوتا ہے۔ اِس دور میں ہندوستانی صنعتوں نے بہت ترقی کی۔ صنعت و تجارت پر سرمایہ داروں نے جو رقمیں لگائیں، اُس پر اُن کو بے شمار نفع ہوا۔۔۔۔۔۔ لیکن اُن لوگوں کا کسی نے کوئی خیال نہ کیا جو ہندوستان کی دولت میں اضافہ کا اصل سبب تھے۔ اور اُسوقت بھی مزدوروں کو مشین کا پُرزہ ہی سمجھا گیا"[ا]

حالات کی مساعدت کے ساتھ ساتھ، حکومت نے بھی ہندوستان کی صنعتی ترقی کی راہ میں آسانیاں پیدا کیں ۱۹۱۶ء میں حکومت نے روئی کی درآمد پر ½ ۷ فیصدی ڈیوٹی بڑھا دی اور دوسری طرف ہندوستان میں طیار ہونے والے سوتی کپڑوں پر کوئی ڈیوٹی نہیں بڑھائی۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی مل کے مالکوں کی اس سے زیادہ اور کیا خوش نصیبی ہوسکتی تھی۔ دوسری طرف لڑائی نے برطانوی صنعت کو درہم برہم کر دیا تھا، اس لئے لنکاشائر کے مال کے مقابلہ کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

اس دور میں ہندوستان کی صنعتی ترقی کا اندازہ ہم کو اُن اعداد و شمار سے بھی ہوتا ہے جو انڈیا آفس نے ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام کے سامنے ہندوستانی مزدوروں سے متعلق پیش کئے تھے:

زرعی مزدور (جن میں کاشتکار مالکان آراضی شامل نہیں ہیں اور جن کی تعداد ۶۶۴۸۸۶۰۰۰ ہے) جو بین الاقوامی مزدور سبھا کی حدود میں آتے ہیں ———— ۲۸۰۱۰۱۳۰

بحری و ساحلی مزدور ———— ۱۴۱۰۰۰

صنعتی مزدور — (جن میں چھوٹی چھوٹی صنعتوں، کارخانوں اور حمل و نقل کے مزدور شامل ہیں) ۲۰۲۱۹۰۰۰

مجموعی تعداد ———— ۴۸۱۷۰۱۳۰

صنعتی کارخانوں اور مزدوروں کی تعداد کا بہتر اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہوگا:

سنہ	کارخانے	مزدور مرد	مزدور عورتیں	مزدور بچے	مجموعی تعداد
۱۹۱۴	۲۹۳۶	۷۴۶۷۷۳	۱۴۱۴۵۷	۶۰۶۴۳	۹۵۰۹۷۳
۱۹۱۸	۳۴۳۶	۸۹۷۴۶۹	۱۶۱۳۴۳	۶۴۱۱۰	۱۱۲۳۹۲۲

اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ مزدوروں میں اپنی تنظیم کا احساس پیدا ہو گیا۔ لیکن یہ احساس کسی سیاسی و

ا The Indian Year Book 1931 P. 514.

جماعتی شعور کا نتیجہ نہ تھا بلکہ جنگ کی وجہ سے چونکہ ضروریات زندگی کی ہر چیز بیحد گراں ہو گئی تھی اور اس گرانی کے تناسب سے اُن کی مزدوری میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، اس لئے ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جا بجا ہڑتالیں بھی ہوئیں اور اُن میں کچھ کامیاب بھی ہوئیں۔

مزدوروں کی پہلی انجمن مدراس میں قایم ہوئی[1]۔ یہ سوتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی یونین تھی۔ اس کے بعد کلکتہ کے ساحلی مزدوروں نے اپنی ایک یونین بنائی۔ اور تیسری یونین بمبئی کے پوسٹ مینوں کی بنی۔ لیکن ان تمام یونینوں کا مقصد صرف اقتصادی دشواریوں پر قابو حاصل کرنا اور کام میں آسانی پیدا کرنا تھا۔

غیر منظم مزدور مزدوروں میں اگر ہم اُن لوگوں کو بھی شامل کرلیں جو تجارتی اور سرکاری دفاتر کے ملازمین میں اور جن کا تعلق متوسط طبقہ سے ہے (اور جنکی تعداد تقریباً ½ ا کرور ہو گی)، تو ہندوستان میں مزدوروں کی تعداد پانچ کرور ہو جاتی ہے۔ لیکن اعلیٰ صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد ۵۰ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے کچھ مزدور ایسے بھی ہیں جن کو مردم شماری کے رجسٹر میں "خانگی ملازمین" کے خانہ میں رکھا جاتا ہے۔ ان کی تعداد ریل کے کارخانوں اور معدنی ذخیروں میں کام کرنے والوں سے چھ گنا زیادہ ہے۔ مگر یہ سب کے سب غیر منظم ہیں۔

وہ مزدور جو سرکاری عمارتوں، پلوں، ریلوے لائنوں، سڑکوں اور نہروں کی تعمیر میں لگے رہتے ہیں اُن کی تعداد اسّی لاکھ کے قریب ہے۔ ان کی حالت سب سے زیادہ تباہ رہتی ہے۔ یہ سب کے سب ٹھیکہ داروں کے ماتحت ہوتے ہیں اور مزدوری نہ تو متعین ہوتی ہے اور نہ اُس کے ملنے کا کوئی وقت مقرر ہوتا ہے۔ کمسن اور نوعمر مزدوروں کو (جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں) ٹھیکہ دار ایک یا دو آنہ سے کسی حال میں بھی زیادہ نہیں دیتے۔

غیر منظم مزدوروں کے دو اور قابل ذکر گروہ ہیں ایک تو نجی طور پر کپڑا بننے والوں کا اور دوسرا دھوبیوں اور حجاموں کا۔ اول الذکر کی تعداد تقریباً تیس لاکھ اور موخر الذکر کی تقریباً بیس لاکھ ہو گی۔ کپڑا بننے والے ظاہرا بالکل آزاد کاروبار کرنے والے معلوم ہوتے ہیں اور پہلی نظر میں اُن کی مالی حالت بہتر نظر آتی ہے۔ مگر یہ پورا طبقہ مہاجنوں کا غلام ہوتا ہے اور اُن کی اقتصادی حالت بیحد تباہ ہے۔ ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ بازار سے سوت اور دوسری ضروریات خرید سکیں، چنانچہ یہ لوگ سوت وغیرہ مہاجن سے قرض لاتے ہیں اور ان کے طیار کئے ہوئے کپڑے کو بازار میں بھی مہاجن ہی فروخت کرتا ہے۔ اس طرح سے مہاجن اس طبقہ کی محنت سے پورا پورا فایدہ اُٹھاتا ہے اور خود محنت کرنے والے کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا۔ تخمینہ لگایا جاتا ہے کہ اس طبقہ کے افراد کی سالانہ آمدنی کسی حال میں بھی دو سو روپیہ کے آگے نہیں بڑھتی۔ کپڑا بننے والوں کے برعکس حجاموں اور دھوبیوں کی حالت نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔

ہندوستان میں بہت سے کارخانے ایسے ہیں جن پر فیکٹری ایکٹ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ وہ کارخانے ہیں جہاں یا تو برقی قوت استعمال نہیں کی جاتی یا جہاں مزدوروں کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ یہ کارخانے چونکہ اُن قیود سے

---

[1] مسٹر شلونکار کے بیان کے مطابق مزدوروں کی پہلی انجمن مدراس میں قایم ہوئی۔ مگر یہ مشتبہ ہے، شاید پہلی انجمن ۱۸۸۴ء میں بمبئی میں قایم ہوئی۔
(Vera Anstey, 'The Economic Development of India' P. 314)

آزاد ہوتے ہیں جو اعلیٰ صنعتی کارخانوں پر عائد ہیں اور چونکہ ان کو بازپرس کا بھی کوئی خوف نہیں ہوتا، اس لئے وہاں بے حد بے عنوانیاں ہوا کرتی ہیں۔ مزدوری بہت کم دیجاتی ہے اور کام بہت زیادہ لیا جاتا ہے۔ مسٹر بی، شیوا راؤ لکھتے ہیں کہ:

"چرم سازی کے کارخانوں میں کام بارہ گھنٹے سے زیادہ لیا جاتا ہے۔ مدراس پریسیڈنسی میں چھوٹے اور بڑے لڑکے رات کو بھی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکوں کو توجوانوں سے بھی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، اگرچہ اُن کو زاید محنت کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا"[1]

اُن کی تنخواہ آٹھ دس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور اُس کے تقسیم ہونے کا بھی کوئی وقت متعین نہیں ہوتا۔

غیر منظم مزدوروں کے سلسلہ میں بیڑی کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ انکی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا ہے۔ بہار اور بنگال میں ان کی بہت کثرت ہے۔ ان صوبوں میں آپ کو صرف شہروں ہی میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں بھی دو چار بیڑی بنانے والے ضرور ملیں گے۔ یہ لوگ بالعموم بیڑی بیچنے والوں اور پان فروشوں کے ملازم ہوتے ہیں یا اکثر اُجرت یا ٹھیکہ پر کام کرتے ہیں۔ ان کی آمدنی بھی بہت کم ہوتی ہے جو کسی حال میں بھی چار آنہ یومیہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ کلکتہ میں تو بیڑی بنانے والوں کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

بعض شہروں میں بیڑی بنانے کے بڑے بڑے کارخانے بھی ہیں۔ ان کارخانوں کے متعلق وہٹلی کمیشن کا بیان ہے کہ

"کارخانوں میں کام کرنے والوں کی کثرت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہاں چلنے پھرنے کی بھی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ زمین کچی اور مرطوب ہوتی ہے، جہاں بیٹھ کر کام کرنا صحت کے لئے سخت مضر ہوتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں جب کام زمین ہی پر بیٹھ کر کیا جاتا ہے .... کارخانے میں کمسن لڑکے زیادہ لگائے جاتے ہیں، کیونکہ اُن کی نازک اُنگلیاں بیڑی لپیٹنے میں زیادہ آسانی کے ساتھ گردش کرتی ہیں۔ بالعموم پانچ یا چھ برس کے بچے کام پر لگا دئے جاتے ہیں۔ دس، بارہ گھنٹے روزانہ بلا کسی رخصت کے کام کرنا پڑتا ہے۔ مزدوری کا اوسط دو آنہ یومیہ کے قریب ہوتا ہے۔ اکثر حالتوں میں تو والدین بیڑی کے کارخانہ والوں کے مقروض ہوتے ہیں اور قرض پاٹنے کے لئے بچوں کو کارخانہ میں داخل کر دیتے ہیں"[2]

صنعتی مزدور

بڑی صنعتوں، چائے کے باغات، معدنی ذخیروں اور ریلوے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد (جن کو منظم مزدور کہا جا سکتا ہے) پچاس لاکھ سے اوپر ہے۔ ان میں ۴۸ لاکھ مزدور روزانہ کام کرتے ہیں اور باقی مزدور بیکار رہتے ہیں جو ملوں کے دروازوں پر اس انتظار میں کھڑے رہتے ہیں کہ شاید کسی کی عوضی پر (جسے کارخانہ کی اصطلاح میں 'بدلی' کہتے ہیں) کام کرنے کا موقعہ مل جائے۔ ½ ۴۸ لاکھ مزدوروں میں ½ ۱۸ لاکھ کے قریب صنعتی کارخانوں میں کام کرتے ہیں، دس لاکھ باغات میں، ½ ۲۷ لاکھ ریلوے کارخانوں میں اور ½ ۲ لاکھ معدنی ذخیروں میں کام کرتے ہیں۔

۱۔ B. Shiva Rao. The Industrial Labour in India P. 229

۲۔ Labour Commission Report (1931), Quoted by B. Shiva Rao. Op. Cit., P. 231

ذیل کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوگا کہ ملک کی بڑی بڑی صنعتوں میں کتنے مزدور کام کرتے ہیں اور اُن کارخانوں کی کیا تعداد ہے:۔

صنعتوں کے نام	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
ٹکسٹائل (کپڑا بننے کے کارخانے)	۷۵۳	۸۲۷۴۴۱
انجینیرنگ	۸۸۸	۲۲۰۵۸۷
پٹرول وغیرہ اور دھات	۱۴۴	۵۶۱۵۹
اشیاء خوردنی اور تمباکو	۲۹۵۷	۲۵۷۵۸۴
ادویات اور رنگ وغیرہ	۵۱۴	۶۴۵۳۹
کاغذ اور چھپائی	۴۵۴	۴۸۶۲۲
لکڑی، پتھر اور شیشہ	۵۳۲	۸۷۰۶۶
کھال اور چرم سازی	۶۸	۱۰۲۷۶
بورے وغیرہ	۲۷۲۹	۲۱۶۲۳۳
متفرقات	۲۲۲	۵۲۲۸۵
مجموعی تعداد	۹۲۶۱	۱۸۴۰۷۹۲[ا]

یہ اعداد و شمار ملک کے بڑے صنعتی کارخانوں اور اُن میں کام کرنے والے مزدوروں کے ہیں۔ لیکن اگر ہم چھوٹی صنعتوں اور اُن میں کام کرنے والے مزدوروں کو بھی شامل کرلیں تو کارخانوں اور مزدوروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوجائے گا۔

ہم ذیل میں صنعتوں اور مزدوروں کے متعلق صوبہ وار تفصیلی اعداد و شمار پیش کرتے ہیں:

صوبہ	کارخانے	مزدور مرد	مزدور عورتیں	نوخیز مزدور	مزدور بچے	مزدوروں کی مجموعی تعداد
مدراس	۱۸۱۸	۱۲۸۷۹۶	۵۰۹۷۹	۹۴۶۸	۵۰۹۷	۱۹۴۳۳۵
بمبئی	۳۴۹۵	۴۰۲۴۴۹	۷۱۵۹۱	۴۱۲۰	۹۴۳	۴۷۹۱۰۳
سندھ	۳۲۲	۲۴۶۰۰	۴۹۴۵	۲۰۳	۱۱۷	۲۹۸۶۵
بنگال	۱۷۳۵	۴۹۵۱۸۳	۵۹۸۵۹	۶۲۷۵	۱۴۷۴	۵۶۲۷۹۱
صوبۂ متحدہ	۵۳۰	۱۴۸۴۰۰	۱۵۱۹	۱۱۵۴	۴۱۲	۱۵۵۰۸۵

[ا] یہ اعداد و شمار ۱۹۳۵ء کے ہیں۔

صوبہ	کارخانے	مزدور مرد	مزدور عورتیں	نوخیز مزدور	مزدور بچے	مزدوروں کی مجموعی تعداد
پنجاب	۷۸۰	۶۱۴۸۶	۸۴۹۴	۱۴۵۳	۸۳۵	۷۲۲۶۸
بہار	۳۱۱	۸۶۱۳۷	۶۳۸۴	۳۲۶	۱۸۷	۹۳۰۳۴
اُڑیسہ	۸۰	۳۱۰۸	۱۳۶۸	۵۳	۱۶	۴۵۴۵
صوبہ متوسط و برار	۷۷۳	۴۱۶۳۱	۱۹۶۴۱	۵۱۵	۱۸۷	۶۱۹۷۴
آسام	۷۶۵	۳۵۵۴۰	۱۰۶۸۱	۳۳۹۴	۱۰۶۲	۵۰۶۷۷
صوبۂ سرحد	۳۰	۱۱۴۴	۳۰	۲	۵	۱۱۸۱
بلوچستان	۱۴	۱۹۸۵	۱۴	۰	۴۷	۲۰۴۶
اجمیر و مارواڑ	۳۵	۱۲۶۱۹	۱۰۴۸	۱۱	۲۰۸	۱۳۸۸۶
بنگلور و کرگ	۱۳	۱۰۱۲	۵۰۷	۱۴	۲۴	۱۵۵۷
دہلی	۷۸	۱۴۹۲۹	۲۶۷	۷۴	۱۲۸	۱۵۳۹۸
مجموعی تعداد	۹۷۴۳	۱۴۵۹۰۱۹	۲۴۰۹۳۲	۲۷۰۶۲	۱۰۷۴۲	۱۷۳۷۷۵۵[1]

اگر ملک کے منظم و غیر منظم مزدوروں کی صرف تعداد کو پیشِ نظر رکھیں تو "ہم بہ آسانی یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان دُنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک ہے۔ کیونکہ یہاں مزدوروں کی مجموعی تعداد ایک کرور ہوتی ہے جو یورپ کے ملکوں پر بھی بھاری ہے"[2]

مزدور کہاں سے آتے ہیں

مزدوروں کی یہ کثیر فوج مشتمل ہوتی ہے، بیدخل شدہ کسانوں، زرعی مزدوروں اور دیہاتی صنعتوں کے اُن ماہرین پر جن کو مشین نے بے روزگار کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستان کا مزدور یورپ کے مزدوروں سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔ مغربی ملکوں کے مزدور "شہری" ہوتے ہیں۔ اُن کے آباد اجداد تو یقیناً دیہات ہی سے آتے رہے ہوں گے، لیکن خود اُن کا دیہات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ہندوستان کا مزدور دیہات کو خیرباد کہنے اور شہر میں بس جانے کے بعد بھی "دیہاتی" ہی رہتا ہے ان مزدوروں کو شہری زندگی کی دلکشی دیہات سے نہیں کھینچ لاتی بلکہ جب افلاس اور بھوک کے مصائب ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں اور دیہات میں گزربسر کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی تو وہ مجبوراً شہر کا رخ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ۱۹۳۱ء کے لیبر کمیشن کا بیان ہے کہ مزدوروں کے لئے "شہروں میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔ جب وہ (مزدور) گاؤں کو خیرباد

[1] یہ اعداد و شمار ۱۹۳۸ء کے ہیں۔

[2] Jathar & Beri, "The History of Indian Economic" P. 85

کہتا ہے تو اُس وقت اُس کے پیش نظر صرف ضروریات زندگی کا سوال ہوتا ہے۔ بہت کم صنعتی مزدور شہروں میں رہنے کے لئے طیار ہوں گے اگر دیہات ہی میں اُن کو پیٹ پالنے کے لئے تھوڑا کھانا اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا میسر آجائے۔ شہر کی کشش اُن کو اپنی طرف نہیں کھینچتی بلکہ وہ شہر کی طرف ڈھکیلے جاتے ہیں"[1]

جب یہ دیہاتی شہر میں وارد ہوتے ہیں تو اُن کی حیثیت اجنبی کی ہوتی ہے۔ وہ صرف شہر والوں کے عادات واطوار اور طرز بود و باش ہی سے ناآشنا نہیں ہوتے بلکہ وہاں کی زبان سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ مسٹر بی۔ شیوا راؤ لکھتے ہیں کہ

"وہ (مزدور) ایک اجنبی کی طرح بالکل تنہا آتا ہے۔ شہر کے حالات اور وہاں کے ماحول سے وہ قطعاً بیگانہ ہوتا ہے۔ گاؤں سے نکلنے کا سبب زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ وہ قرض کے بار سے لدجاتا ہے اور قرضخواہ کے تقاضے اُس کا شہر میں رہنا دوبھر کردیتے ہیں۔ یا اکثر اور وجوہ کی بنا پر وہ گاؤں چھوڑکر کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہتا ہے جہاں اُس کا کوئی جاننے والا نہ ہو"[2]

اس کا نتیجہ بقول مصنفین "ہسٹری آف انڈین اکنامکس" یہ ہوتا ہے کہ:

"آب وہوا کی شدید تبدیلی، غذا کی خرابی، گنجان آبادی (شہر کی)، گرد و پیش کی عفونت وگندگی اور سب پر بالا عزیزوں کی جدائی — ان سب باتوں کا اُس کی صحت پر بے حد ناگوار اثر ہوتا ہے۔ اور پھر جوئے اور شراب کی بری عادتیں بھی اُس کو لگ جاتی ہیں، جن کا گاؤں میں نسبتاً وجود نہیں ہوتا"[3]

بھرتی کا طریقہ

ہندوستان کے کارخانوں میں مزدوروں کی بھرتی کا طریقہ بہت تکلیف دہ ہے۔ جو نئے مزدور کارخانہ میں داخل ہوتے ہیں اُن کا داخلہ بالواسطہ نہیں ہوتا اور نہ اُن کی بھرتی کے لئے کوئی افسر ہی مقرر ہوتا ہے۔ کارخانوں کے کارکن نئے مزدوروں کو لانے اور بھرتی کرانے کے لئے اپنے کسی معتمد مزدور کو مقرر کرتے ہیں۔ اس درمیانی مزدور کو کہیں "مقدم" کہیں "مستری" اور کہیں "سردار" کہتے ہیں۔ نوآمد مزدور کو حصول ملازمت کے لئے اُس درمیانی مزدور کو ایک اچھی رقم بطور رشوت دینی پڑتی ہے جسے مل کی اصطلاح میں "دستوری" کہتے ہیں۔ کلکتہ کے جوٹ کے کارخانوں کی "دستوری" بہت مشہور ہے۔ ملازمت مل جانے کے بعد بھی نیا مزدور اپنی ترقی اور دوسری ضروریات کے لئے اُس درمیانی مزدور کا محتاج رہتا ہے۔ وہ مزدوروں کو سود پر قرض دیتا ہے اور اُن کے جھگڑے چکاتا ہے۔ غرض درمیانی مزدور طرح طرح سے اپنے وجود کو مزدوروں کے لئے ناگزیر بنادیتا ہے۔ تخمینہ لگایا جاتا ہے کہ بعض جگہوں پر درمیانی مزدور کی رشوت کی رقمیں مجموعی طور پر اُس کی تنخواہ سے چار پانچ گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ رشوت کے سلسلہ میں درمیانی مزدور کے ساتھ ساتھ تنخواہ تقسیم کرنے والا کلرک بھی قابل ذکر ہے۔ اُس کی آمدنی بھی خاصی ہوتی ہے۔ ان حالات سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مسٹر کلمین کا بیان ہے کہ

"مرد مزدوروں کی طرح سے عورتیں بھی اِن مشکلات کا یکساں شکار ہوتی ہیں۔ اور بدقسمتی سے اگر کوئی عورت بیوہ ہوئی تو اُس کی مشکلات میں اور اضافہ ہوجاتا ہے"[4]

---

[1] Labour Commission Report (1931) P. 4.
[2] B. Shiva Rao, op. cit. P. 189.
[3] Jathar & Beri op. cit., P. 89.
[4] J. H. Kelman, "Labour in India" P. 108

عورتوں کے لئے ایک مصیبت اور بھی ہے مثلاً

" بمبئی کے سوتی کپڑوں کے کارخانوں میں، اُن شعبوں کی دیکھ بھال کے لئے جن میں عورتیں کام کرتی، اُورسیر عورتیں ہوتی ہیں جن کو 'نائک' کہتے ہیں۔ ان کا تعلق چونکہ گرے ہوئے طبقہ سے ہوتا ہے، اس لئے اُن کی اخلاقی حالت بھی گری ہوئی ہوتی ہے اور وہ اکثر نوجوان لڑکیوں اور عورتوں پر اپنے اختیار کا بیجا استعمال کرتی ہیں"[1]

لیبر کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اِس چیز پر بہت زور دیا تھا کہ مزدوروں کے داخلہ وغیرہ کے سلسلہ میں درمیانی مزدور کا وجود قطعاً ختم کر دیا جائے۔ اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ مزدوروں کی بھرتی کے لئے ایک افسر مقرر کیا جایا کرے جو پڑھا لکھا اور نیکدل ہوا کرے اور اُس کا تعلق منیجر سے ہو۔ مگر اس سفارش کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ پورے ملک میں صرف " دو کارخانے ہیں جہاں مزدوروں کی بھرتی کے لئے لیبر افیسر کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ ایک ساسون کمپنی (Sasoon Co.) اور دوسرا برماشل کا کارخانہ"[2]

چائے کے باغات

ہندوستان کے جن علاقوں میں چائے پیدا ہوتی ہے، اُن میں آسام کا علاقہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ اہم ہے، ان باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کی فراہمی اور بھرتی کے لئے ایک ٹھیکہ دار مقرر کیا جاتا ہے جس کو " سردار " کہتے ہیں۔ یہ سردار مزدوروں کی فراہمی کے لئے ملک کے میدانی علاقوں کا دورہ کرتا ہے جہاں سے وہ بہ آسانی مزدور حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سردار مزدوروں کو چائے کے باغات کی دلکشی، کام کی آسانی اور خوشگوار زندگی کے سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ باغات صنعتی کارخانوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور یہاں کی زندگی زرعی زندگی سے بہت زیادہ مشابہ ہوتی ہے، اگرچہ کچھ ایسے قوانین بنا دئے گئے ہیں جن کی وجہ سے صنعتی مزدوروں اور باغات کے مزدوروں کے حالات میں یک گونہ مشابہت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ایک تعجب خیز حقیقت ہے کہ آسامیوں کو باغات میں کام کرنے سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی اور " آسام کے مزدور تمام کے تمام، بہار اور صوبۂ متحدہ کے رہنے والے ہوتے ہیں"[3]۔ چائے کے باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کو حیرتناک حد تک مزدوری کم دیجاتی ہے۔ انڈین ائیر بک (Indian Year Book) کے مطابق اُن کو حسب ذیل ماہانہ اُجرت ملتی ہے:-

		روپیہ	آنہ	پائی	
آسام	مردوں کو	۶	۳	۵	ماہانہ اُجرت ملتی ہے
"	عورتوں کو	۵	۶	۳	" " " "
"	بچوں کو	۴	۴	۶	" " " "
وادی سورما	مردوں کو	۵	۱۰	۱۱	" " " "
"	عورتوں کو	۴	۱	۱۰	" " " "
"	بچوں کو	۲	۱۲	۹	" " " "[4]

[1] Jather + Beri op. cit. P. 94
[2] The Indian Year Book 1937-38 P. 502
[3] Pramathnath Benerjee, "A Study of Indian Economics," P. 291
[4] The Indian Year Book 1939-40, P. 541

کام کے گھنٹے بقول پرماتھ ناتھ بنرجی :

" مزدوروں کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ کام کے گھنٹوں کا ہے۔ ہندوستان میں کام کے گھنٹے محدود کرنے کا سوال ابتدا ہی سے اُٹھایا گیا۔ ٹریڈ یونین کی بڑھتی ہوئی طاقت اور بین الاقوامی مزدور کانفرنس نے بھی اس تحریک کو بہت تقویت پہونچائی ہے۔"[1]

۱۸۸۱ء سے پہلے ہندوستان میں مزدوروں کے متعلق کوئی خاص قانون ہی نہیں تھا۔ ۱۸۸۱ء میں ایک قانون پاس کیا گیا، جس کی رو سے سات برس کی عمر سے کم کے بچوں کا کارخانوں میں مزدوری کے لئے داخلہ ممنوع قرار پایا اور بچوں کے سلسلہ میں یہ بھی ایک دفعہ اس قانون میں رکھی گئی کہ سات سال کی عمر سے بارہ سال کی عمر تک کے بچوں سے کوئی کارخانہ نو گھنٹے سے زیادہ کام نہ لے اور ہر چار گھنٹے کے بعد ایک گھنٹہ آرام کرنے کے لئے چھٹی دیجائے۔

۱۸۹۱ء میں اس قانون میں ترمیم ہوئی۔ اب بچوں کے داخلہ کے لئے عمر کی قید سات سال سے بڑھا کر نو سال کر دی گئی، اور نو سال سے بارہ سال تک کے بچوں کے لئے کام کے گھنٹے نو سے گھٹا کر سات کر دئے گئے۔ عورتوں کے لئے گیارہ گھنٹے روزانہ متعین ہوئے۔ عورتوں اور بچوں کے رات کے وقت کام کرنے کے متعلق بھی کچھ پابندیاں عاید کی گئیں۔

۱۹۱۱ء میں پھر اس قانون میں ترمیم ہوئی۔ اس مرتبہ نو کے اوپر اور چودہ سال سے کم کے بچوں کے لئے کام کے گھنٹے گھٹا کر چھ کر دئے گئے۔ اس ترمیم کے مطابق پارچہ بافی کے کارخانوں میں مردوں کے لئے بارہ گھنٹے روزانہ کام کا اوسط مقرر کیا گیا اور رات کے وقت عورتوں کا کام کرنا ممنوع قرار پایا۔

۱۹۲۲ء میں کارخانوں کے قانون میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ اس مرتبہ لڑکوں کے کارخانوں میں کام کرنے کے لئے داخل ہونے کی عمر بڑھا کر بارہ کر دی گئی۔ کام کے گھنٹوں میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ جوان مزدوروں کے کام میں ایک گھنٹہ روزانہ کی تخفیف ہوئی یعنی بجائے بارہ کے گیارہ گھنٹے روزانہ کا اوسط مقرر کیا گیا اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ ہر چھ گھنٹے کے بعد ایک گھنٹہ کے لئے آرام کا موقعہ دیا جائے۔

۱۹۳۴ء میں بچوں کے کام کے گھنٹے چھ سے گھٹا کر پانچ کر دئے گئے۔ جوانوں کے کام کے اوقات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی صرف اُن کارخانوں کے لئے جو سال کے سال کام کرتے ہیں دس گھنٹہ روزانہ یا ہفتہ میں ۵۴ گھنٹے مقرر کئے گئے۔

ہندوستان میں کارخانے دو طرح کے ہیں ایک تو موسمی اور دوسرا بارہ ماسی۔ موسمی کارخانوں میں مزدوروں کو گیارہ گھنٹے روزانہ یا ہفتہ میں ۶۰ گھنٹے کے اوسط سے کام کرنا پڑتا ہے۔ سوتی کپڑوں کے کارخانے (بہ استثنائے چند) روزانہ دس گھنٹے کام لیتے ہیں۔ صرف چند ایسے کارخانے ہیں جہاں ۹½ گھنٹے روزانہ کام لیا جاتا ہے۔

ہندوستانی صنعتی کارخانوں کی یہ بھی ایک عجیب خصوصیت ہے کہ ہر جگہ کام کے گھنٹوں کا یکساں تعین نہیں ہے۔ بالعموم مزدوروں کو ہفتہ میں ۴۸ گھنٹوں سے لیکر ۵۴ گھنٹوں تک کام کرنا پڑتا ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار سے معلوم ہوگا کہ

---

[1] Paramathnath Banerjee, Op. cit. P. 295.

ملک کے کتنے فیصدی کارخانے کتنے گھنٹے روزانہ کام لیتے ہیں۔
یہ اعداد و شمار ۱۹۳۵ء کے ہیں :۔

	ہفتہ میں ۴۲ سے گھنٹے	ہفتہ میں ۴۲ سے ۴۸ گھنٹے تک	ہفتہ میں ۴۸ گھنٹے
مستقل کارخانے			
عورتیں	۷ فیصدی کارخانے	۲۳ فیصدی کارخانے	۳۰ فیصدی کارخانے
مرد	۱۵ " "	۸ " "	۶۷ " "
موسمی کارخانے			
عورتیں	۲۷ " "	۱۳ " "	۶۰ " "
مرد	۳۵ " "	۱۱ " "	۵۴ " "

معدنیاتی کارخانوں میں مزدوروں کے ہفتہ وار کام کے گھنٹوں کے حسب ذیل تفصیلی اعداد و شمار ہیں۔ یہ اعداد ۱۹۳۷ء کے ہیں :

مقامات	اوورسیر	کان کن	باربردار	کاریگر مزدور	غیر کاریگر مزدور	عورتیں
جھریا (بہار)	۴۹ گھنٹے	۵۴ گھنٹے	۵۴ گھنٹے	۴۶ گھنٹے	۴۶ گھنٹے	۵۴ گھنٹے
رانی گنج (بنگال)	۵۰ "	۴۶ "	۱۶ "	۴۸ "	۴۷ "	۴۵ "
گرڈیہ (بہار)	۴۲ "	۴۲ "	۴۰ "	۴۴ "	۴۶ "	۴۴ "
آسام	۴۷ "	۴۶ "	۴۸ "	۴۶ "	۴۸ "	• •
پنجاب	۴۲ "	۴۹ "	۳۶ "	۴۲ "	۴۳ "	• •
پنچ ویلی (صوبہ متوسط)	۵۰ "	۴۸ "	۴۹ "	۴۸ "	۵۰ "	• •
صوبہ متوسط	۴۹ "	۴۸ "	• •	۴۹ "	۴۹ "	۴۹ "
بلوچستان	۳۵ "	۳۶ "	۳۷ "	۴۰ "	۳۶ "	• •

اُجرت ــــــــ بدقسمتی سے ہندوستان کے صنعتی یا غیر صنعتی مزدوروں کی آمدنی کے متعلق اعداد و شمار اچھے کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں مرکزی حکومت نے اس سلسلہ میں کام شروع کیا تھا مگر کچھ ایسی صورتیں پیدا ہوئیں کہ یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ ہندوستان کی صوبجاتی حکومتوں میں صرف بمبئی کی حکومت نے اس طرف توجہ کی ہے۔ لیکن ابھی یہ چیز پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچی ہے۔

اب تک جو اعداد و شمار شایع ہوئے ہیں اُن کے مطابق حسب ذیل مقامات پر سوتی اور دوسرے کپڑوں کے کارخانوں میں حسب ذیل مزدوری سنہ ۳۴ء میں ملتی تھی :

	روپیہ	آنہ	پائی	اوسط
بمبئی شہر ------------	۱	۱	۱۰	یومیہ
نواح بمبئی ------------	۱	۰	۳	″
اضلاع تھانہ، کلابا اور رتنا گری -------	۱	۰	۳	″
احمد آباد شہر ------------	۱	۵	۷	″
نواح احمد آباد، کیرہ اور پانچ محال -------	۱	۰	۳	″
بروچ اور سورت ------------	۰	۱۴	۰	″
مشرقی و مغربی خاندیش	۰	۱۲	۰	″
پونا، ناسک اور احمد نگر ------------	۰	۱۵	۷	″
شولاپور شہر ------------	۰	۱۱	۸	″
نواح شولاپور اور ستارہ ------------	۰	۷	۶	″
بیجاپور، دھرواڑ اور کنارہ ------------	۰	۸	۶	″

بنگال کے جوٹ کے کارخانوں میں مختلف طبقہ کے کام کرنے والوں کو ۱۰ روپیہ ماہوار سے ۱۱ روپیہ ماہوار تک ملتے ہیں[1] انڈیا لیگ ڈیلیگیشن رپورٹ کے مطابق ایک کارخانہ میں عورتوں کو دو روپیہ چار آنہ اور مردوں کو تین روپیہ چار آنہ ماہانہ اُجرت ملتی ہے۔

ہندوستان میں سب سے زیادہ اُجرت احمد آباد کے سوتی کپڑوں کے کارخانوں میں دی جاتی ہے مثلاً ایک مزدور جو دو کرگھوں پر کام کرتا ہے اس کو ۴۵ روپیہ سے ۵۰ روپیہ ماہانہ تک دئے جاتے ہیں۔ دوسرے شہروں میں مزدوری اس سے بہت کم ملتی ہے۔ مثال کے لئے آپ صوبۂ متوسط کو لیں جہاں ایک کرگھے پر کام کرنے والے کو ۱۵ روپیہ اور دو پر کام کرنے والے کو ۳۰ روپیہ ماہوار دئے جاتے ہیں۔ کانپور میں دو کرگھوں پر کام کرنے والے کو ۳۵ روپیہ سے ۴۰ روپیہ ماہانہ تک دئے جاتے ہیں۔

انڈیا لیگ ڈیلیگیشن رپورٹ کا بیان ہے کہ اڑیسہ میں معمولی مزدوروں کو چار آنہ یومیہ اُجرت ملتی ہے اور سرکاری کاموں کے لئے اُن کو نصف اُجرت پر کام کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اسی رپورٹ کے مطابق کوئلہ کی ایک کان میں میاں بیوی کو ایک روپیہ دو آنہ یومیہ ملتے ہیں اور ڈھلائی کا نرخ نو آنہ فی ٹن ہے۔ کانپور میں تجربہ کار مزدوروں کو تیس روپیہ ماہانہ سے تیرہ روپیہ ماہانہ تک اُجرت دیجاتی ہے[2]۔

---

[1] ان میں چینی بڑھئی کا کام کرنے والے شامل نہیں ہیں جو اکثر ۹۳ روپیہ ماہوار تک پاتے ہیں۔

[2] India League Delegation Report P 447

ہندوستان کے کارخانوں میں اُجرت تقسیم ہونے کا کوئی ایک وقت متعین نہیں ہے۔ کہیں ہفتہ وار اُجرت تقسیم ہوتی ہے، کہیں پندرہ روزہ اور کہیں ماہوار۔ جس کارخانہ کو جس میں آسانی نظر آئی، اُس نے وہ طریقہ اختیار کرلیا مگر سرکاری قانون کے مطابق ایک مہینہ کے اندر مزدوری تقسیم ہو جانا چاہئے۔

بعض کارخانوں میں ایک اور بھی ستم ظریفی نظر آتی ہے۔ مثلاً احمد آباد کے کپڑا بننے کے کارخانے کے مختلف شعبوں میں مزدوری تقسیم ہونے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ کسی شعبہ میں ہفتہ وار ملتی ہے اور کسی میں پندرہ روزہ یا ماہوار۔

بمبئی میں اُجرت ہر مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو تقسیم ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدور کو اپنی اُجرت کے لئے پہلی بار چھ ہفتوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے کیونکہ کارخانہ والوں نے یہ بھی ایک قانون بنا رکھا ہے کہ کم از کم پندرہ روز کی مزدوری وہ روک لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک قانون ہے کہ اگر کوئی مزدور نوکری چھوڑنا چاہتا ہے تو اُس کو ایک مہینے پہلے نوٹس دینی چاہئے۔ اگر اُس نے بغیر نوٹس کے نوکری چھوڑ دی تو اُس کی تنخواہ ضبط ہو جائے گی۔ کلکتہ کے جوٹ کے کارخانوں میں مزدوری ہفتہ وار تقسیم ہوتی ہے مگر یہاں بھی ایک ہفتہ کی مزدوری ہمیشہ روک لی جاتی ہے۔

احمد آباد کے کارخانوں کا بھی یہی حال ہے۔ کہیں ہفتہ وار، کہیں پندرہ روزہ اور کہیں ماہوار مزدوری ملتی ہے۔

آمدنی و خرچ

بمبئی میں ایک مزدور گھرانے کی ماہانہ آمدنی ۳۰ روپیہ - ۱ آنہ - ۷ پائی - ہوتی ہے۔
احمد آباد " " " " " " " ۴۴ - ۷ - ۲ - " "
شولاپور " " " " " " " ۳۹ - ۱۴ - ۱۰ - " "

خرچ کا فیصدی تخمینہ درج ذیل ہے

فہرست اشیاء	بمبئی (سنہ ۳۲ء)	احمد آباد (سنہ ۲۶ء)	شولاپور (سنہ ۲۸ء)	کیفیت
غذا پر	۴۶٫۶۰	۵۷٫۹۰	۴۹٫۲۵	آمدنی کا فیصدی حصہ
ایندھن اور روشنی پر	۷٫۱۱	۷٫۰۴	۹٫۶۰	" " " "
کپڑا اور جوتے پر	۷٫۷۵	۹٫۴۵	۱۱٫۸۶	" " " "
کرایہ مکان پر	۱۲٫۸۱	۱۱٫۷۴	۶٫۲۷	" " " "
متفرقات	۲۵٫۷۳	۱۳٫۸۷	۲۳٫۰۲	" " " "
	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	

مصنفین انڈین ایئر بک (al) ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس انداز کی آمدنی میں زندگی کا کوئی اطمینان بخش معیار قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستانی

al The Indian year Book 1939-40 P. 559

مزدور اپنی آمدنی نہایت عقلمندی کے ساتھ خرچ کرے گا تو بھی یہ یقینی ہے کہ وہ اپنی غذا پر اتنا صرف کرہی نہیں سکتا جس قدر خرچ کرنا چاہئے .... اُس کے (مزدور کے) پاس کپڑے اس قدر ناکافی ہوتے ہیں کہ اُن کو موسم گرما کے لئے بھی وافر نہیں کہا جا سکتا۔ تعلیم پر خرچ کرنے کے لئے اُس کے پاس کوئی رقم نہیں بچتی۔ رہ گیا گھر کا سازو سامان، سو وہ مشتمل ہوتا ہے، دو ایک بکسوں، متعدد بانس کے ڈنڈوں، ایک گاؤں کے بنے ہوئے کمبل، ایک بوسیدہ چٹائی، چند ٹوٹے پھوٹے کھلونوں اور دو ایک مورتیوں پر[1]"

صوبہ بمبئی کے مزدوروں کی آمدنی اور اُن کے خرچ کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، اُس کی روشنی میں مندرجہ بالا بیان کی صداقت کو کون مشتبہ سمجھ سکتا ہے۔ خرچ کے نقشہ میں تعلیم، تفریح اور دیگر ضروریات کا کوئی وجود نہیں ہے۔ متفرقات کے خانہ میں جو خرچ دکھلایا گیا ہے وہ بیماری، سود اور آمدورفت کے کرایہ ریل وغیرہ پر خرچ ہوتا ہے۔

کانپور کے سرکاری لیبر آفس (Labour Office) کے صیغۂ اعداد و شمار نے اکتوبر اور نومبر ۳۷ء میں کانپور کے مزدور گھرانوں کی آمدنی و خرچ کا، تحقیقات کے بعد ایک بجٹ مرتب کیا تھا۔ اس تحقیقات کے سلسلہ میں ۲۳۶ گھرانوں کے اعداد و شمار جمع کئے گئے اور پھر آمدنی کے اعتبار سے اُن کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:

آمدنی

آمدنی	پہلا گھرانہ	دوسرا گھرانہ	تیسرا گھرانہ	چوتھا گھرانہ
	روپیہ - آنہ - پائی	روپیہ - آنہ - پائی	روپیہ - آنہ - پائی	روپیہ - آنہ - پائی
فی گھرانہ	۵۳ - ۵ - ۸	۳۵ - ۲ - ۸	۲۰ - ۱۱ - ۳	۱۲ - ۱۰ - ۲
فی مزدور	۲۰ - ۹ - ۵	۲۴ - ۲ - ۰	۱۸ - ۱۰ - ۵	۱۱ - ۵ - ۱۱
فی کس	۶ - ۱۲ - ۷	۷ - ۱۴ - ۲	۶ - ۸ - ۱	۴ - ۳ - ۰

خرچ

اشیاء	پہلا گھرانہ	دوسرا گھرانہ	تیسرا گھرانہ	چوتھا گھرانہ
غذا	۳،۹ روپیہ	۴،۰ روپیہ	۴،۳ روپیہ	۲،۵ روپیہ
کپڑا	۰،۶ "	۰،۶ "	۰،۵ "	۰،۴ "
جلاون اور روشنی	۰،۵ "	۰،۵ "	۰،۵ "	۰،۴ "
کرایہ مکان	۰،۶	،۸	۰،۷	۰،۶
امورخانہ داری و متفرقات	۲،۱	۲،۵	۲،۰	۱،۲

[1] Jacker & Bori op. cit., P. 109.

آمدنی و خرچ کا مقابلہ

گھرانہ	آمدنی			خرچ			بچت (+) یا کمی (-)			
	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی		روپیہ	آنہ	پائی
پہلا	۵۳	۸	۵	۵۳	۵	۹	+	۰	۲	۸
دوسرا	۳۵	۲	۸	۳۷	۵	۱۱	-	۲	۳	۸
تیسرا	۲۰	۱۱	۳	۲۲	۲	۲	-	۱	۶	۱۱
چوتھا	۲۵	۱	۳	۲۶	۱۰	۱۱	-	۱	۹	۸

کانپور کے مزدوروں کا جہاں تک تعلق ہے، اُن میں صرف پہلے گھرانے کے مزدوروں کی ماہانہ بچت دو آنہ آٹھ پائی ہوتی ہے۔ باقی تین گھرانوں کی آمدنی میں خرچ پورا نہیں پڑتا۔ تقریباً یہی حال ملک کے تمام صنعتی علاقوں کا ہے۔ ان حالات کی موجودگی میں مزدوروں کا مقروض ہونا تعجب انگیز نہیں۔

قرض ان حالات کی موجودگی میں مزدوروں کا مقروض ہونا حیرتناک نہیں ہے۔ اول تو وہ گاؤں ہی سے مقروض آتے ہیں اور پھر شہر میں بھی اُن کی زندگی قرض کے بار کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ حصول ملازمت کے لئے انکو رشوت دینی پڑتی ہے۔ اور یہ رقم قرض ہی لیجاتی ہے اور جب ملازمت ملجاتی ہے تو مہینہ بھر کا خرچ چلانے کے لئے قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قرض کی یہ رقمیں بہت کم حالتوں میں ادا کی جاتی ہیں کیونکہ آمدنی اس درجہ قلیل ہوتی ہے کہ اُس میں کسی ایسی بچت کی گنجایش ہی نہیں رہتی جس سے قرض ادا کیا جاسکے۔ مزدور کو شادی بیاہ، موت زندگی اور مہمانداری وغیرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بھی مہاجن ہی کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہے ۔ سب سے بڑا قرضہ بنئے کا ہوتا ہے جو ایک آنہ فی روپیہ کے حساب سے مزید منافع لیکر مہینہ بھر کے وعدے پر جنس اور دوسری ضروریات قرض دیتا ہے۔ اگر بنئے کی یہ رقم مہینہ بھر کے بعد ادا نہ کی گئی تو اُس پر سود اور در سود چلنے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنیا سود ۵۰ فیصدی کے حساب سے وصول کرتا ہے۔ تخمینہ لگایا جاتا ہے کہ ہر مزدور کے قرض کی رقم اُسکے تین ماہ کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ مزدوروں کے قرض کا ذکر کرتے ہوئے مصنفین انڈین اکنامکس لکھتے ہیں:

> "مزدور کی زندگی کا بیشتر حصہ قرض کی حالت میں گزرتا ہے اور اندازہ لگایا جاتا ہے کہ مزدوروں کا تین چوتھائی حصہ قرض کے بار سے لدا رہتا ہے اور قرض کی یہ رقم انکی تین مہینہ کی مزدوری کے برابر ہوتی ہے۔ قرضہ کی عدم ادائیگی ایک عام وبا ہے۔ اس کی وجہ اتفاقات اور غربت سے قطع نظر، خود مہاجن بھی ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ قرض ادا نہ ہو اور قرضہ کی معمولی رقم بڑھکر دوگنی چوگنی ہوجائے"۔

یہ ہے ہندوستان کے مزدوروں کی حالت جنکی محنت پر یہاں کی صنعت کا انحصار ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک صنعتی اداروں کا تعلق ہے وہ کافی مالدار ہیں، لیکن ملک کی عام اقتصادی حالت بدستور خراب چلی آرہی ہے اور برابر خراب ہوتی چلی جائے گی، جب تک مزدور طبقہ کی تعلیم، صحت اور آمدنی کو اس قابل نہ بنادیا جائے کہ وہ بھی انسانی برادری میں اپنی انفرادی و اجتماعی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ۔ ایک ملک کی خوشحالی کا معیار یہ نہیں کہ دولت چند افراد میں محدود ہوکر رہ جائے، جبکہ اس کا صحیح معیار یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی ضروریات فراہم کرنے میں تمام ممکن آسانیاں حاصل ہوں اور بقول سر ظفر اللہ خاں، "یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ہم سود لینے والے اداروں کو بالکل ختم نہ کردیں۔"

محمد عتیق صدیقی

یونانی علم الاصنام

یونانِ قدیم کی تاریخ بڑی دلآویزیوں کا مجموعہ ہے۔ اسکے ہر صفحہ پر شان وشوکت، حسن وعشق اور دبدبہ وجلال کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ اس کا ادب آج بھی پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لئے دلکشی کا سامان رکھتا ہے۔ فیڈائس، ہومر، سافوکلس، ارسطو، سقراط، افلاطون، ہیروڈوٹس، ارکیمیدس کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ فنونِ یونان کے مظاہرِ لطیف آج بھی دُنیا سے اپنے حسن ورعنائی کی بدولت خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔ اس کی آب وہوا آج بھی نشہ بخش، کیف آور اور نشاط انگیز ہے۔ غرض اس کا ہر ہر حصہ آج بھی باوجود ہزار انقلاب زمانہ کے حد درجہ جاذبِ قلب ونظر ہے اور اُسوقت تک رہے گا جب تک انسان کا جمالیاتی ذوق فنا نہیں ہوجاتا۔

یونانِ قدیم کا لفظ ایک برقی اثر رکھتا ہے جو ہمارے تخیل کو فوراً جگمگا دیتا ہے اور اس لفظ کا خیال کرتے ہی دو ہزار سال کا زمانہ اپنی تمام حیرت سامانیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور اس میں عقل وتخئیل کی ایسی ایسی سحر کاریاں نظر آتی ہیں کہ ہماری موجودہ تہذیب بھی، باوصف اپنی درخشانیوں کے انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

قدیم یونان کی تہذیب میں تخئیل کی بڑی رنگ آمیزی ہے۔ اس کی قدامت وعظمت کی ساری عمارت علم الاصنام پر تعمیر کی گئی ہے۔ یونانیوں کے نزدیک کاشتکار کا بیج بونا، ملاح کا کشتی کھینا، شاعر کا شعر کہنا، موسیقی کا نغمہ الاپنا، اور سپاہی کا دادِ شجاعت دینا، یہ سب دیوتاؤں ہی کی کارفرمائی تھی۔ سینۂ عشق میں محبت کی گرمیاں، بارگاہِ حُسن میں عشق کی نیازمندیاں اور رسوائیاں وصل کی آرزوئیں، ہجر ومفارقت کی بےچین راحتیں، وصال کی مسعود ساعتیں اور تشکیب وصبر کی ناکام حسرتیں، یہ سب یونانیوں کے نزدیک دیوتاؤں ہی کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ غرض یہ سارا کارگہِ عالم انھیں کے اشاروں پر چلتا تھا اور فضائے بسیط کی ہر شے ایک مافوق البشر ہستی سے وابستہ تھی۔

یونانی اساطیر پر بحث کرنے سے قبل بہتر ہوگا کہ ہم صنمیات کے بعض پہلوؤں پر غور کرلیں۔ ان میں دیوتاؤں کے بعض افعال تو ایسے ہیں جو فہم انسانی کی دسترس سے باہر نہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی ہیں جن کو عقلِ سلیم آسانی سے تسلیم نہیں کرسکتی مثلاً یونانیوں کی "زہرۂ عریاں" اچھی اور بُری دونوں خصوصیات کی حامل ہے اور جتنی وہ دلکش ہے اتنی ہی جراحتِ دل بھی ہے۔ زیوس جس کا مرتبہ خداوندانِ اولمپس میں بہت بلند ہے، اگر وہ بدی کو روکتا ہے اور نیکی کی ترغیب دیتا ہے تو ہیرا کے ساتھ بدسلوکی بھی کرتا ہے اور دوسروں کی جوان لڑکیوں کو "بُری نگاہ" سے بھی دیکھتا ہے۔ بعض دیوتا عجیب عجیب شکلیں رکھتے ہیں۔ کوئی آدھا انسان ہے اور آدھا حیوان۔ کوئی زاہد ومتقی بھی ہے اور رہزنی اور بدکاری کو بھی اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔ انھیں باتوں کو دیکھ کر میکس ملر کہتا ہے کہ علم الاساطیر کا ایک حصہ بالکل "احمقانہ اور غیر مہذب" ہے اور

اس کا اس دور میں جبکہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے، کوئی معقول اور قطعی جواز پیش کرنا نہایت مشکل ہے۔

ازمنہ قدیمہ میں علم الاصنام کے اس لغو عنصر کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں اور بعض لوگوں نے اس کی عقلی تعبیر کرنا چاہی زنا فینز (Xenophanes) نے چھٹی صدی (ق۔م) میں اساطیر نگار شاعروں پر سخت تنقید کی اور اُن کی کوششوں کو بادپیمائی سے تعبیر کیا۔ اس کے بعد فلسفیوں نے اساطیر میں طبیعیاتی نکات ڈھونڈھنے شروع کئے اور مختلف دیوتاؤں کو مظاہر قدرت ثابت کیا۔ بعض فلسفیوں نے کہا کہ یہ محض کہانیاں نہیں ہیں بلکہ تمثیل اور مجاز کے پردے میں اخلاقی مسائل ہیں جو انتہائی خوبی اور صناعانہ تکمیل کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کردئے گئے ہیں۔ لیکن اِن دونوں نظریوں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کیا اُس عہد قبل از تاریخ میں جب علم الاصنام کا آغاز ہوا، انسان اتنا صاحب عقل و ہوش تھا اور وہ طبیعیات اور اخلاقیات سے اتنا باخبر ہوگیا تھا کہ اس نے اِن دقیق مسائل کو اس طرح تمثیلاً رواج دیدیا۔ اس کا جواب تمام علوم جدیدہ نفی میں دیتے ہیں۔

یومرس (۳۱۶ ق۔م) کا خیال ہے کہ دیوتاؤں کی کہانیوں میں انسان کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ یہ تمام دیوتا درحقیقت معمولی گوشت پوست کے انسان تھے جن کو بعد میں تخئیل کی رنگ آمیزی، بطل پرستی اور جوش غلو نے دیوتا اور خداوند بنا دیا (Lactantius) اور سینٹ آگسٹن بھی اسی رائے سے متفق ہیں اور اس کے مزید جواز میں اس قسم کی باتیں پیش کی ہیں کہ اہل کریٹ، زیوس کی قبر سے واقف تھے اور اہل فونیشیا اپنے جنگجو مشاہیر کی قبروں پر خون کا چڑھاوا چڑھایا کرتے تھے۔ الغرض یونانی مفکرین نے اساطیر کو اخلاق۔ طبیعیات۔ مذہب اور تاریخ کی روشنی میں دیکھا۔ تھی جینس (Theagenes) نے ہومر کی اساطیری شاعری میں قدرت کے کارناموں کی جھلک محسوس کی۔ پورفیری نے اساطیر کو اخلاق و مذہب کی داستان سمجھا اور ارسطو نے علم الاصنام کو واضعانِ قانون کی ایجاد قرار دیا تاکہ وہ عوام سے اپنے فیصلوں کو منوا سکیں۔ یومرس نے اسے انسانی تاریخ کا جزو بتلایا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں طامس ٹیلر نے علم الاصنام کو تمثیل سے تعبیر کیا اور بتلایا کہ اس میں مذہبیات کے بڑے بڑے رموز پنہاں ہیں۔ لیکن لابک (Lubbock) نے اس خیال کی تردید کی اور بتایا کہ اس قسم کا تجزیہ انسانی ارتقاء سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ موجودہ زمانہ میں عقلی علوم کی واقفیت نے علم الاساطیر کے سمجھنے میں بڑی مدد دی ہے۔ لسانیات، بشریات، انسان کے ارتقاء اور اداروں کی تاریخ نے اب ہمارے لئے بڑی سہولتیں پیدا کردی ہیں اور موجودہ تحقیق بڑی حد تک اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ علم الاساطیر انسان کے ارتقاء، نطق اور خیال کا مجموعہ اور فسانہ ہے۔ لیکن ماہرین اساطیر ابھی ایک مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں، ایک گروہ، جس کا سرخیل میکس ملر ہے، یہ کہتا ہے کہ علم الاصنام "زبان کی عدالت" ہے یعنی یہ اُن بے سمجھے ہوئے لفظوں اور خیالوں کا مجموعہ ہے جو اسی طرح زبان میں باقی رہ گئے ہیں اور اُن کے اصلی معنی معدوم ہوچکے ہیں۔ اگر ہم فیلالوجی کے ذریعہ اتحادِ لسانی کا راز معلوم کرلیں تو ہم بیراساطیر کے اصلی مفہوم سے باخبر ہوجائیں گے لیکن یہ اگر ہمیں واقفیت حاصل ہوجائے تو بھی چنداں فایدہ نہیں۔ اس لئے کہ بہت سے خرافاتی قصے مختلف قوموں میں بالکل ایک ہیں۔ آریوں کا بہت سا اساطیری علم اہلِ آسٹریلیا، اسکیمو، افریقہ کی جھاڑیوں کے رہنے والے وحشیوں اور جزائر سلیمان کے باشندوں سے ملتا جاتا ہے۔ اس لئے بالفرض اگر ہمیں یہ معلوم بھی ہوجائے کہ زیوس سے مطلب آسمان

اور انہی سے مراد آگ ہے، تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج جتنے قصے زیوس اور انہی سے متعلق ہیں وہ سب شروع میں آسمان اور آگ ہی سے متعلق تھے۔ اس کے علاوہ وحشیوں کے نزدیک سورج، چاند اور ہوا وغیرہ کا مفہوم، ہمارے مفہوم سے بالکل مختلف تھا۔ اگر ہمیں دو دیوتاؤں کے ابتدائی معنی معلوم بھی ہو جائیں تو یہ کیا یقین ہے کہ جو مفہوم اس لفظ سے ہم نے سمجھا ہے وہی اِن لوگوں کے ذہن اور دماغ میں رہا ہو۔

عہدِ جدید کے ماہرینِ اساطیر میں میکس ملر کا نام بہت مشہور ہے جو لسانی ادارۂ فکر کا سالک اور رہنما سمجھا جاتا ہے لیکن تحقیقاتِ جدیدہ کی بدولت اب تاریخی یا بشری گروہ کو زیادہ قوت حاصل ہو گئی ہے اور رفتہ رفتہ اسی جماعت کے خیالات اہمیت حاصل کرتے جاتے ہیں۔

علم الاصنام کے متعلق اس تشریحی اور توضیحی بحث کے بعد اب ہم یونانی دیوتاؤں کی خصوصیات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یونانی دیوتا اگرچہ ازلی نہیں تھے لیکن عموماً ابدی اور غیر فانی سمجھے جاتے تھے۔ اِن کے متعلق اہلِ یونان کا یہ خیال تھا کہ وہ شراب اور ربانی غذا کی وجہ سے زندہ رہتے تھے لیکن عمر، اُن کی صحت پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یونانی اپنے دیوتاؤں کو ہمہ داں، ہمہ بیں اور قادرِ مطلق سمجھتے تھے، لیکن اُن کے مراتب میں بڑا فرق تھا۔ ان کی طاقت غیر معمولی سمجھی جاتی تھی۔ یہ لوگ ہر کام آناً فاناً کر سکتے تھے۔ یہ نہایت عقلمند اور ذی فہم سمجھے جاتے تھے۔ گمراہوں کو عقل بتانے والے بھی یہی تھے۔ ان کی سرشت میں انصاف کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور یہ برے اعمال کی جلد یا دیر میں سزا ضرور دیتے تھے۔

یونانی دیوتا عام طور پر سب ہی لوگوں سے تھوڑی بہت محبت کرتے تھے، گناہگار بھی کفارہ دینے کے بعد اُن کے الطاف و کرم کے مستحق ہو سکتے تھے۔ افراد میں جب دولت کی کثرت ہو جاتی تھی تو دیوتاؤں کے حکم سے اُن پر شیطان کا سایہ کر دیا جاتا تھا۔ معاشرتی فرائض اور قانونی کارروائیوں کی دیکھ بھال خاص طور پر دیوتاؤں کے سپرد ہوتی تھی۔

یونانی دیوتا بعض اوقات لوگوں کے گھر پر بھی جاتے تھے۔ لڑائیوں میں شرکت کرتے تھے اور کبھی کبھی خواب میں بھی نظر آتے تھے۔ وہ آدمیوں ہی کی سی وضع قطع رکھتے تھے اور درد دُکھ سب کچھ محسوس کرتے۔ اس طرح لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان میں اور ہم میں کچھ باتیں مشترک ہیں اور ہماری آواز اُن تک پہونچ سکتی ہے لیکن جہاں تک صفات کا تعلق ہے وہ ان میں عام انسانوں سے حد درجہ بلند اور افضل ہوتی تھیں۔ ماہرینِ فن کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی تھی کہ اُن کے بے مثل مجسمے تیار کر سکیں چنانچہ فیڈیاس کا طیار کیا ہوا مجسمۂ زیوس عجائباتِ روزگار میں شمار کیا جاتا ہے۔

یونانی متعدد خداؤں کے قایل تھے۔ اُن کے تمام علم الاصنام کی ورق گردانی کر ڈالئے۔ آپ کو کہیں بھی واحد اور ازلی خدا کا تصور نہیں ملے گا۔ یونانی دیوتا تخلیقِ عالم کی ذمہ داری سے بھی بری تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ یونان ماضی سے زیادہ حال کی فکر کرتے تھے۔ اسی لئے دیوتا صرف موجودہ نظام کے قیام، بقا اور تغیر و تبدل سے وابستہ تھے اور ماضی میں کیا ہوا اور کیوں ہوا، اس سے انھیں کچھ بحث نہ تھی۔

یونانیوں میں بعض دیوی دیوتا ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً ڈائن (Dione) ہیرا۔ ڈمیٹر اور گائیا (Gaea) اس کا شاید سبب یہ ہے کہ عہدِ عتیق میں یونانیوں کے قبیلے الگ الگ تھے۔

جغرافیائی دقتوں کی وجہ سے ان میں آپس میں میل جول نہیں تھا، لیکن بعد میں جب اتحاد اور ایتلاف ممکن ہو سکا تب بہت سے دیوی دیوتا رل مل گئے یا آپس میں مدغم ہو گئے۔

علم الاساطیر کو سمجھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ یہ قصّے کن حالات کی پیداوار ہیں اور ابتدا میں اس قوم کی کیا حالت تھی جس سے یہ افسانے منسوب ہیں۔ ابتدا میں قوم کا تخیل، فرد کے آغاز شباب کے تخیل کی طرح نہایت رنگین اور دلکش ہوتا ہے اور اس وقت جتنی معلومات کی کمی ہوتی ہے اتنی ہی تصورات کی فراوانی نظر آتی ہے۔ گرد و پیش کے مظاہر قدرت، ذہن اور دماغ پر برا اثر ڈالتے ہیں اور اس کے حواس، مناظر و مظاہر کو محسوس کرتے ہیں۔ جب کان پر بجلی کوندتی ہے تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ جب سورج صبح کو مسکراتا ہوا نکلتا ہے تو وہ مسرور ہو جاتا ہے۔ رات کی بھیانک خاموشی اسے پراسرار اور پرخوف معلوم ہوتی ہے جب موت اپنی قہرسامانیوں کے ساتھ آکر وجود کو عدم میں تبدیل کر دیتی ہے تو وہ مبہوت اور ششدر رہ جاتا ہے۔ قدیم انسان اپنے ہی سے ان سب چیزوں کا اندازہ لگاتا ہے اور بعض وقت اپنی ہی خصوصیات سے ان مظاہر کو متصف کر دیتا ہے۔ بجلی کی کڑک سُن کر وہ اسے شیر کی چنگھاڑ سے تشبیہ نہیں دیتا اس لئے کہ اس صورت میں وہ اپنے ڈر اور خوف کا ازالہ شیر سے نہیں کرا سکتا اور نہ اس کے سامنے اظہار نیازمندی کر سکتا ہے اس لئے اس نے اس سے تصور ایک ایسے انسانِ اعلیٰ کا قایم کیا جس میں تمام بشری صفات اس انسان سے بدرجہ احسن موجود ہوں۔ جیسے جیسے تہذیب و تمدن بڑھتا گیا اُس "خداوند" میں صفات اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہوتی گئیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ پہلے پہلے جن مظاہر فطرت نے انسان کو متاثر کیا وہ اس قسم کی چیزیں تھیں جیسے موسم کی تبدیلیاں یا روز و شب کا تغیر۔ اسی لئے صنمیات کے ابتدائی دور میں ایسے ہی دیوتاؤں کا ذکر ہے جو فضائے سماوی سے متعلق ہیں۔

اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں انسان نے قدرت کو دیکھ کر ایک ایسے نظام کا اندازہ کیا جس میں ترتیب اور پابندی ہے۔ اُسے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ کوئی طاقت مارنے اور ختم کرنے والی بھی ہے اور ہنگامی تبدیلیوں کے باوجود ایک مستقل ضابطہ ہے جس کے ماتحت نظام قدرت چل رہا ہے، اُس نے محسوس کیا کہ موت و حیات کا یہ سلسلہ اسی طرح رہے گا اور رات کی تاریکی کے بعد اسی طرح دن نکلے گا۔ جیسے جیسے انسان کی شعوری اور تمیزی قوتیں بڑھتی گئیں اور انسانی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا دوسرے مظاہر کی تحقیق ہونے لگی اور ان نئی چیزوں کو نئے دیوتاؤں سے منسوب کر دیا گیا۔ یا پچھلے دیوتاؤں کے دائرۂ اثر کو بڑھا دیا گیا۔ خداوندان نو کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آئی کہ قدرت میں ایک کشمکش اور مجادلہ نظر آتا تھا اور انسانِ قدیم نے اس کو بہتر اور آسان سمجھا کہ اسے دیوتاؤں کی باہمی آویزش سے منسوب کیا جائے۔ اس اختلاف کے ساتھ ساتھ اس نے ایتلاف اور اتحاد بھی دیکھا اور بالکل اسی طرح اس کی بھی تعبیر کر لی۔ نمی اور گرمی کو اس نے دیوتاؤں کی شادی بتلایا اور سورج اور چاند کو بھائی بہن۔

کثرتِ اصنام کی موجودگی میں ایک بڑے اور سچے خدا کا تصور بعد کی پیداوار ہے جبکہ انسانی شعور زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا تھا۔ آریہ لوگوں کو خدائے واحد کا احساس تھا۔ اسی طرح یونان میں بھی ایک ایسے مقتدر اور اعلیٰ دیوتا کا تصور پیدا ہو گیا تھا جس کے سامنے دوسرے دیوتا معمولی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن عام لوگوں کی ایک بڑی جماعت آسمان و زمین کے ہر شعبہ میں ایک "خداوند" کو دیکھتی تھی اور اسی سے اس شعبہ کی تمام چیزوں کو متعلق کر دیتی تھی۔ مختلف اوقات

میں لوگ انھیں سے رجوع کرتے تھے۔ اور اظہار تشکر یا امداد کے لئے انھیں کے آستانہ پر جبہ سائی کے لئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ عبادت گاہیں، معبد، مندر اور قربان گاہیں تعمیر ہوگئیں۔ مجسمے طیار ہوگئے اور حسین و جمیل بت تراشے گئے۔ بعض اصنام کی پرستش خاص موسموں میں ہوتی تھی اور بعض دیوتا خاص لوگوں میں مقبول تھے مثلاً جہاز رانوں اور ملاحوں کا خاص تعلق بحری دیوتاؤں سے تھا لیکن بڑے بڑے دیوتا تمام ملک اور قوم سے متعلق تھے اور وہی اتحاد اور یگانگت کا باعث سمجھے جاتے تھے۔ اپالو کو سروش غیبی سمجھا جاتا تھا اور اس کے دارالاستخارہ کے دانشمندانہ فیصلے ہر فرد و بشر کے لئے آیت و حدیث کا درجہ رکھتے تھے۔

یونانیوں کے معبود اعظم زیوس اور دوسرے بڑے بڑے دیوتاؤں کا مسکن اولمپس پہاڑ تھا۔ جہاں اسی عالم آب و گل کا ایک پرتو نظر آتا تھا۔ دیوتا اور دیویاں انسانوں ہی کی طرح رہتی سہتی، چلتی پھرتی اور لڑتی جھگڑتی تھیں۔

دیوتاؤں کی خدمت میں قربانی اور نذر بھی پیش کی جاتی تھی۔ یونانیوں اور رومیوں میں اس کے دو طریقے تھے بعض موقعوں پر پھل۔ کیک اور شراب نذر کی جاتی تھی اور بعض موقعوں پر جانور کو قربان کرتے تھے۔ اسے آراستہ کرکے اور ہار وغیرہ پہنا کر قربان گاہ تک لے جاتے تھے اور بہت سی رسموں کے بعد اسے ذبح کرتے تھے۔ اس کے گوشت کا کچھ حصہ قربان گاہ کی آگ پر جلایا جاتا تھا اور یہ خیال تھا کہ اس کی بو دیوتاؤں کو مرغوب ہے۔ اس کا بڑا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جو شخص اس تمام رسم کو ادا کرے وہ نیک کردار اور پاک باطن ہو گنہگار کی قربانی بھی قابل قبول نہیں ہوتی تھی۔ جانور کے متعلق یہ شرط تھی کہ وہ نہایت تندرست ہو لیکن اس کی عمر، رنگ اور جنس دیوی دیوتاؤں کی مناسبت سے انتخاب کی جاتی تھی۔ صبح کا وقت آسمانی دیوتاؤں کی قربانی کے لئے، اور شام کا 'عالم اسفل کے دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھا۔ موخرالذکر دیوتاؤں کو پورا جانور نذر کیا جاتا تھا۔ قربان گاہ کی آگ بڑی متبرک سمجھی جاتی تھی اور یہ کوشش کی جاتی تھی کہ اس کے لئے ایسی لکڑی جلائی جائے جو صاف روشنی دے۔

شروع زمانہ میں انسانوں کی بھی قربانی ہوتی تھی، اس کے لئے قربانی کرنے والے کا کوئی قریبی عزیز یا دوست انتخاب کیا جاتا تھا۔ ان مواقع پر دیوتا اپنی رائے سے کسی "غیب داں" کے ذریعہ آگاہ کر دیتے تھے۔ عام طور پر قربانی ایک قسم کی نذر تھی جو ایک شخص اظہار تشکر و نیاز مندی کے طور پر یا کسی گناہ کے کفارہ کے لئے بلا تحریک غیر اپنی خوشی سے دیوتاؤں کی خدمت میں پیش کرتا تھا اور دیوتا اس کے متمنی و متوقع رہتے تھے۔ اور جو اس معاملہ میں کوتاہی کرتا تھا اسے سزا دی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے بعض نذرانے وقت مقررہ پر پیش کئے جاتے تھے، کسان کٹائی کے وقت، گلہ بان، گلہ میں نئے بچوں کی پیدائش کے موقع پر، تاجر منافع کی وصولیابی اور سپاہی مال غنیمت ملنے پر نذرانہ دیتے تھے۔ کبھی کبھی قربانی یا نذر کسی لڑائی یا واقعہ کی یادگار یا کسی معاہدہ کی پختگی کے لئے بھی پیش کی جاتی تھی۔

عموماً پرہیز گاری، شکر گزاری یا گناہ گاری کی وجہ سے نذر یا قربانی دیجاتی تھی۔ اسی وجہ سے تقریباً سب لوگ عبادت کرنے اور مندروں وغیرہ میں جانے کے عادی تھے۔ صبح شام، کھانا کھانے کے درمیان، مجالس یا عدالتوں کا کام شروع کرنے سے قبل ایک نہ ایک دیوتا کی عبادت یا تعریف کی جاتی تھی۔ اگر اس موقع اور وقت کے لحاظ سے کسی خاص دیوتا کا نام نہ لیا گیا تو تمام دیوتاؤں سے دعا مانگ لی جاتی تھی۔ جب ایک مخصوص دیوتا کو خطاب کیا جاتا تھا اسوقت بھی یہ جملہ بڑھا دیا جاتا تھا کہ

"اے بلند مرتبت اصلی نام کسے معلوم ہو سکتا ہے؟" تاکہ کوئی دیوتا ناراض نہ ہو جائے۔ اساکلس، ایک دعا میں لکھتا ہے:

"اے خداوند زیوس ——— تو جو کچھ بھی ہو ——— اور تو جو بھی اپنا نام پسند کرے ———
ہم تجھی سے رجوع کرتے ہیں ——— اور تجھی سے دعا مانگتے ہیں"

جب بحری دیوتاؤں سے دعا مانگی جاتی تھی تو دعا مانگنے والا سمندر کی طرف اپنا ہاتھ پھیلاتا تھا۔ اور جب نیچے کی دنیا کے دیوتاؤں کو رجوع کرنا ہوتا تھا تو وہ شخص اپنے ہاتھ زمین پر مارتا تھا۔ اور جب مندر میں دعا مانگی جاتی تھی تو بت کے سامنے نیازمندانہ طریقے سے کھڑا ہو جاتا تھا۔ سخت پریشانی اور تکلیف کے عالم میں ملتجی زیتون کی شاخ لے کر پہونچتا تھا۔ یا ایک لکڑی پر اون لپیٹ کر "بارگاہ خداوندی" میں آتا تھا۔ اور دیوتا کے قدموں سے لپٹ جاتا تھا۔ فیثاغورث نے اپنے معتقدین کو زور سے دعا مانگنے کی تلقین کی تھی لیکن اس کا رواج نہ ہوا۔

بعض وقت تو دعا تختیوں پر لکھ کر یا بند کرکے اور مہریں لگا کر دیوتا کے مجسمہ کے قریب رکھ دی جاتی تھیں تاکہ کسی انسان کو یہ خبر نہ ہو کہ کیا دعا مانگی ہے۔ ایک دعا کا نمونہ ذیل میں درج ہے:۔

زیوس! اے معبود!! ——— ہمیں سب کچھ دے ——— جو اچھا ہے ———
چاہے ہم اسے مانگیں یا نہ مانگیں ——— اور اے معبود! ——— جو برا ہے ——— وہ ہمیں نہ دے ———
چاہے ہم اسے طلب ہی کیوں نہ کریں۔

ان مذہبی رسوم کے علاوہ اہل یونان استخارہ گاہ ڈلفی کے فیصلوں پر بڑا بھروسہ اور ایمان رکھتے تھے اور دیوتاؤں کے فیصلوں کا علم کئی طرح کے شگونوں اور علامتوں سے حاصل کرتے تھے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا تھا کہ اوپر چڑیاں کس جانب اڑ رہی ہیں کاہن شمال کی جانب منہ کرکے کھڑا ہوتا تھا۔ اس وقت اگر چڑیاں دائیں جانب اڑ رہی ہوں تو یہ اچھا اور نیک شگون سمجھا جاتا تھا اور اگر بائیں جانب، تو یہ بری علامت سمجھی جاتی تھی۔ کبھی کبھی جانور ذبح کیا جاتا تھا اور اس کی انتڑیاں دیکھی جاتی تھیں اگر وہ صحیح ہوتی تھیں تو اسے دیوتاؤں کی خوشی اور سازگاری کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔ دیوتا اپنی رائے کا اظہار خواب میں بھی کر دیتے تھے۔ بجلی کا کوندنا۔ زلزلہ کا آنا، چاند یا سورج گہن پڑنا۔ ستارہ کا ٹوٹنا ـــ یہ سب علامتیں تھیں جن سے دیوتاؤں کی رائے معلوم ہوتی تھی۔ تعبیر دینے والوں کا ایک الگ طبقہ تھا جو کاہن کہلاتا تھا۔

اہل یونان اپنے بعض دیوتاؤں کے لئے کچھ خاص کھیل اور جلسے بھی کرتے تھے۔ جب یہ کھیل ہوتے تھے اس زمانہ میں لڑائی بند کر دی جاتی تھی اور راہ گیروں کو دشمن کے ملک سے بھی نکلنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ ان جشنوں اور تہواروں کے نام المپین، پائی تھین، نی مِن اور استھمین تھے۔ اول الذکر تہوار المپیا کی وادیٔ ایلس میں ہر پانچویں سال منعقد ہوتا تھا اس میں عموماً کشتی، گھوڑ دوڑ بازی، جانوروں، رتھوں وغیرہ کی دوڑ کے مظاہرے ہوتے تھے۔ اس میں کامیاب ہونے والے کو صرف زیتون کا ایک ہار دیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی لوگ بڑی قدر کرتے تھے اور دور دور سے سفر کرکے اس میں شرکت کے لئے آتے تھے۔ شہر کے آدمی جیتنے والے کی عزت افزائی کے لئے ایک مجسمہ نصب کروا دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے مجمعوں میں شاعر یا مصنف اپنی تصنیف سے بھی سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔

پائی تھین کا تہوار ہر پانچویں سال اپالو کی عقیدت میں ڈلفی کے آس پاس منعقد ہوتا تھا۔ یہ نور اور موسیقی کا خدا

سمجھا جاتا ہے۔ اس مقابلہ میں گانے اور ورزشی کھیل ہوتے تھے اور جیتنے والے کولارل نام ایک خاص پودہ کی پتیوں کا ہار عطا کیا جاتا تھا۔ نی من کے کھیلوں میں جو زیوس کی خوشنودی کے لئے منعقد کئے جاتے تھے، جیتنے والے کو عشق پیچاں کا ہار دیا جاتا تھا۔ استھمین کا جلسہ ہر تیسرے سال پوسی ڈن کی یادگار میں کیا جاتا تھا۔ اور اس میں صنوبر کا ہار طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

اس سلسلہ میں ہماری جو کچھ معلومات ہے وہ روایات، آثار، اور ادبیات کی بدولت ہم تک پہونچی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یونانی جن دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اُن کی خصوصیات اور اوصاف کے متعلق عوام کو کوئی باقاعدہ تعلیم نہیں دیجاتی تھی۔ پروہت اور کاہن ہوتے تھے لیکن اُن کا فرض ادائیگی رسومات کے بعد ختم ہوجاتا تھا۔ اسی وجہ سے یونانی اساطیر میں کافی گڑبڑ اور ابتری ہے۔ سقراط کو اس بات کی حیرت تھی کہ زیوس جو ایک ہی دیوتا ہے اس کے ہزاروں نام کیوں ہیں

ہم اساطیری معلومات، قدیم لٹریچر کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ شاعروں، مورخوں اور فلسفیوں وغیرہ کی تصانیف علم الاصنام کے متعلق نہایت دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ آثار قدیمہ بھی ہمارے لئے معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں، اس زمانہ کے مجسمے، مصوری و سنگ تراشی کے نمونے، منقش برتن، کھُدے ہوئے قیمتی پتھر، اور سکے ہماری مذہبی اور اساطیری معلومات میں بیحد اضافہ کرتے ہیں اور آج اس علم کے متعلق ہمیں جو تھوڑی بہت واقفیت ہے وہ ادبیات اور آثار ہی کا طفیل ہے۔

علم الاصنام کے اس حلقۂ دام خیال میں غالباً شدید عقلیت پسند لوگوں کو سوائے توہم پرستی یا اسلاف پرستی کے اور کچھ نظر نہ آئے لیکن حساس دل و دماغ رکھنے والے اس آئینہ میں حیات انسانی کا پرتو دیکھیں گے اور اس میں بہت سی ایسی چیزیں پائیں گے جو زندگی کی تلخیوں کے لئے انگبین کا کام دے سکتی ہیں جہاں اس میں فکر و خیال کے رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں وہاں لغویات اور مزخرفات کے کانٹے بھی ہیں۔ انسانی زندگی میں بھی تو معقولیت اور غیر معقولیت دونوں ہی چیزیں ملتی ہیں۔ ایچ۔ ڈیوس نے معقول زندگی کی آرٹ کے نقطۂ نظر سے، بڑی عمدہ تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے "ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سانسوں کی آمد و شد یا اس کی مجموعی تعداد پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ حقیقتاً اس تعداد پر کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سانس رکا رہے یا خارج ہو، یہ دونوں صورتیں خواہ کسی جذبۂ محبت کے ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور جاذب نظر چیز کو دیکھ کر عمل میں آویں"۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ملے گا جو علم الاصنام یا انسانی دماغ کے اس عہد طفولیت کے افسانہ میں حسن اور دلکشی نہ محسوس کرتا ہو۔ اندر کے اکھاڑے، کرشن کی سبھا، زیوس کے پرستان اور باخوس کی مجلس میں آج بھی زندگی کی ناخوشگوار حقیقتیں پناہ گزیں ہو سکتی ہیں۔ ادبیات کی افسوں کاری آج تک اسی علم الاساطیر کی مرہون منت ہے۔ ہومر کی ایلیڈ و ویاس کی مہابھارت، والمیک کی رامائن اور فردوسی کا شاہنامہ آج بھی فقید المثال کارنامے سمجھے جاتے ہیں اور انسان، اس عہد عقل و ہوش میں بھی، تخیل کی انھیں موجوں سے کھیلنا پسند کرتا ہے۔

خواجہ احمد فاروقی، بی۔ اے

نگاہِ بازگشت

(مسلسل)

۲۱۔ فراق گورکھپوری

حضرت فراق گورکھپوری اپنی شاعری کی عمر کے لحاظ سے مشاق نہیں کہے جا سکتے مگر حسنِ شاعری کی وجہ سے بہت سے مشاقانِ سخن پر فوقیت رکھتے ہیں اور بقول محترم مدیر "نگار" "اُن کی شاعری پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ:۔

"ہمیں اُس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے" فراق صرف شاعر ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہیں آپ ادیب بھی ہیں اور ماہرِ تعلیم بھی۔ آپ معلم بھی ہیں اور فلاسفر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اُن کی شاعری میں ماورائے شاعری بھی کچھ چیزیں ملتی ہیں جو اپنی اہمیت میں کسی طرح کم نہیں۔ آپ کی شاعری میں بیانِ حسن و عشق کے علاوہ زندگی پر تنقید و تبصرہ بھی ہے۔ آپ نے اگر محبت کے نکات بیان کئے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ زندگی کے مختلف رُخ کی پردہ کشائی بھی کی ہے۔ اگر وہ والہانہ انداز میں اپنے جذباتِ عشق کی ترجمانی کرتے ہیں تو کبھی کبھی حیات و کائنات پر نگاہ تنقید بھی ڈالتے ہیں۔ آپ کی شاعری تقلید سے یکسر پاک و صاف ہے۔ آپ ایک حقیقی شاعر ہیں اور اپنی شاعری کو آپ نے زیادہ تر جذبات و تاثرات تک محدود رکھا ہے حضرت فراق نے اپنے سوانح حیات بہت مفصل دئے ہیں اور اپنی شاعری کے متعلق خود اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جس سے ہم اُن کے رجحانِ طبع اور اُن کے مذاقِ شاعری کا کچھ صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایک جگہ آپ رقمطراز ہیں:۔

"شاید زندگی کو شعر میں تحلیل کرنا اور شعر کو زندگی کا آئینہ بنانا مقصود زندگی ہو۔ کون جانے ــــ" اس میں شک نہیں کہ آپ کی شاعری حیات پر ایک بسیط نقد و تبصرہ ہے اور آپ کے اشعار آپ کی زندگی کا عکس ہیں۔ آپ نے حیات و کائنات کا بہ نگاہِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ آپ کے احساساتِ صحیح سے حیاتِ انسانی کا کوئی رُخ پوشیدہ نہیں ہے اور آپ کی تنقیدِ حیات میں ایک خلوص و حقیقت ہے۔ جو دلوں پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

جناب فانی کی طرح آپ کے لئے بھی زندگی معمہ سے کم نہیں۔ آپ جس زندگی کی تلاش میں ہیں وہ آپ کو اس دُنیا میں نظر نہیں آتی بلکہ ماورائے افہام و تفہیم ہستی کی حیثیت رکھتی ہے ــــــ چنانچہ آپ زندگی کی اُلجھنوں سے عاجز آ کر کہتے ہیں کہ

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی
زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

اور پھر آپ جب اس عملی زندگی کو اپنی تخیلی زندگی سے مختلف پاتے ہیں تو آپ کی شدتِ احساس آپ کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ

کیسی خوشی۔ کہاں کا الم یہ کوئی بتاؤ
دنیا میں زندگی بھی کہیں دستیاب ہے

عشق زندگی کی اعلےٰ تخلیقی استعداد ہے۔ عشق ایک زبردست محرکِ شعری ہے۔ وہ جذباتِ انسانی کا سرتاج ہے

اس کی واردانتیں عالمگیر ہیں - یہ محرکِ شعری دُنیا کے ہر قوم کی شاعری کا سرمایہ رہا ہے - فارسی اور اُردو میں اس موضوع پر ہمارے شعراء نے ایسے ایسے لطیف مطالب و معانی پیدا کئے ہیں کہ اُن کی مثال دوسری زبانوں میں شاید ہی ملے عشق و محبت اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ خود انسانیت — یہ جذبہ انسانی جبلت کے ساتھ وابستہ ہے اور زندگی کا قوی ترین محرک۔"

جناب فراق کی شاعری میں بھی محبت کے رموز و نکات - حُسن کی لطافتیں اور عشق کی پہنائیاں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں - ملاحظہ ہو:

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر — بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں
رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا — خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم
نگاہِ ناز میں صبحِ ازل کی کیفیت — ارے یہ کیسے فسانے سُنائے جاتے ہیں
بچی بچی سی وہ نظر - ملی ملی سی وہ نظر — یہ فاصلے نئے نئے - یہ قربتیں نئی نئی
نگاہِ کامیاب کا بھی اعتبار اُٹھ گیا — ملیں ترے جمال کو نزاکتیں نئی نئی

جناب فراق اپنی شاعری کے متعلق اظہارِ رائے کرتے ہوئے اپنے مذاقِ شاعری کا ایک اور پہلو واضح کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"مجھے تو زخم ہی کو مرہم بنانا تھا - پھر کیا کرتا - اگر درد بھری آواز میں سکت نہیں تو وہ نغمہ کہاں چیخ ہوگئی ہیں شاعری میں لب و لہجہ کو سب سے ضروری چیز سمجھتا ہوں - اسی لہجہ میں شاعر کی شخصیت چھپی ہوئی ہوتی ہے - شاعر تمام عالم کے دکھ درد کے احساس کو بغیر کم کئے ہوئے اگر اس میں نرمی اور خیر و برکت سمو سکے تو اُس میں قوتِ شفا آجاتی ہے۔ اور شاید یہی چیز شاعری کو عظمت دے سکتی ہے" ہم جناب فراق کی شاعری میں یہی چیز پاتے ہیں اور یہی خصوصیت اُن کو دورِ حاضر کے دیگر شعراء سے الگ کرتی ہے - آپ کی شاعری میں غم و درد کے عناصر پائے جاتے ہیں مگر آپ بجائے اپنے آلام و مصائب کا رونا رونے کے اُن کو نہایت نرم و سبک لہجہ میں بیان کرتے ہیں - مثلاً:

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مُسکرا دیا
پچھلے پہر شبِ فراق کون یہ مجھ سے کہ گیا — تیرا جواب پھر کہاں تو جو یہ درد سہ گیا
بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم — جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

آپ کے بعض بعض اشعار میں میر کا سوز و گداز اور میر کا سا اندازِ بیان پایا جاتا ہے اور اُن کے درد کی کسک کائنات کی روح کو تڑپا دیتی ہے -

پہلے بھی رو لیتے تھے کچھ دن کو اور کچھ راتوں کو — دل ہی ڈوبا جاتا ہے اب آگ لگے برساتوں کو

جناب فراق کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذوقِ جمال کو زندگی سے علٰحدہ نہیں کرتے - اُن کا یہی ذوقِ جمال اُن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے اور اُن کی حیات وارداتِ حسن و عشق کا ایک لطیف دفتر ہے جس کی شرح ممکن ہی نہیں - آپ کے یہاں تغزل کا نہایت اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے اور آپ کے اشعار آپ کے وجدانِ صحیح کا پرتو ہیں - آپ انھیں اشعار کے ذریعہ اپنی دل کی خلش کو دور کرتے ہیں - ملاحظہ ہو:

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں   تو نے تو خیر بے وفائی کی

(اس شعر کا لہجہ اور طنزِ لطیف قابلِ توجہ چیزیں ہیں)

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حُسنِ یار کو   اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

کچھ تو رنگِ جہاں بدل ہی دیا   تیرے دیدار کی تمنا نے

اظہارِ تمنا کی توفیق نہیں سب کو   دیکھی ہی کبھی اے دل ان آنکھوں کی گویائی

اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا   یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں

میں ہوں۔ دل ہے۔ تنہائی ہے   تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن   کیا کریں گر نہ انتظار کریں

جوشِشِ تجدیدِ شوق سچ کہنا   دل کو کیا ہم امیدوار کریں

یہ سب اشعار جذبات کی پاکیزگی اور اندازِ بیان کے لحاظ سے نہایت بلند ہیں اور پھر تغزل کی مخصوص سہل و نرم زبان اور سادگی اشعار میں دونا لطف پیدا کر رہی ہے۔ ان سب کے علاوہ اشعار کا لب و لہجہ اور کہیں کہیں طنز و تعجب اور استفہام کی کیفیاتِ لطیف ایک کیف پیدا کر دیتی ہیں۔ جنابِ فراؔق کی شاعری کی بلندی کا ایک اور راز اُن کے اشعار کی رمزیت میں پوشیدہ ہے۔

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی ست   حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

جناب فراؔق کے بعض بعض اشعار ایسے معنی خیز ہوتے ہیں کہ فطرتِ انسانی اُن کے اندر جذباتی کنایہ پنہاں دیکھتی ہے، جیسے:

تری یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں   محبت ہے شاید تجھے بھول جانا

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے   آج تو کوئی آیا ہوتا

ان اشعار میں رمزیت کے علاوہ اجتماعِ ضدین ایک عجیب لطف دے رہا ہے۔ ایسے اشعار اُردو شاعری میں بہت کم نظر آتے ہیں۔

بعض اوقات آپ معمولی الفاظ سے گہرے جذباتی معانی کی تخلیق کرتے ہیں اور اسی رمزیت و کنایہ کی بدولت آپ کے محدود مشاہدہ میں بے پایانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ "رمزیت کا کمال یہ ہے کہ سامع کے حافظہ میں بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور ہوتی رہیں" اور یہ خصوصیت جناب فراؔق کی شاعری میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ملاحظہ ہو:۔

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر   بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

پھر دل پہ ہے نگاہ کسی کی رُکی ہوئی   کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہو آج پھر

اُن کے اشعار میں اس رمزیت کی بدولت غیر معمولی قوت۔ وسعت اور بلندی پیدا ہو گئی۔ آپ کی نظر زندگی کے متعلق بہت وسیع ہے۔ اس لئے لازمی طور پر آپ کے رمز و کنایہ میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے۔

"زندگی تغیر و تبدیلی کا نام ہے"۔ مگر جناب فراق کی علوئے تخیل اور آپ کے مذاقِ زندگی کی بلندی اِس مضمون کو یوں کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ:

تجھے دُنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے لے کاش　　تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

آپ کے جذبات کی شدت آپ پر غالب نہیں آتی بلکہ آپ کی شاعری آپ کے اپنے وقوفِ جذبات کا پتہ دیتی ہے اور آپ کے اشعار نفسیاتی کیفیات کی تحلیل ہیں۔ مثلاً:

دل میں کچھ غم بھی ہے سرور بھی ہے　　کوئی نزدیک بھی ہے دور بھی ہے
آخر تپاکِ عشق کی کچھ انتہا بھی ہے　　تجھ سے وہ اے فراق بہت دور ہو گئے

الغرض آپ کی شاعری بہت بلند۔ پرکیف اور پر اثر ہے اور ایک نہایت شاندار مستقبل رکھتی ہے۔ آپ کی شاعری میں خامیاں بھی ہیں مگر اتنی کم کہ خوبیوں کے مقابلہ میں وہ قابلِ توجہ نہیں ہیں اور نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں۔

۲۲۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی جناب کیفی صاحب پُرانے غزلگو شاعر ہیں اور اُس دورِ شاعری کی یادگار جو اب ہندوستان میں قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ آپ کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی اور ابھی یہ رنگ پختہ نہیں ہونے پایا تھا کہ آزاد و حالی کی صحبتوں کے اثر سے نیچرل شاعری شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ زیرِ نظر انتخاب میں ہمیں تغزل کے عمدہ نمونے نظر نہیں آتے۔ بلکہ وہی تقلید و فرسودگی مضامین کا رنگ غالب ہے اس میں شک نہیں کہ اُردو ادب میں جناب کیفی کی ہستی ایک قابلِ قدر ہستی ہے اور ترقی اُردو میں آپ کی مساعی یقیناً قابلِ اعتراف و ستایش ہیں۔ مگر آپ کی غزل گوئی اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتی۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:

عمل و عزم ہیں محرومِ جسارت ورنہ　　غیر ممکن کا محل عالمِ امکاں میں نہیں
پیکرِ خاک ہے تو چرخ پہ چھا مثلِ غبار　　تجھ کو مٹی میں ملایا ہے جبیں سائی نے

ان دونوں اشعار میں انسان کو عمل کا درس دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس 'خودی' کی تعلیم دی ہے جو اقبال کے پیغامِ شاعری کا جزوِ خاص تھی۔ اشعار کی بندش اور مضمون آفرینی آپ کی مشاقی کا ثبوت ہیں۔ مگر آپ کے اشعار میں جذبات کا فقدان اور تخیل کی فراوانی ہے۔ اشعار میں تصوفانہ جھلک بھی موجود ہے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ عشقِ مجازی کی کیفیتیں بھی نظر آتی ہیں لیکن اِن میں کوئی جوش و خروش اور اثر آفرینی نہیں ہے۔ آپ نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں فارسی تراکیب سے بھی کام لیا ہے۔ جیسے:

وسعت آرائی دلتنگیٔ حسرت۔ عشقِ محشر آرا۔ فرطِ سوزِ اُلفت۔ سمندِ شوق۔ وارفتۂ ہوائے طرب۔ برہم زنِ حجابِ خود رفتگیٔ حسن۔ ارتقائے وحشت۔ درگہِ توحیدآب وغیرہ وغیرہ۔ جس کی وجہ سے آپ کے کلام میں کہیں کہیں ثقل پیدا ہو گیا ہے اور شگفتگی کا عنصر کم۔

آپ کا کلام خامیوں سے یکسر پاک و صاف نہیں ہے اور کہیں کہیں آپ نے متروکات کو ابتک اپنے یہاں جائز رکھا ہے

جیسے: سکھلانا۔ بتلانا وغیرہ۔

جلوے سکھلاتے ہیں نظارے کا انداز مجھے
پردے آتے ہیں نظر سب نظر انداز سے مجھے
توہی بتلادے مجھے یارب کہاں سجدہ کروں
ذرے ذرے کو تو جلوے طور ساماں کرچکے

یا جیسے اس شعر میں :-

راز اُن کے کھلے جاتے ہیں ایک ایک سبھوں پر
اور اس پہ تماشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

بجائے "سب" کے لفظ "سبھوں" استعمال کیا ہے جو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔

ہو وہ رند یا صوفی مست اُس کی دھن میں ہے
جانے کتنے میخانے بھر دیئے ہیں کوثر میں

اس شعر کے پہلے مصرع میں "کی" حشو ہے ۔" رند و صوفی اس دُھن میں مست ہیں" صحیح بھی ہے اور فصیح بھی۔

صحبتیں اگلی جو یاد آتی ہیں جی کٹتا ہے
کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیتے ہیں ہم یاد نہیں

اس شعر کے مصرع اولےٰ میں "جی کٹتا ہے" کے بجائے اگر "جی کڑھتا ہے" کہتے تو زیادہ فصیح تھا۔ اور اسکے علاوہ مصرع ثانی میں لفظ "ہم" "یاد نہیں" سے اس قدر متصل ہے کہ "ہم یاد نہیں" پڑھا جاتا ہے جو بہت ہی بُرا معلوم ہوتا ہے اور جب تک لفظ "ہم" "یاد نہیں" سے الگ کرکے نہ پڑھا یا جائے تو مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ اس خامی کو یوں دور کیا جاسکتا تھا کہ مصرع ثانی یوں نظم کرتے کہ :

"کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیتے ہیں کچھ یاد نہیں"

انقلاب آنے کو ایسا ہے نہ آیا ہو کبھی
در و دیوار سے آتی ہے یہ آواز مجھے

اس شعر کے پہلے مصرع میں لفظ "ایسا" کہنے کے بعد لفظ "جو" کی تشنگی محسوس ہوتی ہے اور یہ انداز بیان کی ایک خامی ہے اس لئے اگر پہلا مصرع یوں کہتے تو درست ہوتا کہ :

"انقلاب آنے کو ایسا ہے نہ آیا جو کبھی
در و دیوار سے آتی ہے یہ آواز مجھے

جناب کیفی کے کلام میں اس قسم کی اور خامیاں پائی جاتی ہیں ۔ آپ کے کلام میں تغزل کی حقیقی چاشنی اور حلاوت نہیں ہے بلکہ تقلیدی شاعری کی مثالیں آپ کے کلام میں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہیں۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے آپکے اشعار سے آپ کی مشاقی اور شاعرانہ اہلیت کا ثبوت ملتا ہے۔

۲۳۔ تلوک چند محروم

جناب تلوک چند محروم، ایک پُرانے نظم گو شاعر ہیں۔ آپ نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ ہر چند کہ غزل آپ کا موضوع نہیں ہے۔ آپ کی غزلوں میں کہیں کہیں نظموں کا انداز پایا جاتا ہے اور اُسی کے لحاظ سے جدت مضامین اور جدت بیان بھی ہے ۔ مگر ساتھ ہی ساتھ پرانا رنگ شاعری بھی شامل ہے۔ رعایتِ لفظی کی مثالیں بکثرت آپ کے کلام میں پائی جاتی ہیں ۔ آپ کے کلام میں زبان کے لحاظ سے خامیاں موجود ہیں۔ جیسے

پہلو میں دل ہے۔ درد کی دنیا کہیں جسے
پر اس قدر اُجاڑ کہ صحرا کہیں جسے

یہ لفظ "اُجاڑ" غزل کے لئے نہایت ثقیل ہے اور مذاقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔

مگر آپ کے زیر نظر انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا جذبۂ شاعری یقیناً فطری ہے اور زبان کی خامیاں ماحول کا

نتیجہ ہیں۔ آپ کی غزلوں میں صداقت معنوی اور جذبات کی بلندی پائی جاتی ہے۔ بعض بعض اشعار اپنی سادگی وطرفگیِ ادا کے لحاظ سے نہایت پُرکیف اور پُراثر ہیں۔ جیسے:

شبِ فرقت کی داستاں ہے طویل نیند المختصر نہیں آتی

شعر کے مصرعۂ ثانی میں " المختصر " کہکر شبِ فراق کی پوری داستان کی تصویر کھینچ کر رکھدی ہے اور بیان کی سادگی بھی شعر میں ایک کیفیت پیدا کررہی ہے۔ آپ کا ایک اور شعر ہے،

تمھارے آستاں پہ خاک میری زمیں ٹکرا رہی ہے آسماں سے

ایک عام اور معمولی سی بات ہے مگر اندازِ بیان نے شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے۔ آپ کے اشعار میں تغزل کا صحیح رنگ اور شوخی بھی پائی جاتی ہے ۔ ملاحظہ ہو:

تمھیں سے لی ہے صبا نے بھی شوخیٔ رفتار چراغِ گورِ غریباں نہ کیوں بجھا کے چلے
رہے گی حاجت شرحِ جفا نہ محشر میں اسی ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے
وہ رعبِ حسن تھا کہ بن آئی نہ ہم سے بات یوں حالِ دل کہا کہ نہ کہنا کہیں جسے
ہے یہ دُنیا ایک ہی افسانۂ ناکام شوق جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا
جو تو غمخوار ہو جائے تو غم کیا زمانہ کیا۔ زمانے کے ستم کیا

کہیں کہیں آپ نے اپنے اشعار میں اپنے مشاہدۂ کائنات اور تجربات کو بھی سمویا ہے اور کوشش کی ہے کہ تغزل کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے ۔ جیسے:

ہر دورِ غم کہ عہدِ خوشی۔ دونوں ایک ہیں دونوں گزشتنی ہیں خزاں کیا بہار کیا
عقل کو کیوں بتایئے عشق کا راز غیر کو رازداں نہیں کرتے
اب جہاں میں اُن کی قبروں کے نشاں ملتے نہیں عمر بھر جو فکرِ تسخیرِ جہاں کرتے رہے
سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم مجھے یہ ساری دنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

مگر پھر بھی یہ کہنا پڑے گا کہ آپ کا رجحانِ طبع نظم کی طرف ہے اور اُن کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں ان کی نظموں کا رنگ جھلکتا ہے۔ مثلاً:

شبستانِ فلک میں محوِ خوابِ ناز ہے کوئی کہ ایمائے خموشی ہو کواکب کے اشاروں میں
نسیم صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا رہے گی سوختہ حالوں کو آرزو تیری
اے جانِ بہار تیرے دم سے گلزار رہوا تمام رنگیں،
پھر جوشِ بہارِ گل ہے بلبل ہر سمت بچھے ہیں دام رنگیں

۴۴- انند نرائن ملّا

جناب انند نرائن ملّا دورِ حاضر کے ایک خوش فکر نظم گو شاعر ہیں مگر آپ غزلیں بھی کہتے ہیں۔ آپ کی شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی اور اب ہر دو اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آپ کی غزلیات میں غزل کی شیرینی اور لوچ موجود ہے۔ اور دوسرے نظم گو شعرا کی طرح آپ کی غزلوں میں

نظم کا انداز نہیں پایا جاتا بلکہ برعکس آپ کی نظموں میں بھی غزلوں کا سریلا پن موجود ہے۔ آپ کے خود نوشت سوانح حیات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قافیہ و ردیف کی پابندی کو سامنے رکھ کر فکرِ سخن نہیں کرتے۔ بلکہ دو دو چار شعر طبعزاد زمینوں میں خود نکل آتے ہیں۔ نیز آپ نے کسی اُستاد سے مشورۂ سخن نہیں کیا کہ کہیں اُس کا رنگِ شاعری آپ کے کلام پر حاوی نہ ہو جائے۔ اور اس طرح ایک حد تک اپنی انفرادیت کو قایم رکھنے کی کوشش کی ہے مگر ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اِن تمام باتوں کے جناب ملاؔ تقلید سے نہ بچ سکے۔ ملاحظہ ہو:

شیخ! میں اور ترکِ عصیاں وہ بھی جنت کے لئے — جب خطا کی تھی مرے قبضہ میں کیا جنت نہ تھی

مائل بہ ستم چرخ - زمیں بر سرِ کیں ہے — آخر مری دنیائے تمنا بھی کہیں ہے

سوکھنے پائے نہ دل میں دیکھ خوئے آرزو — سیکڑوں دریا تنک آبی سے صحرا بن گئے

مگر آپ کی شاعری کی بنیاد بھی جذبات پر ہے حالانکہ کہیں کہیں تخئیل سے بھی کام لیا گیا ہے اور اُس میں زبان کی صفائی۔ الفاظ کی بندش اور مضمون آفرینی ایک لطف پیدا کر دیتی ہیں۔ جیسے:

جفا صیاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی — قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی

یہ دل کیا ہے۔ کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا — تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی

آلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب — خزاں کے خوف سے رسوائی بہار نہ کر

دل ہے اک دولت مگر درد آشنا ہونے کے بعد — اشک موتی ہیں مگر غم کی جلا ہونے کے بعد

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت — ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

اِن سب اشعار میں زیادہ تر تخئیل سے کام لیا گیا ہے۔ خوشنا نشستِ الفاظ اور معنی آفرینی نے اشعار کو قابلِ توجہ بنا دیا ہے ورنہ اِن میں کوئی سوز و گداز۔ اثر آفرینی یا کیفیت وجدانی نہیں ہے۔ لیکن آپ کے کلام میں تغزل کے صحیح نمونے بھی ملتے ہیں۔ جو بلحاظ اپنی پاکیزگیٔ جذبات۔ جدتِ ادا۔ سادگی اور اثر کے نہایت پُرلطف اور پُرکیف ہیں۔ مثلاً:-

ہشیار حسن - حیرتِ ارمان بن چلی ہے — پہلے فقط نظر تھی اب دل کا سامنا ہے

اتنا بھی مرے عہدِ وفا پہ نہ کرو شک — ہاں! ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ ہے رسمِ جہاں اور

(اس شعر کا اندازِ بیان اور لب و لہجہ شعر میں ایک عجیب لطف پیدا کر رہا ہے ——)

ابھی سن لو تو شاید سن سکو تم دل کے نغموں کو — کہ اب اس کی صدا کچھ خود بخود کم ہوتی جاتی ہے

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ہم تمھیں بھلا سکے — کوئی کمی ہمیں میں تھی۔ یاد تمھیں نہ آسکے

قفل سا اک زباں پہ تھا۔ آنکھ میں کچھ نمی سی تھی — ہوش نہیں کہ دل کا بھید کہہ گئے یا چھپا سکے

تم نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر — دل کے آئینہ میں بال آ ہی گیا

تجھ پہ عیاں ہے رازِ دل۔ جان کے بن نہ بیخبر — معنیٔ خامشی سمجھ۔ صورتِ خامشی نہ دیکھ

پیہم رہِ طلب میں مشکل کا سامنا ہے — ہر گام پہ فریبِ منزل کا سامنا ہے

دِل بجھا ۔ شمع کائنات گئی زندگی کی اُجالی رات گئی

اِن سب اشعار میں کچھ ہو یا نہ ہو مگر ایک اثر و کیفیت ضرور پائی جاتی ہے اور یہ سب اشعار جناب ملّا کے رنگِ تغزل کے آئینہ دار ہیں ۔ مگر ہمیں جہاں اِن کے کلام میں پُر لطف اشعار ملتے ہیں وہاں اُن کے کلام میں کہیں کہیں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں ۔ جیسے :

دل کا چراغ جب تلک تجھسے جلے جلائے جا رات بھی ہے اگر تو کیا۔ رات کو دن بنائے جا

"تلک" دورِ حاضر میں متروک ہو چکا ہے اور اس کا استعمال غیر فصیح خیال کیا جاتا ہے ۔

۲۵- ناطق گلاؤٹھی

جناب ناطق پُرانے غزل گو شاعر ہیں اور آپ کو حضرت داغ سے شرفِ تلمذ حاصل ہو چکا ہے ۔ آپ کے کلام میں قدیم رنگِ سخن غالب ہے اور آپ کے اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے داغی اسکول کا تتبع کیا ہے ۔ جیسے :

نازِ اُدھر دل کو اُڑا لینے کی گھاتوں میں رہا میں اِدھر چشمِ سخن گو تری باتوں میں رہا

فراہم کر رہا ہوں اپنی بربادی کا افسانہ جو گلیاں میں نے دیکھی تھیں وہ گلیاں دیکھتا ہوں میں

کہتے ہیں جسے وحشت وہ بات کہاں صاحب کیا کہتے ہو مجنوں سے دیکھا ہوا دیوانہ

لاتا صنم کدے سے کیا تھی مجال واعظ جی ہاں! ہمیں اُٹھا تا ہم راہ میں پڑے تھے

حلال کر گئے کہکر کہ اب نہ آئیں گے وہ جاتے جاتے تڑپتے پہ ہاتھ ڈال گئے

ان اشعار میں نہ کوئی علوئے تخیل ہے نہ پاکیزگیٔ جذبات ۔ نہ جدتِ بیان ہے نہ ندرتِ ادا ۔ بلکہ چند فرسودہ اور پامال مضامین کو نظم کا جامہ پہنا دیا گیا ہے اور مندرجۂ بالا اشعار کے الفاظ " گھاتیں ۔ صاحب ۔ جی ہاں! گلیاں ۔ حلال وغیرہ وغیرہ سب اس بات کے غماز ہیں کہ جناب ناطق صاحب نے حضرت داغ کے کلام و زبان کی تقلید کی ہے جس میں اپنے جذبات و تاثرات کو کوئی دخل نہیں ۔ اس قسم کے اشعار آپ کے یہاں اور بھی ملتے ہیں ۔ کہیں کہیں رعایت لفظی کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور بعض بعض اشعار میں ہم کو ناسخ کا رنگ شاعری بھی نظر آتا ہے ۔ مثلاً :

ہم کو شیرینیٔ راحت کی تمنا یعنی کم ہے کچھ تلخیٔ ذوقِ دہن و کام ابھی

کھا رہا ہوں رنج اگلی صحبتوں کی یاد میں ہے پُرانے دوستوں میں آج مہمانی مری

ان اشعار میں الفاظ کی رعایت کی وجہ سے آورد پیدا ہو گئی ہے اور کسی قسم کی کوئی کیفیت و دلکشی نہیں ۔

آپ کے کلام میں صفائی و سادگی ضرور ہے مگر اثر آفرینی نہیں ۔ آپ کے اشعار میں سوز و گداز اور کیف و شگفتگی کی کمی ہے ۔ آپ کی اپنی کوئی آواز نہیں بلکہ تقلیدی شاعری کی آوازِ بازگشت ہے ۔ زبان کے لحاظ سے آپ کا کلام یقیناً بہت صاف ہے اور اندازِ بیان میں وہی سادگی اور لہجہ میں وہی دھیما پن اور لوچ موجود ہے جو ادائے تغزل کے لئے مخصوص ہے ۔ آپ کے یہاں بیجا شکوہ الفاظ اور غیر مانوس تراکیبِ فارسی نظر نہیں آتیں ۔ یہی سبب ہے کہ جب آپ کبھی تقلید سے ہٹ کر اپنے تاثرات و وجدان کو نظم کر جاتے ہیں تو وہ کچھ دیر کے لئے اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اور انکے یہی اشعار اپنے اندر ایک کیفیت رکھتے ہیں اور دلوں کو مسحور کر لیتے ہیں ۔ سادگیٔ بیان ۔ لہجہ کا انداز اور طرزِ ادا کی معصومیت

وہ بے ساختہ پن ملاحظہ ہو:

کہنے والا وہ ۔ سننے والا میں — ایک بھی آج دوسرا نہ ہوا
اب کہاں گفتگو محبت کی — ایسی باتیں ہوئے زمانہ ہوا
یاد کرنے کی تو باتیں ہیں بہت سی ناطق — پہلے وہ بھول تو جاؤں جو مجھے یاد نہیں
اے نگاہِ مست اس کا نام ہے کیفِ سرور — آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے
صیاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں — میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں
کیا کروں بیکار کوشش مسکرانے کے لئے — کس کی لے آؤں ہنسی ہونٹوں تک آنے کے لئے
گئے ہیں جب سے وہ اپنے بھی آئے غیر بھی آئے — سب آئے بھی گئے بھی گھر کی ویرانی نہیں جاتی
مرے غم کی انھیں کس نے خبر کی — گئی کیوں گھر سے باہر بات گھر کی

اِن اشعار میں صحیح رنگِ تغزل اور رنگِ تغزل کا مخصوص لب و لہجہ۔ سادگی اور روانی سب ہی کچھ پایا جاتا ہے اور اسلوبِ بیان نے اُن میں ایک تازگی اور کیف پیدا کر دیا ہے۔ ہر چند آپ کے اشعار سے شانِ مشاقی نمایاں ہے مگر پھر بھی آپ کا کلام خامیوں سے یکسر پاک نہیں۔

زبان کے لحاظ سے جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ آئے ہیں آپ کا کلام بہت صاف ہے مگر ہمیں اس مختصر سے انتخاب میں ایک جگہ زبان کی بھی خامی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ نہیں معلوم کس کس سے شناسائی ہوئی — جانتے ہیں یہ کہ پہچانا نہیں کوئی ہمیں

"کوئی ہمیں پہچانا نہیں" نہ صرف روزمرہ کے خلاف بلکہ نہایت غیر فصیح ہے اور ہم عام بول چال میں کبھی ایسے نہیں بولتے کہ "ہمیں کوئی نہیں پہچانا"۔ بلکہ "ہمیں کسی نے نہیں پہچانا" بولتے ہیں۔

بہر حال جناب ناطق کے کلام میں جدت شگفتگی اور سوز و اثر کم اور مشاقی زیادہ نمایاں ہے۔ آپ کے کلام میں جوش و ولولہ کا بھی فقدان ہے۔ نیز آپ کے بہت کم اشعار ایسے ہیں جو دل پر کوئی نقش چھوڑ جائیں۔

۲۶- ناطق لکھنوی

جناب ناطق لکھنوی بہت پرانے کہنے والے ہیں مگر آپ کے کلام میں صحیح تغزل کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ بعض اشعار تو آپ نے اپنے انتخاب میں ایسے دئے ہیں جو کسی طرح بھی تغزل کی حدود میں نہیں آتے۔ جیسے:

ہر ذرہ کائنات ہے اک کائنات کا — موصوف کل صفات ہے ہر جز صفات کا
نار کو نور کر دیا سرورِ کائنات نے — وہ جو لگی تھی طور پہ آکے بجھی حجاز میں
بزرگانِ سلف جب تک رہے رونق رہی ناطق — جب آخر ہوگئی محفل تو ہم پہونچے ہیں محفل میں
اک سنہری سطر تھی جس کی شعاعِ برقِ طور — آج وہ خط صاحبِ معراج کے نام آگیا
مزاج دانوں میں روح القدس بھی ہیں ہم بھی — یہ دیکھنا ہے کہ کون انتخاب ہوتا ہے

یہ اشعار جو کچھ بھی ہوں مگر غزل کے شعر نہیں معلوم ہوتے۔

جناب ناطق لکھنوی دیرینہ رنگِ شاعری کے مقلد ہیں۔ آپ کے یہاں تصوف و فلسفہ بھی ہے اور عشق مجازی بھی آپ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ الفاظ کی تکرار کو بہت پسند فرماتے ہیں اور اس طرح ایک ہی لفظ کو ایک ہی شعر میں دو تین بار استعمال کرکے زورِ بیان پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً:

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے ‏ میں سراپا دل ہوں۔ دل میرا پا درد ہے
روح کا عقدہ اُلجھ کر عقدۂ مشکل بنا ‏ پھر وہ عقدہ پیکرِ انسانیت میں دل بنا
عشق کی خاطر سے انساں عشق کے قابل بنا ‏ درد پہلے بن چکا تھا۔ بعد اُس کے دل بنا
سو تیر زمانے کے۔ اک تیر نظر تیرا ‏ اب کیا کوئی سمجھے گا دل کس کا نشانہ ہے
یہ دل نہیں۔ نور کا ہے شعلہ کسی سے اسکو مفر نہیں ہے ‏ مثالِ برق و شرر ہے۔ لیکن مزاج برق و شرر نہیں ہے

ہمیں اس قسم کی مثالیں جناب ناطق کے دیوان کا تو کیا ذکر۔ اس مختصر سے انتخاب ہی میں بہت ملتی ہیں۔

آپ کا کلام زیادہ تر تقلیدی شاعری کا نمونہ ہے اور آپ کے اشعار میں کم و بیش تصوف کی جھلک پائی جاتی ہو مگر جہاں آپ نے اس رنگ سے ہٹ کر اپنے جذبات کو نظم کیا ہے، وہ پُراثر بھی ہے اور پُرکیف بھی۔ جیسے:

دوبارہ دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا ‏ تمھاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا
گزاری دیکھنے میں اُس کے ساری زندگی میں نے ‏ مگر یہ شوق ہے دیکھا نہیں گویا کبھی میں نے
محبت ایک مدت سے ہے یہ معلوم ہوتا ہے ‏ تمھیں ہر چند پہلی بار دیکھا ہے ابھی میں نے
محبت انسان کی ہے فطرت۔ کہاں ہوا امکانِ ترکِ اُلفت ‏ وہ اور بھی یاد آرہا ہے میں اُس کو جتنا بھُلا رہا ہوں
ڈوبتا ہوں میں مدد میری کرے جو کوئی ہو ‏ مجھ کو احساسِ خدا و ناخدا باقی نہیں
آنکھوں کو بچائے تھے ہم اشک شکایت سے ‏ ساقی کے تبسم نے چھلکا دیا پیمانہ

مگر اس رنگ کے اشعار آپ کے یہاں کم نظر آتے ہیں۔ بعض بعض جگہ آپ کے یہاں سوز و گداز کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور کہیں کہیں آپ کے اشعار میں سادگیِ بیان اور طرزِ ادا شعر کو نہایت پُراثر بنا دیتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

سر آنکھوں پر غمِ دنیا و عقبیٰ ‏ مگر اب دل میں گنجایش کہاں ہے

(دوسرے مصرع کی بیساختگی اور ادائے بیان نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے)

صیاد سے بھی اُنس۔ رہائی کا شوق بھی ‏ اک دل مرا قفس میں ہے اک آشیانے میں

احساسات کے امتزاج کی کس قدر عمدہ مصوری کی ہے کہ سامع دوسروں کے صحیح جذبات و تاثرات سے وقوف حاصل کر لیتا ہے اور پھر پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے ــ جناب ناطق ایک مشاق سخن گو ہیں اور ہر چند کہ آپ کا کلام پختگی کی حد تک پہونچ چکا ہے مگر پھر بھی ہمیں آپ کے یہاں زبان و بیان کی خامیاں نظر آتی ہیں ــ مثلاً:

خیالِ دوستی میں محو تھا۔ مجھ کو معافی دے ‏ نہ پہچانا جو تجھ کو اے نگاہِ دشمنی میں نے

"معافی دے" کا ٹکڑا نہ فصیح ہے اور نہ اہلِ علم کی بول چال میں مستعمل۔ علاوہ بریں اِس فقرہ میں جو لہجہ پوشیدہ ہے وہ بھی مذاقِ سلیم پر ناگوار گزرتا ہے۔

وقتِ بے ہوشی جب آجائے جبھی آلام ہے، دل مسافر کا جہاں ڈوبے وہیں پر شام ہے

اس شعر کے مصرعۂ اولے میں "آلام" کے صرف کی کوئی وجہ ہی نظر نہیں آتی۔ بے ہوشی میں انسان کی غم دُنیا سے بے خبری وجہ سکون ہے نہ کہ وجہ الم۔ اگر آلام[1] کی جگہ "آرام" نظم کرتے تو صحیح ہوتا۔

دیکھ کر اُن کو نظر میں یہ اثر ہوتا ہے جس طرف دیکھئے اِک حُسن نظر آتا ہے

"ہوتا" اور "آتا" قوافی نہیں ہیں اور اس صورت میں جبکہ یہ مطلع نہیں ہو سکتا تو دونوں مصرعوں میں ردیف "ہے" کا استعمال غلط ہے۔ اس طرح اس شعر میں "تقابلِ ردیفین کا ایک بہت بڑا عیب موجود ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے مصرعہ میں "ہوتا ہے" غلط شایع ہوگیا ہے (حالانکہ اس کے شایع ہونے کے بعد مارچ، اپریل یا مئی کے نگار میں اس کی کوئی تصحیح نہیں کی گئی جس طرح جناب سیماب اکبرآبادی کے بعض اشعار کی جو غلط شایع ہوگئے تھے، تصحیح کی گئی تھی۔) اور اُس کے بجائے "آتا ہے" نظم کیا گیا ہے اور "اثر"، "نظر"، قوافی ہیں تو پھر یہ "اثر آتا ہے" کا ٹکڑا نہایت غیر فصیح ہے۔ "اثر پیدا ہونا" یا "اثر ہونا" تو مستعمل ہے مگر "اثر آنا" نہیں ہو سکتے اور اس کا صرف روزمرہ اور محاورے کے خلاف ہے۔

کہیں کہیں آپ کے یہاں مخصوص پُرانا لکھنوی رنگ اور بعض جگہ رعایتِ لفظی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے:

جوشِ گریہ اور اندھیری رات ہے کیا گھٹا ہے۔ کیا بھری برسات ہے

نگاہِ سوزِ محبت میں اب گناہ کہاں نکل رہا ہے یہ آنکھوں سے شعلۂ بے دود

جناب ناطق لکھنوی کہنہ مشق شاعر ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے اپنی کہنہ مشقی کی بدولت کچھ اچھے شعر ضرور نکال لئے ہیں مگر ایک شخص اُن کا کل انتخاب کلام دیکھنے کے بعد اُن کی شاعری سے متاثر نہیں ہو سکتا اور ان کے اچھے اشعار بھی دل پر کوئی دیرپا اثر چھوڑ جانے والے نہیں ہیں۔

(باقی) سید علی سجاد قہر اکبرآبادی۔ بی۔ اے

[1] آلام غلط چھپا ہے۔ آرام ہونا چاہئے۔

چینی باپ کے باغی بیٹے

ہم لوگ پُرانے طرز کے ایک ہوٹل "شان ٹنگ" میں، دستور کے مطابق باورچی خانے سے ہوتے ہوئے داخل ہوئے وہاں باورچی خانے ہمیشہ سامنے کی طرف ہوتے ہیں، اس لئے مہمان گزرتے وقت کھانوں کو مٹی کے چولھوں پر پکتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ یہ رسم اس وجہ سے ہے کہ وہاں پکانا ایک مستقل فن ہے۔ ہم سب ایک بڑے کھانے کے کمرے سے گزر ہی رہے تھے کہ ایک کرخت آواز نے ہمارا استقبال کیا۔ اس آواز کو ہم چیخ، پکار یا شور کا نام نہیں دے سکتے۔ یہ ایک بھاری آواز والے خادم کے کھلے ہوئے حلق سے نکلا ہوا استقبالیہ نعرہ تھا ——— "تین مہمان تشریف لائے ہیں"۔ منچوریا کے ہوٹلوں کا جہاں بکثرت لوگ آیا کرتے ہیں، یہ بھی ایک دستور ہے۔

جوں ہی ہم سب اوپر پہونچے ایک دوسرے خادم نے بھی اُسی استقبالیہ نعرے کا اعادہ کیا۔ اب ہم کھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوئے، یہاں کھانے کے کمرے لکڑی کے تختوں کو کھڑا کرکے بناتے ہیں۔ یہ تختے زیادہ بلند نہ تھے بلکہ فرش اور چھت کے درمیانی حصہ تک آکر ختم ہو جاتے تھے۔ ابھی خادم نے ہاتھ پوچھنے کے لئے ہم لوگوں کو نرم تولئے دیئے ہی تھے کہ استقبالیہ نعروں نے کچھ اور مہمانوں کی آمد کا اعلان کیا، ان مہمانوں نے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے سارے ہوٹل کو سر پر اُٹھا لیا۔ منچوریا کے کسان جب ایک دوسرے کا استقبال کرتے ہیں تو اپنے خیال میں یگانگت کی کوئی رسم اُٹھا نہیں رکھتے 'مہذب' چینیوں کی طرح وہ صرف مصافحہ کرنے یا سر خم کر دینے پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ چونکہ فطرتاً خاموش نہیں ہوتے ہیں اسلئے صرف شانوں کو جنبش دے لینا اُن کے خیال میں کافی نہیں ہوتا۔ وہ چلاتے ہیں اور اتنا چلاتے ہیں کہ کم سننے والوں کے بھی کان کے پردے ہل جائیں۔ وہ چلا کر کہیں گے۔

"اُوہو! شن یوئینگ ہیں" یا

"اہاہا! شن یوئینگ، تم پھر اپنی جیب بھر کر شہر آگئے"

وہ آپس میں باتیں کرتے وقت لفظ "چنگ" (مہربانی) کا استعمال قطعاً غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سیدھی سادھی دو ٹوک باتیں کرتے ہیں اور گیہوں وغیرہ کے بورے فروخت کر چکنے کے بعد تو وہ اور زیادہ صاف دل اور صاف گو ہو جاتے ہیں اور اسوقت وہ ہوٹلوں میں جاکر کھانے، شراب اور چا، وغیرہ پر بڑی بڑی رقمیں صرف کر دیتے ہیں یہیں بیٹھ کر وہ ایک دوسرے کا درد دکھ سنتے ہیں اور یہیں وہ اپنی کمائی پر فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

استقبالیہ نعرے کے ساتھ مہمانوں کی ایک نئی جماعت داخل ہوئی۔ جس وقت وہ گزر رہے تھے، ہم نے اپنے کمرے کے نیم وا پردوں سے دیکھا کہ وہ خلٹ کے جوتے، چست پائجامے اور روئی کے کوٹ پہنے تھے۔ وہ گنتی میں چھ تھے۔

ہمارے بغل والے کمرے میں داخل ہوئے اور بیٹھتے ہی بلند آواز سے باتیں شروع کر دیں ۔ پہلے فصلوں کے متعلق تبادلہ خیال ہوتا رہا، پھر سڑکوں کی خرابی اور بیل گاڑی سے سامان لے جانے کی دشواریوں کا ذکر کیا گیا اور آخر میں بازار کے بھاؤ پر بحث ہوتی رہی۔

"بھائی تکلف نہ کرنا" ایک کرخت آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہم سمجھ گئے کہ کھانوں سے لبریز پیتل کا بڑا ظرف میز پر رکھا جا رہا ہے اور وہ لوگ اپنی تیلیاں سنبھالنے ہی والے ہیں ۔ "کھانا اچھا ہے" ایک آواز نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا :۔

"اگر ہم سو برس بھی زندہ رہیں تو ایسا کھانا ہمیں گاؤں میں نصیب نہیں ہو سکتا"۔ "ہم دیہاتیوں کو شہر میں بہت ہوشیاری کے ساتھ رہنا چاہئے" ایک نے کہا "شہر کے لوگ بڑے دھوکہ باز اور فریبی ہوتے ہیں"۔ "ایسے موقعہ پر تو پولیس سے مدد لینا چاہئے"

"نہیں ۔۔ پولیس والے تو اور بھی فریبی و دغاباز ہوتے ہیں" کسی نے جواب دیا۔

اب ایک کسان نے اپنا نجی معاملہ شروع کیا :۔ "میرا لڑکا اکیس برس کا ہو گیا ہے۔ میں اُسکی شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ اس کے لئے طیار نہیں ہوتا۔ ذرا دیکھو تو۔ تین برس ہوئے میں نے اُس کو ایک اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ اب اسکے خیالات بدل گئے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں وہ اور پڑھنا چاہتا ہے ۔ میں نے اُس سے صاف صاف کہدیا اور تم سے بھی کہتا ہوں کہ شہروں کے طرحدار اسکولوں میں کھیل کود، ناچ رنگ اور تصویریں بنانا سکھلایا جاتا ہے یا پھر اُچک پھاند بتلاتے ہیں، جسکو وہ ورزش کہتے ہیں۔ میں نے تو صاف صاف کہدیا کہ کسان کو نہ تو تصویریں بنانے کی ضرورت ہے اور نہ ناچ گانے کی۔ اُسنے مجھ کو جواب دیا کہ :۔ "تندرست جسم کے اندر حسین روح کی ضرورت ہے"۔ آپ نے دیکھا، اسکول میں اسی قسم کی باتیں سکھلائی جاتی ہیں!"۔ اس پر سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔

"میں نے اُس سے بھی کہدیا اور تم سے بھی کہتا ہوں کہ میں نے کافی دولت پیدا کی ہے جو میری زندگی کے لئے بہت ہے جب میرے پاس یہ سب موجود ہے تو اس کو کتابیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن وہ تو کہتا ہے کہ شادی کرنے سے مر جانا بہتر ہے۔ تم بھلا اس موقعہ پر کیا کرتے ؟"۔۔ "میں ہوتا تو ایک تھپڑ رسید کرتا"۔ ایک کسان نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں نے بھی یہی کیا"، باپ نے فخر کے انداز میں جواب دیا "اور ایک ہی نہیں بلکہ کئی تھپڑ مارے اور ایک مرتبہ تو اتنی مرمت کی کہ ایک ہفتہ تک وہ چل پھر بھی نہ سکا"

میز کے گرد بیٹھنے والوں نے پھر قہقہہ بلند کیا۔ یہ بڑے اطمینان کا قہقہہ تھا۔

"یہ تم نے بالکل ٹھیک کیا" ایک کسان نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن" باپ نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا "اس مار پیٹ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ وہ تو کہتا ہے کہ میں اُس لڑکی سے واقف ہی نہیں ہوں اور کسی ایسی لڑکی سے میں ہرگز شادی نہ کروں گا جس کی میں نے صورت بھی نہ دیکھی ہو۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس جواب پر دو چار ہاتھ رسید کرتا مگر میں نے ضبط کیا۔ اُس کو سمجھانے کے لئے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بلایا۔ اُن سب نے سمجھایا کہ شادی کر لو۔ باپ کے حکم سے سرتابی کرنا بُرا ہوتا ہے۔ لڑکی کے گھر والے ناراض ہیں کیونکہ اس میں لڑکی کی بڑی رسوائی ہے اور تمھاری اس حرکت سے تمھارے باپ کے نام کو بھی بٹہ لگے گا، لیکن سب بے سود اُس پر کسی بات کا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ اُلٹا کہنے لگا "اور میرا کیا حشر ہوگا۔ میرا باپ میری زندگی برباد کرنے پر کیوں تلا ہوا ہے"۔ ایسا سپوت ہے میرا بیٹا وہ اپنے سے تگنی عمر والوں کی صلاح کا بھی احترام نہیں کرتا۔

"میں نے صاف صاف کہدیا ہے کہ اگر اُس نے شادی نہ کی تو میرے ہاتھوں اُسکو دانہ پانی نصیب نہ ہوگا۔ اس کا اُسنے جواب دیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ فاقے کرکے مرجائے گا اور میں بے اولاد ہو جاؤں گا۔ میں اب محسوس کرتا ہوں کہ کھانے کا ذکر کرکے میں نے غلطی کی۔ مجھ کو اس کا ذکر کرنا نہ چاہئے تھا۔ اب اُس کو ایک نئی چال ہاتھ آگئی ہے۔ ایک ہفتہ تک تو وہ آوارہ گردی کرتا رہا پھر ایک دن آکر کہنے لگا کہ مجھ کو پڑھنے کے لئے روپیہ دو ورنہ میں فاقے کرکے جان دیدوں گا۔ اور یہ فاقے سال کے نئے دن سے شروع کروں گا۔ سال کا نیا دن جلد ہی آنے والا ہے۔ اُس دن ہم لوگ دعوتیں کرتے ہیں اور میرا لڑکا اُسی دن سے فاقے شروع کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ تم اس جگہ پر کیا کرتے ؟"

کچھ دیر سناٹا رہا گویا وہ سب لڑکے کے فیصلہ پر سنجیدگی سے غور کررہے تھے۔ جہاں تک مسئلہ کی نوعیت کا تعلق تھا، اب اس نوع کے مسائل اُن کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھے لیکن یہ چال انوکھی ضرور تھی۔ اُن کے گرد و پیش جتنے لڑکے تھے وہ سب یا تو بغاوت کررہے تھے یا بغاوت کرنے کی طیاری میں مشغول تھے۔ اور وہ اپنی مقصد براری کے لئے تمام ناجائز ترکیبوں کا استعمال جائز سمجھتے تھے

بالآخر ایک کسان کی کرخت آواز نے سکوت توڑا۔ "میرے پڑوسی کے بھی ایک ایسا ہی لڑکا ہے مگر اُس نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ اگر لڑکے نے شادی نہ کی تو یا تو وہ اپنی جان دیدے گا یا لڑکے کو مار ڈالے گا۔ لیکن اس جواب کو سُنکر لڑکا گھر سے بھاگ گیا اور اب اس کا خط آیا ہے کہ وہ کبھی گھر واپس نہ آئے گا۔"

"میرے پڑوسی نے" اب ایک دوسرے کسان نے شروع کیا "اپنے لڑکے کو اس قدر مارا کہ وہ شادی کے لئے طیار ہوگیا (ایک کسان چونکتا ہوا کہ کہیں 'پڑوسی' کا اشارہ اس کی طرف تو نہیں ہے)۔ لیکن شادی کے لئے جب سب لوگ جمع ہوئے اور شادی کے تحائف لڑکے کے والدین کو پیش کئے جاچکے تو لڑکا یکایک مجمع کے اندر غائب ہوگیا۔ اس واقعہ کو کئی ہفتے گزر چکے ہیں مگر اب تک اُس کا کوئی پتہ نہیں۔"

"ذلتیں دنیا میں کئی طرح کی ہوتی ہیں" ایک دوسرے کسان نے اب اپنا دکھڑا شروع کیا "میرے لڑکے نے ہمیشہ بے چون وچرا میرے حکم کی تعمیل کی، چنانچہ وہ شادی کے لئے بھی میرے حکم سے طیار ہوگیا۔ لیکن جب اُس نے اپنی بیوی کی شکل پہلی بار دیکھی تو اُس نے تمام اعزہ اور مہمانوں کی موجودگی میں رونا دھونا شروع کیا کہ اُس کی بیوی بدصورت ہے۔ وہ تو بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اُس کو خاموش کیا گیا۔ اگر یہ اُس کی شادی کا دن نہ ہوتا تو شاید میں اس حرکت پر اُس کی پڑی پسلی توڑکر رکھ دیتا۔"

یہاں پر دو کسانوں نے اس انداز سے حلق صاف کیا، گویا وہ مصیبت زدہ باپ کی موجودگی میں ہنسنا مناسب نہیں سمجھتے لیکن وہ کسان جو اپنے لڑکے کی بھوک ہڑتال کے نتائج پر سنجیدگی کے ساتھ غور کررہا تھا اُسنے یہ محسوس نہیں کیا۔ اُس نے پھر شروع کیا۔

"میں نے ہمیشہ دیوتاؤں کی عزت کی ہے اور یہی دعا مانگی ہے کہ وہ مجھکو اولاد صالح عطا کریں لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ مجھے ایسا لڑکا ملا۔ شاید میں نے پچھلی زندگی میں کوئی سخت گناہ کیا تھا اور آنے والی زندگی میں شاید میں کتے یا بکری کی شکل میں جنم لونگا۔ کاش میں اپنے لڑکے کی شادی اور پھر اسکی اولاد کو اپنے پیروں کے پاس کھیلتا ہوا دیکھتا۔ مگر میرا لڑکا تو خچر کی طرح ضدی ہے۔ اگر ماروں تو وہ بھاگ جائے گا، نہ ماروں تو شادی کے لئے طیار نہ ہوگا، پڑھنے کے لئے روپیہ نہ دوں تو وہ فاقے کرکے جان دیدے گا اور اگر روپیہ دیدوں تو شادی نہ کرے گا۔ میری جان شکنجہ میں ہے۔"

"آجکل سب لڑکے ایسے ہی نافرمان ہوتے ہیں" ایک بھدی آواز نے اُس کو تسلی دینے کی کوشش کی "ہمارے زمانے سے یہ زمانہ بالکل مختلف ہے۔ ہم اپنے والدین کی اطاعت فرمانبردار اولاد کی طرح کیا کرتے تھے مگر آج ہماری اولاد اپنے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اسکولوں میں جانے کے بعد اُن کے سروں میں بُرے بُرے خیالات سما جاتے ہیں۔ میرے تین لڑکوں میں سے ایک نے تو اس پر اعتراض کر ڈالا کہ میں اپنے کاشتکاروں سے آدھی پیداوار کیوں لے لیتا ہوں۔ میرے تین اسامی ہیں اور تینوں اُتنا ہی لگان ادا کرتے ہیں جتنا اُن کو دینا چاہئے، لیکن میرا لڑکا جو خود اس آمدنی میں حصہ دار ہے کہتا ہے کہ ہم دوسروں سے زیادہ زمین اپنے پاس کیوں رکھیں اور کاشتکاروں سے آدھی پیداوار کیوں وصول کریں۔ وہ تو کہتا ہے کہ ہم غریبوں کا لہو تک چوس لیتے ہیں اور اس کے لئے اس نے ایک لفظ Exploitation، (غضب ؟) ایجاد کیا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ تمھارے منہ سے تو ابھی دودھ کی بو آرہی ہے اور چلے ہو باپ سے زبان لڑانے۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ یہ جھوٹی باتیں تم نے کہاں سیکھی ہیں اور یہ نیا لفظ کیا ہے جو تم ہر وقت اڑایا کرتے ہو۔ ہم اس سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ دوسرے دونوں بھائی بھی آگئے اور بہانے سے اُسے الگ بُلا لے گئے۔ ایک گھنٹہ بعد میں نے دیکھا کہ تینوں بدمعاش ایک کونے میں چھپے کچھ مشورے کر رہے ہیں اور اُن کے ساتھ میرے ایک پڑوسی کا لڑکا اور میرے دو کاشتکار بھی ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی اُن لوگوں نے اپنی باتیں ختم کردیں۔ لیکن ایک لڑکے نے مجھ کو دھوکا دینے کے لئے فوراً ایک فقرہ گڑھ لیا کہ ہم لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایک بیگھ زمین میں کتنا اناج پیدا ہو سکتا ہے، گویا میں بالکل اُلّو کا پٹھا ہوں اور کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ میں نے بھی جواب دیا کہ" اگر میرے ناخلف لڑکوں کے ہاتھ میں انتظام ہو تو ایک دانہ بھی نہ پیدا ہو"

"ہاں یہ بہت بُرا ہے" ایک اور کسان نے شروع کیا "تم نے سُنا کہ ہوٹسولنگ کے لڑکے کا کیا حشر ہوا ؟ اُن لوگوں نے اُس کا تو سر ہی اُڑا دیا اور کہدیا کہ وہ کمیونسٹ تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ کمیونسٹ نہیں تھا بلکہ وہ ایک ناچنے والی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا اور اُس کو لے بھاگنا چاہتا تھا اور اُسی لڑکی پر پولیس کے افسر اعلیٰ کا لڑکا بھی لٹو تھا وہ لڑکی کو نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ وہ سولہ برس کی ہے اور "ہو" کے لڑکے کی بیوی بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اسی بات پر دونوں میں بہت لڑائی ہوئی۔ "ہو" کا لڑکا اُس کو اپنی بیوی بنانے کی ٹھان چکا تھا یعنی ابھی اُس نے کچھ کیا بھی نہ تھا کہ پولیس نے اُس کو کمیونسٹ کہکر گرفتار کرلیا اور سڑک پر پھانسی دیدی......"

"ہاں، یہ سچ ہے مگر میں نے سُنا ہے کہ وہ واقعی کمیونسٹ بھی تھا"، ایک نے کہا

"اور تھا بھی تو کیا ہوا ؟" ایک نے سوال کیا "یہ ایسی بری چیز ہے کہ اس کے لئے کسی کی جان لے لی جائے ؟"

"خدا مجھ کو محفوظ رکھے"، اُس کسان نے گھبرا کر کہا جس نے اپنے تین لڑکوں کا قصہ بیان کیا تھا "کہیں وہ میرا ہی......" اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"میں نے سُنا ہے کہ لڑکیاں بھی......" ایک دوسرے شخص نے کہا۔

اُس کی آواز میں بھی ارتعاش تھا، جیسے وہ کسی مخدوش زمین پر چل رہا ہو۔ ہوٹل کی نیچے کی منزل سے نئے مہمانوں کی آمد کا شور بلند ہوا اور اس استقبالیہ شور میں ہال کے کمرے کے مہمانوں کی آواز دب گئی۔

(ماخوذ) ع ۔ ح

غالب کی ایک رُباعی

آزاد مرحوم نے اپنے مضمون "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" میں کیا خوب فرمایا ہے:

"غالب اگرچہ پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ ہو گئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔"

کیا یہ فقرے نہایت بچے تلے اور غالب کی شاعری کے آئینہ دار نہیں؟ اگر اس شاعر اعظم کے ابتدائی دور پر آپ سرسری نظر ڈالیں گے تو بھی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنی شاعری کا نقارہ بجا کر نہ صرف سادہ مضامین میں عجیب و غریب گونج پیدا کر دی بلکہ انھوں نے جب ناصر علی اور مرزا بیدل کے نامانوس اور اجنبی نقوش کو ریختہ کے نرم و نازک سانچے میں ڈھالنا چاہا تو اس "ظلم" پر لوگ چیخ اٹھے، یہاں تک کہ بعض ان کے کلام کو مہمل کہنے لگے، جسے سن کر آخر کار غالب کو اپنے استغنا کا یوں اظہار کرنا پڑا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن ـــــ جو لوگ ان کی شخصیت سے مرعوب اور ان کی علمی و فنی قابلیت کا لوہا مانے ہوئے تھے انکی زبان سے لفظ "مشکل" کے سوا اور کچھ نہ نکل سکا۔ چنانچہ مرزا غالب کی زندگی میں ایک صاحب حکیم آغا جان عیش ایک مشاعرہ میں اپنے خیالات کا اس سے زیادہ اظہار نہ کر سکے کہ:

اگر اپنا کہا تم آپ سمجھے بھی تو کیا سمجھے مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالباً انھیں چہ میگوئیوں کی طرف غالب نے اپنی اس رباعی میں اشارہ کیا ہے کہ:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

کھلم کھلا کم اور دبی زبان سے زیادہ اسی قسم کے اعتراضات غالب پر ہوئے تاہم کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان کے سامنے مقابلہ میں آتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے کلام میں بعض ایسی باتیں رہ گئیں جو کسی طرح ان کے شایان نہیں، کون شبہ کر سکتا ہے کہ غالب نہ صرف زبان بلکہ فنونِ شعری میں کامل دستگاہ رکھتے تھے لیکن کیا ان کا کلام خامیوں اور کمزوریوں سے پاک رہ سکا؟ اس کا جواب دینے سے پہلے آپ اس رُباعی کو پڑھ لیجئے کہ:

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب دم رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

اوزان رباعی پر منطبق کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مصرعۂ ثانی میں پورے ایک سبب خفیف کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی اس حالت میں اس کی تقطیع "مفعولن مستفعلن مفاعیلن فع" یا "مفعولن مفعول فاعلاتن فعلن" ہوتی ہے جو اوزان رباعی سے قطعی خارج ہے اور اس کی صحت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس مصرعہ سے ایک "رک" کم کرکے "مفعولن فاعلن مفاعیلن فع" کے مطابق کر دیا جائے۔ وہ لوگ جو مرزا غالب سے مرعوب ہو کر انھیں سہو و خیال سے پاک و مبرا خیال کرنے پر آمادہ ہیں غالب کی غلطی کو کاتب کے سر تھوپنے میں کسی طرح حق بجانب نہیں کہے جا سکتے۔ اسوقت میرے پیش نظر تقریباً تمام اہم مطبوعہ نسخوں کے علاوہ چند قلمی نسخے ایسے موجود ہیں جن کی چھان بین کرنے کے بعد یقینی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بیچارے کاتب نے نہیں بلکہ خود مرزا غالب نے دھوکا کھایا ہے۔

اسوقت غالب کے دیوان کا قدیم ترین نسخہ میرے سامنے ہے۔ اگرچہ وہ شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں سید المطابع کے چھپے ہوئے نسخہ کی قلمی نقل ہے لیکن اپنی قدامت کی وجہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نسخہ کے بعد کا وہ قلمی نسخہ ہے جو ۱۸۵۵ء میں خود مرزا غالب نے اپنی پوری نگرانی میں کتابت کرا کے نواب یوسف علی خاں بہادر مرحوم والی ریاست رام پور کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد یہی نسخہ مطبع احمدی میں ۱۲۷۸ھ مطابق سنہ ۱۸۶۱ء میں طبع ہوا جس کے خاتمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

> "دانہ کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص وداد آئین میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خانصاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ پر حرف غلط نہ رہا ہو الخ"

اخیر میں غالب کے نام کی مہر کے بعد کی عبارت سے پایا جاتا ہے کہ یہ نسخہ ۲۰ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ میں طبع ہوا جس کے اخیر میں غلط نامہ بھی شامل ہے۔ اس اہتمام کے باوجود یہ نسخہ پسندیدۂ غالب نہ بن سکا۔ اس لئے اسی سال وہ پھر مطبع نظامی کانپور میں چھاپا گیا جس کا خاتمہ اس عبارت پر ہوا کہ:

> "بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے امیدوار رحمت دغفران محمد عبد الرحمن بن حاجی محمد روشن خاں طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا اس لئے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین خانصاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کا ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخہ کے شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ مطبع کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا"

اس کے بعد سنہ ۱۸۶۳ء میں منشی شیو نرائن نے اپنے اہتمام سے مطبع مفید خلائق آگرہ میں اس کو چھاپا۔ یہ وہی منشی شیو نرائن ہیں جنکے نام مرزا غالب کے خطوط پائے جاتے ہیں۔

ان نسخوں کے علاوہ کتبخانہ ریاست رام پور میں ایک قلمی نسخہ اور بھی موجود ہے جس کا سرورق نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم والی ریاست رام پور کے قلم کی تحریر سے مزین ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ عبارت نواب مرحوم کے زمانۂ ولی عہدی کی ہے

اس لئے اس نسخہ کی کتابت کا زمانہ ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ قرار دیا جا سکتا ہے۔

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا اس لئے ماننا پڑے گا کہ یہ تمام نسخے خواہ وہ مطبوعہ ہوں یا قلمی ان کی زندگی میں طیار ہوئے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی نسخہ مرزا غالب کی نظروں سے گزرے بغیر رہ سکا ہو۔ ان کے انتقال کے بعد پہلی بار ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں منشی مہا نراین مالک اخبار خیر خواہ ہند و ریختی اخبار نے دیوان غالب کو چشمۂ فیض دہلی میں چھاپا۔

اس زمانہ تک کے تمام نسخوں میں رباعی کے اندر "رک" کی تکرار پائی جاتی ہے جو غالب کی نظروں میں تو خیر کبھی کھٹکی ہی نہیں لیکن لطف یہ ہو کہ (چونکہ ان کی دھاک چاروں طرف لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی) اس نے دوسروں کی زبانوں پر بھی مہر لگائے رکھی۔ یہاں تک کہ مرحوم مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی کی شرح دیوان غالب ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں بمقام حیدر آباد طبع ہوئی اور اس وقت پہلی بار زمانہ کو علم ہوا کہ غالب نے اس رباعی کے مصرعۂ ثانی میں کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔

اگرچہ ۱۳۱۸ھ میں حافظ احمد حسن شوکت میرٹھی دیوان غالب کی شرح لکھ چکے تھے لیکن وہ غالباً تحریفات کی سنک میں پوری رباعی کو چھوڑ گئے اور رباعی ان کی دستبرد سے بچ گئی۔ اس کے ۴-۵ سال بعد ہی غالباً ۱۹۰۴ء میں مولانا حسرت موہانی نے شرح دیوان غالب لکھی جس میں انھوں نے ایک "رک" کو رباعی کے مصرعۂ ثانی سے خارج کر دیا۔ لیکن اس کا سبب بتانے میں وہ بالکل ہی خاموش رہے۔ پھر کیا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے حسرت موہانی کی تقلید میں ایک "رک" کو اڑانا شروع کر دیا۔ لیکن کسی میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ غالب کو موردِ الزام بناتا۔ چنانچہ جب ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں میں شرح کے ساتھ دیوان غالب چھپا تو اس رباعی کے ذیل میں شارح نے کس قدر احتیاط کے ساتھ ذیل کی عبارت لکھی ہے کہ:

"اس رباعی کے دوسرے مصرع میں بعض دیوانوں میں "رک" کو بتکرار لکھا ہے جس کی وجہ سے وزن رباعی سے دو حرف زائد ہو جاتے ہیں اور یہ تکرار غلط ہے۔"

اور حضرت عبدالباری آسی نے اپنی شرح میں غالب کی قابلیت سے ڈرتے ہوئے اپنے دماغ پر زور دئے بغیر لکھ مارا کہ:

"رباعی کا دوسرا مصرع اور نسخوں میں "رک رک کر بند ہو گیا" ... پایا جاتا ہے اور اس صورت میں دو رکن (؟) بڑھتے ہیں مگر غالب کی نسبت ناموزوں کہنے کی جرأت نہیں ہوتی اور ہم اس کو سہو کاتب سمجھ کر صحیح لکھنے کی جرأت کر گئے ہیں۔"

لیکن دیوان غالب مطبوعہ نظامی پریس، دیوان غالب مطبوعہ برلن، غالب نامہ از شیخ محمد اکرام ایم-اے اور نسخۂ حمیدیہ میں ایک "رک" پر اکتفا کر کے کسی قسم کا نوٹ لکھے بغیر ہی ٹال دیا گیا ہے۔ اس لئے ان نسخوں کو معرض بحث میں لانا بیکار ہے، دیکھنا تو ان دو شارحین کو ہے، جو "بعض نسخوں" اور "سہو کاتب" کی آڑ لیکر اپنی ناجائز غالب پرستی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں حالانکہ تحقیق کی روشنی میں یہ الفاظ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بھی دیوان غالب مرتبہ خان بہادر شیخ عبدالقادر بی-اے بیرسٹر ایٹ لا (۱۹۱۹ء) دیوان غالب مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ (۱۹۲۵ء) دیوان غالب مرقع چغتائی (۱۹۲۸ء) اور مطالب الغالب از مولانا سہا (۱۹۲۱ء) میں اس رباعی کے دوسرے مصرعہ میں "رک" کی تکرار باقی رہی۔ ہدیۂ سعید میں قاضی سعیدالدین احمد ایم-اے ایل-ایل-بی لیکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے غالباً

اس جھگڑے سے الگ تھلگ رہنے کے لئے اس رُباعی کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔

اب رہ جاتا ہے صرف طاہر ایڈیشن جس کے متعلق آغا طاہر صاحب کا تحریری دعویٰ ہے کہ "خود مرزا صاحب کے مصدقہ اور قلمی نسخہ کے مطابق ہے"۔ اس کے ساتھ آغا صاحب نے جس عبارت کا بلاک بنوا کر شایع کیا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ منقول عنہ نسخہ ۶ رجمادی الثانی ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۰ دسمبر ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا اور اس پر مرزا غالب نے "نگارندہ را آفریں و نگرندگاں را نوید" اپنے قلم سے لکھکر مہرِ تصدیق ثبت کردی۔ اس تحریر کے بموجب منقول عنہ نسخہ ۱۲۷۷ھ کا قلمی ہے لیکن اس میں "رک" کی تکرار نہیں۔ حالانکہ اس کے ایک ہی سال بعد محرم اور ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں دوبار مصنف کی تصحیح کے ساتھ مطبع احمدی دہلی اور نظامی پریس کانپور میں دیوان غالب طبع ہوا اور اس میں "رک" کی تکرار موجود ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ۱۲۷۷ھ میں غالب نے مصرعہ کو درست کردیا تھا تو اس کے دوسرے ہی سال باوجود تصحیح مصنف پھر ایک "رک" زیادہ کیونکر ہوگیا۔ اس لئے یہ تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ طاہر اڈیشن میں کاتب کی اصلاح کارفرما ہے اور غالب سے اس رباعی کے وزن میں قطعی سہو ہوا۔ اور اس کو تسلیم کرکے ہم اس لغزش کا سبب قایم کرنے میں مرحوم نظم طباطبائی کے موید ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جنھوں نے فرمایا ہے کہ جو عروض فارسی اور اُردو کہنے والوں نے عربی کو ماخذ سمجھ کر اختیار کیا ہے یہ عروض عربی ہی کے لئے خاص ہے۔ اُردو کہنے والوں کو پنگل کے اوزان میں کہنا چاہئے جو ہندی کے اوزان طبعی ہیں اور جن اوزان کو ہم نے اختیار کیا ہے ان میں ہم بہ تکلف شعر کہتے ہیں۔ اسی سبب سے غالب سے شاعر نے بھی ان اوزان پر قابو نہ پایا اور وزن غیر طبعی ہونے کے سبب سے دھوکا کھایا۔

بلاشبہ مختلف زبانوں کے اوزانِ شاعری بھی مختلف ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر زبان کا خاص لہجہ ہوتا ہے اور اس کے اسماء و افعال کے مخصوص اوزان ہوتے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ عربی کے اوزان سے پنگل کے اوزان ہماری طبیعت سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اس لئے ہم کو تھوڑی بہت اس میں ترمیم کرکے ایسے اوزان ترتیب دینا چاہئیں جو اُردو کے اوزان کہے جاسکیں۔ اس کے بعد ہماری شاعری کی وہ عروضی خامیاں جن سے غالب سا شاعر بھی محفوظ نہ رہ سکا، دور ہوسکیں گی۔

ساحل بلگرامی

۱۹۴۱ء کی ایک لرزہ خیز تصنیف

ایک ہندوستانی ریاست کے عیاش حکمران کی پرائیویٹ زندگی کے سنسنی خیز واقعات "مورخ کے افسانے" نامی کتاب میں پڑھئے یہی کتاب ہے جسکے شایع ہونے کے بعد مورخ صاحب پر چار مرتبہ حملہ ہوچکا ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ ضخامت ۱۳۱ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔

زہریلی ناگن:۔ جناب سید محمود مورخ بی۔ اے مدیر روزنامہ مسلمان دہلی کے دس انتہائی دلچسپ مختصر افسانوں کا مجموعہ، زبان سادہ وسلیس۔ خیالات پاکیزہ اور پلاٹ دلچسپ ہیں۔ ضخامت ۱۴۸ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔ علاوہ محصولڈاک۔

شہر خموشاں:۔ جناب سید محمود مورخ بی۔ اے کے سات لرزہ خیز سائنٹفک فسانوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ حصۂ اول:۔ اس میں گاندھی جی۔ سی آر داس۔ مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر کے مختصر مگر جامع حالات تحریر ہیں اور ہندوستانی سیاست پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ ضخامت ۱۴۰ صفحہ۔ قیمت ۸؍ علاوہ محصول۔ (نوٹ) خریداران نگار ۲۸ دسمبر تک سالہ کا حوالہ دیکر یہ چاروں کتابیں دو روپے آٹھ آنہ میں منگوا سکتے ہیں۔ البتہ محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔ **منیجر گلفروش پبلشنگ ہاؤس۔ لال کنواں دہلی**

اُردو ادب کا سماجی پسِ منظر

(شاہانِ اودھ کے وقت میں)

اُردو شاعری نے دکن میں آنکھیں کھولیں۔ لیکن ابھی اس کی بولی بچوں کی بولی تھی جس کی غلطیاں اور لکنتیں بھی دل کو لبھا لیتی ہیں۔ دلّی میں آکر یہ آواز کھلنے لگی سلجھنے لگی بھر پور ہونے لگی جیسے جیسے یہ آواز بالغ ہوتی گئی۔ اس میں سوجھ بوجھ کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ اس میں گہرائی، پختگی، زندگی کی کسک، نشاط کی رنگینی آتی گئی اور نشوونما پاتی ہوئی ایک شخصیت اس میں جلوہ افروز ہونے لگی۔ اس کا ایک مزاج بنتا گیا۔ وہ اسوقت کے حساس طبقہ کی زندگی کی آئینہ دار بننے لگی۔ لیکن عادل شاہ اور نادر شاہ کے حملوں کے صدمے اٹھاکر اس زندگی کی سانس اُکھڑ چلی تھی۔ اب یہ زندگی کیا رہ گئی تھی۔ اسے مرزا یگانہ کی زبان سے سنئے:

چارہ نہیں کوئی سنبھلتے رہنے کے سوا — سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا

اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے — جھونکے کھا کے سنبھلتے رہنے کے سوا

سودا کہتا ہے:۔ "کہا میں آج یہ سودا سے، کیوں ہے ڈانواں ڈول" اگر سودا کی جگہ اگر دلّی پڑھیں تو لفظ ڈانواں ڈول میں ہو اس وقت کے ہندوستان اور اس کی زندگی کا لبِ لباب۔ مل جائے گا۔ یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ اگر اُردو شاعری بابر کے زمانہ اور اورنگ زیب کے زمانہ کے درمیان پروان چڑھی ہوتی تو وہ کیسی ہوتی اور کس زندگی کی جھلک دکھاتی۔ بہر حال جب دلّی کی سلطنت کا زوال شروع ہوا تو دلّی میں اُردو شاعری کا دورِ اول کا کمال نظر آتا ہے یعنی اُردو شاعری کا پہلا دور دن اُگنے کا نہیں بلکہ دن ڈوبنے کا نغمہ ہے۔ جس طرح کی شاعری اُردو میں عموماً ہوتی رہی ہے۔ اس پر نظر ڈالتے ہوئے اقبال نے کہا ہے:۔ "جو قومیں کچھ کام کرتی ہیں اُنھیں مذاقِ سخن نہیں ہے"۔ جب قوم نکمی ہو گئی تو شاعری کی طرف مائل ہوئی اُسوقت دلّی میں رہے تو ہوں گے نہ جانے کتنے شعرا جن میں دس بیس کا کلام حال میں ہمارے ہاتھ آگیا ہے لیکن ان سیکڑوں شاعروں میں چار نام بہت مشہور ہیں۔ میر۔ سودا۔ درد اور سوز۔

اگرچہ دلّی کے بادشاہ، ارکان سلطنت اور رئیسوں کو کسی قدر اس نئی شاعری کا چسکا لگ چکا تھا پھر بھی نہ تو شاعروں کی روٹی دال درباروں سے چلتی تھی نہ دلّی کی اُردو شاعری درباری شاعری تھی۔ کم سے کم شاعری کی دُنیا ابھی بہت حد تک آزاد تھی۔ پھر بھی اس طرح کام کب تک چلتا بادشاہ اور رؤسا کے درباروں سے قطع نظر کرکے عام اہلِ شہر بھی اب اس عالم میں نہ تھے کہ شعرا کے ساتھ سلوک کرسکیں۔ "ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا"۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ابھی اور شاعروں کے پاؤں تو کسی حد تک دلّی میں جمے ہوئے تھے۔ لیکن سوز پہلا شاعر تھا جس کو دلّی چھوڑنی پڑی۔

ملک تو اپنی جگہ پر تھا لیکن دلّی اُجڑ رہی تھی۔ لکھنؤ بس رہا تھا۔ مغل سلطنت کے وزیر ایک ایک کرکے اپنے اپنے صوبوں کے مالک بنتے جا رہے تھے، مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر چلا تھا۔ ان صوبوں میں سب سے آباد اور شاداب صوبہ اودھ کا تھا۔ اس صوبہ کے وزیر یا گورنر نواب آصف الدولہ بہادر اگرچہ ابھی تک کہلاتے نواب وزیر ہی تھے اور برائے نام یا برائے رسم اگرچہ وہ شہنشاہ دہلی کو اپنا آقا بھی کہتے تھے۔ لیکن اودھ کے مالکِ کل بن گئے تھے۔ اُن کی حکومت میں صوبۂ اودھ میں ہُن برس رہا تھا۔ زمین سونا اُگل رہی تھی۔ سرکاری خزانہ مالامال تھا۔ دولت کی دیوی اودھ کی نئی سلطنت سے خوش تھی، یہ سب کچھ تھا لیکن دربار میں کلاونتوں کی کمی تھی۔ شاعری اور دوسرے علوم و فنون ایسی چیز تھے جو سونے پر سہاگہ کا کام کرتے۔ لیکن این سعادت بزور بازو نیست۔ اس لئے لکھنؤ میں شاعری کا چراغ دلّی کے چراغ سے جلا۔ سوز جب دلّی سے مصیبتیں جھیلتے ہوئے لکھنؤ پہونچے تو نواب آصف الدولہ نے شاعری میں اُنھیں اپنا اُستاد بنایا۔ لیکن بقول آزاد کے "چند روز آرام سے نہ گزرے تھے کہ خود دنیا سے گزر گئے۔ نواب کی غزلوں کو دیکھو اُنھیں کا انداز ہے" آزاد نے بات تو ٹھیک لکھی ہے لیکن میں نے نواب آصف الدولہ کی متعدد غزلیں دیکھی ہیں۔ سوز کی غزلوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ ہلکی سی تبدیلی کا خفیف سا احساس ہوتا ہے۔ سوز کی غزلوں کی ٹیس اور کسک، اُن کا کھنچاؤ اور تناؤ ان غزلوں میں کچھ ڈھیلا اور ہلکا پڑ چلا ہے اور خارجیت کہیں کہیں آواز کے رخنوں سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ رنگین خارجیت جو بہت کچھ بن کر اور بہت کچھ بگڑ کر لکھنوی شاعری کی بساطِ ناز پر کھیل کھیلنے والی تھی۔ سوز نے لکھنؤ کا رُخ کیا تو کچھ دنوں بعد سودا اور پھر میر کے پاؤں بھی دلّی سے اُکھڑ گئے اور یکے بعد دیگرے ان دونوں نے بھی لکھنؤ کا رُخ کیا۔ سودا اگرچہ دلّی کے شاعر تھے اور اگرچہ اُن کی شاعری بھی دلّی کی شاعری تھی لیکن زندہ دلی اور خارجیت کا جو عنصر اُن کے کلام میں تھا وہی عنصر کچھ نکھر کر، کچھ دب کے گزر کر لکھنؤ کی زندگی، لکھنؤ کے مزاج، لکھنؤ کے دربار اور لکھنؤ کی شاعری کا جزوِ اعظم ہونے والا تھا۔ اب آیئے ذرا لکھنؤ کے نئے شہر اور نئی راجدھانی کے سماجی پس منظر پر نظر ڈالیں۔ شہر کی دولت خوشحالی بےفکری رونق اور چہل پہل کا کیا کہنا۔ لیکن اُجڑی ہوئی لُٹی ہوئی دلّی کی تہذیب کئی سو برس کی پرانی تہذیب تھی اُس میں خلوص، معصومی، اور معنویت آ چکی تھی۔ زندگی کے گہرے سوتے اس تہذیب کو سیراب کر رہے تھے۔ اگرچہ ان سوتوں میں بہت کم تری رہ گئی تھی۔ پھر دلّی کی زندگی اور تہذیب پر اہلِ باطن اور باصفا فقیروں اور صوفیوں کا حیات بخش اثر تھا۔ وہاں کی شاعری کی گہوارہ جنبانی مظہر جانِ جاناں اور میر درد ایسے روحانیت کے رازداروں نے کی تھی۔ ان تمام صفات سے لکھنؤ کی قلعی شدہ بظاہر چمکتی ہوئی زندگی اور تہذیب محروم تھی۔ باطنیت اور داخلیت کا اس تہذیب میں آسانی سے گزر نہیں تھا۔ مفکروں فقیروں اور اہلِ باطن کی جگہ جدید علماء نے لے لی تھی۔ بےتکلف فطری نیکیاں جذبات حرکات و سکنات سب میں تکلف اور تصنع کی جھلک ملتی ہے۔ زندگی سرے سے آدابِ مجلس ہو کر رہ گئی تھی اور اس کی تمام بھڑک میں ایک سستاپن تھا۔ خوشی کے میلوں ٹھیلوں میں کوئی گہرا جذباتی عنصر نہیں تھا اور محرم کے دنوں میں بھی کربلا کا واقعہ جو ماتم دلوں میں پیدا کرتا تھا اسے دسے کے وہ عموماً یہیں تک پہونچتا تھا کہ:

سر کوٹ کا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے   رات ہم ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے   (شاہ حاتم دہلوی)

ماتم بھی ایک جذباتی تعیش بن گیا تھا۔ اس عیش پرستی بناوٹ اور تکلف کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خوشی خوشی رہی نہ غم غم رہا

اور زندگی ایک سطحی چیز ہو کر رہ گئی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ انحطاط دلی کی روایتیں اور اُس کے اثرات لکھنؤ کی نئی زندگی میں بھی گھن کی طرح لگ گئے۔ دلی کا اُتار اور لکھنؤ کا اُٹھان دونوں ایک مسلسل انحطاط (Continued decadance) کے مختلف نمونے ہیں۔ ایک پریشان حالی میں انحطاط کا نمونہ ہے دوسرا خوشحالی میں انحطاط کا نمونہ ہے۔ لچھن دونوں کے بڑے تھے۔ انجام دونوں کا بُرا ہوا اور قریب قریب ایک ہی وقت۔ لکھنؤ کی جگمگاہٹ دلی کی پھیکی روشنی کا خیال کرکے شاعر کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے:

"بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے"

دلی کی اُداس زندگی میں لکھنؤ کا نشاط ایک حسین تحفہ تھا۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کا ملک اور ہندوستان کی زندگی اپنی رنگا رنگ نوعیتوں کے باوجود اکھنڈ اور ناقابل تقسیم چیز ہے سنسکرت ادب کا عہدِ زریں وہی زمانہ ہے جب ملک بھر میں بُری بھلی ایک مرکزی حکومت قایم تھی۔ ہندی ادب میں تلسی داس اور سور داس کا شاندار زمانہ بھی وہی ہے جب اکبر کا راج ملک بھر میں تھا۔ بنگالی زبان میں ٹیگور اور اُردو میں اقبال بھی اُسی زمانے کی چیزیں ہیں۔ جب ملک بھر میں ایک ہی حکومت قایم ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہندوستان ہمیشہ ادھ موا ہو گیا ہے۔ ہاں مُرغِ بسمل کی وہ تڑپ کہ ہر قدم پر یہ گماں یاں رہ گیا واں گیا ضرور اس زمانہ کا ادب بھی دکھائی دیتا ہے۔ جب ہندوستان کے بند سے بند جدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کی زندگی اور شاعری بھی اُسی شکست کی آواز ہے۔

ہاں تو وہ چیز جس کو مشہور انگریزی شاعر اور نقاد میتھیو آرنلڈ اعلیٰ سنجیدگی (High Seriousness) کہتا ہے لکھنؤ میں نہ آئی تھی اور نہ آسکتی تھی۔ سماجی زندگی کے اُس داخلی اور خارجی پس منظر کا لکھنؤ کی شاعری پر اور اُردو ادب پر کیا اثر پڑا؟ سوز، سودا، میر کے دلی سے لکھنؤ آنے کا تذکرہ آچکا ہے۔ لیکن اُن کے آنے کے پہلے سے خاص لکھنؤ میں اور خاص لکھنؤ کے نواب سے لے کر معمولی طبقہ کے لوگوں میں پچاسوں آدمی ایسے تھے جو شعر کہتے تھے۔ مشاعرے ہوتے تھے لیکن ابھی لکھنؤ کا رنگ دلی کے رنگ سے نمایاں طور پر الگ نہ ہوا تھا، ابھی نگاہیں دلی ہی کے اساتذہ پر اُٹھتی تھیں۔ اس لئے سوز، سودا اور میر جب آئے تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نواب اور رؤساء نے اُن کی سرپرستی کی۔ اُن میں شاعروں کے آگے پیچھے میر حسن بھی دلی سے لکھنؤ آئے۔ ابھی خاص لکھنؤی شاعری تو زیادہ قابلِ توجہ نہیں ہے لیکن لکھنوی زندگی کی خوشحالی اور خارجیت کے کچھ اچھے اور بُرے اثرات دلی سے آئے ہوئے اُن شعرا کے کلام پر ضرور پڑا۔ بات یہ تھی کہ لکھنؤ کی شاعری جس ضلع جگت اور خارجیت کے لئے بدنام ہے اُن خرابیوں کے جراثیم خود دلی کے اہلِ نظر ایسے اشعار کو شاعری کا اعلیٰ نمونہ نہیں سمجھتے تھے اور لکھنؤ والے زبان کی شاعری پر جان دینے لگے تھے۔ لکھنؤ پہونچ کر میر کی نظر میں بھی ضلع جگت کی اہمیت بڑھ گئی۔ لیکن خارجیت نے فایدہ پہونچایا وہ یہ کہ غزلوں سے اُردو شاعری آگے بڑھی میر کی کئی مثنویاں اُن کے قیام لکھنؤ کی یادگاریں ہیں۔

میر حسن جب تک دلی میں تھے صرف نرم و نازک غزلیں کہتے تھے، لکھنؤ کی کھلی اور بھری فضا میں آکر ہی اُنھوں نے مثنوی بدر منیر لکھی۔ جس طرح ناٹک یا ناول لکھنے کے لئے شاعر یا مصنف کو اپنی شخصیت سے باہر آنا پڑتا ہے اور اس رنگا رنگ عالم پر نظر ڈالنا پڑتی ہے اُسی طرح مثنوی لکھنے کے لئے بھی آپ بیتی سے گزر کر جگ بیتی کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔ لکھنؤ کی زندگی کی خوشحالی اور خارجیت نے ہماری شاعری کی لغت میں وسعت دی اور یہ مثنوی اسی زندگی کی دین ہے۔ اُردو سے پہلے بھی

دلّی اور دلّی کے اطراف کی شاعری کا مقابلہ اگر اودھ کی شاعری سے کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی فضا مسلسل نظموں کے لئے زیادہ موزوں تھی اور دلّی و اطراف دلّی کی فضا میں غزلیت زیادہ تھی۔ سور داس نے غزلیں یا بھجن لکھے مگر ملک محمد جائسی اور تلسی داس نے اور آلھا کے مصنف نے مسلسل نظمیں لکھیں۔ نظیر اکبرآبادی ضرور آگرہ کے تھے اور اُردو کے وہ پہلے نظم گو شاعر ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں اطراف دلّی کی حدیں بڑھکر گویا پورے ہندوستان کی حدیں بن گئی ہیں۔ مگر اسوقت تو ہم آپ لکھنؤ میں ہیں میں نے برابر یہ محسوس کیا ہے کہ دہلوی شعراء کے شعور میں پورے ہندوستان کی زندگی موجزن ہے اور لکھنوی شعرا کے محدود شعور میں صرف لکھنؤ کی آبادی ہے اور لکھنؤ کی زندگی ہے۔

میر تو مثنویوں میں بھی عموماً آپ بیتی ہی کہتے ہیں۔ لیکن میر حسن نے جاگیر دارانہ (Feudal) زندگی کی چھی خاصی جیتی جاگتی تصویر مثنوی سحر البیان میں پیش کردی ہے۔ اور اس کے لئے دلّی اور لکھنؤ کی جاگیر دارانہ (Feudal) زندگی کے دور انحطاط کا سماجی پس منظر ضروری تھا۔ اس مثنوی کے لکھنے کی تحریک بھی جبھی تھی کہ یہ زندگی خوشحال اور فارغ البال نظر آئے جیسا وہ لکھنؤ میں نظر آرہی تھی۔ جہاں تک سودا کے کارناموں کا تعلق ہے غور کرنے سے معلوم ہوگا، کم سے کم مجھے یہ معلوم ہوا کہ دبستان دہلی کے پیشوا خان آرزو سے متاثر ہونے والے اُن کے بعد کے شعرا میں سودا کے اُستاد شاہ حاتم تنہا شخص تھے جن کا تخیل اور مزاج خارجی شاعری اور اس کی رنگینیوں کی طرف مائل تھا اگر ہم دلّی کو داخلیت کا سرچشمہ اور لکھنؤ کو خارجیت کا سرچشمہ سمجھیں تو ہمیں دلّی اور لکھنؤ کا سراغ ہندوستان کے نقشے میں ملنے کی بجائے مختلف مزاج کے آدمیوں کے دلوں میں ملیگا۔ دلّی اور لکھنؤ ہمارے دلوں میں ہیں اس طرح دبستان لکھنؤ کی بنیاد شاہ حاتم کے دل میں اور اُن کی شاعری میں تھی اور اُنکے خاندان کے شاعروں کے دلوں میں تھی۔ یعنی لکھنؤ کے وجود سے پہلے ہی سے لکھنوی شاعری کی طرح دلّی میں پڑچکی تھی، جب لکھنؤ بسا تو وہاں کی زندگی نے شاعری کے اس رنگ کو اور چمکایا اُبھارا اور نکھارا۔ یہی وجہ ہے کہ سودا جب لکھنؤ آئے تو اُنکی غزلگوئی جس میں شاہ حاتم کی غزلگوئی نہایت با فروغ اور ترقی یافتہ صورت میں موجود تھی لکھنؤ میں بہت مشہور ہوگئی۔ سودا کی غزلیں سنکر اہلِ لکھنؤ کا یہ حال تھا کہ:

واہ ری تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن پھر بھی سودا، دلّی کا شاعر تھا اس کی خارجیت میں بھی عموماً وہ رس وہ گہرائی وہ وزن اور وہ بات ہے جو لکھنؤ کی غزلگوئی میں نہیں ملتی اگرچہ وہ سطحی تقلید سودا کی غزلگوئی کی ہے۔ اس غزلگوئی میں سودا کا رنگ سودا سے تیز ہے لیکن سودا کی غزلوں کا رس یہاں پھیکا ملیگا۔ خارجیت بھی داخلی اور خارجی ہوتی ہے۔ یہاں بھی معاملہ نہ درتہ ہے۔ سودا کی ہجو میں بھی اسی لکھنوی مزاج کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ لائے تو یہ چیز اپنے ساتھ دلی سے لیکن جتنا اُس سے حضرات لکھنؤ پھڑک پھڑک اُٹھے اتنے بے اختیار اہلِ دہلی نہیں ہوئے تھے۔ سودا کی ہجوؤں کا جتنا اثر لکھنؤ کی غزلگوئی پر پڑا اتنا سودا کی غزلوں کا بھی نہ پڑا۔ سودا کی ہجو لکھنؤ کی غزل گوئی کے اُس حصہ پر اثر انداز ہے جس میں معشوق اور رقیب دونوں کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ دونوں پر پھبتیاں کسی گئی ہیں اہلِ لکھنؤ کے اِن قطعات میں واسوختوں اور اِن مسلسل غزلوں میں سودا کی ہجو جلوہ گر نظر آئے گی جن میں معشوق کی وہ وہ درگت اور فضیحت ہوئی ہے کہ توبہ! ۔ نواب آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خاں تخت پر بیٹھے۔ لکھنؤ کی زندگی کا بناؤ چناؤ وہاں کے بانکے ترچھے، وہاں کی مضحکہ خیز اکڑ، اس زندگی کی ظاہر چمک دمک اور حقیقی سنجیدگی کا فقدان یعنی بگڑوں کے اور

بگڑ جانے کا منظر نظر آتا ہے۔ سوزؔ۔ میرؔ۔ سوداؔ کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ اب جرأتؔ، مصحفیؔ اور انشاؔ کا زمانہ تھا۔ سب سے پہلے دربار پر نظر ڈالئے کیونکہ سماجی زندگی کے پس منظر کا دربار پیش نظر تھا۔ حیرت ہوئی کہ آخری تاجدار دلی بہادر شاہ ظفر کے لٹے ہوئے دربار کے حالات پڑھئے پر تو شاہی شان و شوکت نہ سہی لیکن ایک رعب اور دبدبہ کا اثر دلوں پر پڑتا ہے۔ لیکن اودھ کے دربار کا حال پڑھکر نواب سے انشا کی وہ نقالیاں وہ سستی اور بے مغز اور غیر حقیقی ظرافت و بزلہ سنجی سے کوسوں دور سستی باتیں نظر آتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن کو پڑھکر بالکل ہنسی نہیں آتی۔ کیونکہ ہنسی مذاق کے لئے بھی معنویت اور داخلیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں یہاں ناپید۔ وہ باتیں اور چھیڑ چھاڑ جن میں طرفین کو سنجیدہ ہونے کی توفیق بھی نہیں عطا ہوئی ان سب سے ایک ایسی محفل کا پتہ چلتا ہے جس میں لوگ ہنسنا چاہتے ہیں اور ہنسنا نہیں آتا رونا چاہتے ہیں لیکن رونا نہیں آتا۔ شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے وقت کی زندگی سے ذرا برتر اور بلند ہوں ایک وہ جو اس زندگی کے سب سے متبذل حصے کو چمکائیں۔

مصحفی لکھنؤ میں آکر بھی دلی اور لکھنؤ کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ وہی نرمی، وہی اعتدال، وہی رچی ہوئی رنگینی جو دلی والوں کے یہاں ہے مصحفی کی غزلوں اور ان کے قصیدوں میں ملتی ہے۔ لکھنؤ کی رنگینی خارجیت نے بھی مصحفی کو بنایا کہیں کہیں بگاڑا بھی لیکن جو خارجیت سوداؔ کے یہاں دبی دبی سی تھی اسے مصحفی نے اس طرح چمکایا کہ ہم اُسے حواس خمسہ کا شاعر (Poet of the Sense) کہہ سکتے ہیں۔ خاص کر احساس رنگ (Sense of Colour) جیسا مصحفی کو تھا کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ لکھنؤ کی پرتکلف گفتگو۔ لکھنؤ کی بات چیت میں جو ٹھسا تھا وہ صفات حلول ہو کر ان البیلے اور رواں دواں اشعار میں نمایاں ہیں جن میں مصحفی نے اکثر پتھر کو پانی کر کے دکھا دیا ہے۔ جرأت نے بھی سماجی پس منظر کا بنے ہوئے رنگ میں اثر لیا نہ کہ بگڑے ہوئے رنگ میں یعنی شدید اور پرخلوص جنسی محبت کی جگہ اہل لکھنؤ کی زندگی میں محبت کی نقالی اور خود بینی نے لے لی تھی۔ جرأت نے اس زندگی کے خارجی حرکات و سکنات یعنی اس کی معاملہ بندی، اتنی صحیح کی ہے کہ شاعری نے مصوری کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ دیوان جرأت کے صفحات کے سیمیں پردوں پر عشقیہ زندگی کی سطحی مگر چلتی پھرتی ہنستی بولتی تصویر نظر آتی ہے جو سچی بھی ہے اور دلکش بھی جس کی خارجیت میں داخلی جذبات کی ہلکی سی چاشنی ہے جرأت کی شاعری اور جرأت کے رنگ کی شاعری صرف لکھنؤ میں پیدا ہو سکتی تھی لکھنؤ کی زندگی کے سماجی پس منظر کے بغیر جرأت کی شاعری ناممکن تھی۔ انشا کے متعلق میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے بلکہ رائے نہیں یقین اور احساس رہا ہے کہ اگرچہ وہ اپنی ظرافت کے لئے مشہور ہیں اپنی مہذب شاعری کے لئے مشہور ہیں لیکن انھیں سب کچھ آتا تھا سوا ظرافت کے انھیں سب کچھ آتا تھا لیکن ان میں یہ سلیقہ نہ تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کس بات پر کس خیال پر کس موقعہ پر ہنسنا چاہئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انشا نہ مصحفی تھے نہ جرأت بلکہ اس طرح کے شاعر تھے جو وقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی چونکہ ان میں ایک غیر معمولی ذہانت اور طباعی تھی اس لئے اپنے کلام کے اس حصہ میں جو مزاحیہ نہیں ہے انھوں نے ایک خاص انداز پیدا کیا ہے سوداؔ اور میرؔ کے بعد صرف انشا ایسا شاعر ہے جو نمایاں طور پر صاحب طرز ہے اُردو شاعری میں شاید ہی انشا ہی تنہا شخص ہے جسے ہم (Poet of fancy) کہہ سکیں،

دلی اور لکھنؤ کی سماجی زندگی اور شاعری میں یہ فرق بھی قابل توجہ ہے کہ دلی کے شعرا میں حریفانہ لاگ ڈانٹ نے وہ صورت اختیار نہ کی جو لکھنؤ میں محض لکھنوی زندگی کی سطحیت۔ روحانی بے مائگی اور جو محض ایک باطل نظریۂ زندگی کا نتیجہ ہو سکتی تھی مصحفی اور انشا کے معرکوں کے پہلے سوداؔ اور میر ضاحک لڑیں اور ان کے طرفداروں کے معرکے آب حیات میں پڑھئے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا سماجی پسِ منظر دھوکے کی ٹٹی تھی اور اس کی متاعِ زندگی لے دے کر (Treasury) رہ گئی تھی۔ لوگ اُس زمانہ کے لکھنؤ کی بذلہ سنجی اور ظرافت کی داد دیتے ہیں۔ مگر مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے اور بچپن ہی سے ایسا محسوس کیا ہے کہ ان بدنصیبوں کو شوخی شرارت ہنسنا ہنسانا آتا ہی نہیں تھا ان سب چیزوں کے لئے دماغ چاہئے۔ علم زندگی چاہئے اور یہ سب وہاں سرے سے ندارد۔ بہر حال جراُت۔ مصحفی۔ انشا کی ہستیاں اپنے وقت کے لوگوں سے بلند ہستیاں تھیں اور اپنے وقت کے لمالِ نمازوال کو بھی کچھ اُبھار گئیں کچھ بگڑے ہوئے عناصر کا بناؤ دکھا گئیں۔ کچھ رنگ دکھا گئیں، کچھ رنگ اڑا گئیں کچھ رنگ جما گئیں۔

اُردو نثر بھی اُس زمانے میں پر پرزے نکالتی ہے۔ جس کی یادگار انشا کی لکھی ہوئی رانی کیتکی کی کہانی اور دریائے لطافت ہے جو اُردو کی پہلی قواعد ہے ایک بگڑے ہوئے زمانے میں ایک بگڑے ہوئے شاعر نے ایک بگڑی ہوئی چیز کا اُردو شاعری میں اضافہ کیا یعنی سعادت یار خاں رنگین نے ریختی کہی۔ یہ وہی حضرت ہیں کہ جب انھوں نے میر کا شاگرد ہونا چاہا تو میر نے اُن کا کلام سُن کر کہا:۔

"صاحبزادے! آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں، نیزہ بازی، تیر اندازی کی کثرت کیجئے۔ شہسواری کی مشق فرمائیے۔ شاعری جگر خراشی اور جگر سوزی کا کام ہے آپ اس کے درپے نہ ہوں۔"

اب جراُت، مصحفی اور انشا کا دور بھی ختم ہوتا ہے۔ ابھی نوابانِ اودھ کی سلطنت قایم ہے۔ اب غازی الدین اور اُن کے بعد نصیر الدین تخت نشین ہوتے ہیں اور لکھنؤ کی زندگی اور شاعری بھی۔ دلّی کی شاعری اور لکھنؤ کی شاعری دونوں کا سماجی پس منظر شہر میں رہنے والے رؤسا، اُمرا، اور اوسط درجہ کے لوگوں کی زندگی ہے۔ حضرت نظیر اکبر آبادی وہ تنہا شخص تھا جس نے اُردو ادب کو کم سے کم شہر میں رہنے والے عوام کی زندگی سے روشناس کیا۔ ورنہ یاد رہنے کہ شروع سے اب تک اُردو ادب اور اُردو شاعری کا سماجی پس منظر پورے ہندوستان کی سماجی زندگی نہیں رہی ہے۔

پریم چند اور اُن کے مقلدوں نے اُردو نثر میں ضرور اس کمی کو پورا کیا۔ لیکن یہ تو بہت بعد کو ہوا۔ جراُت، مصحفی، انشا، اور رنگین کے بعد ناسخ اور آتش آتے ہیں۔ دونوں نے صرف غزلیں کہی ہیں اور ان کی غزلوں میں بھی مختلف پہلوؤں سے لکھنؤ کی زندگی کا پس منظر نظر آتا ہے۔ ناسخ نے زبان کو بہت کچھ بنایا اور شاعری کو بہت کچھ بگاڑا۔

آتش نے جہاں وہ ناسخ کی پیروی سے بچ گئے ہیں زبان اور شاعری دونوں کو بنایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب لکھنؤ کی زندگی میں یہ پُرانی رنگ رلیاں قایم تھیں لیکن خارجی اور داخلی طور پر کچھ سنجیدگی آچلی ہے۔ آتش کی غزل میں سنجیدگی اور بانکپن کا وہ امتزاج ہے جو صرف لکھنؤ میں ممکن تھا، اس لکھنؤ میں جو اپنے عہدِ طفولیت سے سنِ شعور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زندگی کا سماجی منظر بدل رہا تھا۔ اسی سے آتش کی شاعری کے تیور اور انداز بھی بدلے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر لکھنؤ کے پورے لٹریچر سے ہمیں ایک چیز لینی ہو تو ہم بلا تامّل مثنوی گلزارِ نسیم کو لیں گے جس کے کئی ہزار اشعار میں لکھنؤ کا مزاج، نظریہ، شاعری، اندازِ بیان، لکھنؤ کی تہذیب، نفاست، اور لطافت سب جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

نسیم کے بعد بھی لکھنؤ کی لکھنویت قایم رہی۔ انیس اور دبیر اور اُن کے بعد کے شعرا نے بہت کچھ لکھنؤ کے رنگ کو اپنایا۔ لیکن اگر کوئی ایک تصنیف لکھنؤ کے رنگ شاعری کی نمایندگی کر سکتی ہے تو وہ گلزارِ نسیم ہے۔

(نشور لاسلکی لکھنؤ) فراق گورکھپوری ایم۔اے

مکتوباتِ نیاز

بجا ارشاد ہوا - لیکن آپ کو کیا خبر کہ ابھی تو یہاں کہنے کو دفتر کا دفتر پڑا ہوا ہے - اتنا کچھ کہنے کے بعد بھی پہلا ورق تمام نہیں ہوا !

رونا کہاں ہوا ہے مجھے دل کھولکر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آگیا

گھبرائیے نہیں، وہ وقت دور نہیں جب یہ "قصرِ جہل" مٹ کر رہے گا اور انسانیت کا چہرہ اس غُبار کے اندر سے مسکراتا ہوا نظر آئے گا !

ہمیں نہیں معلوم دُنیا اس سے پہلے کتنی مرتبہ تباہ ہو ہو کر پھر آباد ہوئی ہے، لیکن اب فطرت کی ان اٹھکیلیوں کو ختم ہوتا ہے - یا تو اسے برباد ہو کر اب سنورنا نہیں، یا اگر سنور گئی تو پھر برباد ہونا نہیں - یہ برزخی دور اب اپنی آخری گھڑیوں سے گزر رہا ہے اور وہ ساعت قریب ہے جب اہرمن و یزداں میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ ہوجانا ہے !

اُف رے تجاہل ! آپ جو کچھ چاہتی ہیں، وہ ہو چکا، لیکن آپ کو کسی طرح اس کا یقین تو آئے
کہ سعدیؔ از پئے جاناں برفت و جاں انداخت !

مسکرائیے نہیں - زخم کے ٹانکے ٹوٹتے ہیں، اور پھر وہ گھڑی سامنے آجاتی ہے جب
تغافل از تو می آرید و حسرت می چکید از من !

میں نے پہلے بھی کبھی "شیوۂ عشق" کی طرف سے کوئی معذرت بارگاہِ حُسن میں پیش نہیں کی تھی اور اب بھی اس کا یارا نہیں - اس لئے اس طنز سے کیا فایدہ کہ
ایں آتشِ نیرنگ نہ سوزد ہمہ کس را

جلکر خاک ہوجانے والوں سے بھی آپ کی محبت کا تماشہ دیکھ چکا ہوں اور پروانوں کی طرح تڑپنے والوں سے بھی ! لیکن آپ کو شاید اس کا علم نہیں کہ
خاطرِ پروانہ از ہر آتشے خرسند نیست

اس سے مراد آپ کے پندارِ حُسن کو صدمہ پہونچانا نہیں، بلکہ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ آپ اگر کبھی سے

محبت کریں بھی تو نتیجہ معلوم !

بود محبت ناداں بلا کہ یوسف را
طرب سرائے زلیخا تمام زنداں ست!

اس مرتبہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، اسے پھر لکھئے، شاید اب کے یقین آجائے !

مکرمی - زحمت تو ہوگی، لیکن کسی دن وقت نکال کر، پروفیسر صاحب سے مل لیجئے اور اُن سے صرف اتنا پوچھ لیجئے کہ کیا میرے چار خطوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں پہونچا - اگر وہ کہیں کہ "نہیں"، تو فوراً اُلٹے قدم واپس آجائیے اور کچھ نہ کہئے، لیکن اگر وہ خط پہونچنے کا اقرار کریں، تو ان سے دریافت کیجئے کیا وہ مجھ سے خفا ہیں اور خفا ہیں تو کیوں ؟

حیرت ہے کہ یہ لوگ کالجوں اور اسکولوں میں طلبہ کو کیا درسِ اخلاق دیتے ہوں گے اور آیندہ نسل کی طرف سے دنیا کو کیا توقع ہو سکتی ہے - میں ابھی آپ کو نہ لکھوں گا کہ میں نے انھیں کیا لکھا تھا اور وہ کیوں جواب نہیں دیتے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ میں آپ کو اطلاع دوں گا اور شاید آپ یہ سُنکر حیران رہجائیں گے کہ وہ اپنے کتنے مکروہ جُرم کو اپنی خاموشی سے چھپانا چاہتے ہیں -

اگر ممکن ہو تو یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ وہ اس دوران میں کہیں باہر تو نہیں جا رہے ہیں - شاید میں خود آسکوں

بندہ نواز - آپ نے بھی کن لوگوں کا ذکر کیا - ان میں سے کس کو کس پر ترجیح دیجائے ؟

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند

اس سے زیادہ اگر آپ کو حال معلوم کرنا ہے تو باسط صاحب سے پوچھئے، ورنہ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ خود تجربہ کیجئے - حماقت تو ہوگی لیکن بہت کار آمد، کیونکہ اس طرح آپ حق الیقین کے درجہ تک پہونچ جائیں گے

حیرت ہے کہ جب میں آپ کو ایک بار لکھ چکا تھا، تو پھر آپ نے دوبارہ کیوں دریافت کیا - شاید آپ کو یقین نہ آیا تھا - بہرحال اس باب میں اب مجھ سے مزید استفسار کی ضرورت نہیں - میں اپنی رائے پر اب بھی قائم ہوں، آپ کو تامل ہو تو خود تحقیق کیجئے، ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز میرے لئے زہر ہو اور آپ کے لئے تریاق!

جناب بندہ - اس کا کیا علاج کہ آپ صرف "عریاں تنی" کو کمال سمجھتے ہیں اور میں

دامانِ چاک چاک دگریباں دریدہ را

اُس میں پھر بھی ہوش کا شائبہ موجود ہے ! ——— آپ مجھ سے کپڑے اُتار کر کھُل کھیلنے کو کہتے ہیں اور میں ایک ایک تار کا حساب لینا چاہتا ہوں —— اُدھر ایک ایک رگ میں نشتر چبھونا اور ادھر ایک ایک رگ سے پھانس نکالنا !

آپ اس کی لذت سے واقف نہیں - براہ راست خدا سے معاملہ رکھنے والوں کا یہی دستور ہے -
آپ کو مادی ذرایع کی ضرورت ہے، اس لئے یہ بات مشکل سے سمجھ میں آئے گی !

کرمی - جلال اسیر واقعی اچھا شاعر تھا - ضرور اس کا مطالعہ کیجئے، لیکن عرفی کا سا جمال اس میں کہاں، اسیر کے چند اشعار مجھے یاد ہیں، آپ کے انتخاب میں نہ آئے ہوں تو لکھ لیجئے :-

اسیر از دوست پرسیدن چہ حاجت — سوالے را کہ دشنامش جواب ست

تیغ برکف، بادہ در سر، خندہ پنہاں زیر لب — از برائے جانِ ما خوش محفلے آراستند

دل را در آتش افگنم و بوئے او می کنم — منت نمی تواں ز نسیم و صبا کشید

از غبار شوق طرح کعبۂ دل ریختند — گردِ رہ بر داشتند و رنگِ منزل ریختند

اُلفت نمی کنند بہ کس دل دویدہ ہا — گلچیں نمی شوند جراحت گزیدہ ہا

شمع را ہمدرد بلبل کرد عشق — برگ گل چید و پرِ پروانہ ساخت

زاہد کہ گزشتہ از دو عالم — از خود چہ قدر گزشتہ باشد

لیکن جلال اسیر کے یہ تمام اشعار ایک طرف اور عرفی کا یہ شعر ایک طرف :
خوش آنکہ پیش تو پرسند حالِ عرفی و او — شکایتے بہ کنایت ز روزگار کنند
ایک اور شعر سن لیجئے :
نہ گویمت بنشین در قدح شراب انداز — کرشمۂ کن و یک شہر را خراب انداز

وقت کی باتیں

ایک آہنی عزم و ارادہ کا انسان

(اسٹالین)

سترہ کروڑ روسی آبادی کا قاید اعظم، جو اسوقت ہٹلر کے مقابلہ میں صف آرا ہے اور جس کی کامیابی پر نہ صرف اشتراکیت کی زندگی بلکہ یورپ کی تمام حکومتوں کی آزادی منحصر ہے۔ دنیا کے اُن چند انسانوں میں سے ہے، جن کی ابتدائی زندگی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُن کو آخر میں یہ کچھ ہونا ہے اور جن کی کامیابی اتفاق سے زیادہ خود انسانی عزم و ارادہ کی پختگی کی رہین منت ہے۔

اب سے نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ ۱۸۷۹ء میں ایک لڑکا جوزف نامی طفلس کی سرزمین پر پیدا ہوتا ہے، اور ایک ایسے غریب خاندان میں جس کی روزی کا سہارا صرف جوتے بنا بنا کر بیچنا تھا۔

جوزف کے باپ کی خواہش تھی کہ اس کا لڑکا مذہبی تعلیم حاصل کر کے پادری بنے، لیکن یہ دبلا پتلا مگر خود سر لڑکا اسکول میں مذہبی کتابوں کے بجائے علوم و فنون کی کتابوں اور انقلابی لٹریچر پر زیادہ توجہ صرف کرتا، اس لئے وہ ۱۸۹۶ء میں اسکول سے نکالا گیا۔ اسوقت طفلس میں روسی مزدوروں کی ایک انجمن قایم تھی، یہ اس میں شامل ہو گیا۔ یہاں اس نے بہت جلد غیر معمولی عزت حاصل کر لی اور انقلاب پیدا کرنے کے جرم میں چھ مرتبہ گرفتار کر کے سائبیریا بھیجا گیا۔ یہ ہر مرتبہ قید سے بھاگ کر باہر نکل آیا اور ہر مرتبہ ایک نیا نام اختیار کیا آخری نام اسٹالین تھا۔

جب یہ سائبیریا کی طرف جلا وطن کیا جاتا تو وہاں بھی بیکار نہ بیٹھتا بلکہ انقلابی جماعت کے آدمیوں سے ملتا رہتا۔ پولیس اس کا پیچھا کرتی اور یہ ہمیشہ کسی نہ کسی تدبیر سے بھاگ نکلتا۔ یہ اپنے جلسوں کے لئے بہت پوشیدہ مقامات تجویز کرتا اور وہیں مزدوروں کو بلا کر انقلاب کی دعوت دیتا۔ چنانچہ جارجیا میں یہ جلسے ایک مسلم قبرستان میں ہوا کرتے جہاں کا گورکن، اسٹالین کا دوست تھا۔

ایکبار اسٹالین کو معلوم ہوا کہ پولیس اس کے پریس کی جستجو کر رہی ہے، اس نے پریس اور ٹائپ وغیرہ سب اسی گورکن کو دیدئے۔ اس نے اپنے ایک اور دوست قاسم نامی کے سپرد کر دیا اور اس طرح اسٹالین کا پریس پولیس کے ہاتھ نہ آسکا۔

قاسم کاشتکار تھا اور اسی کے گھر پر اسٹالین اور گورکن جمع ہو کر باتیں کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ قاسم کو بھی تحریک انقلاب سے دلچسپی پیدا ہونے لگی اور آخر کار وہ انقلاب کا بڑا حامی ہو گیا۔ اب اسی کے مکان میں پریس قایم کیا گیا جہاں پریس کے آدمی عورتوں کا بھیس بدل کر برقعوں میں آتے اور یہیں سے انقلابی لٹریچر کی اشاعت کی جاتی۔

قاسم ہر صبح کو ترکاریوں کا ٹوکرا لیکر باہر نکلتا جس میں پھلوں کے نیچے انقلابی اشتہارات و اعلانات چھپے رہتے۔ یہ کارخانوں میں پہونچکر مزدوروں کے ہاتھ پھل وغیرہ فروخت کرتا اور انھیں اشتہارات میں لپیٹ کر حوالہ کر دیتا۔

یوں تو اسٹالین اور لینن کی رسم و راہ خط و کتابت کے ذریعہ سے ۱۹۰۳ء ہی میں ہو چکی تھی لیکن ملاقات سب سے پہلے ۱۹۰۵ء

میں ہوئی جب فنلینڈ کی بالشویک کانفرنس میں ان دونوں کا اجتماع ہوا۔ اس ملاقات کا حال خود اسٹالین کی زبان سے سنئے، وہ کہتا ہے کہ:- "میں خیال کرتا تھا کہ لینن اپنی جسامت کے لحاظ سے دیوپیکر انسان ہوگا، اس لئے جب میں جلسہ میں پہونچا تو اور بہت سے لوگ جمع تھے لیکن لینن مجھے نظر نہ آیا۔ وہ لینن جس کی خاص تصویر میں نے اپنے ذہن میں قایم کی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب وہ یہاں آئیگا تو ہر طرف سناٹا چھا جائے گا، لوگ مودب کھڑے ہوجائیں گے اور ہر شخص کی نگاہیں اسی کی طرف اٹھی ہوئی ہوں گی۔ لیکن جب دیر تک کوئی ایسا انسان نہیں آیا تو میں نے پوچھا کہ لینن کب تک آئے گا؟ اس کے جواب میں ایک شخص نے حیرت سے پوچھا کیا تم لینن کو نہیں جانتے وہ کیا کھڑا ہوا باتیں کر رہا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہگیا کہ میرا دیوپیکر لینن، نہایت ہی معمولی جسم کا انسان تھا اور لوگوں سے اس طرح بے تکلفانہ باتیں کر رہا تھا گویا وہ بھی انھیں میں سے ایک ہے، اس کی اس سادگی نے مجھ پر بڑا اثر کیا اور میں ہمیشہ کے لئے اسکا گرویدہ ہو گیا۔"

اسٹالین نے انقلاب روس میں جتنا نمایاں حصہ لیا اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ دو مرتبہ اسے (Red Flag) کا تمغہ ملا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک جنگی کونسل میں ممبر کی حیثیت سے اس نے کام کیا۔

انقلاب کے بعد زیادہ تر سینٹ پیٹسبرگ ہی میں رہا اور لینن کے مددگار ہونے کی حیثیت سے وہیں کام کرتا رہا۔ اسوقت لینن کا ایک اور مشیر ٹراٹسکی بھی تھا، لیکن ٹراٹسکی زیادہ تر چل پھر کر تقریریں کیا کرتا تھا اور اسٹالین مرکز ہی میں رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسٹالین کو پارٹی میں زیادہ درخور حاصل ہو گیا اور جب ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو لینن کا انتقال ہوا تو اشتراکی جماعت کی امیدیں زیادہ تر اسی سے وابستہ ہوگئیں یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ سکریٹری جنرل ہو گیا۔

اسٹالین کی پرائیویٹ زندگی بھی عجیب و غریب ہے۔ اس کی بیوی تین بچے چھوڑ کر ۱۹۳۲ء میں مرچکی ہے اور اسٹالین انھیں کےساتھ کریملن* کے ایک چھوٹے سے سہ منزلہ مکان میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس مکان میں ایک کھانے کا کمرہ ہے، ایک چھوٹا سا ہال ہے اور تین خوابگاہ۔ اور یہ سب نہایت معمولی فرنیچر رکھتے ہیں۔ دونوں بیٹے رات کو کھانے ہی کے کمرے میں رہتے ہیں اور لڑکی ایک علٰحدہ کمرے میں۔ کھانا پاس کے ہوٹل سے آجاتا ہے اور اسٹالین معہ اپنے تینوں بچوں کے اسی پر قناعت کرتا ہے۔

یہ ہے وہ سادہ انسان جو اس وقت روس کا ڈکٹیٹر اور تمام روسی آبادی کا محبوب لیڈر ہے۔ لینن نے چاہا تھا کہ اس کے بعد کلی نن پریسیڈنٹ مقرر کیا جائے اور وار شلاف کمانڈر انچیف، لیکن اسٹالین کے اقتدار نے یہ بات پوری ہونے نہ دی اور ٹراٹسکی کو بھی آخرکار وہاں سے جلاوطن ہونا پڑا۔

اسٹالین بہت کم بولتا ہے، وہ خطیب و مقرر نہیں ہے، لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے اس سے مضبوطی ارادہ و فراست ضرور ظاہر ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کا مقابلہ کرنے میں ہٹلر کو اس قدر دشواریاں پیش آرہی ہیں۔

دودھ اور سائنس

سیکڑوں برس سے دُنیا یہی سمجھتی آرہی تھی کہ دودھ صرف پینے کی چیز ہے، لیکن آج ہم اسے کھا سکتے ہیں، پہن سکتے ہیں اور اس پر سوار بھی ہوسکتے ہیں، ہم اس کے قلم بنا کر لکھ سکتے ہیں، اسکے بٹن اپنے کوٹوں میں لگا سکتے ہیں اور پہیے بنا کر ان کو سواری کے کام میں بھی لا سکتے ہیں۔ ایک گلاس جس میں آپ پانی پیتے ہیں، ایک فانوس جسکے نیچے شمع روشن رہتی ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی وقت یہ دونوں ایک گیلن دودھ کی شکل میں پائے جاتے ہوں۔

سائنس نے دودھ کی بہت سی چیزیں بنائی ہیں، انھیں میں سے ایک وہ ہے جسے (Lanital) کہتے ہیں،

* کریملن، ماسکو کے اس محل کا نام ہے جہاں زار رہا کرتے تھے لیکن اب یہاں سودیٹ حکومت کے اجلاس ہوتے ہیں۔

یعنی "دودھ کا اُون"۔ دودھ سے کپڑا طیار کرنا بظاہر بہت عجیب بات معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے ——— چار سال پہلے کی بات ہے کہ اٹلی کا ایک شخص لندن کی سڑکوں پر چلتا پھرتا نظر آیا جو کپڑے کا سوٹ پہنے ہوئے تھا لیکن لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ دودھ کا بنا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ چند مہینے قبل بھی میں، ایسا ہی ایک سوٹ پہن کر آیا تھا جو ۸ بوتل دودھ سے طیار ہوا تھا۔ جب اس کی خبر واشنگٹن پہونچی تو وہاں کے ماہرین علم الکیمیا نے تحقیق شروع کی اور آخرکار (Lanital) طیار کر کے پیٹنٹ کرا لیا گیا۔

بنانے کی ترکیب بہت معمولی ہے۔ دودھ سے Casein یا (جُبُن) نکال کر اسے ایک خاص قسم کی چھلنی کے اندر سے گزارتے ہیں جس سے ریشے بن جاتے ہیں اور ان ریشوں کو کاٹ کر کپڑا طیار کیا جاتا ہے۔

دودھ سے نہ صرف کپڑا طیار ہوتا ہے بلکہ بٹن اور Steering wheel بھی بن سکتے ہیں، اور اسکے لئے دودھ کو Plastic کا (نرم و لچکدار صورت) میں تبدیل کرنا ہوگا۔ صنعتی اداروں میں اب پلاسٹک مادوں کی بڑی قدر ہے، کیونکہ دھات کو گلانا، ڈھالنا، یا جوڑنا بہت وقت چاہتا ہے، اور اگر ہم نرم و لچکدار چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھانچے بنا بنا کر سخت و خشک کر سکیں تو بڑی آسانی ہے، چنانچہ پچھلے بیس سال کے اندر لاکھوں چیزیں پلاسٹک مادوں سے طیار کی گئی ہیں۔ دودھ کو پلاسٹک بنانے کی کوشش جاری ہے اور ہاتھی دانت کی جگہ اس سے برابر کام لیا جا رہا ہے۔ یعنی جن چیزوں کی طیاری میں ہاتھی دانت سے کام لیا جاتا ہے، ان میں اب دودھ کا "ہاتھی دانت" استعمال ہوتا ہے ——— دودھ سے ایک خاص Paint (رنگنے کا روغن) بھی طیار کیا جاتا ہے اور گوند بھی۔ یہ گوند اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ ہوائی جہازوں کی لکڑیاں اُسی سے جوڑی جاتی ہیں۔ نفیس کاغذوں کی سطح چکنی کرنے کے لئے بھی Casein ہی کی وارنش کی جاتی ہے ——— مکھن یا Casein نکالنے کے بعد دودھ کا ۹۲ فی صدی حصہ چھاچھ کی صورت میں رہ جاتا ہے، لیکن بیکار یہ بھی نہیں ہے۔ اس سے ربڑ طیار ہونے لگا ہے اور سڑکوں کے Reflectors (عکس ڈالنے والے نشانات) بھی اس سے بننے لگے ہیں۔ ایک خاص قسم کی شکر ہے جسے دودھ کی شکر (Sugar of milk) کہتے ہیں اور جو دواؤں کی طیاری میں بکثرت استعمال ہوتی ہے، یہ شکر بھی چھاچھ ہی سے طیار ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے مرغیوں کی ایک مہلک بیماری میں جس کا نام Coccidosis ہے، چھاچھ بہت مفید ثابت ہوئی ہے ——— چھاچھ سے حیاتین "G" بھی طیار ہوتی ہے جس کے استعمال سے مرغیوں کے بچے بہت جلد بڑھتے اور طیار ہوتے ہیں یہاں تک کہ چھ ہفتے میں ان کا وزن دو پونڈ کے قریب ہو جاتا ہے۔

غزل:-

کیسی خوشی کہاں کا غم۔ لذتِ درد بھی ہے ختم　　کہتے ہیں جس کو زندگی وہ مری زندگی نہیں
یہ بھی مرا نصیب ہے میں جو ملول ہو گیا　　آپ کے التفات میں ورنہ کوئی کمی نہیں
میری نظر اِدھر اُٹھی۔ اُن کی نظر اُدھر جُھکی　　ہو گئی گفتگو تمام۔ بات مگر ہوئی نہیں
دیکھ سکوں انھیں یہ محال! اُف ری نزاکتِ جمال　　پھر بھی مری نگاہ کو شکوۂ نارسی نہیں
وجہ سکوں نہ بن سکا حسن کا التفات بھی　　میرے نصیب ہی میں اب کوئی مگر خوشی نہیں
ذوقِ طلب ابھی ہے خام۔ شوق ابھی ہے بے نظام　　دل میں ہے سوزِ ناتمام۔ آگ ابھی لگی نہیں
اُن کی نظر نے کی عطا لذتِ بیخودی مجھے　　لذتِ بیخودی مگر حاصلِ زندگی نہیں

[illegible]

غزل :-

جو رات اتنی بھیانک تھی کیا سُہانی ہے
بڑے مزے کی کہانی تری کہانی ہے

میری زباں پہ یہ کس رنگ کی کہانی ہے
شباب وعشق سے معمور زندگانی ہے

گزر گئی شبِ غم ہے نمود صبح نشاط
نفس نفس میں جوانی ہے شادمانی ہے

یہ کس کے کوچے سے آکر نسیم نے چھیڑا
مری رگوں میں نئے خون کی روانی ہے

چمک رہا ہے زمانے میں داغ عشق میرا
سیاہیِ شبِ دیجور پانی پانی ہے

ٹھکانے لگنے دے مٹی بھی اب یہیں میری
تمام عمر ترے در کی خاک چھانی ہے

جگا کے خاک کے پتلوں میں درد بھر دیگا
ترا پیام ہے اور وہ مری زبانی ہے

اُسی کی عمر گزرتی ہے تیری قربت میں
جسے ہراس یہ رہتا ہے موت آنی ہے

سُناؤں گا تمھیں روداد زیست سوچ تو لوں
پُرانی بات ہے بھولی ہوئی کہانی ہے

بہت کڑی ہے تری راہ اور منزل دور
نگار پانوں ہیں پیری ہے ناتوانی ہے

دلوں دلوں ہی میں ہوتے ہیں اُن سے راز و نیاز
بڑے مزے کی محبت کی زندگانی ہے

اُٹھا رہا ہوں مزے تیرے لطفِ پنہاں کے
عجیب چیز خموشی ہے بے زبانی ہے

جگر کا نام مٹائے سے مٹ نہیں سکتا
یہ جگہ ہے جہاں عمر جاودانی ہے

جگر بریلوی

علیگڑھ میں ——— ایک خاتون کی خودکشی پر

اور ایک جسم حرص کی ہلچل سے چھٹ گیا
اور ایک ذہن رنج مسلسل سے چھُٹ گیا

اور ایک روح کاوشِ عقبیٰ سے بچ گئی،
اور ایک جان کاہشِ دنیا سے بچ گئی

اور ایک دل نے رسم کی زنجیر توڑ دی
اور اک جگر نے شاخِ غلامی مروڑ دی

اور اک جبیں فریبِ عقیدت سے بچ گئی
اور اک زبان جرم سیاست سے بچ گئی

اور اک شعور موت سے بچ کر نکل گیا
اور اک ضمیر گرنے سے پہلے سنبھل گیا

اور اک خیال عرش کے اس پار جا لگا
اور اک گمان اپنی حدوں سے گزر گیا،

اور ایک نغمہ ساز کی اُلجھن سے چھٹ گیا
اور ایک تیر قیدِ کماں سے رہا ہوا

اور اک کلی نے چاک کیا اپنا پیرہن
اور ایک جگنو توڑ گیا بندشِ چمن،

اور اک کرن غبارِ مسافت میں کھو گئی
اور ایک تتلی آگ کی موجوں پہ سو گئی

اور ایک چاند ٹوٹ کے گم ہوگیا کہیں
اور ایک کشتی ہوگئی دریا میں تہ نشیں

انسان کے خدا! پھر اک عورت کی خودکشی
ٹھکرا کے رکھ گئی ترا فرمانِ زندگی

فضل الدین اثر

شعاع

اُفق چمکا، ہوئی کافور شب کی ظلمتِ پیہم — پیامِ صبح رنگیں ہے، سحر کی آسماں تابی
دمِ خورشید نے اک روح پھونکی نبضِ ہستی میں — تپش پیدا ہوئی ذروں میں مثلِ رقص سیمابی
چلی موجِ نسیمِ صبح اُٹھکر کنجِ گلشن سے — گریزاں چشمِ غنچہ سے ہوا کیفِ گرانخوابی
ہر اک شاخِ چمن جھومی، گلوں کی انجمن جھومی — ہی پیمانۂ خورشید سے جوئے مئے نابی!

طلسمِ خوابِ شب ٹوٹا نمودِ صبحِ روشن سے
پرافشاں ہوگئے طائر نکل کر کنجِ گلشن سے

شعاعِ مہرِ تاباں کیا ہے؟ اک پیغامِ بیداری — سکوتِ غنچۂ گل کو صلائے نغز گفتاری
ہوا ہے سست رو جو قافلہ تاریکیِ شب سے — چمک کر اُس کو دیتی ہے نویدِ برق رفتاری
بجھا دیتی ہے جاکر چرخ پر تاروں کی قندیلیں — زمیں پر آکے ذروں کو عطا کرتی ہے بیداری
چمن کو تابشِ شبنم سے کر دیتی ہے آئینہ، — قبائے گل پہ تارِ زر سے پھر کرتی ہے زرکاری
شعاعِ مہر ہے شاید، دیارِ نور کا قاصد! — جہانِ خاکِ تیرہ پر، ہوا فرمانِ خور جاری

جھلک نورِ ازل کی، جلوۂ خود بیں کا آئینا
یہی بن جائے گی اک دن شرارِ آتشِ سینا

کبھی یہ بن کے برقِ نور تڑپی کوہِ فاراں پر — سمٹ کر بن گئی جگنو، شبِ تارِ بیاباں پر
کبھی شمعِ حقیقت ہے دلِ تاریکِ گوتم میں — کبھی رازِ تجلی ہے، کفِ موسیٰ عمراں پر
کبھی نورِ نگہ بنکر یہ نکلی چشمِ بینا سے — کبھی خود بن گئی پردہ، ضیائے عقلِ انساں پر
کسی کو مشعلِ امید بن کر راہ دکھلائی — گری بنکر کبھی بجلی، کسی کے خرمنِ جاں پر
کیا روشن کبھی صحرا، چراغِ لالہ و گل سے — کبھی بنکر سحر پھیلی، جبینِ ماہِ تاباں پر

ہر اک ذرہ میں پیدا ہے جھلک نورِ حقیقت کی
زمیں سے آسماں تک، موجزن ہے روح وحدت کی

تمیزِ رنگ و بو یکسر فریبِ چشمِ باطل ہے — گلستاں میں جو گل ہے، پہلوئے انساں میں وہ دل ہے
تہِ دریا جو گوہر ہے، وہی گلشن میں شبنم ہے — وہی ہے سوزِ پروانہ، جو نورِ شمعِ محفل ہے
زباں پر جو تکلم ہے، وہی لب پر تبسم ہے — وہی ہے آبِ خنجر میں، جو اشکِ چشمِ بسمل ہے
وہی ہے رنگ و بو گل میں، جو نغمہ قلبِ بلبل میں — وہی تابش ہے تاروں میں جو رو دوحِ پیکرِ گل ہے

وہی ہے ایک جلوہ جس سے ہر محفل ہے نورانی
چراغِ ماہ کیا ہے؟ پرتوِ مہرِ درخشانی!!

شمس شیدائی سہسرامی
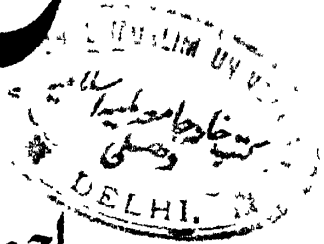
حاجیوں کے جہازات

شاہی سمندری بیڑہ، شاہی ہندوستانی بیڑہ اور شاہی ہوائی فوج کی حفاظت میں سال گزشتہ کا حج بخیریت تمام ہوگیا تھا اور اب مُغل لائن فخر کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ حکومتِ ہند کی رضامندی اور مشور سے حاجیوں کے لئے جہازات کی روانگی کا انتظام ہوگیا ہے۔

چونکہ اس وقت لڑائی جاری ہے اس لئے جہازوں کے نام اور اُن کی روانگی کی صحیح صحیح تاریخیں نہیں بتائی جاسکتیں لیکن حج کے جانے والوں کو چاہئے کہ وہ مقررہ تاریخوں میں بندرگاہوں پر پہونچ جائیں اور اسکا انتظا بھی کرلیں کہ انھیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا جو پانچ روز سے زیادہ نہیں ہوگا۔

شرح کرایہ حسب ذیل ہے:۔

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ
فرسٹ کلاس واپسی ٹکٹ (مع کھانے کے)	۷۴۴ روپیہ	۷۱۶ روپیہ
تختۂ جہاز / تھرڈ کلاس واپسی ٹکٹ	۲۰۳ روپیہ	۱۹۶ روپیہ

س کے علاوہ ہر مسافر کو روانگی کے وقت بندرگاہ پر جہاز تک پہونچانے اور جدہ میں جہاز سے اُتارنے کے لئے مزید (۔/۴) دینا ہ
مزید تفصیلات پتۂ ذیل سے دریافت کیجئے:۔

ٹرنر موریسن کمپنی لمیٹڈ نمبر ۱۶ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

[illegible]ات جنسی (۲)

شہوانیات

[illegible]یں فحاشی کی تمام فطری اور [illegible]سموں کے حالات اور انکی تاریخی [illegible]ہمیت پر نہایت شرح و بسط [illegible]تقادہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا [illegible]شی دنیا میں کب اور کس طرح [illegible]یز کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج [illegible]ردی۔ اس کتاب میں آپ کو [illegible]یز واقعات نظر آئیں گے

[illegible] روپیہ (ﷲ) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۶ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (ﷲ) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲؍) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ مادئین کا مذہب

۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (ﷲ) علاوہ محصول

شاعر کا انجام

نیاز کے عنفوانِ شباب کا افسانہ، حسن و عشق [illegible] کیفیات اس کے [illegible] جملہ میں موجود ہیں، یہ اپنے پلاٹ اور انشاء [illegible] سے اس قدر بلند ہے کہ دوسری جگہ اس کا [illegible] سکتی۔

[illegible] آنے [illegible] علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، عسرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت، دیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ [illegible] علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا ختم تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲؍) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی [illegible] اس کتاب پر [illegible] ایک ہزار روپیہ انعام [illegible]

قیمت دو روپیہ [illegible] علاوہ محصول